تذکرۂ شاعراتِ اُردو

آغاز سے موجودہ دور تک کی عفت مآب شاعرہ خواتین کا
تذکرہ، معہ انتخاب کلام و تبصرہ

تالیف

محمد جمیل احمد ایم۔اے بریلوی

ناشر
قومی کتب خانہ بریلی

طبع اوّل — ایک ہزار

(مطبوعہ بریلی الیکٹرک پریس بریلی - آر - ایس - لال رستوگی پرنٹر)

ک

مندرجات

خ

د

ر

ز

ضمیمہ

چند مضامین حواشی

× × × × × × × × ×

فہرست تصاویر

تعارف

[از محترم جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی ام اے پی ایچ ڈی (لندن)]

اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر اپنے وسیع مفہوم میں وزن و بحر کی قید سے آزاد رہ کر بھی شعر ہی رہتا ہے لیکن عرف عام میں جسے ہم شعر کہتے ہیں اس کا منظوم ہونا لازمی ہے۔ تو گویا اب شاعری کے بنیادی عناصر دو ٹھہرے۔ تخیل اور موزونی طبع۔ یہ دونوں چیزیں فطری ہیں کسبی نہیں۔ لیکن قدرت نے اپنے اس انعام کے لئے صرف مردوں کو مخصوص نہیں کیا۔ فیض کا دروازہ مستورات پر بند نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے اور کسی دلیل کی محتاج نہیں چنانچہ ہر متمدن عہد میں ایسی خواتین گذری ہیں جو ہر اعتبار سے شاعرہ تھیں۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فطرت نے اس باب میں عورتوں کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں کی۔ تو شاعرات کی تعداد اتنی مختصر اور ان کے کلام کی تعداد اس قدر کم کیوں ہے کہ مرد شاعروں کے مقابلے میں ان کا عدم وجود برابر ہے؟ وجہ ظاہر ہے۔ جہاں تک جسمانی زور و قوت کا تعلق ہے قدرت نے مرد کو عورت کے مقابلے میں بدرجہا غالب و قاہر بنایا ہے اسی زور و قوت کی بناء پر مرد نے کبھی عورت کو اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھا اور اس کی ذہنی استعداد اور دماغی قابلیتوں کو کبھی نشو و نما کا موقعہ نہیں دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، عورت کے اکثر فطری ملکات معطل رہتے رہتے بالآخر بیکار ہو گئے اور وہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی کارنمایاں نہ کر سکی۔ بایں ہمہ بعض طبیعتوں کا جوش اور زور، طوفان و سیلاب کے مانند تھا جو مرد کے تعصب کی پیدا کی ہوئی گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود نہ رک سکا اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ

شعر کی دنیا میں بہت سے تابناک جواہر پارے عورت کے دل و دماغ کے خزینوں سے نکل کر عالم وجود میں آئے، لیکن مرد کی "غیرت" نے گوارا نہ کیا کہ انھیں منظر عام پر آنے دے۔ میر صاحب نے شعراء کا تذکرہ لکھا لیکن کسی شاعرہ کا ذکر کرنا یا اس کا کوئی شعر نقل کرنا ایک زبردست اخلاقی گناہ سمجھا۔ حالانکہ خود ان کی صاحبزادی شعر کہتی تھیں اور اچھا کہتی تھیں یہی حال میر حسن کے بعد آنے والے اکثر دوسرے تذکرہ نویسوں کا ہے کہ عورت کے ذکر سے اُن کی "اخلاقی غیرت" کو شرم کا پسینہ آنے لگتا ہے۔ زمانہ کی دستبرد اور مردوں کی اس دار و گیر کے باوجود خواتین کے کلام کا کچھ حصہ ہم تک پہنچ ہی گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مستورات کے ذوق شعری کی مناسب تربیت کی جاتی تو وہ اس میدان میں کسی طرح مردوں سے پیچھے نہ رہتیں۔

زمانہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہمارے "جنسی اخلاق" کا آئین، آزادی کی ہوا سے متاثر ہونا شروع ہوا۔ وہ اگلی سی پابندیاں اور سختیاں نہ رہیں اور ہمارے شعراء کے تذکروں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خال خال کیا جانے لگا۔ چنانچہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں چند شاعرہ خواتین کا نہایت مختصر حال اور نمونہ کلام درج کیا ہے۔ مولوی عبد الغفور نساخ، شیفتہ سے چند قدم آگے بڑھے اور "سخن شعراء" میں بطور ضمیمہ شاعرات کا مختصر تذکرہ شامل کتاب کیا۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ آزادی کی راہیں کھلتی گئیں اور شاعرات کے مستقل تذکرے لکھے جانے لگے چنانچہ "شمیم سخن" اور "تذکرۃ الخواتین" وغیرہ وجود میں آئے۔

شاعرات کے ان تمام تذکروں میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ مشترک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں جن شاعرہ عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر

طوالتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعرات کے حالات نہایت نامکمل اور نمونۂ کلام
بیحد مختصر ہے بعض شاعرات کا صرف تخلص اور صرف ایک شعر نقل کرنے پر
اکتفا کی گئی ہے۔ حالات جب صرف نام یا تخلص تک محدود ہوں تو پڑھنے
والے کو شاعرہ کے ماحول کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، اور نہ وہ یہ معلوم کر سکتا
ہے کہ شاعرہ کن کن چیزوں سے کس حد تک متاثر ہوئی ہے۔ اسی طرح جب
نمونۂ کلام ایک دو شعروں سے زیادہ نہ ہو تو لکھنے والے کے میلانات اور
رجحانات کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میر صاحب کا سوز و گداز
آج ضرب المثل ہے لیکن اگر ان کے صرف یہ دو شعر ہم تک پہنچے ہوتے:۔

ہے تیرہ روز اپنا لونڈوں کی دوستی سے ؛؛ اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش ؛؛ کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

تو ظاہر ہے کہ ہم ان کے متعلق جو رائے قائم کرتے وہ سراسر لغو ہوتی یہی حال
دوسرے اکابر شعرا کا ہے۔ انشا کی ٹھٹول بازی سے کون واقف نہیں، لیکن
اگر ان کی صرف یہ غزل:۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ؛؛ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نمونے کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہوتی تو یقیناً ہم انہیں ایک نہایت
سنجیدہ گو شاعر سمجھتے اور ظاہر ہے کہ ہماری یہ رائے حقیقت کے سراسر خلاف ہوتی
بنا بریں شاعرات کے حالات اور ان کا کلام مہیا کرنے میں جس بے توجہی سے کام
لیا ہے اب اس کی تلافی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے تذکرہ نگار کا
یہ فرض ہے کہ وہ کم سے کم اپنی ہمعصر شاعرات کے حالات اور ان کا منتخب کلام
پوری کوشش کے ساتھ فراہم کرے۔ کلام کا نمونہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اتنا
تو ہو کہ پڑھنے والا اس کے مطالعے کے بعد لکھنے والی کی رنگ طبیعت کو سمجھ سکے۔
مسٹر محمد جمیل احمد ایم اے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے

شاعرات کا یہ مبسوط تذکرہ موسوم بہ "شاعرات اُردو" مرتب کیا۔ اس میں شاعرات کے حالات بھی ہیں اور کلام کا معقول نمونہ بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی نکتے اور تنقیدی اشارے بھی۔ عصر حاضر سے پہلے کی شاعرات کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ دوسرے تذکروں سے ماخوذ ہے۔ اس لیئے لازمی طور پر نا تمام ہے۔ البتہ دورِ حاضر کی شاعرات کے حالات اور کلام کی فراہمی میں بڑی کد و کاوش کی ہے اس آزادی کے دور میں بھی شاعرہ خواتین کے حالات اور کلام کا مہیا کرنا "ہفتخوانِ رستم" کو طے کرنے سے کم نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ جمیل صاحب دورِ حاضر کی شاعرات کے متعلق اتنا کثیر سوانحی اور شعری مواد کیونکر فراہم کر سکے۔

"شاعرات اُردو" کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ دوسرے تذکروں کے برعکس "شاعرات اُردو" میں ان شاعرات کا ذکر یکقلم ترک کر دیا گیا ہے جو زنانِ بازاری کے طبقہ میں شامل ہیں جمیل صاحب کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض طوائفیں خود بھی شعر کہتی تھیں اور اچھا کہتی تھیں لیکن اکثر و بیشتر ان کا کلام ان کے مرد احباب کا کہا ہوا ہے اور جمیل صاحب کا یہ خیال بے بنیاد نہیں۔

کسی تذکرہ کے متعلق یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمہ وجوہ مکمل ہے اپنی ان کوتاہیوں کے باوجود جن کا ازالہ موجودہ حالات میں تقریباً ناممکن تھا۔ "شاعرات اُردو" اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے خدا اسے حسنِ قبول روزی کرے اور جواں سال مؤلف کی سعی مشکور ہو۔ آمین۔

(ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے پی ایچ ڈی لندن)
ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ

پیش لفظ

[ازجناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے، دبیر کامل، منشی فاضل، ایچ، پی، اے رجسٹرار جامعہ اردو و صدر شعبۂ فارسی و اردو آگرہ کالج آگرہ]

ہر ملک کی خواتین نے جہاں تمدن، معاشرت اور سیاسیات میں کم و بیش حصہ لیا ہے وہاں زبان و ادب، اور شعر و شاعری کی ترقی میں بھی انھیں ایک حد تک شریک پایا جاتا ہے۔ یورپ ہو یا ایشیا، چین ہو یا جاپان، ایران ہو یا ہندوستان، ہر ملک میں وہاں کے ماحول اور تمدن کے مطابق ایسی خواتین پیدا ہوتی رہی ہیں جو ادبیات کے گلستاں کو سدا بہار بنانے میں ساعی ہوئیں۔ یوں بھی عورت میں فنون لطیفہ سے لذت گیر ہونے کے جذبات مرد سے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ معاشرت اور ماحول اسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقعہ نہ دے۔ مصوری، موسیقی، شاعری کے لئے جن لطیف احساسات اور نازک جذبات کی ضرورت ہوتی ہے وہ عورت میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ مگر ہندوستانی ماحول نے خواتین کے ان احساسات و جذبات کو بہت کم ابھرنے اور ظاہر ہونے کا موقعہ دیا ہے۔ خواتین کی جانب سے اس تغافل کا ہی نتیجہ ہے کہ شاعرات سلف کے حالات اور کلام سے ہم بالکل تاریکی میں ہیں۔ آج ان کے احوال و کلام کی تدوین کی کوشش، ظلمات میں آب حیات کی تلاش سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس دور میں معاشرت کی اک گونہ تبدیلی اور نشر و اشاعت کی سہولت کے باعث، ہم کو کچھ ادیب اور شاعر خواتین کے نام نمایاں نظر آنے لگے ہیں اگر خواتین کا یہ علمی ذوق، اور ادبی خدمات کا شوق، اسی طرح ابھرتا رہا، اور افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہ سکا، تو شاید ہماری ادیب و شاعر خواتین قابل عزت جگہ پانے کی مستحق ٹھہر سکیں گی۔ مگر تعجب ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی اردو ادبیات کے مؤرخ اور ناقد، خواتین کی ہمت افزائی اور ادبی خدمات کا

اعتراف و تذکرہ کرنے سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔

جناب جمیل صاحب بریلوی ایم۔اے (مصنف اردو شاعری کی مختصر تاریخ) ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور تنہا اس زبردست اور مشکل کام کو سر انجام دینے کے لئے آمادہ ہو گئے "شاعرات اردو" شاعر خواتین کا تذکرہ ہے جس میں جمیل صاحب نے نہایت کاوش اور تحقیق کے بعد ابتدا سے لیکر موجودہ دور تک کی شاعرات کا کلام اور حالات فراہم کئے ہیں اس کتاب سے تاریخ و تنقید ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اردو میں مدت مدید سے تذکرے لکھے گئے، لیکن اس تمام عرصہ میں شاعر خواتین کے متعلق "شاعرات اردو" جیسا کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ اس لئے تاریخ ادبیات کے مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں مصنف کی یہ محنت جو مرتبہ رکھتی ہے ظاہر ہے۔

کتاب کے مقدمہ سے جمیل صاحب کی متانت طبع، ذوق سلیم اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعرات کے مختلف دور اور اسکول قائم کرنے میں مصنف نے محنت سے کام لیا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے تحت ان تمام خواتین کا تذکرہ آگیا ہے جن کے نام یا دو ایک شعر قدیم تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ کتاب کا زیادہ حصہ دور حاضر کی شاعرات پر مشتمل ہے جس میں تذکرے کے ساتھ ساتھ کلام پر تنقید و تبصرہ کا فرض بھی ادا کیا ہے۔ اور اکثر شاعرات کا انتخاب کلام بھی تفصیل سے درج کیا ہے۔ شاعرات کے خود نوشتہ حالات اور خود کردہ انتخاب کا شمول اس کتاب کی ایک دلچسپ خصوصیت ہے جس کی قدر و منزلت کا اندازہ مورخ اور نقاد ہی خوب کر سکتے ہیں۔ نہ معلوم اس کے لئے مصنف کو کس قدر خلوص و نیاز، اور صبر و استقلال سے کام لینا پڑا ہوگا۔

میں جمیل صاحب کی اس تصنیف اور محنت کو کامیاب اور لائق مبارکباد سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ ادبی خدمت علمی حلقوں میں خراج تحسین حاصل کرے گی۔

محمد طاہر فاروقی

انتساب

خواہرانِ محترم

آمنہ و بنّو

کے نام

جنکی

آج صرف یاد باقی ہے

جمیلہ

نام مصنف - محمد جمیل احمد

پیدائش ۲۲ر جون سنہ ۱۹۲۱ء

مولد - بدایوں

مسکن - بریلی

تعلیم - ام۔ اے (اقتصادیات) فرسٹ ڈویژن سنہ ۱۹۴۰ء

ال۔ ٹی سنہ ۱۹۴۱ء

پتہ - معرفت قومی کتب خانہ - بریلی - یو۔پی

دیگر تصانیف :-

(الف) مطبوعہ :-

(۱) اردو شاعری کی مختصر تاریخ

(۲) غزالہ

(۳) ٹوٹے ہوئے دل

(۴) تاثرات

(ب) زیر طبع :-

(۱) اقبالیات

(۲) آئینۂ سخن

(۳) سازو مضراب

(۴) سراب

(۵) وداعِ آخر

مصنف

محمد جمیل احمد ایم۔اے بریلوی

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم ص۹۲

التماس

موجودہ صفحات میں اردو شاعرات کا ایک مختصر تذکرہ اور ان کے
کلام کا ایک مختصر انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا
خیال تو اس وقت آیا تھا جب میں اپنی کتاب "اردو شاعری کی مختصر تاریخ"
(مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) مرتب کر رہا تھا لیکن اس وقت چند در چند
وجوہات کی بنا پر یہ چیز صرف عالم خیال ہی میں رہی۔ عموماً زمانہ نقوش
کو ہلکا کرتے کرتے مٹا دیا کرتا ہے۔ مگر یہ نقش کچھ اس طرح کا تھا کہ
وقت کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ گہرا ہو گیا۔ نیرنگ خیال بابت ماہ جون
سنہ ۱۹۴۰ء میں میں نے "شاعرات ہند" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا
جو بہت پسند کیا گیا اور پھر ہر طرف سے اسی خیال کو تکمیل تک پہنچانے کی
تاکید ہونے لگی۔ اور بالآخر میں نے اس کار مشکل کو شروع کر ہی دیا۔
لیکن جتنا کام کرتا گیا اتنا ہی یہ کام اور زیادہ مشکل نظر آتا گیا۔ آخر مسودے
کو نامکمل حالت میں چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اتفاقاً کچھ عرصہ بعد محترمی
پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) نے اس مسودہ کو اسی طرح
غیر مکمل صورت میں دیکھا۔ آپ نے میری ہمت افزائی فرمائی اور کہا
"مجھے آپ کی یہ کتاب بہت پسند ہے۔ آپ نے اچھا کام کیا ہے"

اس کے بعد پھر میری کچھ ہمت بندھی اور پھر میں نے کام کرنا شروع کردیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ آپ نے بھی مسودہ دیکھ کر میری ہمت افزائی کی اور کچھ مفید مشورے بھی دئیے۔ عام طور پر یہ خیال پسند کیا گیا۔ طبقۂ نسواں اور خصوصًا شاعرات نے میرے اس خیال کو سراہا اور میری ہمت بندھائی:

مسز بی حق نے لکھا:۔

"کتاب شاعراتِ اردو کی ترتیب کا خیال قابلِ ستائش ہے"

محترمہ عزیز جہاں بیگم ادا نے لکھا:۔

"شاعراتِ اردو کی ترتیب کا خیال مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی دنیا میں آپ کی اس کوشش کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔"

محترمہ آمنہ خاتون عفت نے لکھا:۔

"آپ کے قومی جذبات اور جنس نسواں کی قدر قابل مبارکباد ہے۔"

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:۔

"جملہ خواتین آپ کی اس محنت کی داد دینگی۔"

شہزادی تیمور جہاں حجاب نے لکھا:۔

"آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ واقعی شاعرات بیویوں کی حقیقی دلی ترجمانی ہے اس چیز کا تو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ کوئی روئے زمین پر مذاقِ سخن رکھنے والی عورتوں کی حوصلہ افزائی کریگا۔

بلکہ ہم لوگ اس بات سے تنگ آچکے تھے۔ ہر زمانہ مشاعرہ پر اظہار تنقید کیا جاتا رہا جس کے سبب ہم لوگوں کے حوصلے پست ہوچکے تھے مرادآباد۔ دہلی میرٹھ اور مظفرنگر کے مشاعروں کے بعد جن کی بجنے صدارت کی متذکرہ بالا نتائج نکلتے رہے" آپ نے زمانۂ حاضرہ کی شاعرات کو صفحۂ قرطاس پر لاکر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے' علاوہ اس کمزوری کو پورا کرنیکے جس کی ضرورت اسوقت ہمارے ملک کی تمام لائبریریوں کو تھی"......

ایک اور مکتوب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"خبر نہیں آپ نے ان منتشر ٹکڑوں کو کیسے یکجا کر دیا ہے واقعی آپکو بڑی تلاش اور کاوش کرنا پڑی ہوگی"

محترمہ صابرہ سلطان حزیں نے لکھا:۔

"کتاب مذکور کی اشاعت اردو ادب پر آپ کا ایک احسانِ عظیم ہوگا عورت کی جہاں ہر چیز کو پسِ پشت ڈالا جاتا رہا ہے وہاں اسکی شاعری بھی ناقابلِ التفات سمجھی گئی"

محترمہ خدیجہ مستور لکھنوی نے لکھا:۔

"یہ معلوم ہو کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ آپ نے اردو شاعرات کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے۔ شکر ہے کہ اردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہو رہی ہے"

محترم جناب رازق الخیری صاحب (ایڈیٹر رسالہ عصمت) فرماتے ہیں:۔

"میری دلی دعا ہے کہ آپ اس کوشش میں کامیاب ہوں۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔"

بہر حال ان ہمت افزائیوں نے میری دستگیری کی اور آج کسی نہ کسی طرح ان صفحات کو ختم کر رہا ہوں۔ ایک غیر متعلق شخص اسکو دیکھ کر کہے گا کہ اس میں کیا رکھا ہے، چند بے ربط جملے، دو چار شعر اور بس، لیکن جو لوگ اس قسم کا کام کرنے کے کچھ تھوڑے سے بہت بھی عادی ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اوراق "بھی کس قدر جگر کاوی اور محنت چاہتا ہے۔

موجودہ مجموعہ میں شاعرات کا جو انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے اس میں کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا گیا نہ کسی خاص اصول کی سختی سے پابندی کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اکثر مختلف خواتین کے کلام کے انتخاب میں مختلف معیار قائم کرنا پڑے ہیں۔ اور اس کی وجہ تھی۔ شاعرات۔۔۔ خصوصاً شاعرات گزشتہ کا اتنا زیادہ اور ایسا کلام دستیاب نہیں ہو سکا کہ ان سب کا انتخاب کسی ایک خاص معیار کے مطابق کیا جا سکتا۔ اگر ایک بلند معیار قائم کر کے انتخاب کی کوشش کی جاتی تو اکثر ان خواتین کو جو اس تذکرہ میں شامل ہیں نظر انداز کر دینا پڑتا۔ اور اگر کوئی پست معیار قائم کیا جاتا تو یہ مجموعہ بجائے ذوق سلیم کو تسکین بخشنے کے اس پر ایک بار بن جاتا۔ علاوہ ازیں پھر اکثر خواتین کا کم و بیش تمام کلام پیش کر دینا پڑتا۔ جو موجودہ مجموعہ کا مقصد نہیں حقیقت یہ ہے کہ کسی انتخاب میں کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ معیار انتخاب کرنے والے کے ذوق۔

منحصر ہوتا ہے اور خود ذوق قانونِ تغیر کا ماتحت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ مختلف شخصوں کا ذوق مختلف ہوتا ہے، خود ایک ہی شخص کا ذوق مختلف اوقات اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے۔ کیفیت کے کسی ایک خاص لمحہ میں ایک شعر اس کو اشکبار کر دیتا ہے اور دوسرے لمحہ میں وہی شعر بے کیف و سادہ نظر آتا ہے، البتہ اس بات کی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ خواتین کا جو کچھ کلام راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے منتخبہ اشعار اس میں بہتر ہوں، ان شاعرات کے کلام کی نمائندگی اور ان کی خصوصیات کی طرف رہبری کر سکیں، صاف اور اگر ممکن ہو تو پُر کیف پُر اثر ہوں اور حتی المقدور معائب سے پاک ہوں۔ انتخاب میں جذبات کو الفاظ پر ہر جگہ ترجیح دی گئی ہے! اس لئے کہ میرا نظریۂ شاعری خوبصورت الفاظ کا چناؤ نہیں بلکہ خوبصورت جذبات کا صداقت آگیں اظہار ہے۔ اکثر شاعرات سلف کا صرف ایک ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ دستبرد زمانہ سے ان کا صرف ایک ہی شعر یادگار رہ گیا ہے اور ان کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

شاعرات کے کلام —— اور اس سے زیادہ ان کے حالات —— کی فراہمی میں مشکلات پیش آئیں۔ اردو کے جتنے خاص خاص تذکرے ہیں وہ سب شعرا سے متعلق ہیں البتہ تلاش و کاوش کے بعد چند چھوٹے چھوٹے تذکرے ایسے ملتے ہیں جن میں کچھ خواتین کے اشعار

ہیں، لیکن قریب قریب ان سب تذکروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ شاعرات کے زمانے اور مقام کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اکثر پورا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ حالات نہایت ناکافی اور تشنہ ہیں، کلام پر تنقید و تبصرہ کا بالکل فقدان ہے، کلام کے نمونے جو پیش کئے گئے ہیں وہ نہایت مختصر، غیر تسکین بخش اور اکثر پوچ و لچر ہیں؛ یہ تو خیر شاعرات گزشتہ کے متعلق تھا۔ لیکن شاعرات حاضرہ کے متعلق یہ بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں میری مشکلات ظاہر ہیں میں نے سوچا کہ خود شاعرات کو لکھوں اور خود ان سے ان کے حالات اور انتخاب کلام حاصل کروں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پتے کیسے حاصل ہوں میں نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن، دہلی ریڈیو اسٹیشن، اور مختلف رسالوں (خصوصاً زنانہ رسالہ) کے ایڈیٹروں کو لکھا، ہر جگہ جواب ایک مستقل خاموشی تھی۔ میں ایک گداۓ مبرم کی طرح برابر تقاضہ کرتا رہا۔ بالآخر لکھنؤ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کا جواب ملا کہ اس سلسلے میں ہم کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے بعد محترم رازق الخیری صاحب ایڈیٹر رسالہ عصمت نے تحریر فرمایا:-

"اصولاً میں کسی خاتون یا کسی مضمون نگار کا پتہ کسی کو نہیں لکھ سکتا۔ چونکہ یہ اصول کی بات ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگی۔"

خیر۔ ان بزرگوں نے اتنا کرم تو کیا کہ جواب دیا۔ اوروں نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ فرمائی۔ پھر بھی جتنے پتے مجھے معلوم ہو سکے میں نے

ان پر عریضے ارسال کئے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری آواز بالکل صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی۔ اس طرح میں اس مجموعہ میں کچھ شاعرات کے خود منتخبہ اشعار اور خود مرسلہ حالات بھی پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں ان ذریعوں کے علاوہ میں نے ملک کے ادبی رسالوں اور صحیفوں سے بھی بہت مدد لی ہے؛

ہماری شاعرات کی کوئی ترتیب و تقسیم بھی نہیں کی گئی۔ اور کی بھی کیسے جاتی جب ان کے کلام ہی کو محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہ کی گئی۔ تو ترتیب و تقسیم و تنقید کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ میں نے صفحات ذیل میں اس امر کی پہلی مرتبہ کوشش کی ہے اور یہاں جو ترتیب و تقسیم پیش کی گئی ہے وہ راقم الحروف ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے چونکہ اس کے بغیر کوئی تذکرہ بھی تاریخی، تنقیدی اور ادبی حیثیت سے قابلِ وقعت نہیں۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے شعراء کو مختلف ادوار اور اسکولوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ میں نے بھی اسی روش کی تقلید میں شاعرات کے مذکورہ ذیل ادوار و اسکول قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) موجدین

(۲) شاعرات اُردو کا دہلی اسکول

(۳) شاعرات اُردو کا لکھنؤ اسکول

(۴) دورِ حاضر

مختلف ادوار کو سمجھنے اور اس وقت کی زبان اور شاعری کا اندازہ

کرنے کے لئے اردو زبان کے ارتقا کا ایک مختصر سا خاکہ بھی ضروری تھا اس لئے آغاز میں وہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ ہجری اور عیسوی سنہ جہاں تک ممکن ہوا ہے "مختصر تاریخ ہند" مصنفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی رفیق دار المصنفین، اور "داستان تاریخ اردو" مصنفہ پروفیسر حامد حسن قادری سے لیے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں مصنفوں نے بڑی کاوش اور احتیاط سے ہر جگہ تمام اصل ہجری سنہ اور حسابی عیسوی سنہ درج کئے ہیں۔

شروع میں بطور مقدمہ شاعرات کے کلام پر ایک مختصر ریویو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں مختلف ادوار اور اسکولوں کی شاعرات کے کلام کی نمایاں خصوصیات پیش کر دینے کی کوشش کی گئی ہے خصوصاً دور حاضر کی شاعرات کے مختصر حالات درج کرنے کے بعد ان کے کلام پر مجمل تنقیدی نوٹ بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ ان تنقیدی نوٹوں کے متعلق ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

کچھ گرامی قدر شاعرات سے قطع نظر، مجموعی حیثیت سے شاعرات کا کلام ابھی سخت اور شدید تنقیدوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور یوں بھی عیب جوئی اور عیب نمائی میرا مسلک نہیں۔ اسلئے ان تنقیدی نوٹوں میں تحسین، ہمدردی اور ہمت افزائی کا پہلو غالب ہے۔ چونکہ میرا مقصد تعمیر ہے تخریب نہیں۔ پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ واقعات سے انحراف نہ ہو اور تنقید تنقید ہی رہے۔

ادوار گزشتہ میں شاعرات کے ناموں کی ترتیب میں زمانہ اور

وقت کا حتی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ مگر موجودہ دور میں چونکہ زمانہ کا کوئی خاص سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیئے ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے جس میں کسی تخلص کو تلاش کرنا نسبتہً آسان تر ہے۔

موجودہ مجموعہ میں صرف عفت مآب خواتین کو شامل کیا گیا ہے اسمیں شاہدانِ بازاری کے اشعار و حالات پیش نہیں کئے گئے اسکا سبب یہ نہیں ہے کہ شاہدانِ بازاری کا شمار عورتوں میں نہیں، یا ان کے جذبات قابل اعتنا نہیں اس کے کئی سبب ہیں:۔ اوّل یہ کہ شاہدانِ بازاری کے کلام کی بابت وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں کا کلام ہے یا ان کے قدردانوں میں سے کسی نے ان کے نام سے کہہ دیا ہے لیکن یہی اعتراض بعض مواقع پر شاعرات پر بھی صادق آسکتا ہے اور مجھے اس میں کلام نہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں اس شبہ کے لیئے ہر ممکن گنجائش موجود ہے اور یہاں نظاہر اس کے امکانات کم ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ عورت فطرتاً شرم و حیا کا مجسمہ ہے اور یہ چیز نسوانی فطرت کا ایک ضروری جزو ہے ہمارے ذہن میں عورت کے تصور کی لطافت ہی اسوقت تک قائم ہے جبتک حیا و شرم کے جذبات اس کے ساتھ ہوں یہی وجہ ہے کہ ابتذال و فحاشی ایک دفعہ مرد کی زبان سے اس قدر گراں نہیں

سلہ میں انگریزی پڑھنے کے بعد بھی اپنے نظریوں میں خالص مشرقی ہوں اور میرا نظریہ بھی مشرقی نظریہ ہے۔ اسکو مغربی کسوٹی پر نہ جانچئے یہ لطافت اس کثافت کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ جمہ

گذرتی اور اس قدر حیا سوز نہیں ہوتی جتنی کہ عورت کی زبان سے ہوتی ہے۔ شاہدان بازاری کے کلام کا زیادہ تر حصہ فحاشی و ابتذال پر مشتمل ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ شاعرات کے یہاں بھی اکثر مبتذل اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یاسمن۔ گوہر۔ ضیاء۔ شرم اور کنیز (فاطمہ بیگم) وغیرہ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ ان میں بھی یاسمن اور کنیز دونوں لونڈیاں تھیں بیگمات میں سے نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی فحاشی ان کے کلام میں کہیں کہیں ملتی ہے ان کا عام رنگ نہیں۔ برخلاف اس کے شاہدانِ بازاری کا عام رنگ یہی ہے چند مثالیں جو بغیر کسی خاص کاوش و اہتمام کے لی گئی ہیں ملاحظہ ہوں۔

دلبر (اکبر آبادی)

قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس　　اک روز لپٹ کر شب مہتاب میں سونا

امراؤ جان زہرہ (لکھنؤ چوک)

سو بوسے گر دیئے ہیں تو دس اور دیجئے　　تسبیح میں ضرور ہیں دانے شمار کے

شیریں (لکھنؤ چوک)

رات باقی ہے ٹھہر جا ابھی جلدی کیا ہے　　دلِ شیدا مجھے بیتاب نہ کر وصل کی رات

نگین جان زینب (لکھنؤ چوک)

اجل جو حسرتِ بوس و کنار میں آئی　　چمٹ کے لاش کو قاتل نے خوب پیار کیا

صاحب جان جانؔ

جان و دل بیچتے ہیں ہم اپنا　　ایک بوسہ پہ لے لو سستا ہے

بندی جان نازؔ (آرہ)

منھ سے بولو تو سہی کل ہے کی گھبراہٹ ہے
بات کی بات میں ہوتی ہے سحر وصل کی رات

منی بائی حجابؔ (کلکتہ۔ رامپور بھی آکر رہی تھی حجابؔ اور داغؔ کے اکثر افسانے مشہور ہیں)

اُنسے کہدو کہ ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی ۔۔۔ وعدہ ہم سے ہو رہو غیر کے گھر وصل کی رات
شوخ ہو بیباک ہو سفاک ہو چالاک ہو ۔۔۔ کیوں شبِ وصلت میں مجھسے آپ شرماتے ہو

زہرہ (انبالہ)

جان جاتی ہے تمھارے ہجر میں ۔۔۔ اب لپٹ جاؤ خدا کے واسطے

خورشید جہاں خورشیدؔ (کانپور)

ہم تڑپتے ہیں تو ہنس ہنس کے یہ فرماتے ہیں
کیا ہوا تھا یہ ترا دردِ جگر وصل کی رات

فہیمن جان صنمؔ (کلکتہ)

چھاگلیں یار کی کرتی ہیں قیامت برپا ۔۔۔ سیکڑوں بار بجاتی ہیں گجر وصل کی رات

یہ کس قدر مخرب اخلاق اور حیا سوز اشعار ہیں! اور ان کا ابتذال فحاشی اور سوقیت کس قدر شدید اور گھناؤنی ہو جاتی ہے جب یہ احساس باقی رہے کہ یہ ایک عورت کی زبان سے نکلے ہیں

یہاں پر بھی یہ رکیک و مبتذل اشعار قاری کے ذوقِ سلیم پر غالباً گراں گزرے ہیں گے، مگر ان کو یہاں پیش کرنے کا مقصد ناظرین پر یہ واضح کرنا

ہے کہ اس حیاسوز فحاشی اور اس ابتذال میں جو کچھ شاعراتِ سلف کے کلام میں باقتضائے رنگِ زمانہ ملتا ہے کیا فرق ہے۔

تیسری وجہ شاہدانِ بازاری کو یہاں شامل نہ کرنے کی یہ ہے کہ ان کو عفت مآب خواتین و بیگمات کے دوش بدوش ایک ہی بزم میں پیش کرنا ان خواتین و بیگمات کی توہین ہے۔ اس لئے میں نے موجودہ مجموعہ کو شاہدانِ بازاری کے کلام سے ملوث نہیں ہونے دیا ہے، البتہ اگر وقت نے فرصت اور واقعات نے اجازت دی تو شاہدانِ بازاری کا ایک تذکرہ علیحدہ مرتب کرونگا۔ اور اس میں عفت مآب خواتین شامل نہیں کیجائینگی۔

میں موجودہ مجموعہ کیلئے معذرت خواہ نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اپنا جرم خود تسلیم ہے، فضلائے ادب کی بے نیازی اور زمانہ کے گرد وغبار میں چھپے ہوئے ایک گوشۂ ادب کو چرا کر میں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں، اور اس جرم کیلئے ہر سزا کا مستوجب ہوں۔

لیکن! ـــــ مجھے اس تذکرہ کے نقائص اور خامیوں کا پوری طرح احساس ہے۔ ان مساعی کی کامیابی و صحت کا دعویٰ نہیں۔ البتہ ادب کے اس شعبہ میں جس کے ساتھ بدقسمتی سے تجاہلِ عارفانہ برتا گیا اور برتا جارہا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ تشنہ و غیر مکمل لیکن التفات طلب، اگر آپ نے اس مجموعہ کو اس نظر سے دیکھا کہ کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا ہوا ہے تو میرے گھبرائے ہوئے ضمیر کی وحشت کچھ اور بڑھ جائے گی لیکن اگر آپ کی نظریں اس پر اسطرح پڑیں کہ اس ضمن میں کیا ہو چکا ہے اور

اب کیا کیا گیا ہے تو میں آج بھی اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا ہوں۔
مجھے احساس ہے کہ موجودہ تذکرہ میں اکثر وہ خواتین شامل ہونے سے رہ گئی ہونگی جن کو شامل ہونا چاہیئے تھا مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے انکی شعر گوئی سے انحراف یا انکی شاعرانہ عظمت سے انکار ہے بلکہ اس کی وجہ ان کے کلام اور حالات کا اسوقت دستیاب نہ ہو سکنا ہے۔ اگر شاعرات نے توجہ فرمائی اور اپنے حالات و کلام وغیرہ مجھے ارسال فرما دیئے تو انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں نہ صرف یہ کہ یہ کمی پوری ہو جائے گی بلکہ موجودہ دور کی زیادہ سے زیادہ شاعرات کے خود نوشتہ حالات اور انتخاب کلام بھی پیش کر سکوں گا جسکی ابتدا اسی اڈیشن سے کر دی گئی ہے نیز ادب نواز حضرات و خواتین سے میری التجا ہے کہ وہ آئندہ اڈیشن کو زیادہ سے زیادہ مکمل صورت میں پیش کرنے کیلئے میری اعانت فرمائیں اور اپنے مفید مشوروں اور پُر خلوص مدد سے مجھے استفادہ کا موقعہ دیں۔

آخر میں ان تمام خواتین کا بہ دل مشکور ہوں جنھوں نے اپنا کلام اور اپنے حالات مجھے ارسال فرمائے۔ یا دوسری خواتین کے حالات و کلام کی فراہمی میں میری مدد فرمائی۔ میں اس دلچسپی اس ہمت افزائی، اس پُر خلوص اعانت کے لئے بے حد ممنون ہوں ——— اور یہ جذبۂ ممنونیت یہ اظہار تشکر رسمی نہیں قلبی ہے۔

جمیل

بریلی
یکم جنوری ۱۹۵۴ء

مقدمہ

مُقدمہ

تذکرہ نویس اور اُردو شاعرات

شاعرات کے کلام کی تدوین کی ضرورت

اُردو ادب کا ایک نہایت تعجب خیز اور تاسف زا واقعہ یہ ہے کہ جہاں شعراء کے کلام کو شروع ہی سے محفوظ رکھنے اور سراہنے کی کوشش کی گئی وہاں خواتین کی مساعی شعری کو نہایت بے پرواہی سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مستثنیات زندگی میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعراء" (۱۲۸۱ھ) میں کچھ شاعرات کا ضمناً ذکر کر دیا ہے یا اسی طرح دو چار نام اور بھی بتلائے جا سکتے ہیں جہاں کہیں کہیں دو ایک شاعرات کے نام بھی نظر آجاتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ شاعرات کے ساتھ اس ادبی التفات کا عشر عشیر بھی نہیں برتا گیا جو شعراء کے ساتھ برتا جاتا رہا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ممکن ہے اس اغماض کی تھوڑی بہت ذمہ دار ہماری قدیم مشرقی تہذیب اور اخلاق ہو جس میں عورت کو کسی عنوان سے بھی منظرِ عام پر لانا ایک عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن افسوس اس کا ہے کہ

یہ تجاہلِ عارفانہ صرف اسلاف تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آج اس روشنی ترقی اور تہذیب کے زمانہ میں بھی جو تذکرے اردو میں قابلِ قدر کہے جاسکتے ہیں ان میں کہیں خواتین کا نام تک نظر نہیں آتا ممکن ہے ان بزرگوں کے نزدیک صنفِ نازک کے جذبات قابلِ احترام نہ ہوں اور کمال بے نیازی و بیدردی سے تلف کئے جاسکتے ہوں لیکن کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب شاعروں کے کلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی اور کیجا رہی ہے تو کیوں نہ ان ہی اغراض و مقاصد کے ماتحت خواتین کا کلام بھی مدوّن کیا جائے ممکن ہے جواب میں یہ عذر پیش کیا جائے کہ شاعرات کا کلام شعراء کے کلام سے پست ہے اور اس معیار پر پورا نہیں اترتا اور اسوجہ سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہیں کیجا رہی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا بہمنی دور کے اردو شاعروں مثلاً نظامی، نصرتی، رستمی وغیرہ کا کلام آج کی شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے ؟ کیا ولی۔ انشا اور نظیر اکبرآبادی کا تمام تر کلام اس معیارِ شاعری پر پورا اترتا ہے ؟ کیا ناسخ اور ان کے تلامذہ کا بیشتر حصہ کلام اس معیارِ شاعری پر پورا اترتا ہے جس کو آج صحیح معنوں میں شاعری سمجھا جارہا ہے ؟ —— اور پھر بھی ان حضرات کا کلام محفوظ رکھا گیا اور آج بھی رکھا جارہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی معقول عذر ہی نہیں۔ خواتین میں جہاں کچھ شاعرانہ حیثیت سے نومشق اور مبتدی ہیں وہاں بہت سی ایسی خواتین کے نام بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جو نہایت

کہنہ مشق، قادر الکلام، صاحب ذوق اور خوش گو ہیں یوں تو خود شعراء میں بھی بعض کا کلام بعض سے پست ہے اور یہی بھی محفوظ رکھا گیا اور رکھا جارہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً خواتین کا کلام اس قدر بلند نہیں کہ اساتذہ کے کلام کے مقابلہ پر لایا جاسکے، تاہم صدہا شاعر ایسے نکالے جاسکتے ہیں جن کا کلام اکثر خواتین کے کلام سے پست ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ قلم چونکہ زیادہ تر مرد کے ہاتھ میں رہا ہے اسلئے وہ عام طور پر عورت کو گرا تا رہا ہے۔ حیات انسانی کا یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ جہاں مرد کی جذباتی تاریخ میں عورت سب سے پیش پیش رہی ہے وہاں اسی عورت کو ہمیشہ پس پشت ڈالا جاتا رہا۔ یہانتک کہ اس کے جذبات تک کو قابل احترام نہیں سمجھا گیا۔ کس قدر افسوس اور ناانصافی کی بات ہے کہ دنیا کے تمام ادبوں کا بیشتر حصہ جس "عورت" کے گرد حلقہ زن ہو اسی عورت کے جذبات لطیف اور ادبی کارناموں کو یوں مٹا ڈالا جائے اور اس پر کوئی التفات نہ کیا جائے۔ "میں نہیں سمجھتا کہ فضلائے ادب اپنی شہرت کی پرنخوت بلندیوں پر پہنچکر بھی کس طرح اپنے اس ادبی جُرم کا جواز پیش کرسکیں گے" وجدانی حیثیت سے بھی جذبات عورت کی زبان سے ادا ہونیکے بعد شدید تر ہوجاتے ہیں۔ وہی بات اگر مرد کی زبان سے ادا ہو تو اس میں اتنا کیف و اثر نہیں ہوتا جتنا کہ ایک عورت کی زبان سے ادا ہونیکے بعد اس میں پیدا ہوجاتا ہے یہ ایک

نفسیاتی حقیقت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کے جذبات کو عورت سے ایک فطری وجبلی لگاؤ ہے۔ ہندی شاعری میں جو کشش، جو شیرینی اور جو کیف واثر ہے اس کی ایک بہت بڑی وجہ ـــــ جو اور تمام وجوہات پر فوق ہے ـــــ یہ ہے کہ اس میں جذبات کا اظہار بجائے مرد کے عورت کی زبان سے ہوتا ہے، اسلئے یہ ایک مزید سبب ہے جس کی بناء پر خود عورت کی زبان سے ادا کئے ہوئے جذبات کو محفوظ رکھنا اور اسکی قدر کرنا چاہیئے تھی۔

حیاتِ انسانی کے اس دورِ نہضت میں "عورت" نے جو اہمیت حاصل کرلی ہے وہ چنداں تشنۂ اظہار نہیں۔ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے؛ صدیوں کا جمود ٹوٹ رہا ہے، معاشرت اور تمدن، تہذیب و اخلاق کے خودساختہ اصول گریزاں ہیں، زمانہ مجبوراً مساوات کیطرف آرہا ہے۔ اسلئے اب خواتین کے ساتھ وہی تجاہلِ ماضی برتنا ان کے جذباتِ لطیف کو ٹھکرانا اور ان کے کارناموں کو قابلِ التفات نہ سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

چنانچہ ضرورت ہے کہ ان کے کلام کو جمع کیا جائے اور ملک کے اس گرانمایہ ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کیجائے۔

اُردو زبان کی تخلیق و ارتقا اور اسمیں شاعری کا آغاز

ہر قوم و ملک کی زبان پر اس کی تاریخ اسکے تمدن، اسکی معاشرت کا بہت اثر پڑتا ہے، اُردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اگر ہندوستان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسطرح تاریخی اثرات اس زبان کی تخلیق کا باعث ہوئے۔

اس وقت سے کہ جس وقت کی کوئی مستند تاریخ بھی موجود نہیں ہے، مختلف قومیں شمالی مغربی راستوں سے ہندوستان میں آتی اور بستی رہیں، تاریخ نے ان قوموں کو "غیر آرین" اقوام کے نام سے موسوم کیا ہے، یہ قومیں اپنی اپنی زبانیں اپنے ہمراہ لائیں جو کچھ تبدیل شدہ صورت میں "پراکرت" کے نام سے موسوم ہوئیں۔

تقریباً ساڑھے تین ہزار برس کا زمانہ گزرا بحیرۂ اسود اور بحیرۂ اخضر کے مابین سیحوں اور جیحوں کے سواحل پر اور کوہ قاف کے ارد گرد ایک قوم آباد تھی جو اقتصادی ضروریات کی بناء پر کچھ مغرب کیطرف چلی گئی اور کچھ یورپ میں آباد ہوگئی اور کچھ مشرق میں آکر ایران اور ہندوستان میں آباد ہوگئی۔ ہندوستان میں یہ لوگ "آرین" کہلائے۔ یہ لوگ اپنی زبان اپنے ہمراہ لائے جو "سنسکرت" کہلائی

بدھ مذہب کے بانی شاکیا منی مہاتما بدھ ۵۴۳ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے، انھوں نے پالی زبان میں اپنے مذہب کی اشاعت کی مہاتما بدھ کے یہ فقرے سید محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے نقل کئے ہیں۔

"دھرم گرو۔ دھرم گرو۔ دھرم کا سنکھ پھونکو۔ دھرم کا ڈنکا بجاؤ۔"

اگر محمود صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے اور واقعی یہ فقرے مہاتما بدھ کے ہیں تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پالی زبان کس قدر اردو کے قریب آچکی تھی۔

آرین قوم اپنی زبان کو متبرک سمجھتی تھی اسلئے اس کو دوسرے اثرات سے پاک رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی، تقریباً چار سو برس تک ان کی یہ کوشش کامیاب رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ زبان مغلوب قوم (ڈراوڑ) کی زبان سے خلط ملط ہونے لگی اور اس طرح یہ خفیف تغیر مختلف پراکرتیں ظہور میں آتی رہیں اور مٹتی رہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں ایک ہندو فاضل کے ایک محققانہ خطبہ کی مدد سے ان پراکرتوں پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

"ایک ہندو فاضل مہا مہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب کے عنوان سے چند خطبے دیئے تھے جنکو ہندوستانی اکاڈمی نے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کردیا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرت زبانوں کا کچھ کچھ حال بیان کیا ہے اور ان کی حسب ذیل چھ قسمیں بتائی ہیں :-

ماگدھی - شورسینی - مہاراشٹری - پیشاچی - اونتی اور اپ بھرنش -

۱۔ **ماگدھی** ۔ مگدھ اور اس کے قرب و جوار کے عوام کی زبان تھی قدیم "ماگدھی" اشوک کے کتبوں میں ملتی ہے۔ عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے ملازم مثلاً دھقیور، سپاہی بدیسی، جین، سادھو اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں

۲۔ **شورسینی** ۔ شورسین یا متھرا کے قرب و جوار کے علاقہ کی زبان تھی۔ سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی بات چیت میں اسکا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔

۳۔ **مہاراشٹری** ۔ مہاراشٹرا یعنی مرہٹے کی زبان۔ اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کیلئے کیا جاتا تھا۔

۴۔ **پیشاچی** ۔ پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی و شمالی حصوں کی زبان تھی۔

۵۔ **اونتکا** ۔ اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی یہ زبان اجین اور مندسور میں رائج تھی۔

۶۔ **آپ بھرنش** ۔ اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا۔ دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے۔ راجپوتانہ مالوہ، کاٹھیاوار اور کچھ وغیرہ مقامات کے ڈنگل بھاشا کے

تمیت اس بھاشا کی بگڑی ہوئی صورت میں ہیں، قدیم ہندی بھی بیشتر اس بھاشا سے نکلی ہے۔

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں:-

۱- **ٹامل** - جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فائق ٹامل ہے - اس زبان کا نشوونما زیادہ تر جینیوں کے ہاتھوں ہوا اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے۔

۲- **ملیالم** - ملیبار کی زبان ہے مگر اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہیں۔

۳- **کنڑی** - اس زبان کے ادبیات کی پرورش و پرداخت بھی جینیوں نے کی۔

۴- **تیلنگو** - اندھرا صوبہ میں مروج ہے۔

(ہندوستان میں ہندوستانی " نقوش سلیمانی" از سید سلیمان ندوی ص ۲۴-۲۵)

محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اور تین برس تک وہاں قیام کیا۔ اس زمانہ میں بہت سے عرب سپاہیوں نے ہندوستان میں شادیاں کیں اور یہیں بس گئے ان واقعات نے بھی یہاں کی زبان پر بہت اثر ڈالا - اور یہاں کی مقامی پراکرتوں میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہونے لگے۔

اس کے بعد محمود غزنوی کے متواتر سترہ کامیاب حملوں سے یہاں کی زبان بہت متاثر ہوئی اور رفتہ رفتہ ملکی زبان میں عربی کے

ساتھ ساتھ فارسی الفاظ بھی شامل ہونے لگے۔ محمد غوری کے حملوں نے اس اختلاط کو اور مدد پہنچائی۔ محمد غوری نے ۱۱۹۲ء (۵۸۸ھ) میں پرتھی راج کو شکست دیکر اسلامی حکومت مستقلاً ہندوستان میں قائم کردی۔ اسلئے مسلمانوں کی تہذیب، تمدّن، معاشرت اور زبان کا جو اثر یہاں کی ملکی زندگی اور زبان پر پڑ رہا تھا اس نے بھی زیادہ گہری دیرپا اور مستقل صورت اختیار کرلی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے، اور اکثر مصنّفین نے ان کی نقل کی ہے کہ پرتھی راج کے درباری شاعر چندر کوی نے ایک کتاب "پرتھی راج راسو" تین جلدوں اور ستّر حصّوں میں لکھی ہے جو اس وقت کی ہندی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں بکثرت عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں لیکن یہ نظریہ کہ یہ کتاب غوریوں کے زمانہ میں لکھی گئی اب قطعی طور سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے پہلے نہیں لکھی گئی[1] اس کتاب پر حافظ محمود خاں شیرانی کے فاضلانہ تبصروں نے جو اورنٹیل کالج میگزین میں چھپے ہیں اس بھید کو پوری طرح کھول کر رکھدیا ہے۔ البتہ اس سے پہلے کی ایک ہندی کتاب کا پتہ چلا ہے۔ اس کتاب کا نام "بیسل رائے ہے اندیہ" نوبت لال کی تصنیف ہے۔ اسمیں عربی و فارسی آمیز

---

[1] ملاحظہ ہو "نقوشِ سلیمانی" از سید سلیمان ندوی صکہ حاشیہ

ہندی کے نمونے ملتے ہیں[۱] اس کے علاوہ مسعود، سلمان، اور ابو عبد اللہ کے کلام سے بھی زبانوں کے باہمی اختلاط پر بہت روشنی پڑتی ہے!

محمد غوری کے بعد سلطان بلبن۔ سلطان تغلق اور سلطان فیروز کی علم پروری نے اس اختلاط کو بہت ترقی دی سلطان فیروز نے نگرکوٹ سے بہت سی سنسکرت کی کتابیں منگوا کر ترجمہ کروائیں۔ لودیوں میں سکندر علم و ادب کا عاشق تھا۔ اس نے حکام کا انتخاب ذاتی قابلیت پر رکھا۔ ہندوؤں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور خصوصاً کایستھوں نے حصول منصب و جاہ کیلئے فارسی پڑھنا شروع کی۔ فارسی و بھاشا کا یہ اتحاد دراصل موجودہ اردو کا آغاز تھا اسلئے یہ خیال کہ اردو کی بنیادیں شاہجہانی دور میں قائم ہوئیں، داستان پارینہ بن چکا ہے۔! دراصل یہی زمانہ اردو کی تخلیق کا زمانہ ہے۔

افغانوں کا زمانہ تاریخ ہند کا نہایت پُر آشوب زمانہ گزرا ہے! لیکن اردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک اہم دور ہے، فارسی و بھاشا کا یہ اختلاط و اتحاد ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا کہ ۱۲۵۵ء (۶۵۳ھ) میں سپہر ادب کے اس نیر اعظم نے طلوع کیا جسکو عرف عام میں خسرو کہتے ہیں یہ پہلی ہستی تھی جس نے اس ساز کے خاموش تاروں کو پہلی دفعہ چھیڑا!

---

[۱] ملاحظہ ہو اردو سب کمیٹی رپورٹ موسومہ "اردو زبان اور ادب" مرتبہ سید ضامن علی صاحب ام اے۔ صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔

اس ساز کی آواز ملک میں پہلی مرتبہ گونجی ——— یہ آواز سرودِ اردو کا اوّلین نغمہ تھی! امیر علیہ الرحمۃ کے اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

سب کوئی اس کو جانے ہے　　پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ گھڑی میں میکھا ہے　　فکر کیا ان دیکھا ہے [1]

امیرؔ کے بعد نظریں کبیرؔ (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء / ۸۴۴ھ تا ۹۲۴ھ) پر پڑتی ہیں۔ ہر چند کہ کبیرؔ ہندی کے شاعر تھے پھر بھی ان کے یہاں اکثر صاف اردو کے اشعار نظر آتے ہیں

کر گذران غریبی پر　　مغروری کس پر کرتا ہے

یہ تن ہے کاغذ کی پڑیا　　بوند پڑے سے گل جاؤگے
کہیں کبیرؔ سنو بھئی سادھو　　اک نام بنا پچھتاؤگے

گنگا جاؤں نہ جمنا جاؤں　　نہ کوئی تیرتھ نہاؤں
ڈالی چھیڑوں نہ پتہ چھیڑوں　　نہ کوئی جیو ستاؤں
کہیں کبیرؔ سنو بھئی سادھو　　میں واہی کے بھجن گاؤں

جب مغلوں کا زمانہ آیا تو یہی مخلوط زبان) ایک نئے رنگ میں ظاہر

---

[1] ملاحظہ ہو "اردوئے قدیم" یہ دونوں شعر حمد باری میں ہیں۔

ہوئی کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں اور رہنے سہنے کی جگہوں کیلئے اب تقریباً تمام عربی و فارسی الفاظ استعمال ہونے لگے تھے اور ان ہی زبانوں کی صرف و نحو اور لغات اب ہندی میں آ گئے تھے۔ اسکی ایک بڑی وجہ خود اکبر کی سیاسی پالیسی تھی، ہندو شہزادیوں کے محل میں آنے، ہندوؤں سے ربط ضبط بڑھنے اور خود محل کے اندر ہندو تہوار منائے جانے کی وجہ سے فارسی اور بھاشا کے اس اختلاط کو بہت تقویت پہنچی اور اس طرح خود شاہی محل میں اس نوزائیدہ زبان کی پرورش ہونے لگی۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ شاہجہاں اپنے بھائی کو "شاہ بھائی" اور دادا کو "شاہ دادا" کہتا تھا۔ اسی زمانہ میں اُردو زبان فارسی نظم کے سانچے میں ڈھلی اور اسوقت سے اس میں اور ہندی میں فرق پیدا ہو گیا۔ اس زمانہ سے اُردو کا علمی دَور شروع ہوتا ہے۔ اس لئے مغلوں کا زمانہ کتابی اور تحریری اُردو کے ظہور کا زمانہ ہے۔

امیر خسروؒ نے اردو شاعری کا آغاز ضرور کیا ـــــ لیکن یہ صرف آغاز ہی تھا اُردو زبان کے اوّلین شعراء دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتک سمجھا جاتا تھا کہ دکن اسکول کے قیام کا زمانہ ۹۸۹ھ ۱۵۸۱ء یعنی محمد قلی قطب شاہ کا عہد ہے لیکن حال ہی میں تحقیقات جدید سے اس سے بھی پہلے بھی دَور کے کچھ اُردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جس سے اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ دکن اسکول کے قیام کا زمانہ قطب شاہی دور نہیں بلکہ بہمنی

دورِ (۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء تا ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء) ہے۔ دکن میں اردو کا مکمل خاکہ اس وقت تیار ہو چکا تھا۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے بہمنی حکومت کے زمانہ میں ۸۰۱ھ ۱۳۹۷ء میں دکن گئے اور وہیں ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء میں انتقال فرمایا اسوقت دکن میں اردو (جسکے دوسرے قدیم نام ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور دکھنی وغیرہ بھی ہیں) لہ عام طور سے رائج ہو چکی تھی، نثر میں خواجہ صاحب کے اکثر جملے تو کچھ مصنفین نے نقل کئے ہیں مگر مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے معتمد انجمن ترقی اردو نے اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشو ونما

لہ ملاحظہ ہو "نقوشِ سلیمانی"، از سید سلیمان ندوی،

یہ خیال کہ اس زمانہ میں دکن میں اردو ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی غلط ہے۔ یہ غلطی اکثر مصنفین نے کی ہے یہانتک کہ خود اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ میں یہ غلطی موجود ہے، صفحہ ۱ پر تحریر ہے؛

"دکن میں اردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہوگئی تھی اور ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔"

واقعہ یہ ہے کہ دکن میں ولی سے پہلے اردو کبھی ریختہ کے نام سے نہیں پکاری گئی۔ سب سے پہلے ولی نے (اور وہ بھی غالباً سفر دہلی یعنی تقریباً ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۰ء کے بعد) اس لفظ کا استعمال اردو کیلئے کیا ہے یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو ؛ رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ملاحظہ ہو:۔ مقالاتِ ہاشمی از جناب نصیر الدین ہاشمی حصہ اول صفحہ ۳۰۹-۳۱۰

میں صوفیائے کرام کا کام" میں ایک قدیم بیاض کے حوالہ سے خواجہ صاحب کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں اور سید نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "مقالاتِ ہاشمی" حصہ اوّل میں "خواجہ بندہ نوازؒ کی ہندوستانی شاعری" کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں خواجہ صاحب کے نام سے کچھ اُردو اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اگر یہ اشعار واقعی خواجہ صاحب کے ہیں، اور بعد کو ان کے کسی معتقد نے کہہ کر ان کے نام سے وابستہ نہیں کر دیئے ہیں تو ہمیں دکن میں اُردو شاعری کا آغاز قطب شاہی دور سے تقریباً سو برس پہلے سے کرنا چاہیئے۔ ان اشعار میں جو خواجہ صاحب کے نام سے مولانا عبدالحق صاحب نے کسی قدیم بیاض سے نقل کئے ہیں ایک مثلث بھی ہے جو ہاشمی صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ وہ مثلث یہ ہے:

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نبی رسول کا میرے جیو میں سمایا
اپیں اپیں دکھاوے کیسی آر سی لایا

خواجہ صاحب کا ایک اور نعتیہ شعر ملاحظہ ہو جو ہاشمی صاحب نے نقل کیا ہے:

اے محمدؐ ہجلو جم جم جلوہ تیرا — ذاتِ تجلی ہو گی سیں پور نہ سہرا

بہمنی دورِ حکومت کے ایک قدیم ممتاز دکنی شاعر کا حال ہی میں پتہ چلا ہے جس کا تخلص نظامی تھا اس کا زمانہ ۸۶۳ھ ۱۴۵۸ء ہے اس کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے جس کے چار شعر یہ ہیں:۔

کہوں سد ساچی نظامی دھرم — پدم سب سنے بات بانچی کدم

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار ۱   پرت بال سینا کو تار ادھار

عطارد مسخر ہوا سے قلم   مسخر کیا سور سے بہت علم

چمکنے لگے جب کتک مہتیر   پیرا ہوا کیا دھرت آکاس پر

اس کے بعد دکن میں قطب شاہی (گولکنڈہ) اور عادل شاہی (بیجا پور) دور کے اردو شاعر ملتے ہیں۔

قطب شاہی دور کے شاعروں میں سب سے پہلے خود محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء) کا نام آتا ہے جو ابراہیم عادل شاہ بیجا پور اور جہانگیر کا ہمعصر تھا ۲ فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا اس کے اردو کے دو شعر یہ ہیں :-

ہے محمد قطب شہ بارہ اماماں کا غلام   میں سو عاجز دس ٹھیرایا علی سنج دستگیر
آیت قرآن جیوں نازل ہوا حضرت کی تئیں   مرتضیٰ ہیں بس دو جگ میں جیوں محمد بینظیر

۱۔ یہ مثنوی احمد شاہ ثالث (۸۶۵ھ/۱۴۶۰ء تا ۸۶۷ھ/۱۴۶۲ء) کے عہد میں لکھی گئی تھی، جو خاندان بہمنی کے گیارھویں حکمراں علاؤالدین ہمایوں شاہ (۸۶۲ھ/۱۴۵۷ء تا ۸۶۵ھ/۱۴۶۰ء) کا لڑکا تھا۔

۲ سید عبدالحی صاحب نے گل رعنا میں اسی قطب شاہ کی بابتہ لکھا ہے کہ "یہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس تک ہماری نظریں پہنچ سکی ہیں"۔

محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء تا ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) بھی جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجہ، داماد اور جانشین تھا، اُردو میں شعر کہتا تھا اس کے صاف اشعار کا انداز یہ ہے:-

ساقیا آ شراب ناب کہاں — چندر کی پیالی ہیں آفتاب کہاں

پیا سانولا من ہمارا لبھایا — نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء تا ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء) بھی جو اس کے بعد تخت پر بیٹھا شاعر تھا۔

عادل شاہی دور کے شاعروں میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی المخاطب بہ "جگت گرو" والیٔ بیجاپور (۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) جو عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمراں تھا اور کمال خاں ذبیر رستمی جو محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ء) کے عہد کا شاعر گذرا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف "نورس"[۵۱] ہے۔ اس کی ابتدا

---

[۵۱] اس کتاب کا ذکر گلِ رعنا، تاریخ ادب اُردو مترجمہ مرزا محمد عسکری اور اُردو شہ پارے وغیرہ میں آیا ہے لیکن ان سب نے اس کو علم موسیقی کی ایک کتاب کہا ہے (ملاحظہ ہو گلِ رعنا صفحہ ۲۳۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۵۔ اردو شہ پارے صفحہ ۳۴۔ صفحہ ۳۵) لیکن سید نصیر الدین ہاشمی جنھوں نے اس کتاب کو خود دیکھا ہے وہ رقمطراز ہیں:- "ابتک خیال یہ تھا کہ "نورس" فن موسیقی کی کتاب ہے اور اس میں راگ راگنیوں کی تفصیل و تشریح درج ہوگی مگر دراصل اس میں سندی راگ راگنیوں کے اقسام یا ان کے قواعد درج نہیں ہیں بلکہ بعض راگوں کے تحت دکھنی نظمیں لکھی گئی ہیں۔" (مقالات ہاشمی حصہ اول صفحہ ۳۹)

حسب ذیل عنوان اور شعر سے ہوئی ہے۔

"اپچلی در مقام کوری"

سید محمد[1] میرے دل پر نانو | جیوں رسول کر لکھے عرش ٹھانو

خاتمہ ذیل کے شعر پر ہوا ہے،

راگ گبری راگنی کستوری | سیا سو کیس کیس دھلا

اس کے دو اور شعر جن میں "نورس" کا نام آیا ہے یہ ہیں،

سہلا "نورس" کلیاں بدھاوے | ابراہیم گر گنی گاوے

بن بیچ ٹھاوی "نورس" کا آتی | بھر بھر دارو پیالا پیلانی

رستمی نے "خاور نامہ دکھنی" کے نام سے ایک رزمیہ مثنوی تصنیف

کی جو دراصل فارسی خاور نامہ مصنفہ حسام کا ترجمہ ہے اسکے دو شعر ہیں۔

غلو کہتی ہے مجھکو کمال خاں دبیر | تخلص سو ہے رستمی بینظیر

خاور نامہ دکنی کینیا ہوں نام | ہوا خاوران پر قصہ تمام

ان کے علاوہ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے مشہور

شاعروں میں وجہی، ابن نشاطی، غواصی، احمد جنیدی، شاہی مرزا،

شغل، نصرتی اور ہاشمی وغیرہ گزرے ہیں۔ غواصی کی تصنیف

---

[1] سید محمد سے مراد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔

"طوطی نامہ نخشبی"[۱] اور مولانا نصرتی کی مثنویاں "گلشن عشق" اور "علی نامہ" مشہور ہیں۔ ہاشم علی برہانپوری۔ کاظم علی، رام راؤ، سیوا، اور قلی خاں اس دور کے مشہور مرثیہ گو گزرے ہیں۔

۱۔ یہ کتاب نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے اور بالکلیہ دکنی نظم ہے اس کتاب کے متعلق ابتک عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اسکا ایک مصرعہ اردو اور ایک فارسی میں ہے "شعر الہند" اور اردو سرفے کمیٹی کی رپورٹ تک میں اسکے متعلق یہی صراحت ملتی ہے، مولانا عبد السلام صاحب ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں "غواصی نے طوطی نامہ نخشبی کو نظم کیا جسکا ایک مصرعہ ہندی اور ایک مصرعہ فارسی تھا"۔ اردو سرفے کمیٹی کی رپورٹ میں اسکے متعلق لکھا ہے "غواصی نے نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ کیا تھا جس کا ایک مصرعہ ریختہ اور ایک فارسی تھا" اس قسم کے تمام بیانات غالباً میر حسن کے تذکرہ سے ماخوذ ہیں جس میں اس کتاب کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے۔

غواصی تخلص در وقت جہانگیر پادشاہ بود، طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی گفتہ ا ھ

لیکن دراصل یہ تمام بیانات غلط ہیں سید نصیر الدین ہاشمی صاحب نے جنھوں نے خود اس کتاب کو دیکھا ہے، نیرنگ خیال بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء میں اسکے متعلق ایک مفصل مضمون لکھکر اس غلطی کا ازالہ کر دیا ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا، یہ کتاب بالکل دکنی نظم ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

رتن خاص دریائے لولاک کا	جھلک لامکاں نور افلاک کا
محمد نبی سید المرسلیں	سدا روشن اسنتے دنیا ہور دیں
کہتے ہیں جو تھا کوئی سوداگر ایک	وجاہت منے پاک صورت میں نیک
جہاں میں جھلکتا اچھے جم مدام	بحق محمد علیہ السلام
غواصی اگر تول ہے سچا غواص	لگا عشق اپنا خدا سات خاص

اس نامے کے دو نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔

دکن کے حملوں کے سلسلے میں عالمگیرؒ کی عمر کا ایک بڑا حصّہ اورنگ آباد میں بسر ہوا۔ حیدرآباد کی تباہی کے بعد شعراء اورنگ آباد آگریس گئے اور ایک عرصہ تک یہ علم و ادب اور اُردو شاعری کا گہوارہ رہا۔ ان شعراء کی زبان نسبتاً کچھ صاف ہوگئی تھی پھر بھی دکن کے الفاظ و محاورات ان کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے شعراء میں سب سے زیادہ عروج شمس الدین ولیؔ[1] کو حاصل ہوا۔ ولیؔ کا اثر اُردو شاعری پر دو طرح سے پڑا۔ اوّل یہ کہ فارسی کی تمام بحریں اردو میں آگئیں اور آئندہ کیلئے اُردو شاعری کا نمونہ بن گئیں۔ دوم یہ کہ ان بحروں کے ساتھ فارسی کی اصطلاحات، شاعرانہ محاورے، استعارے اور تشبیہیں بھی تمام اُردو میں آگئیں۔ یہ چیز ابتدائی دور میں اُردو شاعری کے لئے معین و مددگار ثابت ہوئی۔ چونکہ اسوقت تک اُردو شاعری کا کوئی مستقل انفرادی خاکہ تیار نہیں ہوا تھا، اور اسے کسی بیرونی مدد اور نمونہ کی ضرورت تھی مگر بعد کو یہی چیز اُسکے لئے بہت مضر بھی ثابت ہوئی۔ اُردو کے شاعر صرف فارسی شاعری کی

---

[1] ۔ اب تک ولیؔ کے متعلق جو معلومات حاصل تھیں وہ آبحیات اور دوسرے تذکروں تک محدود تھیں۔ مگر پروفیسر سید ابراہیم صاحب سیانی ام۔ اے کی مساعی قابل داد ہیں کہ انھوں نے ولیؔ کے کلام کو مدون کرکے "دیوان ولیؔ" کے نام سے شایع کر دیا ہے۔ ولیؔ کے متعلق یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

تقلید میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اور اس وجہ سے اُردو شاعری کا کوئی علیحدہ انفرادی قالب تیار نہیں ہو سکا اور اس طرح اسکی اصلی ترقی رک گئی۔

۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء میں دکن میں اورنگ زیبؒ کا انتقال ہو گیا اور اس طرح دکن کی مہم کا جو بیس برس سے جاری تھی خاتمہ ہو گیا۔ امراء بھی برسوں کی جنگ سے پریشان ہو چکے تھے، عالمگیرؒ کے بعد جب محمد شاہ رنگیلے تخت پر بیٹھے تو دلی شعراء کا مرکز بن گیا۔ امراء بھی شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ مشاعرے منعقد ہونا شروع ہو گئے اور اب اُردو شاعری کی نشو و نما بجائے دکن کے دہلی میں ہونے لگی۔ ولی اور دیگر شعراء بھی دکن سے آئے۔ یہ دراصل دہلی اسکول کا قیام تھا۔ ولی کی پیرانہ سالی کے زمانہ میں سودا و میر کا شباب تھا مظہر جانجاناں۔ درد۔ سوز۔ قائم۔ یقین وغیرہ سب اسی زمانہ سے متعلق ہیں۔

دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں اُردو کیطرف خاص توجہ کیگئی بہادر شاہ کے زمانہ میں بیدل المتوفی ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۱ء ادھر توجہ کی ان کے شاگرد امیروں میں ایک محمد امیر خاں انجام تھے۔ جب ان دونوں کو اُردو شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ان کے ساتھ اور بھی بہت سے اُردو شاعر پیدا ہو گئے انھوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا کام الفاظ کی چھان بین اور تحقیق تھی۔ تحقیق شدہ الفاظ تمام ہندوستان میں بطور سند کے سمجھے جاتے تھے۔ محمد شاہ نے امیر خاں انجام کو "عمدۃ الملک" کا خطاب دیکر اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ اسلئے یہ انجمن "عمدۃ الملکی انجمن" کے نام سے مشہور ہے۔ (۱)

(۱) ملاحظہ ہو "مغل اور اردو" مصنفہ نواب نصیر حسین صاحب خیال

دہلی اسکول کے سلسلے میں غالب، مومن، شیفتہ اور ذوق وہ نام ہیں جو اردو شاعری کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پہنچکر اردو شاعری اپنی ترقی کے بام بلند پر پہنچ گئی دہلی اسکول کی ممتاز ترین خصوصیت روحانی اور جذباتی تجربات کا شاعری میں اظہار ہے اور شاعری کا یہی نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے۔

جب شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی پر تباہی آئی تو آشوب زمانہ سے مجبور ہوکر شعراء رفتہ رفتہ دلی سے نکلکر لکھنؤ میں پناہ لینے لگے۔ یہاں آصف الدولہ کے عہد وزارت سے غازی الدین حیدر کے زمانہ تک[1] ان خانماں برباد شعراء کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اس دور میں ہر امیر کے دربار میں شعراء کا وجود شانِ امارت میں داخل ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مرزا سلیمان شکوہ کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جن کے دامنِ تربیت میں مصحفی و جرأت جیسے شاعروں کی تربیت ہوئی۔ انشا کو میر سعادت علیخاں کی مصاحبت نصیب ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس زمانہ میں لکھنؤ شاعری کا ایک مخصوص طرز قائم ہوگیا۔ یہ لکھنؤ اسکول کا آغاز تھا۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ اسکول کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسوقت لکھنؤ کی معاشرت میں جو نزاکت اور عیش پرستی

---

[1] شعر الہند حصہ اول صفحہ ۲۴۶

پیدا ہوگئی تھی اس کا اثر اسوقت کی لکھنؤ شاعری پر بھی پڑا ہے

لکھنؤ شاعری کا ابتذال اسی عیش پرستی کا آئینہ دار ہے۔ سودا اور میر کے زمانے میں اگرچہ زبان بہت کچھ صاف ہوگئی تھی پھر بھی اس میں اکثر غلط، بھدّے اور ثقیل الفاظ موجود تھے۔ شیخ ناسخ نے زبان کو غلط الفاظ سے پاک کیا۔ اور اپنی تمامتر توجّہ اصلاح زبان کی طرف منعطف کردی۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ زبان شستہ اور پاکیزہ ہوگئی مگر اس ہنگامہ میں شاعری کا اصل مطمح نظر یعنی ترجمانی جذبات نظروں سے محو ہوگیا۔ اور شاعروں کی توجّہ خوبصورت اور صحیح الفاظ و محاورات کے چناؤ میں گھر کر رہ گئی۔

نواب یوسف علیخاں (۱۸۵۵ء ۱۲۷۱ھ تا ۱۸۶۵ء ۱۲۸۱ھ) اور انکی وفات کے بعد نواب کلب علیخاں (۱۸۶۵ء ۱۲۸۱ھ تا ۱۸۸۷ء ۱۳۰۴ھ) کے عہد میں رامپور میں شعراء کی بیحد قدر و منزلت ہوئی۔ نواب کلب علیخاں کی قدر افزائیاں ہر صاحبِ کمال کو گرویدہ کئے ہوئے تھیں۔ ان کے دربار میں اکثر اساتذہ، دہلی و لکھنؤ کا مجمع رہا اور بازارِ شاعری خوب گرم رہا یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر، داغ، منیر، جلال، تسلیم وغیرہ وغیرہ جیسے باکمال شعراء سب رامپور میں موجود تھے لیکن یہ صورت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی نواب موصوف کی وفات کے بعد یہ محفل درہم برہم ہوگئی۔ کچھ شعراء حیدرآباد چلے گئے اور کچھ نے اپنی اپنی راہ لی۔ اور دنیائے ادب کا یہ درخشندہ دور جلد ہی افسانۂ ماضی بن گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے بعد سے سیاسیات کے جدید نظم و نسق کے ساتھ انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار دی گئی اور اس کے لحاظ سے عوام کی تہذیب اخلاق اور معاشرت پر بھی انگریزی اثرات غالب آنے لگے اور درحقیقت یہی اثرات شاعری میں دورِ جدید کے آغاز کے محرک ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کا آغاز مغربی ادبیات کا منت کش ہے۔ جدید دَور کا آغاز دراصل ۱۸۷۴ء (۱۲۹۰ھ) سے ہوتا ہے جب مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں طرح کی بجائے "خاص" عنوان پر نظمیں لکھوائی گئی تھیں۔ آزاد نے شاعری میں لفظی صناعی سے گزر کر اس طرز کی بنا ڈالی جس کا عنصر غالب "پیغام" اور "اصلاح" ہے، جس کام کو آزاد نے صرف شروع کیا تھا۔ اس کو حالی نے عملی جامہ میں پیش کیا۔ دَورِ جدید کے علمبرداروں میں آزاد۔ حالی شبلی۔ مولانا اسمٰعیل۔ اور اکبر الہ آبادی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے جنسی عشق و محبت کے تصور سے بلند ہوکر ملکی، ملّی اور اخلاقی مضامین پر زور دیا۔ دورِ جدید کی بہترین پیداوار اقبالؔ کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی اقبالؒ نے ملّی و اخلاقی شاعری کو اپنا موضوعِ فکر بنا لیا اور اسکو اس مقام بلند تک پہنچا دیا جس کی مثال اُردو تو کیا عربی اور انگریزی ادب میں بھی ملنا مشکل ہے۔

موجودہ دَور میں قصیدہ، مرثیہ، اور مثنوی پر کوئی خاص

توجہ نہیں کی گئی۔ غزل گوئی کا دور دورہ بھی کم ہوگیا اور اس کی جگہ مختلف قسم کی نظموں نے لے لی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ دور کے شعراء نے محسوس کیا کہ غزل جس کا ہر شعر بلحاظ معنی منفرد اور دوسرے اشعار سے غیر مربوط ہوتا ہے، مسلسل جذبات کی ترجمانی کا نہایت ناقص ذریعہ ہے، اور چونکہ اعلیٰ قسم کی شاعری کیلئے صرف چند مختلف انفرادی جذبات کی انفرادی ترجمانی کافی نہیں بلکہ مسلسل جذبات کا اظہار ضروری ہے اس لئے انھیں غزل سے بلند ہو کر نظم کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانا پڑا۔

موجودہ دور میں کچھ مذہب پرستی، کچھ قوم نوازی، کچھ تعصب بُری اور کچھ سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت اردو کو مٹا دینے کی کچھ نامحمود و نامسعود تحریکیں ملک میں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں، اور سینما اس مہلک تحریک کو بہت پھیلا رہا ہے۔ لیکن اربابِ نظر کا خیال ہے کہ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اردو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ہندوؤں کی بھی زبان ہے اس کی ترکیب فارسی و عربی ہی سے نہیں بلکہ سنسکرت سے بھی ہوئی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں ہی کے نہیں ہندوؤں کے بھی جذبات پر قائم ہوئی ہیں۔ اگر آج یہ محل مسمار کیا جاتا ہے تو دونوں قوموں کا نقصان ہے۔ دونوں کا خسارہ ہے۔ دونوں کی صدہا سال کی مجموعی

مساعی کے نتیجہ کو صدمہ پہنچنے کا ڈر ہے ۔

سر تیج بہادر سپرو کا یہ قول غور طلب ہے کہ

"اُردو ہمارے دیرینہ تمدن و تاریخ کی یادگار ہے ۔ جو لوگ اُردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ کے بدل دینے کے خیال خام میں مبتلا ہیں"

اور آپ کا یہ بیان یاد رکھنے کے قابل ہے :-

اُردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے اور رہے ۔ اگر ہندو اُردو کو تباہ کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خود اپنی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں" [1]

---

[1] - ماخوذ از تقریر "اُردو زبان" جو صاحب موصوف نے یوم آزادی کے موقعہ پر فرمائی تھی اور جو سالنامہ نیرنگ خیال بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی

اُردو شاعرہ خواتین کے کلام پر ایک نظر

خواتین میں اُردو شاعری کی ابتدا ملکہ نورجہاں؟

خواتین میں اُردو شاعری کی ابتدا "صاحب جلوۂ خضر" کی تحقیق کے مطابق عہد جہانگیری سے ہوتی ہے۔ "جلوۂ خضر" میں ملکہ نورجہاں بیگم کو اُردو کی شاعرہ بتایا گیا ہے

ـــــــــــــــ

لے نورجہاں کا نام مہرالنسا تھا۔ ان کے والد مرزا غیاث بیگ بوجہ غربت تلاش معاش میں قندھار سے ہندوستان آئے۔ رفتہ رفتہ اکبر کے دربار میں انھیں ایک اچھا عہدہ مل گیا۔ مہرالنسا اپنی والدہ کے ہمراہ محل میں آنے جانے لگی اس کا حسن دیکھکر شہزادہ سلیم اس پر عاشق ہوگیا۔ اس واقعہ کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے مہرالنسا کی شادی علی قلی خاں المعروف بہ شیر افگن سے کردی جب سلیم تخت پر بیٹھا تو اس نے شیر افگن کو بنگال میں بردوان کی جاگیر عطا کی۔ (ملاحظہ ہو۔ اسمتھ۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صث۳۷) بعض افترا پرداز مورخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے شیر افگن کو دھوکے سے قتل کروادیا مگر تاریخ کا یہ ایک شرمناک دروغ ہے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی کتاب "تاریخ جہانگیر" میں اس قصہ کو بالکل غلط بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کا دامن شیر افگن کے قتل سے بالکل آلودہ نہ تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ جہانگیر کو شیر افگن پر بعض وجوہ کی بنا پر سلطنت کے خلاف سازش کا شبہ ہوا۔ چنانچہ اس نے خود اپنے سوتیلے بھائی

اور نور جہاں کے حسب ذیل دو اُردو شعر نقل کئے گئے ہیں جو یہ ہیں ؎

دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اسے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

لیکن یہ بیان مصنّف موصوف کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ان اشعار کے

[بقیہ پچھلے صفحہ سے] قطب الدین کوکا کو بنگال روانہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ڈاکٹر بینی پرشاد کی زبانی سنئے وہ لکھتے ہیں:-

"جب شیر افگن قطب الدین سے ملنے آیا تھا تو شاہی فوج نے اس کو گھیر لیا۔ اس بات کو دیکھکر شیر افگن سخت برہم ہوا۔ اور قطب الدین اس کو دھیما کرنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ شیر افگن نے اس پر تلوار کا وار کر دیا قطب الدین زخمی ہو کر تقریباً مر چکا تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ شیر افگن کو مار ڈالیں۔ اور ایک کشمیری سپاہی نے جو قطب الدین کی فوج میں تھا شیر افگن کو گرا دیا اور دیگر شاہی سپاہیوں نے ہر طرف سے گھیر کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ شیر افگن کے یوں مارے جانیکے بعد ہی قطب الدین کی روح بھی جسم سے پرواز کر گئی"۔ (تاریخ جہانگیر صـ۱۴۶)

متعلق اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ محجن الدین معین بدایونی شاگرد مرزا سودا کے ہیں۔ میر حسن کے تذکرے میں یہ دونوں شعر اور اسی غزل کا ایک اور شعر معین کے حالات میں موجود ہیں۔

ویسے بھی ان اشعار کی زبان کو دیکھنے کے بعد اس قسم کی غلطی کرنا تعجب خیز ہے۔ زبان کی شستگی، صفائی و سلاست اور تراکیب بندش کی چستی سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ یہ اشعار بہت بعد کے زمانہ کے ہیں۔

[پچھلے صفحہ سے] یہ واقعہ ۱۶۰۷ء (۱۰۱۶ھ) میں ہوا۔ اس کے بعد مہرالنساء بیوہ ہو کر آگرہ چلی آئی اور تقریباً چار برس کے بعد ۱۶۱۱ء (۱۰۲۰ھ) میں جہانگیر سے اس کی شادی ہو گئی اور اس کو "نورمحل" اور پھر "نورجہاں" کا خطاب دیا گیا۔

نورجہاں نہایت غیور، دانشمند اور دلبر عورت تھی۔ جہانگیر کے ساتھ شادی ہوتے ہی اس نے تمام مملکت میں اپنا وقار قائم کر لیا اور وہی سلطنت کا سارا انتظام کرنے لگی۔ اس کے باپ کو اعتماد الدولہ اور اس کے بھائی کو آصف خاں کا خطاب ملا اور دونوں اعلیٰ عہدوں پر مامور کئے گئے۔

جہانگیر نے سلطنت کے اکثر کام نورجہاں کے سپرد کر دئے تھے۔ وہ سب کاموں کی خود دیکھ بھال کرتی تھی۔ اور دربار میں بیٹھکر سب لوگوں کی فریادیں سنتی تھی وہ زبانِ فارسی کی بہت بڑی ادیبہ اور شاعرہ تھی۔ اکثر نئے قسم کے زیور اور لباس اس کی ایجاد ہیں، نورجہاں فیاض اور مخیرہ بھی حد درجہ کی تھی۔ وہ غریبوں کی ہمیشہ دستگیری اور امداد کرتی رہتی تھی۔ غریب لڑکیوں کی پرورش اور

عہد جہانگیری میں شمالی ہند میں اردو شاعری کے متعلق ابھی تک کچھ بصراحت معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں جہانگیر کے زمانہ میں صرف ملا نوری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرعے اردو کے بھی نکل گئے ہیں، مثلاً ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد بیچارۂ نوری نہ کرے ہو نہ ڈرے ہو

[پچھلے صفحہ سے] شادی کا انتظام وہ خود کیا کرتی تھی

وہ بہت بالغ نظر اور زبردست سیاست داں بھی تھی جبوقت ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۶ء میں جہانگیر کابل جا رہا تھا۔ مہابت خاں نے بغاوت کی اور اس کو گرفتار کر لیا۔ نور جہاں خود فوج لیکر گئی لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ خود بھی مہابت خاں کے قبضہ میں آگئی لیکن اس قید کی حالت میں اس نے جس قدر دانشمندی اور ہوشیاری کا ثبوت دیا تاریخ میں اسکی مثال ملنا مشکل ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی عقلمندی اور تدبیر کی بنا پر خود اس قید سے نکل گئی بلکہ جہانگیر کو بھی نکال کر لے گئی اور مہابت خاں جیسا زبردست سپہ سالار اور سیاست داں اس سے زک کھا کر دکن کو بھاگ گیا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں اپنے داماد "شہریار" کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی مگر آصف خاں نے شہریار کو شکست دیکر خسرو کے لڑکے داور بخش کو تخت پر بٹھال دیا اور اپنے داماد خرم کو جو اس وقت دکن میں تھا بلوا بھیجا۔

لیکن ان کے متعلق بھی سید نصیر الدین صاحب ہاشمی کا خیال ہے کہ "یہ نوری بیجا پوری ہیں" (مقالات ہاشمی حصہ اول ص۲۷)

اس دور کے دکنی شعراء سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان ابراہیم عادل شاہ وغیرہ ہیں - ان کا زمانہ سولھویں صدی عیسوی ہے اور ان کی زبان و کلام کا اندازہ یہ ہے:-

سلطان محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ) ۱۵۸۰ء ۹۸۸ھ تا ۱۶۱۱ء ۱۰۲۰ھ

چلی چندنی میں جب تلک پیو ہمارا | اوتن عکس دیکھی چندر تھی اتارا
بسی جن صبا میں پرت ہم سجن کی | میں اسکی پرت کچ نہیں اوتھی پیارا

[پچھلے صفحہ سے] خرم دکن سے آکر تخت نشین ہوا اور شاہجہاں کا لقب اختیار کیا نورجہاں نے اب سلطنت کے کاموں سے بے تعلق ہو کر لاہور میں سکونت اختیار کرلی اور شاہجہاں نے دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرر کردی - آخر ۱۶۴۳ء ۱۰۵۴ھ میں اس زبردست ملکہ نے دنیا سے رحلت کی

نورجہاں کی رحلت کی یہ تاریخ (۱۶۴۳ء) ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب "اسٹوڈینٹس ہسٹری آف انڈیا" میں دی ہے (ص۲۲۵) لیکن اسمتھ نے لکھا ہے کہ تقریباً ستر برس کی عمر میں ۱۶۴۵ء ۱۰۵۶ھ میں اسکا انتقال ہوا" (آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا ص۳۸۳ حاشیہ)

اگر نورجہاں کی وفات کی یہ تاریخ صحیح ہے تو اس کا سنہ پیدائش تقریباً ۱۵۷۵ء ۹۸۳ھ ہوگا

چھبیلی سون لگیا ہے من ہمارا کہ اس بن نہیں ہے ٹک دل قرارا
صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل میں صبوری کیوں کرے ہوکر تمھارا

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (بیجاپور) ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء

شامی عنبر بتیاں سپھرائے شربت گھول امرت پلائے
بادل دماہے بجلی بجاوے باجی خالو شتابی آنے پاوے

〰〰〰

میرا نیر سکندر ہوا ڈھونڈی سید محمد ابراہیم کوں دکھا نگری

غواصی اور نصرتی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ مگر ان کی زبان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ غواصی کے دو شعر ہیں۔

جن ہے جواہر لال کے سمندر کا گہیر ہے غواص اس دور میں بے نظیر
سو لیو جواہراں کا رلیا تا ہے بہار جو ملک ہندوستاں میں ایک ٹھار

[طوطی نامہ تحشی]

مولانا نصرتی فرماتے ہیں:۔

خریدار کو خوب سودے سے کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام
شہ کی ثنا نصرتیؔ نفز بول یوں لکھی دور کے دفتر اوپر اچھے ہر ایک بچن

حال ہی میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور سے بھی پہلے بہمنی دور حکومت کے کچھ اردو شاعروں کا پتہ چلا ہے جنہیں نظامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا زمانہ پندرھویں صدی عیسوی ہے۔

مگر ان کی زبان اُن شعراء سے بھی زیادہ خراب ہے

کھڑا ہوی جو بات میں رانکر	کہی کو تو الیوں کہ مجھکوں پکر
اگر چوروجبری با ہوئے سپاہ	پکر کون تس بہتر کھوری باہ
نکر بان جی لوہے کراکا نتہ سنگ	نہ ہوتا کدھن کا نتہ کو نہ بہنگ

ان اشعار کے بعد پھر ایک دفعہ ان اشعار کو پڑھیئے جو صاحب "جلوہ خضر" نور جہاں کے بتاتے ہیں، اور یہ امر پھر خود ہی واضح ہو جائیگا کہ یہ خیال کہ یہ زبان اس زمانہ کی ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خود ولی اور کہیں کہیں سودا تک کے یہاں زبان میں ثقل و گرانی وسقم موجود ہے اس لئے قطع نظر اس سے کہ اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ اشعار معین الدین معین بدایونی کے ہیں ویسے بھی اس زبان کو اس دور کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ نور جہاں نے کچھ اُردو میں کہا ہو لیکن آج اسکا کوئی اُردو شعر موجود نہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اُردو میں شعر کہنا تحقیق نہیں۔ اس لئے ملکہ نور جہاں کا شمار اُردو شاعرات میں نہیں کیا جا سکتا۔

شہزادی زیب النسا مخفی[۱]

ملکہ نور جہاں کا اُردو میں شعر کہنا ثابت نہیں۔ نور جہاں کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی صاحب فضل و کمال دختر شہزادی زیب النساء مخفی پر پڑتی ہے شہزادی زیب النساء فارسی کی مسلم الثبوت شاعرہ تھی گو بعض ناقدین کو اس میں کلام ہے کہ موجودہ دیوان مخفی اسی زیب النساء کا کلام ہے۔

زیب النساء کا اُردو میں شعر کہنا مختلف شہادتوں سے ثابت ہے۔

(۱) مشہور فرانسیسی وقائع نویس موسیو گارسن ڈتاسی[۲] (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء) اپنے تذکرہ میں شہزادی زیب النساء کی اُردو میں شعر گوئی کی شہادت دیتا ہے۔ یہ مغربی محقق لکھتا ہے۔

---

[۱] حالات دیکھیے زیب النساء مخفی کے تذکرہ میں

[۲] موسیو گارسن دتاسی (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء) انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی عالم اور مستشرق گذرا ہے۔ اس کو اُردو سے عشق تھا۔ پیرس میں بیٹھا بیٹھا اُردو کی رفتار و ترقی کا غائر مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اپنے فرانسیسی اور انگریز احباب کے ذریعہ یہاں کے حالات اور کتب دستیاب کرتا تھا۔ ہر سال کے ختتام پر اپنی یونیورسٹی میں اُردو کی سالانہ ترقی پر نہایت مفصل اور محققانہ لیکچر دیتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اس نے اُردو پر اس طرح انیس[۱۹] لیکچر دئے جن کا ترجمہ آٹھ سو صفحات کی ضخیم جلد میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دیا ہے

"میں نے زیب النساء کی اُردو نظمیں دیکھی اور پڑھی ہیں۔"

(۲) صاحب "جلوۂ خضر" اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:-

"ایک پرانی بیاض میں شہزادی کے اُردو شعر ہماری نظر سے گذرے ہیں۔"

(۳) نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال اپنی کتاب "مغل اور اردو" میں رقمطراز ہیں۔

"مخفی تخلص کرتی تھی اور فارسی میں اپنے جذبات دہراتی تھی مگر اُردو میں بھی اس نے جو کچھ کہا ہے اس زبان کا سرمایۂ ناز سمجھا جاتا ہے۔" [زیب النساء اور اردوئے معلیٰ مغل اور اردو ص۳۱]

[پچھلے صفحہ سے] اس شخص نے عربی، فارسی، سنسکرت، اُردو اور ہندی کی بڑی خدمت کی ہے اور بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستانِ تاریخ اُردو" میں گارسن دتاسی کے تذکرہ میں اس کی ان کتابوں کے نام گنائے ہیں جو اُردو کے متعلق ہیں، وہ کتابیں یہ ہیں:-

(۱) پند آموز حکایات کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۲۱ء)

(۲) انتخابِ کلام میر تقی میر معہ ترجمہ زبان فرنچ (مطبوعہ ۱۸۲۶ء)

(۳) قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین کا فرنچ ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۴) انتخابِ کلام ولی اورنگ آبادی (مطبوعہ ۱۸۳۶ء)

(۵) لغت جات عربی و فارسی و اُردو (مطبوعہ ۱۸۲۸ء)

پھر نواب صاحب موصوف اسی صفحہ کے حاشیۂ زیریں میں لکھتے ہیں،
"شاہزادی کی اصل مادری زبان فارسی تھی مگر وقت کا اثر
اور اردو کے اقبال کو دیکھنا کہ زیب النساء اس ملکی زبان کو نہیں
بھولتی اور اسے خلعتِ نظم عطا کرتی ہے"

[پچھلے صفحہ سے] - (۶) ذکر تذکرہ جات مشتملبر حالات شعراء و مصنفین ہندی اردو (مطبوعہ ۱۸۳۸ء)
(۷) مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی و فارسی و اردو (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)
(۸) ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اردو کتابوں میں ہے (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)
(۹) انتخاب قصہ گل بکاولی معہ ترجمہ زبان فرانسیسی (مطبوعہ ۱۸۳۵ء)
(۱۰) اردو زبان کا ابتدائی رسالہ (مطبوعہ ۱۸۳۳ء)
(۱۱) سعدی دکھنی ہندوستان کا ایک مشہور شاعر (مطبوعہ ۱۸۴۳ء)
(۱۲) تذکرہ شعرائے اردو (دو جلدوں میں) مطبوعہ ۱۸۴۷ء
(۱۳) انتخابات اردو ہندی (مطبوعہ ۱۸۵۴ء)
(۱۴) تذکرہ مصنفین معہ تصانیف اردو (مطبوعہ ۱۸۶۸ء)
(۱۵) خطبات متعلق زبان اردو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک (مطبوعہ ۱۸۷۴ء)
(۱۶) خطبات متعلق زبان اردو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک
(۱۷) تذکرہ شعرائے اردو (تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورہ نمبر (۱۲) کا ترمیم شدہ
اڈیشن معہ اضافہ مقدمہ مشتملبر تاریخ زبان و اصناف شاعری - اس میں تین ہزار
اردو ہندی شعراء و مصنفین کا تذکرہ ہے (مطبوعہ ۱۸۷۰ء)
(داستان تاریخ اردو صفحہ ۶۸-۶۹)

لکھتے ہیں کہ شہزادی کا زیادہ تر کلام تلف ہوگیا اس کا اُردو کلام اب نایاب ہے۔

صاحب جلوۂ خضر نے زیب النساء کے تین اُردو مطلعے پیش کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

جدا ہو مجھسے مرا یار یہ خدا نہ کرے　　　خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی　　　پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے　　　خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے[1]

ان اشعار کے علاوہ زیب النساء کا کوئی اُردو شعر نہیں ملتا۔

میو سیو ڈ تاسی اور صاحب جلوۂ خضر کی روایت کے بعد ہمیں اس مسئلہ پر درایتاً بھی نظر ڈالنا ہے اور اس کیلئے ہمیں اسوقت کے شاعرانہ ماحول پر نظر ڈالنا ہوگی۔ شہزادی زیب النساء کی تاریخ ولادت ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء ہے اور تاریخ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۱ء ہے۔ زیب النساء کی وفات کا مادۂ تاریخ "وادخلی جنتی" ہے۔ ابھی

---

[1] میری نظر سے یہی شعر "تذکرۃ الخواتین" میں گتا بیگم شوخ اہلیہ نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر نظام وزیر عالمگیر ثانی کے تذکرہ میں گذرا ہے۔ لیکن تذکرۂ شمیم سخن میں جو تذکرۃ الخواتین کا اکثر ماخذ رہا ہے یہ شعر شوخ کے بیان میں موجود نہیں ہے

۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب انتقال ہوا تو ۱۱۱۳ھ کے ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ اس لئے تاریخ گو نے آئندہ سال کا مادۂ تاریخ کہہ دیا جو ایسی صورت میں جائز ہے جو اشعار زیب النساء کے نام سے پیش کئے گئے ہیں ان کی زبان کی صفائی اور رنگ کی پختگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر یہ اشعار واقعی زیب النساء کے ہیں تو اس کی اخیر عمر کے ہیں۔ وَلی غالباً اسوقت دہلی آچکے تھے چونکہ وہ تقریباً سنہ ۱۷۰۰ء مطابق سنہ ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے ہیں[1]

اس وقت دہلی میں مرزا عبدالقادر بیدل موجود تھے یہ عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے دہلی میں پرورش پائی تھی اور شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیرؒ کی سرکار میں نوکر ہوئے تھے۔ آخر عمر گوشۂ عزلت میں فقر و توکل میں بسر کی اور ۱۷۲۱ء مطابق ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔ یہ بھی کبھی کبھی اُردو میں کہا کرتے تھے۔ پرانے تذکروں میں ان کے دو ایک اُردو اشعار اب تک موجود ہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب داستان تاریخ اُردو میں اُن کے دو اُردو شعر قائم اور میر وغیرہ کے تذکروں کے حوالے سے دئے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

---

[1] تاریخ داستان اُردو مؤلفہ پروفیسر حامد حسن قادری صفحہ ۲۵

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردہ سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں
(داستان تاریخ اردو ص۲۸-۲۹)

علاوہ ازیں اس وقت دہلی میں اکثر شعراء پیدا ہو چکے تھے جو بعد کو اردو کے بڑے بڑے اساتذہ ہوئے۔ ان میں شاہ مبارک آبرو (المتوفی ۱۷۳۳ء) اور خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اشرف علی۔ فغاں۔ ناجی۔ احسن اور حاتم وغیرہ بھی ان ہی کے ہمعصر تھے۔ ولی اور ان شعراء کی زبان میں کہیں کہیں سقم بھی نظر آتا ہے مگر ان کے یہاں نہایت شستہ اور صاف زبان کے نمونے بھی بکثرت موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ولی

سفرِ عشق کا اگر ہے خیال　　ہمت دل کو زاد راہ کرو
عاشقو عاشقی کے دعوے پر　　آہ وزاری کے دو گواہ کرو
گل و بلبل کا گرم ہے بازار　　اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

زندگی جامِ عیش ہے لیکن　　فائدہ کیا اگر مدام نہیں

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں　　تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی　　بندمت ہو سبحہ و زنار کا

مستی ہیں روز حشر تک کو بتن کو ہوا ہے آدہ ⁂ جو جام چشم یار سے می پی کے متوالا ہوا

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجائے

اے ولی رہنے کو دنیا ہے مقام عاشق کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

شاہ مبارک آبرو

سخن اوروں کا تشنہ ہو کے سنتا اور سب کہتا
مگر اک آبرو کی بات جب کہتے تو پی جاتا

ناجی۔

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گو سر میں آب

احسن

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف
ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

شاہ حاتم

ہجر کی زندگی سے موت بھلی کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

ان اشعار سے اس وقت کی صاف زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔
زیب النساء فارسی کی قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعرہ تھی جن لوگوں نے موجودہ دیوان مخفی کے زیب النساء کا کلام ہونے پر شبہ کیا ہے

ان میں علامہ شبلی بھی ہیں۔ لیکن خود علامہ شبلی جو زبردست تاریخداں بھی تھے۔ زیب النساء کے مسلم الثبوت فارسی شاعرہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ شہزادی زیب النساء نہایت ذہین، طباع، صاحب علم و فضل اور صاحب جوہر خاتون تھی پھر جب ماحول پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دہلی میں شعر و شاعری کا چرچا ہو چکا تھا۔ اچھے اچھے شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ ان تمام واقعات و شواہد کی روشنی میں یہ امر قابلِ قیاس ہے کہ زیب النساء نے اُردو میں بھی کچھ کہا ہو۔ اور اس کی تصدیق موسیو ڈٹاسی اور صاحب جلوۂ خضر کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ جن دونوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ شہزادی کا اُردو کلام ان کی نظر سے گزرا۔ اب رہا یہ سوال کہ متذکرہ بالا اشعار زیب النسا کے ہیں یا نہیں۔ ان کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زبان بہت زیادہ صاف اور رنگ بہت پختہ ہے۔ زیب النساء کے شاعرانہ ماحول اور خود شہزادی کی فطرتی ذہانت و ذکاوت کو دیکھتے ہوئے یہ امر کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اشعار اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کہے ہوں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اسوقت کے شعراء کی طرح زیب النساء کے اُردو کلام میں بھی صاف اور خراب دونوں زبانوں کے نمونے موجود ہوں لیکن اب صرف یہی

اشعار باقی رہ گئے ہوں جن کی زبان اس قدر صاف تھی، باقی کلام
گردشِ روزگار کے ہاتھوں تلف ہو چکا ہو، لیکن اگر تحقیق کسی وقت
یہ بھی ثابت کر دے کہ یہ اشعار کسی اور کے ہیں زیب النسا کے نہیں
تب بھی اس سے زیب النسا کی اُردو گوئی کی نفی لازم نہیں آتی۔
اس وقت ہمیں مو سیو ڈ تاسی اور صاحب جلوۂ خضر کے بیانات کے
پیش نظر یہ کہنا ہو گا کہ شہزادی زیب النساء اُردو میں بھی کہتی تھیں۔
لیکن آج ان کا کوئی اُردو شعر باقی نہیں۔

شاعرات اُردو کا دہلی اسکول

شہزادی زیب النسا کے بعد میرؔ و سوداؔ کے زمانہ کی کچھ خواتین کا کلام ملتا ہے۔ ان خواتین کا ایک دور قائم کیا جا سکتا
ہے، جو اس زمانہ سے لیکر غدر سے کچھ عرصہ بعد تک کی شاعرات
پر مشتمل ہے۔ خواتین بھی اپنے ماحول اور زمانہ سے متاثر ہوئی ہیں
ان کے کلام پر شعراء کا بھی اثر پڑا ہے اور شعراء کی طرح خواتین میں
بھی شاعری کے دو مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ اس طرح شاعرات
کے بھی دہلی اور لکھنؤ کے دو اسکول قائم کیے جا سکتے ہیں، یہ
پہلا دور دہلی اسکول سے متعلق ہے۔

بیگم بنت میر تقی میر۔ جینا بیگم تلمیذ سودا۔ بسم اللہ بیگم تلمیذ
انعام اللہ یقین۔ کاملہ بیگم جعفری تلمیذ شاہ نصیر۔ قادری بیگم تلمیذ شاہ نصیر
بھوری بیگم ضیاء تلمیذ شاہ نصیر۔ حیدری خانم حیدری، بادشاہ بیگم مخفی، نواب

اختر محل اختر - نازنین - گنا بیگم شوخ - گوہر بیگم گوہر - اور سکندر جہاں بیگم ضیا وغیرہ وغیرہ اس دور کی خاص شاعرات ہیں ان خواتین کے کلام میں دہلی کے اساتذہ کی امتیازی خصوصیات موجود ہیں!

(۱) شاعری کا سب سے بڑا کمال ذاتی یا شخصی جذبات کا ـــــ ان جذبات کا جو شاعر یا شاعرہ نے خود محسوس کئے ہوں ـــــ اظہار ہے اور اس قسم کی اعلیٰ شاعری کے نمونے ان شاعرات کے یہاں موجود ہیں -

بسم اللہ بیگم

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے ۔۔۔ کہے مضطر ہے دل گاہے تپاں ہے

جینا بیگم

دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے ۔۔۔ تمھارے آنیکا نت انتظار رہتا ہے

شوخ

شمع کیطرح کون رہ جانے ۔۔۔ جسکے جی کو لگی ہے سو جانے

امیر بیگم اسیر

خاک میں ملگئی ہوں جس پہ اسیر ۔۔۔ اسی دل میں غبار ہے اپنا

مخفی

خدا جانے کیا بات ہے اسمیں مخفی
کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے

سکندر جہاں ضیاء

یوں جو ہم نوجوان مرتے ہیں ان کی یادِ شباب ہے دل میں

واہ ری نارسائی قسمت ان کے در تک نہ ہو سکا جانا

رباعی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں طوفاں زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں
ظالم اب اپنے در سے اٹھاتا ہے کس لئے کیا کم ہے یہ ستم کہ ترے دل سے دور ہوں

ان اشعار کی تاثیر سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہر شعر ایک نشتر ہے جو دل میں اُترتا چلا جاتا ہے، اور یہ کیفیت یہ اثر ان میں اس وجہ سے ہے کہ یہ جذبات شدت کے ساتھ محسوس کئے گئے ہیں اور سادگی کے ساتھ ادا ہو گئے ہیں۔ اور شاعری کا مقصود یہی ہونا چاہیے۔

ان شاعرات کی غزلوں میں تغزل کے اصلی جوہر موجود ہیں۔ سوز و گداز، درد و اثر، جوش و مستی، یاس و حسرت سب کی مثالیں ملتی ہیں۔ غزل کی زبان اصولاً نہایت شیریں، نرم، صاف اور شستہ ہونا چاہیے۔ ان خواتین کی غزلیات میں یہ جوہر بھی موجود ہے۔

جعفری

ساقیا مجھکو ترا ساغر پلانا یاد ہے کلمۂ لا تقنطوا سے دل چھکانا یاد ہے

خفی

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں

اے خفی اپنے اشک بے تاثیر　　عفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

خاکساری:۔

لکھا نصیب کا کوئی مٹا نہیں سکتا　　کہ میرے درد کو ہمدم بٹا نہیں سکتا

حاتم

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی　　میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوار ہو

عفت

رونے کیلئے میرے جنازہ پہ اب عفت　　جز یاس والم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

(۲) کلام میں نازک مزاجی اور عشق کی خودداری کافی حد تک موجود ہے جو میر جیسے تنک مزاج اور غیور الطبع شاعر کے اثرات کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

عشق کا وقار اور خودداری ملاحظہ ہو:۔

خفی:۔

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد　　شرمندہ ترے ایک بھی دانہ کے نہیں ہم

فاطمہ:۔　نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائے گا

(۳) اکثر پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضامین کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے اور طرز بیان کی خوبی اور لطافت نے ان کو اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ مثلاً عاشق محبوب کو رقیب کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا ہے اور بے اختیار اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس کو اس طرح ادا کرنا کہ "مژہ موتی پرو رہی تھی" ندرت ادا کی

ایک اعلیٰ مثال ہے؛

شوخ:- رقیبوں سے وہ جب دم سنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اے دردِ جگر موتی پروتی تھی

پھر ایسے موقع پر خود "دردِ جگر" کو مخاطب کرنا بلاغت کی کیسی نادر مثال ہے!

یا مثلاً محبوب کی شرم وحیا کی تعریف شاعری میں ایک عام بات ہے لیکن ذرا یہ ندرتِ ادا ملاحظہ ہو:-

نازنین

کس جسنِ ادا کی آمد ہوئی چمن میں نرگس نے منہ چھپایا پتوں کے پیرہن میں

یہ حسنِ تعلیل کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔

یا مثلاً شاعرہ محبوب کی ابرو کو تیغ سے تشبیہ دیتی ہے، بعد کو خیال آتا ہے کہ خون آشامی اور سفاکی میں تیغ ہرگز ابروئے محبوب کے مدِمقابل نہیں لائی جاسکتی اس کو انتہائی لطافت کے ساتھ یہ کہکر ٹال دیا جاتا ہے کہ "یہ رواروی کی بات تھی"!

گوہر:-

ابرو کو جو تیرے تیغ باندھا یہ بات تھی اک رواروی کی

۴- تشبیہ واستعارے اکثر نہایت نیچرل سادہ ولطیف ہیں، ان میں بڑی شگفتگی اور تازگی ہے۔

جینا بیگم:- ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے ؛ کاسۂ نرگس میں جوں شبنم ہے

یہ کتنی نیچرل، کتنی لطیف، اور کتنی مکمل تشبیہ ہے، پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حیا:۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا آب گہر میں عکس بناتا ہے یار کا

یہ کیسی نادر تشبیہ اور کیسا لطیف تخیّل ہے!

عصمت دہلوی

لعل لب جاں بخش ہے گویا ورق گل اور رخ پہ پسینہ ہے ترا جوں عرق گل

یوں نرمۂ گوش اسکا لچکتا ہے گہر سے شبنم سے لچک جاتا ہی جیسے ورق گل

(۵) کلام میں کہیں کہیں شوخی کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

گوہر

چھلنی داغوں سے دل ہے گوہر انگیا ملی ہم کو سوزنی کی

مصرعہ ثانی میں ابتذال پیدا ہو گیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ شاعرہ کا مقصود اصلی ابتذال نہیں، شوخی و ظرافت ہے۔

ان شاعرات کے یہاں خامیاں بھی ہیں۔ کلام کی ناہمواری، پستی، رکیک و عامیانہ جذبات، اور ذان کے عیب ہیں۔ لیکن یہ عیب کہاں نہیں کیا خود میر جیسے خدائے سخن کے یہاں یہ تمام عیب اور خامیاں موجود نہیں۔

شاعرات اُردو کا لکھنؤ اسکول

اس کے بعد ان خواتین کا دور آتا ہے جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں۔ خواتین کے اس دور کو دور ثانی

کہہ سکتے ہیں، ان میں اکثر شاعرات وہ ہیں جو نواب واجد علیشاہ کے زمانہ حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس دور کی ممتاز شاعرات یہ ہیں:۔

۱۔ حرم نواب آصف الدولہ۔ بیگم جان المعروف بہ بہو بیگم المتخلص بہ جانی۔ دلہن

۲۔ حرم نواب واجد علیشاہ۔ حیدری بیگم عرف ماہِ طلعت المتخلص بہ قمر۔ نواب بیگم حجاب۔ نواب صدر محل صدر۔ عالم سلطان جہاں بیگم المخاطب بہ محبوب محل المتخلص بہ محبوب۔

۳۔ دیگر خواتین:۔ چنبیلی المتخلص بہ یاسمن کنیز و تلمیذ سید انشا۔ سلطان بیگم سلطان۔ ضیائی بیگم ضیا۔ بہو بیگم محل خاص نواب یوسف علیخاں والیٔ رامپور۔ نواب شاہجہاں بیگم شیریں فرمانروائے ریاست بھوپال۔ شمس النساء بیگم شرم تلمیذ خواجہ وزیر پارسا۔ مستور بیگم مستور۔ کنیز فاطمہ کنیز۔ شریر وغیرہ وغیرہ

جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی یہ شاعرات اپنے ماحول اور زمانہ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ اسوقت لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت میں جو عیش پرستی آگئی تھی اس کا اثر یہاں کے شعراء کی طرح شاعرات کے کلام پر بھی پڑا ہے اور لکھنؤ اسکول کے ابتذال کی ایک بڑی وجہ بھی ماحول کا اثر ہے درا صل آج جس چیز کو ہم مبتذل اور رکیک کہتے ہیں وہ اس وقت مبتذل نہیں سمجھی جاتی تھی اور اس پر

انگشت نمائی نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا، تو شعرا، لکھنؤ اسکول کی شاعرات تک کے یہاں مبتذل، رکیک اور سوقیانہ مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔

ذلیل کنیز مرزا سلیمان شکوہ

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں ہیں تم تو ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

میں فرشتہ کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے اپنے کرتوت پہ جس دم کہ میں آجاتی ہوں

یاسمن کنیز سید انشا

دخترِ رز سے رات صحبت تھی شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا

فاطمہ بیگم کنیز دختر نواب نصرت الدولہ

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائیگی

یہ ابتذال و فحاشی کی نہایت رکیک اور حیا سوز مثالیں ہیں۔

لیکن متذکرہ بالا تینوں شاعرات لونڈیاں تھیں پھر بھی یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یہ شعر ان ہی کے ہیں یہ کسی نے کہکر ان کے نام کے ساتھ شامل کر دئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ دہلی کی شاعرات کے یہاں کہیں کہیں اور لکھنؤ کی شاعرات کے یہاں اکثر مبتذل اور عامیانہ مضامین ملتے ہیں لیکن مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ اس گناہ کی ذمہ دار اس قدر وہ شاعرات نہیں جس قدر کہ ان کا ماحول، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، اور ان کا زمانہ ہے۔

۲۔ لکھنؤ کی معاشرت میں بقول مولانا عبدالسلام ندوی جو نزاکت اور زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اس کا اثر یہاں کی شاعری پر ایک اور طرح سے بھی پڑا ہے، اس کی وجہ سے یہاں کی زبان میں اکثر زنانہ پن پیدا ہو گیا ہے، شعرائے لکھنؤ کے کلام کا یہ ایک عیب ہے۔ مگر شاعرات کے یہاں یہی چیز حسنِ کلام کا زیور بن جاتی ہے۔ چونکہ یہاں اس کی وجہ سے زندگی اور ادب میں ایک صداقت آمیز مطابقت پیدا ہو جاتی ہے، اس قسم کا لب و لہجہ عورتوں کی زبان اور ان کا حصہ ہے، اس لئے اُن کے منھ سے ایسی زبان بہت نیچرل اور فطرت و حقیقت کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

بہو بیگم :۔

شب بزمِ ملاقات میں ہر چند یہ چاہا	آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشکِ قمر سے
پر خوف یہی دل میں مرے آیا کہ ہے ہے	نازک ہے نہ دب جائے کہیں تارِ نظر سے

نواب صدر محل صدر :۔

بیٹھے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر	منھ کو بگاڑ کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ

۳۔ ناسخ نے جب اصلاحِ زبان کی طرف توجہ کی تو رفتہ رفتہ یہ خیال لکھنؤ کی فضائے شاعری پر کچھ ایسا غالب آگیا کہ لوگوں کی توجہ جذبات سے ہٹ کر الفاظ پر مرکوز ہو گئی۔ اور شعرا کا طرۂ امتیاز خوبصورت اور صحیح الفاظ کا انتخاب سمجھا جانے لگا۔ اس سے زبان کو تو ضرور فائدہ ہوا، مگر روحِ شاعری کو زبردست صدمہ پہنچا اور شعر محض آورد اور لفظی صناعی بن کر رہ گیا۔ اور مراعاۃ النظیر، تجنیس، ایہام، تضاد وغیرہ وغیرہ تمام صنعتیں یہاں کی

مرغوب صنعتیں بن گئیں یہ صنعتیں دہلی کے متقدمین شعراء کی بھی مرغوب صنعتیں تھیں۔ شاہ مبارک آبروؔ، ناجیؔ، احسنؔ، حاتمؔ، خان آرزوؔ شاہ نصیبر سب کا کلام ان صنعتوں کا گنجینہ ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ میرؔ اور سوداؔ ہی کے زمانہ سے دہلی کے شاعر سنبھلنے لگے انھوں نے محسوس کیا کہ یہ شاعری کا مطمح نظر نہیں بلکہ صحیح مطمح نظر ترجمانی جذبات ہے انھوں نے سمجھ لیا کہ تمامتر آورد اور شاعری کا عیب ہے اس کا حسن نہیں اور انھوں نے حتی المقدور اس سے احتراز کیا۔ لیکن لکھنؤ میں یہی چیز استادی کا ثبوت اور شاعری کا کمال سمجھی جانے لگی اور چونکہ یہاں کی شاعرات بھی اسی ماحول میں سانس لے رہی تھیں۔ اس لئے وہ بھی اس اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی شاعرات کے یہاں بکثرت رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں جنکی بنیاد سراسر آورد پر قائم ہے۔

جانیؔ حرم آصف الدولہ۔

دہن پر تیرے تھا ہم کو تو ہم — یہ عقدہ آج ہی ہم پر کھلا ہے

دولہنؔ حرم آصف الدولہ

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا — تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیر فلک — خانۂ دل جو گرا ہو اُسے آباد کرو

ضیائیؔ بیگم ضیا

میں ہوں وہ تنگ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک — اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

فاطمہ بیگم کنیز

نقّاش نے اس بت کا مرے نقش جو کھینچا ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا

شبرین فرمانروائے بھوپال

کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

پہلے شعر میں دہن، عقدہ اور عقدہ کے ساتھ کھلنا، دوسرے میں آبلہ پھوٹ کر بہنا، آنکھ، نری، راہ، قافلہ تیسرے میں عمارت، خانۂ دل، اگرنا، آباد کرنا، چوتھے میں خاک، مٹی، بنانا، خراب کرنا۔ پانچویں میں نقاش، بت، نقش، کھینچنا، ساعد، ہاتھ، پہنچا چھٹے میں کافر، زلف، لام، اس لام — سب رعایت لفظی کی مثالیں ہیں — سب الفاظ اسب آورد!

۴۔ پھر بھی جہاں شاعرات کا مطمح نظر آورد اور الفاظ کا انتخاب نہیں رہا ہے بلکہ ترجمانیٔ جذبات رہا ہے وہاں اشعار بغایت بلند اور پُرتاثیر ہو گئے ہیں، ان میں درد بھی ہے اور کیف بھی، سادگی بھی ہے اور صفائی بھی، شعرائے لکھنؤ میں بالخصوص آتش کے یہاں اس قسم کے تغزل کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔

حجابی ؂

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جانِ ناتواں کی!
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

دلہن:۔

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

مستور ؎ خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت
رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

صدر ؎ صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اُٹھاؤں ہاتھ
بابِ قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

قمر ؎ نہ پوچھ اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے، درد و حسرت ہے فغاں ہے آہ و زاری ہے

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا　　بھول کر بیٹھے ہیں پھر نہ کبھی یاد کیا

شرم

کوئی نا آشنا نہیں ایسا　　ملے ہیں آپ آشنا کیا خوب

لیکن یہ یہاں کا عام رنگ نہیں۔

۵۔ لکھنوی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عاشق اکثر اپنی خودداری کھو بیٹھا ہے اور بہت پست و ذلیل نظر آتا ہے اور اس طرح عشق کے وقار و غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت بھی خواتین کے کلام میں موجود ہے۔

شیریں ؎ قابلِ پابوس کیا ہم بھی نہیں ہیں آپ کے
کیا خطا کی ہم نے گر چوما قدم کو کیا ہوا

دہلی اسکول کے تحت میں فاطمہ کا یہ شعر گزر چکا ہے ؎

نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت　　ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائیگا

ان دونوں شعروں کے مطالعہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کا یہ امتیازی فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔ شعرائے دہلی جہاں کہیں عاشق کی نیازمندی اور خاکساری دکھاتے ہیں وہیں ساتھ ہی ساتھ اس کی خودداری، وقار اور عظمت کو بھی قائم رکھتے ہیں۔ ان دو متضاد جذبوں کو ایک جگہ جمع کردینا فن شاعری کا ایک زبردست کمال ہے۔ مثال کے طور پر شیرین کے مندرجہ بالا شعر کے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے ؎

کرتے ہو مجھکو منع قدمبوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

دورِ حاضر

:- دورِ جدید کی چند ممتاز شاعرات کے نام یہ ہیں :-

صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ تسنیم ملیح آبادی۔ عزیز جہاں آدا بدایونی۔ کنیز فاطمہ حیا لکھنوی۔ خورشید آرا بیگم خورشید (منشی فاضل و ادیب فاضل) ام الشہاب زیب عثمانیہ لدھیانوی۔ نوشابہ خاتون قریشی۔ نجمہ تصدق ام۔اے۔بی۔ٹی۔ آمنہ خاتون عفت مظفرنگری۔ رابعہ خاتون پنہاں بریلوی۔ بلقیس جمال بریلوی۔ میمونہ خاتون غزالہ بریلوی۔ شاہزادی تیمور جہاں حجاب دہلوی۔ گوہر اقبال حور میرٹھی۔ خورشید اقبال حیا میرٹھی سیدہ سردار اختر۔ اختر حیدرآبادی۔ عابدہ خانم نسرین۔ سیدہ بیگم حبیب اللہ خاں صاحبہ رفعت جہاں نکہت۔ انوار فاطمہ تسنیم لکھنوی۔ بشیر خالدہ ادیب۔ ممتاز جہاں ناز۔ نجمہ رحمت اللہ بی۔اے۔ سعیدہ عرف شوکت دلہن۔ محبوب جہاں محبوب۔ شکیلہ خاتون شکیل۔

شکیلہ خاتون نکہت۔ عارفہ بیگم انجم۔ کنیز میمونہ۔ بشیر النساء بیگم بشیر۔ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری۔ ناز بلگرامی۔ محترمہ حیدر زیدی۔ وفا ٹونکی۔ ح۔ بیگم اختر۔ ثروت جمیل ثروت مظفرنگری۔ عذرا جمال دہلوی۔ صابرہ سلطان حزیں وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ شاعراتِ سلف اپنے کلام میں یا تو ایسے الفاظ لاتی تھیں جو تذکیر و تانیث پر بصراحت دلالت نہ کریں۔ مثلاً

مخفی (دہلوی)

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں

عالم حرم واجد علیشاہ

جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے مجھیں قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہے سزائے دل

اور یا اپنے آپ کو بتذکیر نظم کرتی تھیں۔

اشک (دہلوی) ؎ کسی عاشق کا بیشک استخواں ہے میں نہ مانونگا

کہ شانہ تیرے رخ تک اتنا بیباک آتا ہے

سلطان بیگم سلطان (لکھنوی)

تھی وہ نگاہِ ناز یا ناوک کا تیر تھا ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہکے ہائے دل

پہلی صورت بہتر تھی چونکہ اس میں جذبات کی وسعت پیدا ہوجاتی ہے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ فطرت اور حقیقت سے انحراف تھا اس لئے اثر کو صدمہ پہنچتا تھا۔ برخلاف اس کے موجودہ دور کی شاعرات زیادہ تر اپنے

آپ کو بتانیث ہی نظم کرتی ہیں اور اکثر صیغہ جمع حاضر کی بجائے (جو شاعرات سلف کا مسلک تھا) صیغہ واحد حاضر لاتی ہیں۔ اس سے جذبہ کی عالمگیریت و وسعت تو ضرور باقی نہیں رہتی مگر اس میں ایک ایسی تازگی شدت اور حقیقت آمیزی پیدا ہو جاتی ہے جو نہایت مؤثر ہوتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ممتاز جہاں ناز

کچھ اس قدر میں کھو گئی تیرے خیال میں معلوم خود نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

کنیز فاطمہ حیا

اب نہ لکھونگی عمر بھر اُن کو میں دل کا حال زار اب نہ بناؤ نگی کبھی میں انھیں دل کا راز دار

عابدہ خاتون پروین

کچھ نہیں چاہتی مگر اک نگہ غلط اثر ہمت اعتراف ہو جس سے لب گناہ میں

سائرہ ؎ پشیماں ہو رہی ہوں شکوۂ جور و جفا کر کے
کوئی ہوگا پشیمانِ شکایت میں نہ سمجھی تھی

ظریفہ ؎ میں آپ دکھاتی تمھیں سو رنگ کے جلوے
تم حسرتِ دیدار کا اظہار نہ کرتے

۲۔ اس دور میں شاعرات نے یہ بھی محسوس کیا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

دراصل "ظرف تنگنائے غزل" کبھی بھی "بقدرِ شوق" نہیں تھا۔ لیکن فارسی شاعری کا اثر اُردو پر کچھ اس بُری طرح طاری ہوا تھا کہ ہم اُسکے شکنجے سے باہر نکل ہی نہ سکے۔ غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے جس میں صرف

انفرادی جذبوں کا اظہار ممکن ہے۔ لیکن اس میں مسلسل جذبات کا اظہار پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ محسوسات، تصورات، اور کو انُ کو مربوط اور مسلسل کر کے مکمل تجربات کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اسی لئے غزل عموماً انتشار خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں غزلگوئی کا وہ زور نہیں رہا ہے جو پہلے تھا۔ یہ بات محسوس کی گئی کہ عمدہ قسم کی شاعری کے لئے جذبات و تجربات، تصورات اور تخیلات کو مربوط اور مسلسل صورت میں ادا کرنے کی ضرورت ہے اس لئے رفتہ رفتہ غزل کی جگہ نظموں نے لے لی۔

۳۔ موجودہ دور میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے شدید امتیازات مٹ گئے خواتین نے بیشتر دہلی کا رنگ اختیار کر لیا گو غالب اور مومن کی نازک خیالی اور بلند پروازی پوری طرح خواتین سے نہ نبھ سکی۔ تاہم انھوں نے خیالات زبان اور بیان میں بہت کچھ ان سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شاعرات حاضرہ کے یہاں کی شراب مصطبۂ غالب کی ہی کشیدہ ہے۔

عصرِ حاضر کی شاعرات پر غالب کا اثر دو طرح سے پڑا ہے۔ زبان پر اور خیالات پر۔ فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت اور بندشوں کی چستی و جدت ملاحظہ ہو۔

خورشید آرا بیگم خورشید

مگر ناواقفِ رمزِ گداز و سوز تھا نغمہ ۔۔۔ صباحت سے سحر اور رنگ و بو سے گل تہی دامان

خمار و کیف سے ناآشنا تھی فطرتِ صہبا

بہارِ شامِ سحر آئیں نہ تھیں رنگینیاں ساماں

رابعہ خاتون پنہاں بریلوی

ہیں نگاہیں جوششِ حرماں سے خونِ دل میں نم
مردمِ چشم لہو آمیز ہے حسرت سے شیم
ہر تحرک ہے لبِ سیماب وش کا خوں فروش
ہر رگِ جاں آتشِ اندوہ سے سوزش بدوش

ام الشہاب زینب

شعلۂ شمع فروزاں سے نہیں آتی تپش
گرمیٔ شوقِ شہادت ہے کہ گھبراتا ہے تو

وحید النساء وحید

صد سوزشِ جراحت و صد سوزشِ فراق
دل ہے اک اضطراب کی دنیا لئے ہوئے
امید چارہ سازیٔ بیمار الوداع
خود ہے جگر میں درد مسیحا لئے ہوئے

طرزِ ادا اور خیالات پر جو غالب کا اثر پڑا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

طاہرہ خاتون شبنم	غالب
قیدِ حیات میں تو کرتا ہے فکرِ راحت	قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
دیوانے ہنس پڑیں گے سنکر خیال تیرا	موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ح بیگم اختر صدیقی سندیلوی	غالب
آپ اپنے پہ رشک آتا ہے	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
کہ تمنائے یار کرتے ہیں	میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ظریفہ

منظور نہیں مجھکو تنک ظرفی منصور
دنیا پہ عیاں حالِ دل زار نہ کرتے

غالب

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں

عزیز جہاں آدا بدایونی

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کیے ہوئے
زمانہ ہوگیا ہے اُن کو میہماں کیے ہوئے

غالب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

خالدہ بیگم خالدہ جبلپور

زندگی میری کہیں حرفِ مکرر تو نہیں
برق کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہی نشیمن میرا

غالب

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

۴ - عصرِ جدید کے علمبرداروں نے جنسی محبت کے تصور سے بلند ہوکر شاعری میں "پیغام" اور "اصلاح" کی بنیاد ڈالی تھی اور اس تحریک کا مکمل ترین اظہار اقبال رح کی ہستی میں ہوا - اقبال رح نے قومی، ملی اور اخلاقی شاعری کو اپنا موضوع خاص بنا لیا تھا اور اس میں وہ آپ ہی مجتہد اور آپ ہی مختتم تھا - اقبال رح کا اثر عصرِ حاضر پر اس قدر زیادہ پڑا ہے کہ ابھی اس کو صحیح طور پر محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا اور یہ اثر صرف شعراء پر ہی نہیں شاعرات پر بھی ہوا ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آج ہم خواتین کی زبان سے بھی قومی ملی اور مذہبی بیداری کے نغمے سن رہے ہیں - شاعرات حاضرہ میں اقبال رح کے رنگ کی کامیاب ترین مثال محترمہ زیب عثمانیہ کا کلام ہے -

(الف) تلقینِ عمل } م۔ج۔ اختر گورکھپوری

قسم ہے ذوقِ عمل کی تجھکو قدم بڑھا اضطرابِ ہستی
خلش طلب کی نہیں ہے جس میں وہ خاک پائیگا زندگی کو

نوشابہ خاتون قریشی

ہے سکونِ موت سے بدتر سکونِ انجماد — سعیٔ و حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی
تا بکے سامانِ نکہت ہستیٔ بیکار ہو — رزم گاہِ دہر میں آمادۂ پیکار ہو

زیب عثمانیہ

وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام — جس کے قوا ہیں محرومِ آرام
تو سادہ رہرو ہیں سادہ رہرو — فتنوں سے پُر ہے منزل کا ہر گام
رہِ حیات میں مڑ مڑ کے نقشِ پا کو نہ دیکھ — مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر

جہاں بانو بیگم حیدرآبادی

لن ترانی کی صدا باقی ہے کوہِ طور سے — یاں تنازع للبقا کا جاوداں دستور ہے
اے کہ سن گر آرزوئے منزلِ مقصود ہے — حرکتِ لا انتہا ہی رازِ ہست و بود ہے

سیدہ بیگم حبیب اللہ خانصاحب

خراب حالت ہوئی یہاں تک تغافلِ بے محل کہاں تک
کہ شاہراہِ عمل پہ دنیا قدم برابر بڑھا رہی ہے

آمنہ خاتون عفت

اگر یہ پائے ہمت جانبِ منزل رواں ہوگا — تو ہر خارِ بیاباں رشکِ گلہائے جناں ہوگا

(ب) تعلیم خودی } سیدہ سردار اختر۔

خود کو بھی ہشیار کر مجھ کو بھی ہشیار دیکھ
اشہدان لاالہ ہے میری تعبیر خواب

ام الشہاب زیب عثمانیہ

اپنی خودی کو پوج اے برہمن
کمتر ہیں اس سے تیرے سب اصنام

غنچے کی جیب رنگیں نقد خودی سے خالی
ضعف خودی کی شاہد سبزے کی پائمالی

تاریخ امتوں کی اس بات پر ہے شاہد
ہر کم مذاق ملت ہے جلد مٹنے والی

اے بحر کچھ سمجھ کر قطرہ کی کر اہانت
ہے راز دار تیری دنیائے بیکراں کا

حجلہ عجز سے نکل پردہ بنہ گی اٹھا
وقت کا اقتضا ہے زیب خود کو آشکار کر

عزیز جہاں بیگم ادا۔ بدایونی۔

رخ گردش دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود
ناداں گلہ گردش ایام کہاں تک

اے ذرہ ناچیز خجل مہر کو کر دے
افتادہ تقیدہ گمنام کہاں تک

(ج) مغربیت سے بیزاری }

سیدہ سردار اختر

کتنی اداؤں کیسا تھ آج ہے محو خرام
گردن اخلاق پر خنجر تہذیب حال

جلوہ افرنگ کی آہ بیا فسوں گری
کل کہ جو شے تھی حرام آج وہ شے ہے حلال

پی کے مئے مغربی ہو نہ بہت جوش میں
ہوش میں آ ہوش میں تیرا نہیں یہ کمال

چشم بصیرت میری دیکھ چکی آہ آہ
موت سے پہلے ترا سانحہ ارتحال

سیدہ عذرا جمال

بت افرنگ سے ہو تو نہ اگر رشتہ بہ پا　　اب بھی ہے زندہ و پائندہ ترا ربِ ودود

نوشابہ خاتون قریشی

کلیجے مسلم کے جل چکے ہیں گلوں پہ خنجر بھی چل چکے ہیں
کہ اہلِ یورپ ستم سے اپنے ہماری طاقت کچل چکے ہیں
وہ شورِ ظلم و غضب کا اٹھا ہوئی قیامت زمیں پہ برپا
کہ خونخوارانِ فتنہ افزا بگڑ چکے ہیں مچل چکے ہیں

(۵) قومی و ملّی نغمے　}　زیب عثمانیہ:-

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری　　کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری
زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں　　بچائیگی تجھے کیا کفر کی آئینہ دیواری
مجھے اے زیب پہروں خون کے آنسو رلاتی ہے　　مری ملت کی کم کوشی مری ملت کی ناداری

ثروت جمیل صاحبہ ثروت　مظفر نگری

ہوش میں کاش پھر آجائے مسلمان کا لہو　　توڑ دیں بندِ غلامی ترے آزاد غلام
ماہ و انجم کو گلے اُٹھ کے ملادیں باہم　　حریتِ الفت و توحید کا دیکر پیغام
تیشۂ حق سے کریں قطع حصارِ باطل　　ظلمتِ دہر میں ہو روشنیٔ شمع کلام

قلب پر تمغۂ ایمان لگا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

سیدہ بیگم سیدہ

مخدّراتِ گروہِ مسلم، ہماری حالت ہی کیا رہی ہے
یہ غفلت بے پناہ توبہ کہ قومِ مسلم پہ چھا رہی ہے
وہ عزم باقی نہ رزم باقی نہ شوکت و شانِ بزم باقی
ہماری ہر چیز مٹ چکی ہے کہ ہمکو قسمت مٹا رہی ہے

بیگم نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب

خدا کے واسطے اے مسلمِ خوابیدہ اُٹھ تو بھی
ترا یہ خوابِ غفلت ایک دن خوابِ گراں ہوگا
مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساسِ خودداری
نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اے خواہراں ہوگا
اگر ہو جائے تیرے دل میں پیدا جذبۂ خدمت
تو اے خاتونِ مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا
کہ تیری گود میں پلتی ہے قومِ مسلمِ عالی
توجہ سے تیری ہر فرد فردِ رشتگاں ہوگا

بلقیس جمال

آ سکوتِ شام میں پھر نالۂ پیہم کریں
آلبِ خاموش کو پھر واقفِ ماتم کریں
آ دلِ کاشمعِ محفل کو بنا دیں رازِ دار
گرمکِ سوزاں کو سوزِ زیست کا محرم کریں
کھینچ لیں سینہ سے پھر پوشیدہ نوکیں تیر کی
زخمہائے چاکِ دل شرمندۂ مرہم کریں
آ سرِ گلشن ہیں زخمِ غنچہ محتاجِ رفو
بلبلوں میں پھر بپا ہنگامۂ ماتم کریں

نیم وا کلیوں کو زنگ نے زندگی سے رنگ دیں　　بڑھ گیا ہے خفتہ کو بیدار خواب غم کریں

اک شعاع نور چمکا ہیں جبینِ ماہ پر
ثبت کردیں ایک آنسو آستینِ ماہ پر

(۳) اُمید کی جھلک

جہاں بانو بیگم صاحبہ حیدرآبادی

سو نہ لے چونک غفلت سے سحر ہونیکو ہے　　پھر ہم آغوش تجلی برگ و بر ہونیکو ہے
قافلہ کا کوچ پھر اے بیخبر ہونیکو ہے　　تو پڑا سوتا ہے کیوں کیا دربدر ہونیکو ہے

سیدہ عذرا جمال

ہو نہ مایوس غلامی کے اگر دام میں ہے　　زندگانی کا مزا کوشش ناکام میں ہے

آمنہ خاتون عفت

قدم پہلا سنبھل کر تم نے گر عفت بڑھایا ہے
تو پھر نزدیک منزل جلد تر یہ کارواں ہوگا

سیدہ بیگم حبیب اللہ عفا لقصا حب

خدا یہ دن بھی گزارد یگا وہ سیدہ پھر قرار دیگا
ہماری حالت سنوار دیگا کہ کس کی بگڑی سدا رہی ہے

خورشید اقبال جیا

تو رنج نہ کر مغموم نہ ہو امیدیں مجھ سے کہتی ہیں ؛
اس یاس کے ریگستاں پر سے تسکین کی نہریں بہتی ہیں

(س) حب وطن

بلقیس جمال

آ وطن کی خاک کے ذرّے بتا دیں آفتاب — آ چمن کی ہر کلی سے اک چمن پیدا کریں

سیدہ عذرا جمال :-

اٹھ کہ پھر تیرا وطن گردش ایام میں ہے — تلخئ زہر تیرے بادہ گلفام میں ہے

سیدہ سردار اختر

نشاط کیف غلامی سے بے نیاز کرے — مرے وطن کو خدا حریت نواز کرے

۵ جوش اپنے خاص طرز کا مالک ہے دور جدید میں جوش سے بہتر محاکات کی مثالیں کسی نے پیش نہیں کیں۔ جہاں جوش کاوش اور آورد سے کام نہیں لیتا وہاں اس کے یہاں روح شاعری موجود ہے۔ جوانی کے جذبات کے مختلف پہلوؤں کو جس طرح جوش نے نمایاں کیا ہے وہ بھی کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ جوش کا اثر نوجوان قلب و دماغ پر بہت پڑا ہے اور اس میں ہماری شاعرات بھی شامل ہیں۔ یہ امر بہت امید افزا ہے کہ ہماری شاعرات نے اس وقت تک اپنے کلام کو اس برہنگی سے محفوظ رکھا ہے جو جوش کے نغموں کا خاصّہ ہے ساتھ ہی ساتھ ابھی انھوں نے خدا اور مذہب سے وہ بغاوت بھی نہیں سیکھی جو جوش اور متبعین جوش کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر ہماری شاعرات نے جوش کے معائب سے بچ کر صرف اس کے آرٹ کی تقلید کی تو وہ ایک پختہ ادب کے قابلِ تقلید

نمونے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گی ۔ جوش کے رنگ کی کامیاب مثالیں محترمہ شمیم ملیح آبادی کے کلام میں ملتی ہیں جو خود جوش کی بھانجی ہیں ۔
واقعات نگاری اور فطرت کی منظر کشی کی مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

صفیہ شمیم ملیح آبادی ۔

بزم قدرت پہ کیف طاری ہے ۔۔۔ چاند کا فیضِ عام جاری ہے
سارا عالم رہینِ عشرت ہے ۔۔۔ نور ہے مستیاں ہیں نکہت ہے
جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں ۔۔۔ چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں
بے خبر فکر سے ہے روحِ حزیں ۔۔۔ سانس ہر ایک ہے نشاط آگیں
یہ فضائیں گلوں کی یہ بُو باس ۔۔۔ اب بھی لیکن شمیم دل ہے اُداس

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار ۔۔۔ خاک پر بیٹھی ہوئی ہے دلفگار
چیتھڑوں سے جسمِ لاغر ہے ڈھکا ۔۔۔ کائناتِ دل میں ہے محشر بپا
آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار ۔۔۔ گیسوئے خمدار پر گرد و غبار
قلب میں اُلجھن پریشان و حزیں ۔۔۔ ایک کرتا زیبِ تن نیم آستیں
ایک کہنہ اوڑھنی اوڑھے ہوئے ۔۔۔ جسکے آنچل جا بجا اُدھڑے ہوئے
اندرونی دُکھ کی سچی داستاں ۔۔۔ کر رہی ہے اسکی چشمِ خوں فشاں
بیکسی بیچارگی کا سحر فزا ۔۔۔ دستِ نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات ، یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

بلقیس جمال

سرخ لبوں میں بادۂ شیریں — آنکھیں رنگیں، عارض سیمیں
ناز بداماں محشر آگیں — دامن رنگیں، پلّو زرّیں
آنکھوں میں اک جامِ تبسّم — پتلی میں آرامِ تبسّم
ابرو میں اک دامِ تبسّم — زلفوں میں اک شامِ تبسّم
ہونٹوں میں پیغامِ تبسّم — سرتاپا الہامِ تبسّم

میمونہ خاتون غزالہ

ہونٹوں پہ ہے تبسّم آنکھیں جھکی ہوئی ہیں — معصوم حسن بیخود انگڑائی لے رہا ہے
ہاتھوں میں چوڑیوں کی رنگیں لہریاں ہیں — اک نیم باز غنچہ کانوں میں ہنس رہا ہے
مژگاں میں مست بجلی رقصاں ہے یا ستمگر — کالی گھٹا میں کوئی انگڑائی لے رہا ہے
گیسو سے نرم جھونکے کچھ چھیڑ کر رہے ہیں — ان پیاری انکھڑیوں میں ساغر چھلک رہا ہے
بجلی تڑپ رہی ہے ہر ہر نظر میں قاتل — ہر اک ادا میں ظالم شعلہ بھڑک رہا ہے

معصومیت کی پتلی دیوی نزاکتوں کی
تیری ادائے سادہ جنت نہیں تو کیا ہے

خورشید آرا بیگم خورشید

شفق سے رنگیں اُفق ہوئی ہے جہاں پہ نشہ سا چھا رہا ہے
صبا میں ہمدوش تیرگی ہیں کہیں کہیں جلوہ زا ہیں اختر
ہیں مائل آشیاں عنادل ہیں اہلِ عالم سکون خواہاں
کنار رحمت میں سوئے رحمت پئے سکون شورشیں ہیں مضطر

جمالیات و تجلّی سمٹ گئیں، فضا ہے لیکن کنارِ چشمہ
خموش بیٹھی ہے اک دوشیزہ جمال و رنگ شباب پیکر
ہیں گیسوئے عنبریں پریشاں، نگاہ یکسو لگی ہوئی ہے
ہیں بے نیاز نظارہ آنکھیں ہیں خشک لب زرد رُوئے اور
سکوت کا بُت ہے یا الٰہی شبیہ مایوسی، الم ہے
ہوئی ہے یا محویت مجسّم، یا بیخودی کا جمیل پیکر
نگاہیں ساکن، زبان ساکت ہے دل میں جذبات کا تلاطم
مثالِ سیماب ہر رگِ جاں، جگر میں غم کے لگے ہیں نشتر

عارفہ بیگم انجم :-

یہ کشمیر کا گلستاں، اللہ اللہ — بہاریں فرشتوں کو للچا رہی ہیں
جدھر دیکھئے صورتیں پیاری پیاری — حسینانِ جنّت کو شرما رہی ہیں
یہ معلوم ہوتا ہے دوشیزہ پریاں — خراماں خراماں چلی آ رہی ہیں
نہ دیکھو ہٹا لو نظر اُن کے رُخ سے — حیادار آنکھیں جھکی جا رہی ہیں
یہ پُر کیف منظر ہے کیا روح پرور — نگاہیں نگاہوں کو شرما رہی ہیں
یہ گردش میں ہیں اُن کی مستانہ آنکھیں — کہ گلزار میں جام چھلکا رہی ہیں

کنیز میمونہ

بھوک کی شدت سے ہے چہرہ بدحال — فرطِ غم سے آرزوئیں پائمال
چشم سے لبریز پیمانے عیاں — آنسوؤں سے غم کے افسانے عیاں
ہائے یہ اٹھتی جوانی کا جمال — یہ جبینہ اور روٹی کا سوال

زرد مٹی کی ہے عارض پر نقاب | جس طرح بادل کی تہہ میں ماہتاب
حسرت وارمان منھ پھیرے ہوئے | حادثات زندگی گھیرے ہوئے
زندگی گرداب میں آئی ہوئی | آبرو کی ناؤ چکرائی ہوئی
آسماں کی کجروی افسوس ہے | حسن کی یہ مفلسی افسوس ہے

۶۔ اختر شیرانی اپنی رومان بھری نظموں کے لئے موجودہ عصر میں اپنا ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ اور موجودہ دور کی شاعرات اسکے رنگ سے بھی متاثر ہوئی ہیں۔ ادا۔ بدایونی۔ کنیز فاطمہ حیا۔ نجمہ تصدق ام۔ اے بی۔ ٹی وغیرہ کے یہاں رومانیت کے جو شدید نقوش ہیں وہ درحقیقت اختر ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اس رنگ کی ایک خاص خصوصیت جلنی جذبات کی بے دھڑک نمائش ہے۔ اگر اس رنگ میں نظمیں لکھتے وقت شاعرات صرف اس امر کا لحاظ رکھیں کہ جذبات کی عظمت ان کے پھوٹ پڑنے میں نہیں ان کے ضبط و تحمل میں ہے۔ تو وہ اردو میں اکثر بہترین نظموں کی تخلیق کر سکتی ہیں۔

اس دور کی شاعرات کے چند رومان پرور نغمے ملاحظہ ہوں:۔

محترمہ کنیز فاطمہ حیا

آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کرلیں | دل کے ویرانے کو معمور مسرت کرلیں
گردش چرخ کو پھر خوگر بہجت کرلیں | عمر ناشاد کو سرمایۂ عشرت کرلیں

وقت باقی ہے ابھی آؤ کہ الفت کرلیں
آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کرلیں

آؤ دیکھو کہ سراپا غم پنہاں ہوں میں
شمع کی طرح سے اک شعلۂ سوزاں ہوں میں

دل شکستہ ہوں ستم کش ہوں پریشاں ہوں میں
درد شاید ہو کہ منت کشِ درماں ہوں میں

تم جو آجاؤ تو سب دور شکایت کر لیں
آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

مرے دور رہنے کا غم نہ کر
مرے چھوٹنے کا الم نہ کر

مجھے خامۂ خوں سے رقم نہ کر
مرے دل سے اُف یہ ستم نہ کر

مرا تذکرہ بھی نہ لب پہ لا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

میں رہینِ منتِ یاس ہوں
ہوئیں مدتیں کہ اداس ہوں

غمِ آرزو کے میں پاس ہوں
میں الم کی لطف شناس ہوں

تجھے کیوں ہے ملنے کا آسرا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

تجھے چاہتا ہے دلِ حزیں
کروں لاکھ منھ سے نہیں نہیں

ہوں ترے خیال سے میں قریں
میں کہیں ہوں اور مرا دل کہیں

ہے دلِ حزیں کا یہ مدعا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

تمھیں نے کی تھی محبت کی ابتدا کہ نہیں
تمھیں نے درس غمِ دل دیا کہ نہیں

سکونِ روح کی محفل کو کر کے خود برہم
ہمارے دل کو ستایا غم کیا کہ نہیں

یہ بے نیازیاں اب کس لئے بتاؤ تو
فسانۂ غمِ الفت مرا سنا کہ نہیں

نجمہ تصدق ایم۔اے۔بی۔ٹی

چاندنی، مے، بہار، خلوت ناز
ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

غم نہ کر للّٰہ اتنا غم نہ کر میرے لئے
زندگی کیا ہے فقط ناکامیوں کا نام ہے

وہ مست مست رات، وہ یادِ بدمست رات
اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے

یہ دور کی وادی سے مجھے کس نے پکارا
اک آگ محبت کی مرے دل میں لگا دی

پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی
ہر چیز ترے مست تبسم پہ لٹا دی

پھر کر دیا مدہوش مجھے ہوش میں لا کر
پھر مست نگاہوں نے نگاہوں کو پلا دی

اس شرم جفا پر تری، قربان وفائیں
جب شکوۂ بیداد کیا آنکھ جھکا دی

پھر ہنستی ہوئی آنکھ سے دیکھا مجھے نجمہ
پھر سینۂ تاریک میں اک شمع جلا دی

عزیز جہاں آدا بدایونی

ہاں ابر سیاہ، انجم رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے

تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گذارے

آنکھوں سے ادھر اشک گہر تاب کی بارش
گردوں پہ ادھر سسکیاں لیتے ہوئے تارے

کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں گنگا کے کنارے

بھولے سے نہ وہ جنکو کبھی یاد کریں گے
جیتا ہے کوئی اب انھیں یادوں کے سہارے

میرے مہ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کیونکر شب مہتاب گذارے

سر میں پنہاں تصوّرِ موہوم
دل میں اک آرزوئے نامعلوم

ایک نالہ سا ہے بغیر آواز
ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز

روح میں انتشار سا کیا ہے
دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

کیوں یہ حالت ہے بیقراری کی
سانس لی یا کسی نے چٹکی لی

گھٹ کے روتے ہیں صدمے سہتے ہیں
کیا محبت اسی کو کہتے ہیں

نجمہ رحمت اللہ بی۔ اے

اُفق کے پار اس دلکش فضا میں
جہاں رقصاں ہیں مہر و مہ کی کرنیں

وہاں رنگینیاں قوسِ قزح کی
بناتی ہیں فضا کو ارغوانی

وہاں ہیں چاندنی، پھول اور تارے
مقدس ہیں وہاں کے سب نظارے

وہاں کرتی ہیں خوشیاں رقص ہر سو
مرے ہمدم مجھے لے چل وہیں تو

جفا و جور سب کچھ بھول جائیں
کبھی واپس نہ اس دنیا سے آئیں

شکیلہ بیگم نکہت

گلوں کو اوس سے نہلا کے جا چکی ہے بہار
مجھے تو خون کے آنسو رلا چکی ہے بہار

مری تو دنیا مٹا کر ہی جا چکی ہے بہار
فقط مجھے یہی نغمہ سُنا چکی ہے بہار

بہار بن کے تو آجا کہ جا چکی ہے بہار

صفیہ شمیم ملیح آبادی

پُر کیف ہو جب دنیائے چمن اور سر سو ہو آغاز سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں ہوں وجد میں جب گلپوش شجر
جب محوِ ترنم ہو عالم گل صحرا کو مہکاتے ہوں

جب کھیت ہواؤں کی رو سے میدانوں میں لہراتے ہوں
روشن ہو زمیں کا جب سینہ جب حسن فلک کا سونا ہو
لیلائے شب کے دامن میں اک آدھ ستارا ہوتا ہو
جب نہروں اور تالابوں میں ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم ہو موتی ہر ذرّہ خاک کی لعل و گہر
آراستہ ہو سلمائے جہاں جب نور کے دلکش زیور سے
پُرنور ہو جب تاریک فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت ہٹا کے پردوں کو تو کاش چمن میں در آئے
ہستی کا مری ذرّہ ذرّہ تصویرِ مسرت بن جائے

محترمہ صفیہ شمیم کی اس پُرکیف نظم کے بعد جوش کی یہ لاجواب رباعی ذہن میں آجاتی ہے۔

غلطاں ہے سبو میں عکس انجم ساقی	دریا میں ہے چاند سے تلاطم ساقی
اس وقت نظر ملا کے دم بھر کے لئے	میں تیرے نثار ایک تبسم ساقی

سائرہ

تری گلیوں میں مٹ کر موت کے دن کاٹ دیتی ہیں
تری گلیوں سے اُٹھے گی قیامت میں نہ سمجھی تھی
محبت تھی نشاطِ زندگانی وہ بھی کیا دن تھے

کہ آفت تم نہ سمجھے تھے مصیبت ہیں نہ سمجھی تھی

نظر ملتے ہی کچھ محجوب ہے وہ بیوفا مجھ سے
نگاہوں سے بھی ہوتی ہے شکایت ہیں نہ سمجھی تھی

ظریفہ

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے — کرتے بھی تو رسوا سر بازار نہ کرتے
ہیں آپ دکھاتی تھیں سو رنگ کے جلوے — تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے
جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر — اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے

۷۔ دورِ جدید کی شاعرات نے اخلاقی مضامین کو بھی نظم کیا ہے۔ درس و تبلیغ عموماً روح شاعری کے منافی ہوتے ہیں جبتک کہ کہنے والا رومیؒ سعدیؒ یا اقبالؒ نہ ہو اور شاعرات میں ابھی رومیؒ سعدیؒ یا اقبالؒ کی تلاش قبل از وقت ہے یہی وجہ ہے کہ شاعرات کے اس قسم کے اشعار میں شاعرانہ حسن و کیف تو موجود نہیں البتہ اخلاقیات کے زبردست جواہر ریزے ضرور ہیں۔

نجمہ تصدق ام۔ اے۔ بی۔ ٹی

حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے — زمانہ کا ہر غم اُٹھاتا چلا جا

ممتاز جہاں ناز

جورِ دنیا سے تنگ دل کیوں ہوں — ہم کو ملتا ہے اس ستم میں لطف

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی

مشکلیں غم کی خوشی سے کاٹ دے انساں ہے وہ
کچھ نہیں پہلو میں اک ہنستا ہوا دل چاہیے

شفیق بیگم ناز

حوادث سے زمانہ کے نہ گھبرانا کبھی اے ناز
خدا کے ہاتھ ہے بگڑی ہوئی قسمت بنا دینا

بیگم نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا
توکل دولتِ دارین کا طبل و نشاں ہوگا

شہزادی تیمور جہاں حجاب دہلوی۔

اعانت تو نے گر کی بے کسوں کی اور غریبوں کی
خدا کے فضل سے دونوں جہاں میں کامراں ہوگا

نہ پھول اس عیشِ دو روزہ پہ ہرگز پتلۂ خاکی
کہ اک دن کچھ نہ ہوگا تو بھی زیرِ خاک داں ہوگا

۸ - ہمارے یہاں کثرت سے ایسے مضامین ہیں جن کو الفاظ کے الٹ پھیر سے مختلف زمانوں میں شعراء باندھتے چلے آئے ہیں اس قسم کے اکثر مضامین فرسودہ ہونے کی وجہ سے بے کیف ہوگئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج گل و بلبل کے افسانوں اور ہجر و وصال کی داستانوں میں کوئی لطف باقی نہیں رہا ہے حالانکہ یہ جذبات آج بھی قلبِ انسان میں اسی طرح جلوہ افروز ہیں جیسے کہ پہلے تھے، البتہ ذی استعداد شعراء ندرت اور جدّت ادا سے کام لیکر جدید انداز اور نئے طرز سے اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ معمولی اور مستعمل مضامین میں بھی ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، اور فرسودہ مضامین فرسودہ نہیں معلوم ہوتے۔ اس

قسم کی مثالیں خواتین کے یہاں بھی موجود ہیں

سعیدہ خاتون سعیدہ عرف شوکت دُلہن

شبِ فرقت کی بیتابی سے ہیں واقف نہیں لیکن
کسی نے جیسے کانٹے رکھدیئے ہیں آج بستر میں
نہیں معلوم اس کے بعد کتنے انقلاب آئے
جنوں کے ساتھ اک صحرا بھی آیا تھا مرے گھر میں

وفا ٹونکی

جیسے دل سینہ میں ڈوبا ہی چلا جاتا ہے ... کھوئی کھوئی مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

صفیہ شمیم ملیح آبادی:-

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

عزیز جہاں ادا- بدایونی:-

تارہ سمجھ کے اک اک ذرّہ کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اسکو ڈھونڈھتی ہوں
تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان و آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں

نجمہ تصدق ام-اے-بی-ٹی

اُن کی آنکھیں دیر تک رہتی ہیں اشک کہکشاں
جب کبھی راتوں کو مجھے یاد آجاتی ہوں میں

۸۔ چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو، مسکرا دیے

دلوں سے، جہاں سے، زماں ومکاں سے
میں رسم وفا ہوں اٹھی جا رہی ہوں

۹۔ دور حاضر کی خواتین کے کلام کی ایک خصوصیت تشبیہات و استعارات کی تازگی و شگفتگی، حسن اور لطافت ہے، انسان فطرۃً تصویر سے لطف اٹھاتا ہے اور چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اسلئے اس سے طبیعت کا محظوظ ہونا ایک فطری امر ہے، یہ اثر خصوصاً اسوقت زیادہ لطیف ہوتا ہے جب تشبیہ محسوسات سے دی جائے، اس قسم کی تشبیہ بہت عمدہ خیال کی جاتی ہے اور بہت مشکل بھی ہے۔ چونکہ غیر مادّی اور غیر مرئی اشیاء کی تصویر کھینچنا بہ نسبت مادّی اور مرئی اشیاء کی تصویر کھینچنے کے مشکل ہے تشبیہات و استعارات کی چند نادر اور لطیف مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

عابدہ خاتون نسرین

ہے فسانہ ہر نگاہ میں، ہر ادا میں ہے کہانی
یہ شباب سی امنگیں یہ شراب سی جوانی

یہ عذار پوس کاکل، یہ نمایش پریشاں
کہ شراب جیسے اٹھ کر ہنسے آتش گلستاں

ممتاز جہاں ناز

اتنا سکوں نہیں کہ کروں ترکِ مدّعا
نیرنگیٔ فلک سے تمھاری نظر مجھے

عزیز جہاں ادا بدایونی :-

جبینِ غنچہ پہ شبنم نہیں ہے
عرق آلود روئے ناز نہیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں
جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں

شبِ سیاہ میں روشن ہے شمع جگنو کی
دیا غریب کا جس طرح ٹمٹمایا ہوا
ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے پنکھڑی گل کی
رکا ہوا سرِ مژگاں ہے قطرہ آنسو کا
فضائے ساکن و تیرہ میں جس طرح کوئی
لرز رہا ہو فلک سے گرا ہوا تارہ

صفیہ شمیم ملیح آبادی

چہرہ عرق عرق وہ ادا میں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھئے

۱۰- دورِ حاضر کی شاعرات کے کلام میں جذبات نگاری کی بعض اس قدر اعلیٰ اور بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں کہ اُردو شاعری بجا طور پر ان پر ناز کرسکتی ہے، وہ جذبات ہیں ——— زندہ مگر خوں گشتہ۔ اور اسی لئے ان میں بڑا کیف و اثر ہے :-

صفیہ شمیم ملیح آبادی :-

کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں نہ پوچھئے
دیکھا ہے جو وہ خوابِ پریشاں نہ پوچھئے

کیونکر ہوا ہے درد بھی درماں نہ پوچھئے
مشکل ہوئی ہے کس طرح آساں نہ پوچھئے

وقتِ سفر تسلّیِ پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے

مستقبلِ شمیم ہے جس سے ضیا فگن
وہ دلفریب خوابِ پریشاں نہ پوچھئے

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی

آتشِ غم بجھا رہی ہوں میں
اشک پیہم بہا رہی ہوں میں

کوئی دیکھے مرا جنونِ طلب
ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں

شاید اب عشق ہو گیا کامل
غم میں لذّت سی پا رہی ہوں میں

دیکھئے کس ستم کا ہو آغاز
پھر انھیں یاد آ رہی ہوں میں

وفا ٹونکی :-

ہر گھڑی رونے کی عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
جان لیوا تری فرقت کبھی ایسی تو نہ تھی

موت تاکی جیسے کہ اب اس سے چھڑا سکتی ہے
زندگی مجھ پہ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنی ہستی پہ خود اک بار ہوئی جاتی ہوں
خود سے بیزار طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی

التجاؤں میں اثر ہے نہ دعاؤں میں اثر
مجھ سے برگشتہ مشیت کبھی ایسی تو نہ تھی

دشمنوں سے بھی سمجھنے لگوں ان کو بدتر
دوستوں سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

زندگی جیسے کہ ممکن ہی نہیں تیرے بغیر
تیرے آنے کی ضرورت کبھی ایسی تو نہ تھی

تجھ سے کچھ کہنے کا ارماں کبھی ایسا تو نہ تھا
تجھ سے کچھ سننے کی حسرت کبھی ایسی تو نہ تھی

یوں وفا سے ہوئے ناراض تم اکثر لیکن
جیسی اب ہے تمھیں نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

بلقیس جمال

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سن
داستانِ درد تاریخِ دلِ بیمار سن

تیری اُلفت مرہمِ زخمِ دلِ مجبور تھی
تیری اُلفت روح و جانِ عاشقِ رنجور تھی

تیری اُلفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی
تیری اُلفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی

تیری اُلفت کا معنی تھا ہر اک تارِ نفس
نام لیتی تھی ترا تحریکِ آوازِ نفس
اس نے دیکھی ہیں لہو آمیز راتیں ہجر کی
اس نے دیکھی ہے مرے احساس کی آشفتگی
اونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے
تیری اُلفت جاگ اٹھتی تھی کنارِ خواب سے
سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں
تیری اُلفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں
چاندنی راتوں کی کیف آگیں تجلیات میں
تیری اُلفت نور تھی غمخانۂ جذبات میں
الغرض تیری محبت تھی مرا سرِّ حیات
کائنات الفت تھی مجھکو تیری الفت کائنات

آہ اب کیونکر سناؤں عاشقی کا ماجرا
کسطرح اُلفت کہ تیری مجھسے پھر لوٹا گیا
رخصت اے صبح جمالِ آرزوئے تشنہ کام
السلام اے مرکزِ حسنِ تمنا السلام

عزیز جہاں آرا بدایونی

کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئینگے
وہ آئینگے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے

سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکونِ دل کی وسعتوں کو بیکراں کئے ہوئے
حدیثِ آہ نیم شب سناؤں گی، سناؤں گی
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کئے ہوئے
تجلیاں لئے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو بیکراں کئے ہوئے
متاعِ صبر و ہوش کو لٹاؤں ان کی راہ میں
وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کئے ہوئے
یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظارِ دلستاں کئے ہوئے

یہ کس قدر بلند پایہ شاعری کی مثالیں ہیں! یہ کیسے تڑپتے ہوئے جذبات ہیں! کس قدر شدید طور پر محسوس کئے ہوئے ذاتی شخصی جذبات! ان میں کتنی زندگی ہے، کتنی صداقت ہے، کتنا کیف ہے، کتنا اثر ہے! اگر ہماری شاعرات اس طرح کی بلند پایہ جذبات نگاری کرتی رہیں تو اُردو شاعری منفعل اور شرمندہ نظر نہ آئے گی۔

۱۱۔ ان شاعرات کے بیان میں زور اور کلام میں جوش بھی موجود ہے صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

بلقیس جمال "پروانہ"[1]

میں نغمۂ خموش ہوں پیامِ سوز و جوش ہوں
شرر کدہ بدوش ہوں نوائے خوں فروش ہوں
غمِ دوامِ عشق ہوں کہ صبح و شامِ عشق ہوں
شہیدِ نامِ عشق ہوں کہ اک پیامِ عشق ہوں

[1] جناب تلوک چند محروم نے بھی ایک نظم "پروانہ" کے عنوان سے لکھی ہے جس کے چار بند ہیں،

آفریں ننھے سے کیڑے آفریں یہ ذراسی جاں اور عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں تیرے مرنے کی ادا ہے دلنشیں
شکوۂ حسنِ تغافل کیش کیا
جان دینے کے سوا درپیش کیا

شہپرِ ذوقِ فنا پر اُڑ چلا سوزِ الفت کی ہوا پر اُڑ چلا
عشق کے اوجِ سما پر اُڑ چلا اُڑ چلا راہِ وفا پر اُڑ چلا
گھر سے نکلا جستجوئے یار میں
تاکہ گم ہو جائے کوئے یار میں

بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا اس لئے ہی بہرہ اندوزِ وفا
ظلمتِ شب تجھ کو تورِ وفا تیرا جانا طلعت افروزِ وفا
یہ ترے ننھے سے پر ننھے سے بال
ہیں سراپا دفترِ شرحِ وصال

مری حیات مشتعل ہے ایک سوز مستقل
یہی جہان آب و گل یہی ہے جاں یہی ہے دل
فزوں ہے سوزش جگر دہک رہے ہیں بال و پر
نظر اٹھا اٹھا نظر ہے شمع میری منتظر
لگی ہے آگ سر بسر
سلام عمر مختصر

پچھلے صفحہ سے

اے کہ تجھکو آرزوئے عشق ہے شاہد سرمست بوئے عشق ہے
جانتا بھی ہے جو کوئے عشق ہے مقتل عشاق کوئے عشق ہے
شمع پر پروانہ کو دیکھا نہیں
عشق بازی کھیل بچوں کا نہیں

محترمہ بلقیس جمال کی نظم جذباتی اعتبار سے جناب تلوک چند محروم کی نظم سے بہتر ہے، جمال کی نظم کے جذبات محروم کی نظم کے جذبات سے شدید تر ہیں، علاوہ ازیں محروم کی نظم میں چونکہ ایک تیسری ہستی کے جذبات کی ترجمانی کیگئی ہے ان میں وہ شدت اور اثر کی گہری کیفیت باقی نہیں رہی ہے جو جمال کی نظم میں موجود ہے۔ چونکہ جمال کی نظم میں سب کچھ پروانہ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذاتی جذبات ہیں جو شدید طریقہ پر محسوس کئے گئے ہیں اور اس نے محترمہ کی نظم کو بہت پُر اثر بنا دیا ہے۔

سیدہ سردار اختر

بصد ناز و تمکیں، بصد کج کلاہی
وہ آیا، وہ آیا وطن کا سپاہی

وطن جس کا پیارا، وطن جس کا ایماں — وطن کے مقدر کا روشن ستارا
جواں بازوؤں پر ردا پارہ پارا — جبیں سے نمایاں نگر نورِ شاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وہ تھرا اُٹھی ظلم و طاقت کی دنیا — وہ گھبرا اٹھی کبر و نخوت کی دنیا
وہ گرما اٹھی عزم و ہمت کی دنیا — وہ لہرا اٹھا پرچم بے گناہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

۱۲ — دورِ حاضر کی خواتین کے کلام میں کہیں کہیں فلسفیانہ مضامین بھی نظر آتے ہیں گو یہ ان کا عام رنگ نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مثالیں نظریۂ حیات

بلقیس جمال

کیف غم میں خاک ہے جامِ شرابِ زندگی — آبشارِ درد ہے سحرِ سرابِ زندگی
خاک اُڑتی ہے گلوں کی بلبلیں خاموش ہیں — مختصر سا ہے یہی بابِ کتابِ زندگی

خورشید آرا بیگم خورشید

زندگی تعبیرِ فطرت کا پریشاں خواب ہے — زندگی مجبوریِ انساں کی دو راہیں کراہ
زندگی ناکامیوں کی قسمت بیتاب ہے — زندگی افسردہ ارمانوں کی غم پرور نگاہ

نظریۂ حصولِ مسرت

قیصر جہاں مسولی

خارزارِ غم کو طے کرلیں تو یہ جنت ملے ۔۔۔ بے نیازِ عیش ہو جائیں تو یہ دولت ملے
ترک کردیں لذتیں ساری تو یہ لذت ملے ۔۔۔ نظرِ استغنا جو حاصل ہو تو یہ نعمت ملے

نظریۂ خود فراموشی

ممتاز جہاں ناز

عینِ عرفاں ہے خود فراموشی ۔۔۔ اپنی ہستی کے ہے علم میں لطف

نظریۂ محبت

نثار فاطمہ نثار

محبت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیر و سلاسل کی ۔۔۔ شکایت کیجیے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی

نظریۂ عبادت

ح۔ اختر گورکھپوری

میں اپنے ذوقِ خدا پرستی کو ایسے مرکز پہ لا رہی ہوں
جہاں نہ دیر و حرم کے بندے ذلیل کرتے ہوں بندگی کو

نظریۂ عظمتِ انساں

محترمہ تسنیم ملیح آبادی:۔

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لئے ۔۔۔ نغمہ سرا ہیں مرغِ خوش الحاں مرے لئے
چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے ۔۔۔ آتا ہے روز ابرِ بہاراں مرے لئے
روشن ہے میرے واسطے ضیارِ ماہتاب ۔۔۔ شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے
بخشی ہے مجھکو خالقِ یکتا نے کائنات ۔۔۔ ہیں عیش کے نشاط کے ساماں مرے لئے

اس میں اقبال کے آفاقی نغموں کا اثر کس قدر غالب ہے محترمہ کے یہ اشعار اقبال کے اس مصرعہ کی کیسی دلکش تشریح ہیں ع

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

۱۳۔ اس دَور کی شاعرات نے مرثیئے بھی لکھے ہیں، دو ایک نہایت مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں،

محترمہ کلثوم (اپنے بیٹے کی وفات پر)

بیٹھے بٹھائے مجھپہ تو بپتا سی پڑ گئی ۔۔۔ برچھی غموں کی ہائے کلیجہ میں گڑ گئی
افسوس یک بیک مری قسمت بگڑ گئی ۔۔۔ کیسی ہری بھری مری کھیتی اُجڑ گئی

دکھیاری غم کی ماری نہ روئے تو کیا کرے
کثرت سے غم کی جان نہ کھوئے تو کیا کرے

محترمہ حبا میرٹھی:۔ (علامہ راشد الخیری کی وفات پر)

ابھی بدل نہ سکا تھا مزاج دنیا کا

کئے ہوئے ہے مقیّد رواج دنیا کا
تخیلات پہ اب بھی ہے راج دنیا کا

چلے گئے تم ابھی سے ہمیں شکایت ہے
الم کدے میں تمھاری ابھی ضرورت ہے

۱۴ - دورِ حاضر کی شاعرات نے حمد، نعت و منقبت کے مضامین پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور اس قسم کی بعض عمدہ مثالیں انکے یہاں موجود ہیں

حمد

محترمہ انوار فاطمہ شمیم لکھنوی:-

اپنی نااہلی کا احساس رہا تھا نہ کریم
مجھکو جرأت یہ ہوئی تھی کہ تری حمد کروں

نعت

محترمہ آمنہ خاتون عفّت

مری روح و جاں نذر چشم کرم ہیں
خدارا نظر اک اٹھا دو محمدؐ
گناہوں سے مردہ ہوئی روحِ عفّت
شفاعت سے اپنی جِلا دو محمدؐ

بیگم عروج

تمنا خون بنکر دوڑتی پھرتی ہے رگ رگ میں
مری ہستی کی گویا روح ہے اُلفت محمدؐ کی
قسم کھا کر کہا ہے نخنؔ اقرب ہے کہنے والے نے
وہ مجھ سے دور ہے جسپر نہیں رحمت محمدؐ کی

منقبت

محترمہ انوار

اے شہزادۂ لبِ راحتِ جانِ زہراؓ　　اے جگر بندِ علیؓ فخرِ حجاز و بطحا
اے حسینؓ مدنی سرورِ یاسینِ احمدؐ　　صدفِ بحرِ کرامات کے درِ یکتا
ساقیِ کوثر و تسنیم مکینِ فردوس　　کس قدر رتبۂ عالی تجھے حق نے بخشا

محترمہ ریحان

دلِ قاتل میں لرزہ پڑ گیا تھا جب سنائی تھی
نگاہِ واپسیں میں داستانِ آخری تو نے
سرِ لاشِ پسر تیرے تبسم ہائے پنہاں پر
زمانہ محوِ گریہ ہے جو ہنسی تھی وہ ہنسی تو نے
نہ کیوں شاہا ترا مرنا سبق آموزِ عالم ہو
فنا ہو کر سکھائی ہے جہاں کو زندگی تو نے
فنا تک ہے کی سجدہ گاہِ کربلا ہو لئے
سکھا دی ایک سجدے سے جہاں کو بندگی تو نے

۱۵- اس دور کی شاعرات نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ گو یہ قطعات طویل نہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں :-

محترمہ ساجدہ بنت وانش شاہجہانپوری

دردِ دل بیش کبھی بھی رائگاں جاتی نہیں　　آہ کا ہوتا اثر ہے قلب پر وہ ہو بہو

جسطرح آذر صفت اک بت تراش ہوشیار — کاٹ کر پتھر بناتا ہے بتانِ خوبرو

محترمہ سلمیٰ لاہوری:-

یوں ہی آسان کٹ نہیں سکتی — زندگانی کا سلسلہ ہے دراز
جس کو کہتے ہیں لوگ شادی و غم — ہیں اسی راہ کے نشیب و فراز

۱۶ - شاعرات حاضرہ نے رباعیاں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ اکثر رباعیاں نہایت پُر اثر و بلند پایہ ہیں۔

شاہزادی تیمور جہاں۔ حجاب دہلوی (آپ تیموریہ نسل سے تعلق رکھتی ہیں)

عبرت کدہ دہر کے والی ہم ہیں — افسوس کہ وقت پائمالی ہم ہیں
تیمور کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے — اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

محترمہ عابدہ خانم نسرین

دل سرد ہے جا بادۂ عنابی لا — سونے کیلئے حسین مہتابی لا
دس بجنے کو آئے ہیں نیند کا نام نہیں — اے اول شب لباس شب خوابی لا

مستقبل پر ایک نظر:- خواتین کی اردو شاعری کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کے پیش نظر ہے انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اگر ایک طرف ان کے یہاں روایتی شاعری ملتی ہے تو دوسری طرف ذاتی جذبات اور قلبی واردات کی بھی کمی نہیں۔ اگر انھوں نے قدیم طرز پر اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے تو وہ جدید خیالات سے بھی پوری طرح متاثر ہوئی ہیں اگر ان میں بعض خواتین نو مشق

ہیں تو وہاں بعض ایسی کہنہ مشق شاعرات بھی ہیں جن کے کلام میں پختگی، صفائی، بلند پروازی سب کچھ موجود ہے، اور ان کو بجا طور پر اُستادی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے خواتین کا کلام ابھی بہت کچھ اصلاح طلب ہے، لیکن موجودہ ترقی کو دیکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مستقبل کے متعلق مایوس ہو جائیں۔

موجودہ دَور میں تعلیم کی ترویج و ترقی نے خواتین خصوصاً مسلم خواتین میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کر دیا ہے اور یہ ذوق بہت امید افزا ہے شاعرات کی ایک معتدبہ جماعت پیدا ہو گئی ہے اور تعلیمِ نسواں کی کوششوں کے ساتھ اس جماعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہماری عصبیت پرور ذہنیتوں نے اُردو کا گلا نہ گھونٹ دیا —— اور یوں بھی انکی پھونکوں سے یہ چراغ بجھتا نظر نہیں آتا —— تو رفتارِ زمانہ اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ یہ جماعت بہت جلد ترقی کریگی اور مستقبل قریب میں ہندوستان میں ایسی شاعرات پیدا ہو جائینگی جو صحیح معنوں میں شعر و شاعری کی علمبردار ہونگی۔ اور اردو ادب کی اس بڑی کمی کو پورا کر دیں گی جو آج بھی اس میں موجود ہے۔ گو اب پرانی شاعرانہ روش کی ترقی کا زیادہ امکان نہیں تاہم جذباتی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قومی، وطنی، محاکاتی، اور فلسفیانہ شاعری میں ابھی ترقی کی بہت گنجایش باقی ہے، اور موجودہ خواتین نے قدیم طرز تغزل کو ترک کر کے اس رنگ میں کہنا شروع بھی کر دیا ہے جو دماغی اور ذہنی

ترقی کی نہایت شاندار تمہید ہے۔

ادب کے متعلق دنیا میں دو نظریے قائم ہیں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" موجودہ دور میں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے شعر و ادب کی افادی حیثیت و ضرورت کو محسوس کرلیا ہے، ان کا مذہب "ادب برائے زندگی ہے۔ ان کے نزدیک ہر ایسا ادب مردود و نامسعود ہے جس کو زندگی اور زندگی کی گہری حقیقتوں سے تعلق نہ ہو، یہ امر بھی بہت امید افزا ہے کہ ہماری شاعرات بھی ادب کی اس افادی ضرورت کو رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگی ہیں، اور وہ دن دور نہیں جب وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں گی کہ اگر ادب کا زندگی اور زندگی کے گہرے حقائق اور ضروری مسائل سے تعلق نہیں تو وہ ادب پائندہ اور دیرپا نہیں ہو سکتا ہے، حضرت علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے

ہیں شعر کے اسرار سے واقف نہیں لیکن یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ سرافیل

لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم شاعرات کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ زمانۂ قریب میں شاعرات کی جماعت میں بہت کثیر اضافہ ہوگا، وہ صحیح راستوں کو ڈھونڈیں گی، وقت کی ضرورت کو سمجھیں گی اور اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ اپنا اور قوم کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچالیں گی بلکہ ساتھ ہی ساتھ ملک، قوم، مذہب اور زبان کی بہترین خدمات بھی انجام دے سکیں گی، کیا عجب ہے کہ اس

ہنگامہ میں کوئی سیفو[1]، کوئی خنساء[2]، کوئی قرۃ العین[3]، کوئی میرا بائی[4]
کوئی مس ایلزبتھ بیرٹ براؤننگ[5] بھی پیدا ہو جائے۔

بہر حال یہ ہوا ایک مختصر سا خاکہ دَورِ سلف اور دَورِ حاضر کی خواتین کے
شعری کارناموں کا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل کی شاعرات اپنے پیچھے زمانہ
میں کیا نقوش باقی چھوڑتی ہیں۔

موجودہ شاعرات کی ادبی مساعی ہر حیثیت سے قابلِ تحسین و آفرین ہیں،
لیکن میں مستقبل کی خواتین کو اس سے بھی زیادہ شاندار ادبی حیثیت سے
دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں عالمِ خیال میں آج بھی شاعرۂ فردا کو یہ کہتے ہوئے سُن
سکتا ہوں کہ ع طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہیں فسانہ

---

[1] سیفو (Sappho) زبردست یونانی شاعرہ جس کا شمار ہومر (Homer) کے ساتھ ہوتا ہے اس کے متعلق ناقدین کے الفاظ یہ ہیں:-

"Sappho, the greatest of women poets, the peer of the greatest poets of the other sex in the supreme power of uniting art and passion .. .." (Elis)

[2] خنساء مشہور عربی شاعرہ جو اپنے کلام کی بدولت غالباً ہمیشہ زندہ رہے گی۔

[3] قرۃ العین - ایران کی زبردست شاعرہ، مقررہ و ادیبہ

[4] میرا بائی - ہندی کی زبردست شاعرہ۔

[5] مس ایلزبتھ بیرٹ براؤننگ - Miss Elizabeth Barret (ز Browning ۔ انگلستان کے جواں مرگ شاعرِ اعظم براؤننگ (Browning) کی بیوی جو بہت مشہور اور بہت بلند پایہ شاعرہ گذری ہے۔

شاعراتِ اُردو

موجدین

شاعراتی زیب النساء "مخفی"

شاعراتِ اُردو

موجدین

مخفی

شاہزادی زیب النساء بیگم کا تخلص ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (سنہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء تا سنہ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کی سب سے پہلی اولاد تھیں۔ زیب النساء، دلرس بانو بنت شاہنواز[1] صفوی کے بطن سے شوال سنہ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں پیدا ہوئی تھیں!
ابتدائی تعلیم حافظہ مریم ام عنایت اللہ خاں[2] کے سپرد ہوئی ——
حافظہ مریم اپنے زمانہ کی نہایت قابل اور تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ انہوں نے

---

[1] شاہنواز کا اصلی نام بدیع الزماں تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں معزز عہدوں پر سرفراز ہوا اور شاہ نواز خاں کا خطاب پایا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ شاہجہاں نے سنہ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں اورنگ زیب کی شادی اسکی بیٹی دلرس بانو سے کردی۔ چار لاکھ کا مہر باندھا گیا۔ طالب آملی نے تاریخ کہی۔ ع

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

[2] عالمگیری امراء میں عنایت اللہ خاں ایک نہایت معزز عہدہ دار تھا۔

سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ شہزادی نے صرف دو سال تین ماہ[۵۱] میں قرآن شریف ختم کرلیا۔" اس کے بعد حفظ کرایا گیا جس وقت شاہزادی نے کلام مجید حفظ یاد کیا اُن کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ اورنگ زیب نے انعام میں اس فاضل معلمہ کو تیس ہزار اشرفیاں دیں[۵۲]

اس کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم شروع ہوئی اور ملّا سعید اشرف ماژندرانی[۵۳] نے جو ایک جیّد ایرانی عالم اور فارسی کے زبردست شاعر تھے اس تعلیم کی تکمیل کی۔ شاہزادی نظم و نثر میں ملّا سعید اشرف ہی سے اصلاح لیتی تھیں۔ اس لئے اکثر لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ فارسی میں جو کلام زیب النساء مخفی کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل ملّا ہی کا کلام ہے۔

ملّا اشرف غالباً ۱۰۶۹ھ ۱۶۵۹ء میں جب شاہزادی کی عمر تقریباً اکیس سال کی تھی۔ تعلیمی خدمات پر مامور ہوئے تھے اور تقریباً چودہ برس کے قریب وہ اس تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے۔ ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء میں ملّا نے وطن جانے کی اجازت چاہی اور ایک قصیدہ لکھکر

---

[۵۱] مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۹۶۰-۹۶۱

[۵۲] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۸

[۵۳] ملّا سعید اشرف ماژندرانی ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ اورنگزیب کی حکومت کے شروع زمانہ میں ایران سے آئے تھے۔ بڑے متبحر عالم اور زبردست شاعر تھے۔ عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کیلئے خود مقرر کیا تھا۔

شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست اس طرح کی گئی تھی۔

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل — در غربتم اگرچہ فزون ہست اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند — گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی ست چہ دہلی چہ اصفہاں — دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندھار

شاہزادی نے انعام و اکرام دیکر رخصت کیا اور ملّا اپنے وطن ایران کو واپس چلے گئے۔

۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۱ء میں اورنگ زیب نے شاہزادہ اکبر کو راجپوتوں کی بغاوت[۱] فرو کرنے کے لئے ایک فوج کے ہمراہ جودھپور روانہ کیا راجپوتوں کے بہکانے سے شاہزادہ خود باغی ہوگیا اور حصولِ تخت کے لالچ میں خود عالمگیر کے خلاف صف آرا ہوگیا۔ زیب النساء اور اکبر میں جو سگے بھائی

---

[۱] اس فتنہ کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ جسونت سنگھ والی مارواڑ کا ۱۶۷۸ء میں پیشاور میں انتقال ہوگیا۔ مہاراجہ کی دو رانیاں لاہور آئیں اور ان کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب نے از راہِ لطف و عنایت ان دونوں لڑکوں کو دہلی میں رکھکر خاص اپنی عاطفت و نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ راجپوت بغاوت پر تُلے بیٹھے تھے انکو ایک اچھا بہانہ مل گیا اور انھوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ بادشاہ ان دونوں لڑکوں کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی بغیر سوچے سمجھے راجپوتوں نے بغاوت کر دی۔

بہن [1] سے خط و کتابت ہوتی تھی اور وہ اس وقت بھی جاری رہی۔ یہ خطوط مشکوک نگاہوں سے دیکھے گئے اور شاہزادی پر شاہی عتاب نازل ہوا۔ چنانچہ زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند ہوگئی۔ مال و متاع ضبط ہوگیا اور شاہزادی کو قلعہ سلیم گڑھ میں رہنے کا حکم ہوا۔ مگر جلد ہی شاہزادی کی بیگناہی ثابت ہوگئی اور اورنگ زیب نے ان کا قصور معاف کر دیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کو شاہزادی سے بہت محبت تھی اور وہ ان کی

---

[1] زیب النساء کے پانچ بھائی تھے جن میں دو شہزادہ محمد اکبر اور شہزادہ محمد اعظم حقیقی اور باقی تین شہزادہ محمد سلطان، شہزادہ معظم شاہ اور شہزادہ کام بخش سوتیلے بھائی تھے۔ ان کے علاوہ زیب النساء کے چار اور بہنیں تھیں ان کے نام یہ تھے۔ زینت النساء بیگم۔ زبدۃ النساء بیگم۔ بدر النساء بیگم اور مہر النساء بیگم۔ زینت النساء بیگم کی شادی سلطان اورنگ شاہ والی ترکستان سے ہوئی تھی۔ زبدۃ النساء کا عقد دارا شکوہ کے لڑکے سپہر شکوہ سے ہوا تھا۔ لیکن عین عالم شباب میں انتقال ہوگیا۔ بدر النساء کی وفات بھی عالم شباب ہی میں ہوئی۔ مہر النساء شہزادہ مراد کے لڑکے ایزد بخش سے بیاہی گئیں۔ اس تفصیل سے مغربی مصنفین کی اس یاوہ گوئی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ سلاطین تیموریہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کی موضوعہ روایتوں سے انھیں مغل شہزادیوں کو بدنام کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

بڑی قدر و منزلت کرتے تھے جب وہ کہیں باہر سے آتیں تو شاہزادوں کو حکم تھا ان کے استقبال کیلئے بھیجا جاتا ۔ سنہ ۱۰۹۲ھ میں جب روح اللہ خاں کی والدہ حمیدہ بانو بیگم کا انتقال ہوا تو شہنشاہ نے شاہزادی زیب النساء کو رسم تعزیت ادا کرنے کیلئے بھیجا سنہ ۱۰۹۳ھ میں جب شاہزادہ کام بخش کی شادی ہوئی تو تمام رسوم شاہزادی کے محل میں ادا ہوئیں ۔ جملہ ارکان دولت شہنشاہ کے حکم سے شاہزادی کی ڈیوڑھی تک پاپیادہ گئے ۔ عالمگیر، زیب النساء کو سفر و حضر میں ساتھ رکھتے تھے کشمیر کے سفر میں بھی زیب النساء شہنشاہ کے ہمراہ تھیں البتہ جب اورنگ زیب دکن کی مہم پر گئے تو شاہزادی دہلی ہی میں مقیم رہیں ۔ اسی دوران میں ۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۱۱۳ھ مطابق سنہ ۱۷۰۱ء کو شاہزادی نے انتقال کیا ۔ وَادْخُلِی جَنَّتِی مادہ تاریخ ہے اس مادہ سے ۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں ۔ چونکہ انتقال کے وقت سال پورا ہونے میں ایک دن باقی تھا اسلئے تاریخ گو نے ایک دن بعد کی تاریخ کہہ دی ہے ؛

علامہ شبلی لکھتے ہیں :-

" عالمگیر اس زمانہ میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا یہ خبر سنکر سخت غمزدہ ہوا بے اختیارانہ آنکھوں سے آنسو نکلے اور باوجود انتہا درجہ کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لاسکا سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کیلئے زکوٰۃ و خیرات دیں

اور شہزادی کا مقبرہ تیار کرائیں "

شاہزادی کا انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر ان کی وصیت کے مطابق ان کو لاہور میں نئے کوٹ کے قریب (جو اب "نواں کوٹ" کہلاتا ہے) شاہی باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ باغ شاہزادی نے خود ہی بنوایا تھا۔ اور خوبصورتی میں شالامار کے بعد اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔

شاہزادی زیب النسا نہایت عالم و فاضل خاتون تھیں۔ عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتی تھیں۔ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:۔

" تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النسا علوم عربیہ اور فارسی زباں دانی میں کمال رکھتی تھی نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی خود صاحب تصنیف گذری ہیں

مگر علامہ شبلی فرماتے ہیں " لیکن اسکی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں"۔ مجمع النفائس میں ملا سعید اشرف مازندرانی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ زیب النسا کی ایک بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جسکا نام ارادت فہم تھا حوض میں گر پڑی۔ اسپر ملا سعید اشرف نے ایک قطعہ لکھکر شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کا وہ شعر جس میں ارادت فہم کا نام آیا ہے یہ ہے "

دوش از دست ارادت فہم خاکم در دہن
چوں بیاض سینۂ ماہی در آب افتادہ است

اس کے علاوہ تذکروں میں شاہزادی کی ایک اور تصنیف

"زیب المنشآت" کا ذکر ملتا ہے؛ "تذکرۃ الغرائب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ "ہیں نے اس کو دیکھا ہے"؛ زیب المنشآت شاہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے؛

زیب النساء بڑی علم دوست اور فضل و کمال کی بڑی قدر دان تھیں، بڑے بڑے علماء و فضلا خدمت میں حاضر رہتے تھے تصنیف و تالیف کا محکمہ قائم تھا۔ اس کیلئے شاہزادی نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جس کے متعلق مصنف مآثر عالمگیری لکھتا ہے کہ اسکی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔ خود مصنف موصوف کے الفاظ یہ ہیں :-

"درسرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بنظر ہیچ یکے در نیامدہ باشد" (ص۵۳۹)

"زیب النساء کی سرپرستی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے ایک کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں :-

"زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں اس لئے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے حکم دیا کہ اسکا فارسی ترجمہ کریں چنانچہ اسکا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھدیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے"

شاہزادی زیب النساء نہایت متشرع، عبادت گذار، زاہدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔ مزاج میں بےحد نفاست و سادگی تھی۔ حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ

"لباس عموماً سادہ اور سفید پہنتی تھی۔ غالباً تمام عمر ریشمی اور رنگین لباس زیب تن نہیں کیا۔ میا بائی[1] کا بیان ہے کہ وہ اس قدر سادگی پسند تھی کہ اس نے تمام عمر سرمہ اور مسّی استعمال نہیں کیا۔۔ تاہم وہ اپنی خواصوں اور دیگر متعلقین عورات کو اپنی پیروی پر مجبور نہ کرتی تھی بلکہ اس کے برخلاف ان کو رنگین اور ریشمین لباس پہننے کی تاکید کرتی تھی۔۔" [2]

خود زیب النساء کے نام سے جو فارسی کلام موجود ہے اس میں یہ شعر ملتا ہے ؎

دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام　　زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساء ست

شاہزادی تمام عمر ناکتخدا رہیں کسی تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شادی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہزادی دارا شکوہ کے بیٹے سے (جنکا نام غالباً سلیمان شکوہ تھا) منسوب ہوئی تھیں۔ مگر جب انھوں نے سیاسی پیچیدگیوں کا شکار ہو کر وفات پائی تو پھر شاہزادی

---

[1] میا بائی زیب النساء کی دودھ پلائی تھی۔

[2] "شہزادی زیب النساء" مصنفہ حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی ص ۲

نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تمام عمر تجرد میں اپنے علمی ذوق میں بسر کر دی۔

عالمگیر نے ملک الشعرائی کا عہدہ جو عرصے سے چلا آرہا تھا ختم کر دیا تھا [1]۔ لیکن زیب النسا کی ادب نوازی اور قدر دانی نے اسکو گویا دوبارہ قائم کیا۔ بڑے بڑے شعرا غزلیں، نظمیں اور قصیدے کہکر لاتے تھے اور انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ علامہ شبلی نے بیان کیا ہے جس سے تیموریہ بیگمات کی علم دوستی، قدر دانی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے اس واقعہ کو علامہ شبلی ہی کے الفاظ میں سنئے:-

"جہاں آرا بیگم (زیب النسا کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی ہر طرف پردہ کرا دیا گیا۔ میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم کا ہاتھی پاس سے گذرا تو بیساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا۔

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش } باغ میں برقعہ پہنکر اسلئے جاتی ہے
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش } کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آوے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپیہ دلوائے لیکن ساتھ

[1] اس عہدہ پر قدسی، طالب آملی، قدسی اور کلیم مامور رہ چکے تھے۔

ہی حکم دیا کہ شہر سے باہر نکال دیا جائے (یعنی گستاخی کیوں کی) اس واقعہ سے اندازہ سے ہوسکتا ہے کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے" ۔ ١ه

چند افسانہ پردازوں نے اور ان کی کورانہ تقلید میں کچھ ناعاقبت اندیش مصنفوں نے زیب النساء اور عاقل خاں کے جو قصے [٢] بیان کئے ہیں وہ سب ان کے من گھڑت [٣] افسانے ہیں جن کو حقیقت سے کوئی

١ه - یہ واقعہ صاحب خزانہ عامرہ نے صیدی طہرانی کے تذکرے میں بیان کیا ہے۔ غالباً علامہ شبلی نے وہیں سے لیا ہے۔

٢ه - اس طرح کے غلط قصوں کو مغربی مصنفین خصوصاً ڈاکٹر برنیر (Francois Bernier) نے بہت کچھ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے جو اس کے اکثر بیانات کی طرح بالکل بے بنیاد اور بادر ہوا ہیں۔ برنیر ایک فرانسیسی طبیب تھا جو شاہجہاں کے عہد کے آخری زمانے میں ہندوستان آیا اور عالمگیر کے ابتدائی عہد حکومت تک رہا۔ برنیر، دانشمند خاں کی ملازمت میں تھا جو ایک بڑا درباری اور نہایت عالم و فاضل شخص تھا۔ عالمگیر کے سفر کشمیر میں برنیر شہنشاہ کے ساتھ تھا۔

٣ه - یہ افسانہ اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں میں عشق تھا اور عاقل خاں چھپے چوری محل میں آیا جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ عالمگیر کو خبر ہوگئی۔ عاقل خاں ایک دیگ میں چھپ گیا۔ عالمگیر نے اس دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا (باقی اگلے صفحہ پر)

تعلق نہیں، لیکن یہاں اُن پر تبصرہ کا موقع نہیں۔ یہ بجائے خود ایک مستقل تاریخی موضوع ہے جو با تفصیل بحث کا محتاج ہے۔ اوپر جو باغ والا واقعہ پیش ہوا ہے اس سے مغل شاہزادیوں کے آداب اور کیرکٹر پر روشنی پڑ چکی ہے۔ علاوہ ازیں ایک غور طلب امر یہ بھی ہے کہ وہ اورنگزیب جس کے زہد و اتقا، اور اخلاق و مذہبیت کو آج بھی اس کا سخت سے سخت ناقد اور بڑے سے بڑا دشمن بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا وہ اس قسم کے ناشدنی واقعات کو خود حرم شاہی کے اندر برداشت کر سکتا تھا اور خود وہی اورنگ زیبؒ جس زیب النساء کی اس قدر عزت اور اس قدر قدر و وقعت کرتا ہو، کیا اس کے متعلق کچھ مفسدوں نے جو ناہنجار افسانے بیان کئے ہیں ان میں کچھ بھی حقیقت ہو سکتی ہے؟

پچھلے صفحہ سے} عاقل خاں نے دم نہ مارا اور اسی میں جلکر مر گیا مرتے وقت یہ مطلع پڑھا

بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم ❊ از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

اگر صرف اس واقعہ پر ہی بغور نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کسقدر لغو اور بے بنیاد ہے عاقل خاں لاہور کا حاکم تھا۔ زیب النساء دہلی میں رہتی تھیں، علاوہ ازیں زیب النساء کا محل گویا باورچیخانہ تھا اور وہاں ہر قسم کے برتن موجود تھے کہ عاقل خاں ایک دیگ میں چھپ گیا پھر ایک طرف اہتمام رازداری یہ تھا کہ جلکر مر گیا اور منھ سے اُف تک نہ کی اور دوسری طرف خود اورنگ زیب جیسے پر جلال اور با جبروت شہنشاہ کی موجودگی میں پردہ دری اور گستاخی کا یہ عالم تھا کہ مذکورہ بالا مطلع بآواز بلند پڑھا۔ سچ ہے کہ جھوٹ کو ثبات نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ع قصۂ گوہاں حق زما پوشیدہ اند

علامہ شبلی رقمطراز ہیں :-

" عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے اور چونکہ شاعر تھا تمام تذکروں میں اسکے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں نام و نشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا، اور جو مستند اور معتبر خیال کیجاتی ہیں حسب ذیل ہیں :-

عالمگیر نامہ - مآثر عالمگیری - مآثر الامرا - تذکرہ سرخوش، خزانۂ عامرہ سرو آزاد - ید بیضا - ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اسکی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو ۱۱۰۸ھ میں واقع ہوئی "

حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی (مصنف شہزادی زیب النسأ) کے بیان کے مطابق شاہزادی کی شاعری کی ابتداء تیرہ چودہ برس کی عمر سے عربی زبان سے ہوتی ہے - شروع میں شاہزادی نے ایک عربی قصیدہ لکھا تھا جو حمد میں تھا لیکن اس کے بعد سے عربی میں کہنا بند کر دیا اور فارسی میں کہنے لگیں جو کچھ کہتیں بہت چھپا کر ایک بیاض میں رکھتیں - جب ملا سعید اشرف ماژندرانی شاہزادی کے معلم مقرر ہوئے تو اتفاقاً ایک دن وہ بیاض ان کی نظر پڑ گئی - ملا نے اشعار کی تعریف کی اور اس دن سے خود اصلاح دینے لگے !

زیب النسا کے دیوان کے متعلق ناقدین میں بہت اختلاف رائے ہے

ایک طبقہ موجودہ دیوانِ مخفی کو ان کا دیوان تسلیم کرتا ہے[۲] دوسرا طبقہ سرے سے ان کے شاعرہ ہونے ہی سے منکر ہے[۱] ان دونوں گروہوں کے بیچ میں جو درمیانی طبقہ ہے اس میں علامہ شبلی جیسا زبردست تاریخ داں اور جید نقاد بھی شامل ہے۔ علامہ زیب النساء کے شاعرہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن موجودہ دیوانِ مخفی کو شاہزادی کا کلام تسلیم نہیں کرتے خود علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں :۔

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعر تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا "

زیب النساء[۲] کے نام سے بہ تین اردو شعر منسوب کئے جاتے ہیں جن کی تائید

---

[۱] مولوی احمد علی سندیلوی مصنف تذکرہ مخزن الغرایب زیب النساء کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔ " اما دیوان اشعار جائے بہ نظر نیامدہ۔ مگر در تذکرہ انتخابش بہ نظر آمدہ لیکن اعتبار نہ شاید سبب آں کہ اکثر شعرا از اساتذہ صاحب آں تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود "

مولانا علی آزاد صاحب تذکرہ ید بیضا شاہزادی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔ "ایں دو بیت از نام او مسموع شدہ" وہ دونوں اشعار یہ ہیں :۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد　　کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نہ شد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت　　غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نہ شد

[۲] سطورِ بالا میں شاہزادی کے جو حالات پیش کئے گئے ہیں اس میں میرا ماخذ دوسری کتابوں کے علاوہ جن کے حوالہ دیدئے گئے ہیں علامہ شبلی کا محققانہ اور پُر از معلومات مقالہ بھی رہا ہے جو علامہ نے شہزادی پر الندوہ جلد ۶ نمبر ۹ بابتہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

مشہور فرانسیسی عالم و مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی اور نواب نصیر حسین خیال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہزادی کا باقی اُردو کلام دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہوچکا ہے۔ ان اشعار کے متعلق مقدمہ میں روشنی ڈالی جاچکی ہے وہ اُردو اشعار (جو سب مطلعے ہیں) یہ ہیں :-

(۱)

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

(۲)

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

(۳)

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

شاعرات اُردو کا دہلی اسکول

شاعرات اُردو کا دہلی اسکول

بیگم: میر تقی میر کی دختر تھیں۔ شادی کے چند ہی روز بعد انتقال کیا۔ میر کو بیگم سے بہت محبت تھی اور ان کے انتقال کا ان کو بیحد صدمہ ہوا۔ میر کا یہ لاجواب شعر اسی سانحہ کی یادگار ہے

اب آیا دھیان اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

بیگم کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

برسوں خم گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا

کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا

وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اسکا
سر ہم نے تہ خنجر خونخوار تو رکھا

اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا[1]

---

[1] تذکرہ شمیم سخن اور تذکرۃ الخواتین میں بیگم کا صرف پہلا۔ دوسرا اور تیسرا شعر درج ہے۔ چوتھا شعر اور مقطع ایک قدیم تذکرے میں ملے ہیں جو شکستہ اور کرم خوردہ حالت میں کتب خانہ یادریہ گوپامئو میں دستیاب ہوا ہے یہ تذکرہ محترمہ خدیجۃ النساء کا لکھا ہوا ہے۔ اسکا نام "اذکار خواتین" ہے اور اسکا سنہ تصنیف

چلبنا بیگم :- مرزا بابر مغفور کی دختر اور جہاندار شاہ بہادر ولیعہد بادشاہ دہلی کی محل خاص تھیں - بقول صاحب تذکرہ چمن انداز مرزا سودا کی شاگرد تھیں -

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا — مدّعا تم کو یاں نہ آنا تھا
ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم گئے — کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

[بقیہ پچھلے صفحہ سے] ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء ہے - یہ چند صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں ۳۷ شاعرات کا اجمالی تذکرہ ہے، آخر میں بطور تتمہ محترمہ خدیجۃ النساء کے صاحبزادے جناب مفتی محمد حسن صاحب حسن نے اپنی والدہ ماجدہ کے مختصر حالات لکھے ہیں، محترمہ کے جد اعلیٰ العلامہ ملا وجیہ الدین مؤلف فتاوے عالمگیری مشہور و معروف بزرگ گزرے ہیں - آپ کی والدہ کے نانا قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح مسلم تھے - آپ کے والد مفتی انعام اللہ صاحب بھی صاحب تصنیف تھے آپ کے شوہر مفتی نور اللہ المتخلص آباد آگرہ میں تھانہ دار تھے ۱۸۵۷ء میں نائب کوتوال رہے - محترمہ فارسی کی تعلیمیافتہ باذوق خاتون تھیں - آپ نے لیارضہ ذیابیطس ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا -

تذکرہ "افکار خواتین" نہایت مختصر اور مجمل تذکرہ ہے - حالات دو چار جملوں سے زیادہ نہیں - زیادہ تر شاعرہ خواتین کے ایک ایک دو شعر پیش کئے گئے ہیں -

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر ‏ کیا جانیے کس ساعت بد آنکھ لگی تھی
دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے ‏ تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

تصویر[۵۱] :- صاحب گلستان بے خزاں نے ان کے دو شعر دیے ہیں حالات معلوم نہیں۔ غالباً یہ دہلی یا نواح دہلی کی رہنے والی تھیں اور میر و سودا کا زمانہ پایا تھا۔

چل ہوا کھا، نہ صبا اس دلِ دلگیر کو چھیڑ
کیا مزا پائے گی تو غنچۂ تصویر کو چھیڑ[۵۲]

---

[۵۱] صاحبِ تذکرہ چمن انداز نے لکھا ہے کہ غالباً تصویر صاحب گلستان بےخزاں کی شاگرد تھیں لیکن مصنف تذکرۃ الخواتین صاحب تذکرہ چمن انداز کا یہ قیاس نقل کرنے کے بعد اسکی مخالفت کرتے ہیں اور رقمطراز ہیں :-

"یہ قرین قیاس نہیں ہے اسلئے کہ کتاب مذکورہ بالا گلشن بےخار کے جواب میں لکھی گئی تھی اور غرض اسکی تدوین و ترتیب سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے جو گلشن بے خار میں نظیر اکبرآبادی کو ایک عامیانہ بازاری شاعر بنایا ہے اسی وجہ سے گلستان بےخزاں میں مشاہیر دہلی مثل غالب و مومن پر اعتراض کئے گئے ہیں اگر یہ شاعرہ گلستان بےخزاں کی شاگرد ہوتی تو غالباً ازراہ تفاخر اس کا ذکر کرتے۔" صہ ۳۸

[۵۲] ۔ تصویر کے اس شعر کی تمام تر بنیاد صنعت مراعاۃ النظیر پر ہے۔ ہوا کھانا، صبا، دل دلگیر، غنچہ تصویر وغیرہ سب ارتباط لفظی کی مثالیں ہیں الفاظ اس

محبت اب تلک رکھتی ہے یہ تاثیر مجنوں کی
کہ بن لیلیٰ نہیں کھنچتی کہیں تصویر مجنوں کی

بسم اللہ:- بسم اللہ بیگم نام - اور بسم اللہ تخلص تھا؛ دہلی میں پیدا ہوئیں اور وہیں قیام رہا - بچپن سے شاعری کا شوق تھا - منشی انعام اللہ خاں یقین تلمیذ مرزا جانجاناں مظہر کی شاگرد تھیں -

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے　　　کہ مضطر ہے دل گا ہے طپاں ہے
نہ کیجئے ناز حسن عارضی پر　　　نہ سمجھو یہ بہار بے خزاں ہے

جعفری:- کاملہ[1] بیگم نام اور جعفری تخلص تھا - قادری بیگم کی بڑی بہن تھیں - شاہ نصیر سے تلمذ حاصل تھا - اپنے وقت کی مشہور شاعرہ تھیں انھوں نے عالم شاہ کا زمانہ پایا تھا - شاہ نصیر کی مرغوب صنعتیں مراۃ النظیر

(پچھلے صفحے سے) پُر تکلف انداز میں اصل جذبہ دب کر رہ گیا ہے اور اسی لئے شعر بے کیف ہو گیا ہے مگر اس جذبہ کو سید انشا نے اسطرح ادا کیا ہے کہ آج بھی ان کا یہ شعر اُردو شاعری کیلئے باعث ناز ہے -

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　　تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

علاوہ ازیں جو لطافت و کیف "نکہت باد بہاری" میں ہے وہ "صبا" میں کہاں اور جو بات "اٹھکھیلیاں کرنے" میں ہے وہ "چھیڑنے" میں کہاں ؟

[1] "اذکار خواتین" میں آپ کا نام عارفہ بیگم لکھا ہے"

اور ایہام ان کے یہاں بھی موجود ہیں ؎

ساقیا مجھکو ترا ساغر پلانا یاد ہے　　کلمۂ لاتقنطو سے دل چھکانا یاد ہے

تصوّر اس صنم کا دل میں لائے جسکا جی چاہے
ہماری بات سنکر آزمائے جسکا جی چاہے
کہا منصورؒ نے سولی پہ چڑھ کے عشق بازوں سے
یہ اس کے بام کا زینہ ہے آئے جسکا جی چاہے
غرورِ حُسن پرہم سے وہ ناحق جا بجا کرتا ہے
یہ نوبت چند روزہ ہے بجائے جسکا جی چاہے
محبّت کے محل میں عاشقِ جانباز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جسکا جی چاہے

قادری :- قادری بیگم نام اور قادری تخلص تھا جعفری بیگم کی چھوٹی بہن تھیں ان کو بھی شاہ نصیر سے تلمذ حاصل تھا۔

شرطِ وفا یہ نہ تھی غیر کے گھر جائیے　　کچھ تو حیا کیجئے جی میں تو شرمائیے
ترسِ خدا چاہئے اے بُتِ ترسا تجھے　　عاشقِ رنجور کو اتنا نہ ترسائیے
ہجر میں اے قادری سخت ہے مضطر یہ دل
ایک دن اس سے ضرور ملنے کی ٹھہرائیے

حیا :۔ حیات النساء نام، چھوٹی بیگم عرف، اور حیا تخلص تھا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی دختر اور شاہ نصیر کی شاگرد تھیں۔ شعر و شاعری کی طرف بچپن سے میلان تھا۔ عمر بھر نا کتخدا رہیں۔ کافی عمر پائی تھی۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں انتقال کیا۔ دستبرد زمانہ سے صرف دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا　　آب گہر میں عکس نہاتا ہے یار کا

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آ گیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی پرائے نام سو سو کوس[۱]

بی بی :۔ اللہ بندی بنت حاجی احمد اللہ مفتی۔ آپ مفتی محمد ولی کی شریک حیات تھیں۔ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ عابدہ زاہدہ اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ مفتی علیہ الرحمۃ آپ کی یادگار تھے۔ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں انتقال کیا۔ ان کی قبر گوپامئو میں ہے۔ ایک شعر یادگار ہے[۲]

تو نے چل کر دو قدم مُردوں کو زندہ کر دیا
اب تو اعجاز مسیحا تیری ٹھوکر میں رہا

---

[۱] علامہ اقبال رح:۔ حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

[۲] تذکرہ "اذکار خواتین"

بی بی حلیمہ:- بنت محمد امان بن ابوسعید بن مفتی علیم اللہ بن مفتی عبید اللہ بن شیخ علیسٰی مفتی محدث گوپاموی۔

بی بی حلیمہ نواب ذکی الدین محمد جان بن شیخ عبدالسبحان خاں شہید کی زوجہ تھیں جو نواب والاجاہ کے خاندان سے تھے ان سے حاجی معظم الحق المخاطب بہ ذکی الدین محمد خاں صدر الصدور مدراس پیدا ہوئے۔

بی بی حلیمہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں ۲۵ رمضان ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء کو انتقال کیا۔ ایک شعر یادگار رہ گیا ہے:

پیچتا ہوں دل اگر اسے ماہ کنعاں چاہیے
چپکے کیوں بیٹھے ہو کہدو "کیوں نہیں ہاں چاہیے"

حرماں:- سیدۃ النسا نام اور حرماں تخلص تھا مولانا فضل حق منطقی خیرآبادی ثم دہلوی کی دختر تھیں۔ والد سے دینی علوم حاصل کئے تھے دنیوی علوم میں منطق بھی پڑھی تھی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء یا اس سے کچھ پہلے آپ کی شادی سید احمد حسین ابن سید تفضل حسین خیرآبادی سے ہوئی تھی۔ تذکرہ "اذکار خواتین" کی مؤلفہ محترمہ خدیجۃ النساء لکھتی ہیں "مجھ سے عمر میں بڑی ہیں۔ بہن کی شادی میں ملی تھیں" ایک شعر یادگار رہ گیا ہے:-

درد دل، درد جگر، کاوش دل کاہش جاں
اتنے آزار ہیں، اور ایک کلیجہ میرا

حیدری :- حیدری خانم نام اور حیدری تخلص تھا۔ بشارت اللہ خاں دہلوی مصاحب خاص بادشاہ دہلی کی اہلیہ تھیں۔ ستر برس کی عمر میں سنہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں انتقال ہوا۔ صرف ایک شعر یادگار ہے :-

حیدری نام ہے تیرا کیا خوب　　　جو کہ تجھ سے پھرا وہ حیدر ہے

کیفی :- کیفی تخلص تھا۔ نام معلوم نہیں۔ آپ تیموریہ خاندان کی ایک شاہزادی تھیں۔ غدر سے پہلے وفات پائی۔

کس کا منھ ہے جو کرے مدح تری مہر نبی ؛ نعت اطہر میں ہو جب شخص ذکی محض غبی[۱]
حبذا ذات تری مایۂ حاجت طلبی ؛ مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

حق تعالیٰ نے کیا آپ کو اتنا اکرام　　　تجھ سے خنداں ہیں لب غنچۂ امید انام
ہیں شجر اور حجر غرق سحاب انعام　　　نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں لقبی

فاطمہ :- اللہ داد نام اور فاطمہ تخلص تھا۔ مدرسہ زنانہ دہلی میں فارسی کی معلمہ تھیں سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء تک زندہ تھیں صرف ایک شعر یادگار رہ گیا ہے

۱؎ اس خمسہ میں قدسی کی غزل کو تضمین کیا گیا ہے اسی غزل کو نواب اختر محل اختر المتوفی سنہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء نے بھی تضمین کیا ہے مقابلہ کیلئے ملاحظہ ہو تذکرہ نواب اختر محل اختر

آپ کی مرضی ہم نے پالی ہے　　پھر یہ کیوں لیت ولعل ٹالی ہے

عصمت :۔ نام معلوم نہیں۔ غالباً یہی نام اور یہی تخلص تھا۔ دہلی کی رہنے والی تھیں ۱۲۸۹ھ میں مدرسہ تعلیم مستورات میں معلمہ تھیں صاحب علم وفضل خاتون تھیں۔

لعلِ لبِ جاں بخش ہے گویا ورقِ گل　　اور رخ پہ پسینہ ہی تراجوں عرقِ گل
یوں زمزمہ گوش اسکا لچکتا ہی ہوا سے　　شبنم سے لچک جاتا ہی جیسے ورقِ گل
لب ہوئے بند نام احمد سے　　اور مشکلکشا نے کھولدئے

یاد :۔ نام معلوم نہیں۔ یاد تخلص تھا۔ آپ خاندان تیموریہ کی ایک خاتون تھیں۔ تاریخ وفات ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء ہے۔

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا　　کہ اب یاد دنیاں سے چلنے کو ہے
سرانجام غسل وکفن کر رکھو　　تنِ زار سے جاں نکلنے کو ہے[1]

اختر[2] :۔ نواب اختر محل نام اور اختر تخلص تھا۔ آپ کا تعلق خاندان تیموریہ سے ہے ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء تک بقید حیات تھیں۔ نہایت ذہین، طبّاع

---

[1] اس قطعہ کے متعلق محترمہ خدیجۃ النساء نے اپنے تذکرہ "اذکار خواتین" میں لکھا ہے کہ یاد نے نزع کی حالت میں لکھا تھا۔

[2] نواب اختر محل اختر کی بابت مولوی عبدالباری آسی لکھتے ہیں:۔ "لفظ لفظ سے مشق کلام کا پتہ چلتا ہے"۔

اور نہایت مزاج تھیں۔ آپ کے کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی ظاہر ہوتی ہے نعت و منقبت سے زیادہ شغف تھا کبھی کبھی غزل کہتی تھیں۔ تذکرہ مرآت خیال میں انکی یہ نعت درج ہے جو فاسی کی ایک مشہور غزل پہ تضمین ہے۔

تجھ پہ قربان ہوں اے ہاشمی و مطلبی کہ ہے مشہور دو عالم تری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

وہ ترا نور ہے ماہِ فلک و مہرِ کرم تیرے جلوے سے منور ہوئے دونوں عالم
تاب یوسف کو کہاں کہ ترے دیکھے قدم من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

واہ کیا درجہ ہے کیا شان ہے اور کیا رتبہ خالقِ ارض و سما خود ہے ترا مدح سرا
انبیا کہتے ہیں سب صل علیٰ صل علیٰ نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

تو ہے نیسانِ کرم اور سحابِ اکرام بھر دیا موتیوں سے دامنِ امیدِ انام
بار آور ترے باعث سے ہی نخلِ اسلام نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

سب سے پہلے کیا پیدا ترا اللہ نے نور پردۂ ذات میں اس نور کو رکھا مستور
اور اس نور کا اظہار ہوا جب منظور ذاتِ پاکِ تو دریں ملک عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

ہے ترے نور سے پُرنور زمین و بدشت　　گلشنِ چرخ ہی تیرے سے ہی پئے گلگشت
تیرے ہی واسطے ہیں خاص یہ جنّاتِ ہشت　　شبِ معراج عروج تو ز افلاک گذشت

بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسیدی ہیچ نبی

قدسیاں آنکھیں بچھاتے ہیں ترے زیرِ قدم　　خاکِ پا تیری ہے سرمۂ چشمِ عالم
بخشیو مری تقصیر تو اے شاہِ اُمم　　نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم

زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

سختی حشر سے گھبرائیگی جب مخلوقات　　اور نہ بن آئیگی اے ابرِ کرم کوئی بھی بات
انبیا سب تجھے کہدینگے کہ ای ابرِ نجات　　ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی

ہو گئی لہو و لعب ہی میں مری عمر بسر　　یادِ خالق میں نہ مصروف ہوئی یہ دم بھر
گھستی ہوں ناصیۂ عجز کو تیرے در پر　　چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر

اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

دردِ عصیاں کے سبب سے ہے مری جان چلی　　اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح سے ہے یہی　　سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

اک[1] آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا　　لو آج ہم نے اسکا بھی جھگڑا مٹا دیا

---

[1] تذکرہ شمیم سخن اور تذکرہ اذکار خواتین میں یہ شعر بھی اختر کے نام سے پیش کیا گیا ہے اور غالبًا اول الذکر تذکرہ سے صاحب تذکرۂ آنخواتین نے بھی اسکو نقل کیا ہے۔
لکھا ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا　　ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
لیکن حیاتِ انیس میں یہ شعر میر انیس کے نام سے درج ہے۔

نقصیر یار کی نہ قصور عدو ہے کچھ
اخگر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

زہرہ :- فاطمہ نام اور زہرہ تخلص تھا۔ مفتی سلیم اللہ گوپا موی کی صاحبزادی تھیں اور مولوی محمد اسمٰعیل خیر آبادی کو منسوب ہوئی تھیں۔ فارسی خواں تھیں۔ عابدہ زاہدہ تھیں۔ مولوی صاحب نے شعر کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ آپ نے ۲۴ شوال ۱۲۹۶ھ کو انتقال کیا۔ اور قصبہ نارنول گوپا مئو میں دفن ہوئیں۔ محترمہ خدیجۃ النساء نے "اذکار خواتین" میں آپ کی بابت لکھا ہے کہ "راقمہ کی بہن ہوتی ہیں۔"

یہ بھی حاضر، وہ بھی ہے موجود اے جانِ جہاں
آپ کو کیا چاہیئے، دل چاہیئے، جاں چاہیئے؟

حجاب :- ایک کشمیری الاصل خاتون تھیں ۱۲۹۳ھ میں بمبئی میں مقیم تھیں اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ اُردو میں ان کا ایک شعر ملا ہے

کیا جانے بھلا لذتِ دیدار کو اپنی
جبتک کوئی یا دیدۂ خونبار نہ ہووے

خفی :- بادشاہ بیگم نام، یوسف والی عرف اور خفی تخلص تھا۔ محمد یوسف سادہ کار کی نواسی اور چھوٹی بیگم کی لڑکی تھیں۔ چھوٹی بیگم کی شادی ایک انگریز بلاک نامی سے ہوئی تھی۔ اس سے خفی پیدا ہوئی۔ خفی کی شادی بھی کسی انگریز سے ہوئی تھی جسکا نام معلوم نہیں۔ مگر یہ شادی خوشگوار اور کامیاب

نہ ہوسکی۔ صاحب تذکرہ چمن انداز نے لکھا ہے کہ خفی انگریزی فارسی اردو تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھی۔ بہت خوشنویس تھی اور شاعری میں اکثر لوگوں کو اصلاح بھی دیتی تھی۔ تذکرہ چمن انداز کی تصنیف کے وقت یہ شاعرہ زندہ تھی۔ اس سے صاحب تذکرۃ الخواتین نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء میں زندہ تھی۔

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بیوفائی کرتے ہیں
اے خفی اپنے اشک بے تاثیر مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

خاکساری:۔ دہلی کی ایک عفت مآب پردہ نشین خاتون تھیں۔ تذکرۃ الخواتین میں لکھا ہے کہ ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء تک حیات تھیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں

مصیبتوں میں کوئی کام آ نہیں سکتا کہ اپنے درد کو دل بھی بٹا نہیں سکتا
لکھا نصیب کا کوئی مٹا نہیں سکتا کسی کے درد کو ہمدم بٹا نہیں سکتا

خانم:۔ یہ دہلی کی ایک عفیفہ تھیں۔ نام معلوم نہیں۔ خانم تخلص تھا ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء تک حیات تھیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔

مجھکو کدورتوں سے ملاتے ہو خاک میں کہہ دیجئے جو آپکے دل میں غبار ہو

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوار ہو

اشک:۔ آپ کا نام معلوم نہیں، اشک تخلص تھا۔ آپ کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے تھا۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) تک زندہ تھیں۔ تذکرہ چمن انداز اور تذکرہ مرآت خیالی میں آپ کے دو شعر ملتے ہیں جو آپ کی یادگار ہیں۔

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے تجھے تو اوبت کافر فقط ترسانا آتا ہے
کسی عاشق کا بیتاب استخواں ہے میں نہ مانونگا کہ شانہ تیرے رخ تک اتنا بیباکانہ آتا ہے

امراؤ:۔ آپ کا نام حسینی بیگم اور تخلص امراؤ تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی میں رہتی تھیں۔ بہادر شاہ کی غزل پر غزل کہی تھی جس کے اب صرف دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں۔

باغ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے پہلے ہی سبزہ بیگانہ بنایا ہوتا
گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری تو مجھے ساکن ویرانہ بنایا ہوتا

سومی:۔ آپ کا تعلق خاندان تیموریہ سے تھا قبل از غدر شباب کا عالم تھا۔ صاحب تذکرہ جمیل کا بیان ہے کہ غدر کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہیں

شور ہے اسکی بے وفائی کا بس نہیں چلتا کچھ رسائی کا
دام زلف سیہ ایسے توبہ نہ بنا ڈھب کوئی رسائی کا

ناز: ۔ عالم آرا نام اور ناز تخلص تھا۔ خاندانِ تیموریہ کی ایک شاہزادی تھیں۔ غدر کے بہت عرصہ بعد تک زندہ رہیں۔ عالم شباب میں شعر و شاعری سے شوق تھا۔ یہ اشعار جب ہی کی یادگار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کے غدر کے زمانہ میں ناز کا عالم شباب تھا۔

مجھ سے روٹھا وہ یار جانی ہے ۔۔۔ جان جانے کی یہ نشانی ہے

ہے اگر شوق بادشاہی کا ۔۔۔ ناز کر غلامی علیؑ کی تو اسے

ثریا: ۔ نام بڑی بیگم[1] اور تخلص ثریا تھا۔ آپ مرزا علیخاں کی اہلیہ تھیں۔ جو شاہ دہلی کے وظیفہ خواروں میں سے تھے ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں مرزا علیخاں کا انتقال ہو گیا اور ثریا بیوہ ہو کر آگرہ چلی گئیں اور وہیں آخر تک سکونت پذیر رہیں۔

بتا دیں ہم تمھارے کاکلِ شبگوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی ہم اپنی یا اسے کالی بلا سمجھے

جسے دیکھا اٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو
تری مژگاں کو ہم سوفارِ مژگانِ قضا سمجھے

اسیر: ۔ امیر بیگم نام تھا اور اسیر تخلص تھا شاہ فخر الدین صاحب

---

[1] آپ کا نام تذکرۃ الخواتین میں نیٹری بیگم لکھا ہے مگر اذکار خواتین میں بڑی بیگم بتایا گیا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔ "ج"

قدس سرہ کی تلمیذہ تھیں۔ بیگمات چغتائیہ میں سے تھیں۔ بہت زندہ دل خوش مذاق اور بذلہ سنج خاتون تھیں۔

عشق دار و مدار ہے اپنا — بیقراری قرار ہے اپنا
خاک میں ملگئی ہوں جس پہ اسیر — اسی دل میں غبار ہے اپنا

مبارک:۔ مبارک النساء نام اور مبارک تخلص تھا۔ شاہ نجم الدین صغیر خلف شاہ نصیر کی اہلیہ تھیں۔ شاہ نصیر سے اصلاح سخن لیتی تھیں۔ دہلی وطن تھا۔ ۱۸۸۰ء (۱۲۹۶ھ) میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ گئیں اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔

مجھے کیا خوف محشر ہو مبارک دن قیامت کا
پکڑ لوں گی میں گوشہ دامنِ خاتونِ جنت رضؓ کا
عذابِ گور کی سختی الٰہی کیونکہ میں جھیلوں
تھکا ہارا ہوا آیا ہوں میں پہلی ہی منزل کا

مخفی:۔ آپ کا نام سلطان جہاں اور تخلص مخفی تھا۔ مرزا قادر بخش صابر گورگانی کی اہلیہ تھیں جو مرزا مکرم بخت بہادر ابن مرزا خورد بہادر نبیرہ مرزا معز الدین جہاں دار شاہ بہادر شاہ دہلی کے صاحبزادے تھے۔

لنڈھائی ہے کہ یہیں خفتگانِ خاک شراب — قسم خدا کی عرس کا بڑا ثواب ہوا
خدا جانے کیا بات ہے اے مخفی — کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے

نازنین:- نام و مقام کا پتہ نہیں۔ اس باب میں سب تذکرہ نویس خاموش ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر خوب کہتی تھیں۔

رک گیا دل جو مرا قابلِ افغاں ہو کر — رہ گئے بر ہمی دہر کے ساماں ہو کر
اپنے کشتہ کو تو ٹھوکر سے جلاتے جاؤ — پھر کے جاتے ہو کہاں عیسیٔ دوراں ہو کر
نازنیں جوشِ صفا یہ ہے کہ میرا کینہ — رخ سے ظاہر ہے ترے قلب میں پنہاں ہو کر

کس صاحبِ حیا کی آمد ہوئی چمن میں — نرگس نے منھ چھپایا ہے بوسے کے پیرہن میں
اس مہ وش نے رخ کو کاکل میں جب چھپایا — چوٹی کی بات سوجھی مہ چھپ گیا گہن میں
دم مسیحا نہ بھریں اپنی مسیحائی کا — گر کہیں شہرۂ جاں بخشیٔ جاناں ہو جائے

دل میں میرے ہے خیالِ زلفِ جاناں آجکل
دیکھتا ہوں روز میں خوابِ پریشاں آجکل
دل میں سودا ہے مرے زلفِ سیاہِ یار کا
خوش مجھے آتی ہے سیرِ سنبلستاں آجکل

دم بدم بسمل تڑپتا خوب جی کو کھول کر — پر ادب آموز اسے قاتل ترا دامن ہوا
جان دی جینے جو اس چشم سیہ کے عشق میں — سبزگاہ آہوان چیں مرا مدفن ہوا

احمدی:- نام احمدی بیگم اور تخلص احمدی تھا۔ سونی پت نواح دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک شریف گھرانے سے تھا صاحب تذکرۃ الخواتین

نے لکھا ہے کہ "پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ مگر چونکہ ان کے شوہر کو شاعری کی طرف میلان نہ تھا، نہ اس زمانہ میں شریف مستورات کی شاعری کچھ استحسان کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اس واسطے سنا گیا ہے کہ ان کا دیوان غائب کر دیا گیا اور اسی غم میں احمدی بیگم بیمار رہیں۔ غم کی فراوانی سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمیشہ تپ رہنے لگی۔ ہوتے ہوتے انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ دق ہوئی اور انتقال کر گئیں۔" ان کے اب صرف دو شعر موجود ہیں۔ مولوی آسی نے احمدی کو "شاعرۂ نادرہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

اسے اس خطا پر پشیماں کیا — محبت نے انساں کو انساں کیا
چمن میں بھی مجنوں نے اے احمدی — گلوں کی طرح چاک داماں کیا

راویہ:۔ نام معلوم نہیں۔ راویہ تخلص تھا۔ دہلی کی ایک غریب، مگر عفت مآب خاتون تھیں۔ دلی سیتارام کے بازار میں کوئی چھیپی رہتا تھا اسکی بیٹی تھیں۔ نہایت عمدہ شعر کہتی تھیں۔ ذیل کے تین شعر ان کی یادگار ہیں۔

ہوتی نہ محبت تو یہ آزار نہ ہوتا — دل عشق کے صدموں سے جو بیزار نہ ہوتا
دے اپنی محبت مجھے اے بار خدایا — کر دور دل زار کا آزار خدایا
الٰہی سب گنہ سے پاک کر کر — مجھے لیجا محبت کے در پر

یاس: ۔ آفتاب بیگم نام اور یاس تخلص تھا۔ فیض آباد کی رہنے والی تھیں۔ اپنے وقت کی اچھی شاعرہ تھیں۔

حال تیرے زار کا نوع دگر ہونے لگا — جاں بلب عاشق ترے اے سیمبر ہونے لگا
اک اک فرقت میں جاناں کی مرض ہم کو رہا — درد دل گر مٹ گیا، درد جگر ہونے لگا

نہ جلوہ بخش تیرا نور گر اے مصطفیٰ ہوتا — تو دنیا میں کوئی واقف نام خدا ہوتا
تصدق جاؤں میں اپنے رسول پاک کے ہر دم — مری مشکل میں جو ہے اے یاس وہ مشکل کشا ہوتا

شوخ: ۔ گنا بیگم نام تھا اور شوخ تخلص۔ آپ نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر نظام وزیر عالمگیر کی اہلیہ تھیں۔ بہت خوش مزاج حاضر جواب، اور صاحبِ ذوق خاتون تھیں۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ میر قمر الدین منت سے تلمذ حاصل تھا۔ یہ حالات مصنف گلشن بے خار اور صاحب تذکرہ چمن انداز نے بیان کئے ہیں اور یہی مستند بھی ہیں۔ شوخ کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کسی نے ان کو میر سوز کا شاگرد بتایا ہے کسی نے مرزا سودا کا۔ کسی نے لکھا ہے کہ یہ علی قلی خاں شش انگشتی کی دختر اور نظام کی اہلیہ تھیں کسی نے ان کا تخلص نام بتایا ہے اور کسی نے منظر۔

شوخ اپنے وقت کی ایک ممتاز شاعرہ تھیں بہت کہنہ مشق اور پرگو تھیں، کلام سے متانت، سنجیدگی اور ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔

شمع کی طرح کوئی رہ جانے ۔۔۔ جس کے جی کو لگی ہے سو جانے

جی تک بھی اگر چاہو تو وسواس نہیں ہے
کچھ اور جو ڈھونڈو تو میرے پاس نہیں ہے

اب خواب ہی میں وصل ترا ہووے تو ہووے
ظاہر میں تو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے

تجھ سے کرتی ہی رہی زلف کجی کیا کیجے ۔۔۔ دل مرا لیکے یہ کہتی ہی رہی کیا کیجے

یار پردہ میں ہے اور عاشق سے پابوسی ہے ۔۔۔ نقش پا تک بھی مرے درپئے جاسوسی ہے

عندلیبوں کو وہ گلزار مبارک ہووے ۔۔۔ ہم کو یہ سایۂ دیوار مبارک ہووے

رات دن جس لئے روتے ہو تو اللہ کرے ۔۔۔ ایکدن تم کو وہ دلدار مبارک ہووے

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام ۔۔۔ مجھکو باور نہیں جبتک نشانی آوے

جسطرح میرے دلکو لگی چاہ کسیکی ۔۔۔ اسطرح نہ لگیو مرے اللہ کسی کی

اس زلفِ درازی کو ظالم نہ کترے ۔۔۔ کیا فائدہ ہو عمر جو کوتاہ کسی کی

نے نامہ و پیغام زبانی نہ نشانی ۔۔۔ حالت سے کوئی کیونکہ ہو آگاہ کسی کی

آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے ۔۔۔ خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے [1]

---

[1] یہ شعر شاہزادی زیب النساء مخفی کا بتایا جاتا ہے لیکن صاحب تذکرۃ الخواتین نے شورخ کے تذکرہ میں لکھا ہے اور اس شعر کے سلسلہ میں ایک طویل لطیفہ لکھا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایکمرتبہ غازی الدین بارہ دری میں سو رہے تھے ۔ بیگم وہاں پہنچیں تو ان کی آنکھ کھل گئی اور فوراً یہ مصرعہ موزوں کرکے پڑھا ؎
"آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے" ۔ بیگم نے فی البدیہہ جواب دیا ع "خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے" ۔ مگر تذکرہ شمیم سخن میں جو اکثر صاحب تذکرۃ الخواتین کا ماخذ رہا ہے یہ شعر شورخ کے تذکرہ میں درج نہیں ہے ۔

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا　　ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے　　جلد آجا کہ جی ترستا ہے

لے اُڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے　　گل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اسے دردِ جگر موتی پروتی تھی

ترے رخ کی تجلی دیکھکر کل رات حسرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا　　جی تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

ضرورت: شرف النساء نام اور ضرورت تخلص تھا مرزا کوچک کی اہلیہ تھیں جو تیموری نسل سے تعلق رکھتے تھے نعتیہ رنگ میں زیادہ کہتی تھیں

سرسبز رہے باغ صداوین نبی کا　　مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا

یارب رہے شاداب ہمیشہ چمنِ دیں　　مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا

طلب: صاحب تذکرہ چمن انداز نے لکھا ہے کہ ایک مجہول الحال عورت کا تخلص تھا مگر صاحب ماہ درخشاں نے ان کو دہلی کی ایک

لہ علامہ اقبال رح سہ　　اڑائی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے ملکر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

پردہ نشین خاتون بتایا ہے لیکن انھوں نے تخلص طالب بتایا ہے۔

طالب کو طلب تھی جو دیدار کی   کھلی رہ گئی آنکھ بیمار کی

ماہ:۔ یہ عفیفہ دہلی کی رہنے والی تھیں۔ نام معلوم نہیں حضرت قطب الدین عرف کالے میاںؒ کی مرید تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے لکھا ہے کہ صاحب دیوان تھیں۔ اب مستزاد کا صرف ایک شعر یادگار ہے۔

ماہ کے دل میں ترا نقشِ محبت جو ہے یار۔ نہ مٹے گا وہ کبھی

باغ جنت بھی کوئی دیوے تو درکار نہیں۔ تیرے کوچہ کے سوا

قمر:۔ قمر النساء نام اور قمر تخلص تھا۔ اشرف علیخاں سرور کی اہلیہ تھیں زن و شوہر دونوں کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ شوہر کی وفات کے چند دن بعد انتقال کیا۔ تذکرۃ الخواتین میں صرف پانچ شعر ملے ہیں۔ جو کسی اور تذکرہ سے نقل کئے گئے ہیں ان اشعار سے زبان دانی، قادر الکلامی، ذوق کی سنجیدگی اور رنگ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

جسے لوگ کہتے ہیں خورشید رخشاں   شرارہ ہے اک میرے سوزِ نہاں کا

مری آہ کی کارفرمائیاں ہیں   پتہ لامکاں تک نہیں آسماں کا

ہوئی ہوں تشنۂ جامِ شراب نزع کے وقت

اٹھونگی حشر میں ساقی سبو سبو کرتی

وہاں حضرتِ دل تم کو زیست ہو جاتی   جو تم سے اطلاعِ سرِ زلف مو بمو کہتی

گوہر :- گوہر بیگم نام اور گوہر تخلص تھا۔ کابل مولد تھا جب سدوزئی اور بارک زئی قبیلے ہندوستان آئے تو یہ خاتون بھی اُن کے ہمراہ آئیں اور بقول بعض امرت سر اور بقول بعض لدھیانہ میں سکونت اختیار کی؛ فارسی، پشتو اور اُردو تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں۔ اُن کے اشعار سے زباندانی اور قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے؛ اشعار میں سادگی صفائی برجستگی اور لطافت ہے بہت حسین و جمیل تھیں اور اسکا خود انھیں بھی احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے ؎

مہوش و گلعذار ہم بھی ہیں　　ایک بُتِ نوبہار ہم بھی ہیں

بہت بذلہ سنج اور خوش مزاج خاتون تھیں۔

ستم کر، جور کر، ظلم و جفا کر　　پر اے ظالم کبھی مجھ سے ملا کر
لجا کر، شرم کھا کر، مسکرا کر[1]　　دیا بوسہ مگر کچھ منہ بنا کر

عشق کیسا بلا ہوا صاحب　　کس سے کہئے یہ ماجرا صاحب
غیر اچھا ہی ہوگا اپنے لیئے　　ہم کو کہتے ہو کیوں برا صاحب
آپ کے جاں نثار ہم بھی ہیں　　عاشق و دلفگار ہم بھی ہیں
مہوش و گلعذار ہم بھی ہیں　　اک بُتِ نوبہار ہم بھی ہیں

---

[1] اس مصرعہ کو پڑھکر میر حسن کی مثنوی کے یہ شعر یاد آجاتے ہیں

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے　　بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے　　لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے

امتحان وفا تو ہو وے گا　　تم بھی ہو اور یار ہم بھی ہیں
درد کہتا ہے مجھسے غربت ہیں　　تم نہ گھبراؤ یار ہم بھی ہیں

بس اٹھ گئی رسم دل لگی کی　　رہ گئے وہ جو بات کی ہنسی کی
ابرو کو جو تیر سے تیغ باندھا　　یہ بات تھی اک روا روی کی
چھلنی داغوں سے دل ہے گوہر　　انگیا ملی ہم کو سوزنی کی

آئیے اے جانِ عالم آئیے　　اپنے بندہ پر کرم فرمائیے
عید آئی اور گیا ماہِ صیام　　چاند سا منھ آج تو دکھلائیے
سال بھر گذرا اُمید وصل میں　　عید کا دن ہے گلے لگ جائیے
اک گھڑی بھی بیٹھنا دوبھر ہوا　　دل کو سمجھا لیں گے اچھا جائیے
وصل کی کہتا ہوں جب گوہر سے میں　　ہنس کے کہتے ہیں کہ منھ بنوائیے

فاطمہ:- نام فاطمہ تھا اور یہی تخلص تھا۔ آگرہ کی رہنے والی تھیں

---

۵ اکبر حیدری :-

عید آئی ہے کرم فرمائیے　　مژدہ چشم عنایت لائیے
انتہائے شرم بے جا ہو چکی　　آئیے پردہ سے باہر آئیے
مہر خاموشی الفت توڑئیے　　دردِ دل کہہ جائیے سن جائیے
ماحصل یہ ہے کہ دل رکھ لیجئے　　مختصر یہ ہے گلے لگ جائیے
آپ سے ہے اکبر محزوں کی عید　　آئیے قربانِ مقدم آئیے

نازک مزاج وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت :: ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائیگا

ملکہ :- انّی (Anne) نام اور ملکہ تخلّص تھا۔ شروع میں مذہب تثلیث کی پیرو تھی۔ آخر میں مسلمان ہوگئی تھی۔ مسٹر بلا کیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی لڑکی تھی۔ انگلستان مولد تھا کلکتہ میں سکونت رہی یہیں اُردو اور فارسی کی تعلیم پائی۔ مولوی عبدالغفور صاحب مؤلف تذکرہ سخن شعراء سے اصلاح سخن لیتی تھی۔

ہجر میں دل کو بیقراری ہے :: جوشِ فریاد و آہ وزاری ہے
آنکھیں پتھرا کے ہوگئی ہیں سفید :: کسی بُت کی جو انتظاری ہے
ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام :: میں نے نالہ جو کسی رات سرِ شام کیا[1]
آہ وزاری نہیں سننا تجھے ارانوں کو :: اس صنم کو ملکہ ہی نے مگر رام کیا

جمعیت :- یہ خاتون مسیحی مذہب کی پیرو تھی اور میجر آر جسٹن کی اہلیہ تھی۔ عرصہ تک آگرہ میں اقامت گزیں رہی۔ اُردو و فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھی۔ موسیقی میں بھی دخل تھا۔ اُردو۔ فارسی۔ ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتی تھی بہت ذہین اور طباع تھی۔

---

[1] قاآنی :- ہمسایہ شنید نالہ ام گفت :: قاآنی را دگر شب آمد
میرحسن :- پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ :: بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

خدا کے روبرو جانا ندامت مجھکو بھاری ہے
کوئی نیکی نہ بن آئی اسی کی شرمساری ہے

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

معشوق کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احساں
رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے

خورشید:- یہ عفیفہ دہلی کی ایک سیّد زادی تھیں اور تاکنخدا تھیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ مرثیئے خوب لکھتی تھیں۔ ان کا ایک شعر ملتا ہے مگر صاحب تذکرہ چمن انداز کو اس پر شبہ ہے۔

اے جذبۂ دل کیونکہ اجازت دوں میں تجھ کو
ہے سخت کشش تیری وہ ایسا نہ ہو ڈر جائے

رعنائی:- قدسیہ بیگم نام اور رعنائی تخلص تھا۔ دہلی کی رہنے والی تھیں صرف ایک شعر ملا ہے جو زبان کا اچھا نمونہ ہے۔

میں جانتی تھی آنکھ لگی دلکو سکھ ہوا کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

غریب:- امیر النساء نام اور غریب تخلص تھا۔ میر برکت علی کی زوجہ تھیں جو پٹنہ کے باشندے تھے۔

گر صبا دل میں جگہ اس کے نہیں کرتی تو خیر
اس قدر بھی مجھ سے اس محبوب کو برہم نہ کر

دل کو دیکھ کر وہ جلایا مثل شمع کیوں غریب
وہ ہوا پروانہ غیروں پر تو ہو کچھ غم نہ کر

لو اور وہ تو جلنے لگا میرے نام سے
دل سرد اب تو آہِ شرربار نے کیا

کھلتا نہ تا بمرگ مرا یہ معاملہ
رسوائے شہر مجھ کو دلِ زار نے کیا

عفت: نام معلوم نہیں۔ عفت تخلص تھا۔ حیدر ظہیر دہلوی کی تلمیذ تھیں سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک رسالہ میں آپ کی ایک غزل چھپی تھی اس کے چند منتخبہ اشعار یہ ہیں:

مرتا ہوں کوئی ہائے مددگار نہیں ہے
دل جس نے لیا وہ بتِ عیار نہیں ہے

بوسہ کی طلب پر نہ کہو پھیر کے منھ ہاں
انکار کی صورت ہے یہ اقرار نہیں ہے

سنتا نہیں احوال کوئی کس کو سنائیں
ہمدرد نہیں کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

ہم تجھ پہ فدا ہوتے ہیں اور ہم سے ہی کھنچنا
لازم تجھے اے خنجرِ خونخوار نہیں ہے

حیرت ہے ملا آئینہ کو بختِ سکندر
قسمت وہ ہماری ہی کہ دیدار نہیں ہے

رونے کیلئے میرے جنازے پہ اب عفت
جز یاس و الم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

ضیا: سکندر جہاں بیگم نام اور ضیا تخلص تھا۔ صاحبِ تذکرۂ ماہِ درخشاں نے ضمیمہ میں لکھا ہے کہ میر امیر علی صاحب سابق کوتوال ریاست جاورہ

کی دختر تھیں۔ نہایت پختہ مشق اور پرگو شاعرہ تھیں ان کے اشعار سے
قادر الکلامی جھلکتی ہے

جی میں تو فکر بتاں اور لب پہ ہو ذکر خدا — اے دل بیتاب تجھ سے پارسائی ہو چکی
دیکھی گئی نہ ہم سے ہنسی اس کی غیر سے — روکا گیا نہ گریۂ بے اختیار چشم
آنکھیں بھی نذر گریۂ فرقت ہوئیں ضیاؔ — ماتم تھا پہلے دل کا ہوں اب سوگوار چشم
یہ کہتے ہیں ٹھکرا کے وہ نعش عاشق — یہ فتنہ نہیں ہے جگانیکے قابل
بھلا خاکساروں سے اتنی کدورت — نہ تھے خاک میں ہم ملانیکے قابل
بجا ہے وفادار کوئی نہیں ہے — مرا عشق ہے آزمانیکے قابل
یوں جو ہم نوجوان مرتے ہیں — اُن کی یادِ شباب ہے دل میں[1]
مجنبہ گردِ دشتِ جنوں سے تنگ ہوں — جیب کچھ باقی ہے تو داماں نہیں
میری بیتابی پہ روتے ہیں عدو — دوست میرے حال پہ خنداں نہیں
اب اک قاتل سے دوستی کی ہے — موت سے ہم نے دل لگی کی ہے
کب تلک ظلم اے ستم ایجاد — انتہا بھی ستمگری کی ہے ؟
فیضِ استادِ مہرباں ہے ضیاؔ — دھوم جو تیری شاعری کی ہے
بے وفاؤں کو باوفا جانا — ہائے کمبخت دل نے کیا جانا
واہ ری نارسائیٔ قسمت — اس کے در تک نہ ہو سکا جانا
ہوا اک آفتِ جاں پہ فدا دل — نہ دے دشمن کو بھی ایسا خدا دل

---

[1] مومن:- یوں کبھی نوجوان نہ مرتا میں — تیرے عہدِ شباب نے مارا

پئے مشقِ جفا لاؤں کہاں سے　　تمھیں تو چاہیئے روز اک نیا دل

دلِ ناکام لے کر کیا کرو گے　　نہیں ہے یہ تمھارے کام کا دل

بہت کافر سوا تیرے خدا سے　　نہیں رکھتا ہے کوئی التجا دل

بتوں نے کر دیا اب غیرتِ دیر　　کبھی مشہور تھا بیتِ خدا دل

رباعی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں　　طوفاں زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں

ظالم اب اپنے در سے اٹھاتا ہے کس لئے　　کیا کم ہے یہ ستم کہ ترے دل سے دور ہوں

شاعرات اردو کا لکھنؤ اسکول

شاعرات اردو کا لکھنؤ اسکول

حرم نواب آصف الدولہ[1]

جانی :۔ نواب قمر الدین خاں کی دختر تھیں۔ آپ کا نام بیگم جان عرف ہو بیگم اور تخلص جانی تھا۔ نواب آصف الدولہ والی اودھ کی حرم تھیں،

---

[1] نواب آصف الدولہ، نواب شجاع الدولہ کے فرزند تھے۔ نواب یحییٰ خاں نام، مرزا امانی عرف اور آصف تخلص تھا۔ شعر و سخن کے بڑے قدردان اور مربی تھے۔ ان ہی کے عہد میں مرزا سودا، میر تقی میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے۔ ایک اردو دیوان ان سے یادگار رہے۔ جس میں بقول رام بابو سکسینہ "تقریباً ۳۰۰ صفحات میں غزلیں۔ ۱۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے"۔ (تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری ص ۲۹۵)

نواب آصف الدولہ کی تاریخیں یہ ہیں:۔

تاریخ پیدائش۔ سنہ ۱۷۴۸ء مطابق سنہ ۱۱۶۱ھ

تاریخ جلوس ۔ سنہ ۱۷۷۴ء مطابق سنہ ۱۱۸۸ھ

تاریخ وفات ۔ سنہ ۱۷۹۷ء مطابق سنہ ۱۲۱۱ھ

اور اپنے وقت کی اچھی شاعرہ تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے ان کو "شاعرہ گرامی" کے لقب سے یاد کیا ہے

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جانِ ناتواں کی
رگ رگ میں نیش غم ہے کہیے کہاں کہاں کی [۱]

دل جس سے لگا یا وہ ہوا دشمن جانی
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

نہیں ٹانکے مرے زخمِ جگر پہ
یہ اس کا خندۂ دنداں نما ہے

نہیں ٹلتی کسی عنوان سے سر
شب غم بھی کوئی کالی بلا ہے

دہن پر تیرے تھا ہم کو توہم
یہ عقدہ آج ہی ہم پر کھلا ہے

دلہن:۔ نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کی حرم اور نواب انتظام الدولہ کی صبیہ تھیں۔ نہایت خوش خلق، نیک طینت اور صاحبِ ذوق خاتون تھیں تذکرہ سراپا سخن کی تصنیف کے وقت فیض آباد میں مقیم تھیں۔

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا
تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں
مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

ایسے کم ظرف نہیں ہیں کہ بہکتے جائیں
گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیب فلک
خانۂ دل جو گرا ہو اسے آباد کرو

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

---

[۱] تذکرۃ الخواتین میں لکھا ہے کہ آخر وقت میں جب عالم نزع تھا ایک خواجہ سرا ہمدم نامی عیادت کے لئے آیا اور مزاج پوچھا کرت شدت تکلیف کے عالم میں یہ شعر فی البدیہہ نظم کرکے ارشاد فرمایا

[۲] بزم سخن

حرم نواب واجد علیشاہ [1]

قمر :- حیدری بیگم نام، ماہ طلعت عرف اور قمر تخلص تھا مرزا ہمایوں بخت کی دختر اور واجد علیشاہ کی حرم تھیں۔ بہت خوش گو۔ خوش فہم اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ نہایت طباع اور ذہین تھیں۔ یہ بھی واجد علیشاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ اردو اور فارسی دونوں میں دستگاہ رکھتی تھیں۔ اور دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۵ء ہے۔ کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔ خود ان کے منتخبہ اشعار یہ ہیں جو انھوں نے ایک تذکرہ کیلئے دئے تھے۔

مر کے بھی خو نہ گئی بادہ کشی کی زاہد　　حشر میں ساقیٔ کوثر کا نہ داماں چھوٹا
روز و شب کرتی ہی بلبل قفس میں فریاد　　ہائے کیا فصلِ بہاری میں گلستاں چھوٹا
لے گیا قیس پہ بھی فوق تمھارا وحشی　　مر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوٹا

دعویٰ تھا عبث یار مسیحائی کا تم کو　　اچھا نہ ہوا آہ ابھی بیمار تمھارا
داغِ سودا سر پہ ہے پاؤں میں زنجیر شعاع
ہے پریرو تیری الفت میں یہ حالِ آفتاب
گر مقابل ہو تمھارے روئے آتش رنگ کے
بدر کی صورت گھٹے ہر دم کمالِ آفتاب

---

[1] نواب واجد علی شاہ اودھ کے آخری تاجدار اور نواب امجد علیشاہ کے بیٹے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھے شروع شروع میں انتظام مملکت (بقیہ صفحہ ۱۸۶ پر)

سوزشِ داغِ دلِ بیتاب سے پایا فروغ
آ گیا ایسا بھلا کب تھا جلالِ آفتاب

عشقِ خطِ صنم کا تھا اللہ یہ گیا — بہر عذاب آتے ہیں مرقد میں مار سبز
گر آب زندگی بھی تو برسائے اے فلک — کشتِ امیدِ وصل نہ ہو زینہار سبز
اے میکشو تکلف ساقی تو دیکھنا — شیشے ہیں سرخ جام مئے خوشگوار سبز
شبنم نہیں چشمِ پُرنمِ آہو شکار کے — گلشن میں کب ہے نرگسِ بیمار سے غرض
ہوں وہ گشتہ کہ بعد مرگ ہے آغوش جتو — لوحِ مرقد کو مرے سنگِ فلاخن چاہیئے
تیرے جانباز کو بس کافی ہے شمشیرِ نگاہ — قتلِ عاشق کیلئے کیا تیغِ آہن چاہیئے

گلِ سوزاں شگفتہ ہیں یہ فیضِ اشکباری ہے
نسیمِ آہ کا جھونکا یہاں بادِ بہاری ہے
نہ پوچھ اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے درد و حسرت ہے فغاں ہے آہ و زاری ہے
گرے لٹنے ستارے کفش سے تیرے نمایاں
روشِ گلزار کی ہر ایک فرشِ زرنگاری ہے

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا — بھول کر بیٹھے ہیں پھر نہ کبھی یاد کیا

آپ کا ایک اور شعر جو "اذکارِ خواتین میں ملا ہے" یہ ہے :-

آنکھیں پتھرا کے ہو گئی ہیں سفید — کسی بت کی جو انتظاری ہے

حجاب :- نواب بیگم نام اور حجاب تخلص تھا۔ نواب اعظم علیخاں کی دختر

تھیں جو نواب معتمد الدولہ برادر غازی الدین حیدر والی اودھ کے لڑکے تھے، ان کا سنہ پیدائش ۱۲۵۹ھ ہے۔ نواب واجد علیشاہ والئی اودھ کی محل خاص تھیں اور ان کے ساتھ کلکتہ بھی گئی تھیں۔ نہایت خلیق، نیک طینت اور باذوق خاتون تھیں۔

(صفحہ ۱۸۰ سے) عدالت اور رعایا پروری کا شوق رہا۔ مگر جلد ہی خود غرض اور بدخواہ ہم نشینوں نے عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اور پھر رقص و سرود کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ رہا۔ ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو سلطنت انگلشیہ کی طرف سے انتزاع سلطنت کا حکم سنایا گیا اور اس کے بعد کلکتہ بھیجدیئے گئے جہاں دو برس تک فورٹ ولیم میں نظر بند رہے اور پھر تا وفات مٹیا برج میں قیام رہا۔ لکھنؤ سے ان کے ہمراہ انکی بہت سی محلات اور بہت سے دوسرے لوگ بھی کلکتہ گئے تھے۔

نواب واجد علیشاہ کو شعر و شاعری کا بہت ذوق تھا۔ اختر تخلص کرتے تھے اور نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ بہت کثیر التصانیف تھے۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ "انکی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی"۔ (صفحہ ۳۰۲) صرف غزلیات کے چھ دیوان ہیں۔ انکے علاوہ مراثی، مثنویات اور قصائد کے مجموعے علیحدہ ہیں۔ نواب واجد علیشاہ کی تاریخیں یہ ہیں:-

تاریخ پیدائش: ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۲ھ — تاریخ جلوس: ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ

تاریخ معزولی: ۱۸۵۶ء ” ۱۲۷۲ھ — تاریخ وفات ۱۸۸۷ء ” ۱۳۰۳ھ

بن کے تصویر حجاب اسکو سراپا دیکھو منھ سے کچھ بولو نہ آنکھوں سے تماشہ دیکھو

کہیں کیا اے حجاب آخر یہ دیکھا آنکھ سے ہم نے
کیا طوفاں بپا بحر سرشکِ چشمِ پرنم نے
اُڑا دی نیند اس کی جب فراقِ یار کے غم نے
گذاری رات ساری تارے ہی گن گن کے عالم نے
ہوا شب کو جو دھوکا اپنے اختر کا ستاروں میں[1]

صدر: ۔ نواب صدر محل نام اور صدر تخلص تھا۔ نواب واجد علیشاہ آخری تاجدار اودھ کی اہلیہ تھیں، صاحب دیوان تھیں۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے "بادشاہ نامہ" اور "نامہ اسم" کو ان کی تصنیف بتایا ہے۔ اسی تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) تک زندہ تھیں۔

جوشِ جنوں میں رات دن سب سے رہا الگ الگ
میں ہوں جدا الگ الگ، لوگ جدا الگ الگ
میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب اُدھر
منھ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پہ

---

[1] تذکرہ چمن انداز کے مصنف نے لکھا ہے کہ نواب واجد علیشاہ اختر کے دیوان میں ایک خمسہ ان کے نام سے موجود ہے جسکا نمونہ اوپر پیش کیا گیا۔

چلیو خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ

خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریضِ عشق کی
ہیں ہوں دوا سے دور دور مجھ سے دوا الگ الگ

ہجر میں خوب خاک اڑائی اپنے ہوا نہ کچھ اثر
نالے گئے الگ الگ آہ رسا الگ الگ

حسرت و آرزوئے وصل درد و مصیبتِ فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ
بابِ قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

عالم: نام معلوم نہیں۔ عالم تخلص تھا۔ نواب واجد علیشاہ والئے اودھ کی اہلیہ تھیں اور آخر میں ان کے ساتھ جا کر کلکتہ بھی رہی تھیں۔ صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ ایک مثنوی بھی یادگار چھوڑی۔ کہا جاتا ہے کہ ستار بجانے میں کافی مہارت رکھتی تھیں۔

اے باغباں چمن میں یہ کہدے پکار کے
لو بلبلو چلو کہ دن آئے بہار کے

وحشی وہ ہوں کہ قیس نے بھی بس نہ کر سکا
گنڈے بنا کے پہنے گریبان تار کے

بیقراری کیا بیاں ہو اس دلِ بیتاب کی
شور و افغاں سے ہمارے عرش تھرانے لگا

جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمھیں
قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہو سزائے دل

اجاڑے دیکھئے کس کس کے آشیانے کو　　یہی چمن میں ہے اب چار سُو فغاں صیاد
عالم وہ طلبگار تیرے ہونگے اسی دن　　جب کوئی ستم اور وہ ایجاد کریںگے
گذاری رات ساری تارے ہی گن گن کے عالم نے
ہوا شب کو چودھواں اپنے اختر کا ستاروں میں

محبوب : سلطان جہاں نام۔ محبوب محل خطاب اور محبوب تخلص تھا نواب واجد علیشاہ کی حرم تھیں۔ بہت اعلیٰ ادبی مذاق پایا تھا۔ نہایت نیک طینت اور پاک باطن خاتون تھیں۔

اٹھا سکی نہ مصیبت فراقِ یار میں روح[1]　　نکل گئی تنِ لاغر سے انتظار میں روح
نہ نکلی حسرتِ دل ایک بھی کہ موت آئی　　ہمیشہ تڑپے گی تیرے لئے مزار میں روح
جو آنا ہو تجھے مدِ نظر تو آ ظالم　　نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح
نہیں ہے گور کی تنگی سے کچھ ہمیں وحشت　　رہیگی بعدِ فنا کے بھی کوئے یار میں روح
اسی کے حکم سے ہے موت و زندگی محبوب　　حقیقتاً ہے مری دستِ کردگار میں روح

---

[1] صاحب تذکرۃ الخواتین نے نواب عشرت محل عشرت حرم واجد علیشاہ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور مثال میں صرف یہ ایک شعر دیا ہے ؎
گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی　　میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
مگر مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ شمیم سخن میں جو تذکرۃ الخواتین کا اکثر ماخذ رہا ہے یہی غلطی موجود ہے لیکن یہ شعر عشرت کا نہیں میر تقی میر کا ہے

دیگر خواتین

کنیز:۔ اس جواں مرگ کا فاطمہ بیگم نام اور کنیز تخلص تھا۔ نواب نصرت الدولہ بہادر لکھنوی کی دختر کی کنیز تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں علوم ضروریہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کر چکی تھی، نہایت شگفتہ مزاج، حاضر جواب طباع اور ذہین تھی۔ بیس برس کی عمر میں عین عنفوان شباب میں ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء میں انتقال ہوا [1]

نقاش نے اس بت کا سراپا نقش جو کھینچا — ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا [2]

وصل کی شب ہوگا کیا حال ہمیں جو نازسے — جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائیگی

ذلیل:۔ نوبہار نام ذلیل تخلص تھا۔ مرزا سلیمان شکوہ کی کنیز تھی طبیعت فحش گوئی کیطرف زیادہ مائل تھی۔

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں ہیں تم تو — ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

ہیں فرشتوں کی بھی سنتی نہیں ناصح کیا ہے

اپنی کرتوت پہ جیں دم کہ میں آجاتی ہوں

سلطان:۔ سلطان بیگم نام اور سلطان تخلص تھا۔ نواب معتمد الدولہ بہادر

---

[1] اذکار خواتین۔

[2] محترمہ خدیجۃ النساء بیگم نے اپنے تذکرہ اذکار خواتین میں لکھا ہے کہ کنیز نے یہ شعر تین برس کی عمر میں کہا تھا

لکھنوی کی دختر تھیں۔ صاحب تذکرہ چمن انداز کا خیال ہے کہ صاحب دیوان تھیں قبل غدر حیات تھیں کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی ظاہر ہے۔

ہم تو عاشق اسی کے ہو بیٹھے　　دل سے صبر و قرار کھو بیٹھے
صورت اسکی نظر نہ آئے گی　　دل ہی دل میں کڑھا کرو بیٹھے

لگا یا گل سے جو دل کو تو نے سمجھ لے دلمیں یہ اپنے بلبل
ہیں چند روزہ بہار کے دن یہ گل تو روز خزاں نہ ہوگا

کبتک یہ تیرے ہجر کے صدمے اٹھائے دل　　ڈر ہے یہی کہ جان سے اپنی نہ جائے دل
قاتل نے کب کہا تھا کہ آنکھیں لڑا دل　　آخر یہ میری جان پہ آئی بلائے دل
تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا　　ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہکے ہائے دل
سینہ اگر ہے داغوں سے معمور کیا ہوا　　خالی ہے تیرے واسطے عشرت سرائے دل

سلطاں غزل اک اور بدلکر ردیف لکھ
پر شرط ہے کہ لفظ گل آئے بجائے دل

یاسمن: چنبیلی نام اور یاسمن تخلّص تھا۔ سید انشا کی کنیز تھی اور ان ہی سے اصلاح سخن بھی لیتی تھی۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے یاسمن کی بابت لکھا ہے جو بظاہر لطیفہ معلوم ہوتا ہے "عجیب بات یہ ہے کہ صحبت مرد سے اس کو قطعی تنفر تھا۔ سید انشاء نے شاید اس بات کو صحیح خیال کیا۔ اور بہ اتباع شریعت اس کی شادی ایک نہایت معقول آدمی کے ساتھ کر دی تیسرے روز بغیر عارضہ اور مرض کے جاں بحق تسلیم ہوئی۔"

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[1]
سرمہ کھلوایا خموشی نے مجھے ـــــ　　جب وہ منظورِ نظر یاد آیا
دخترِ رز سے رات صحبت تھی　　شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا

ضیاء: ضیائی بیگم نام اور ضیاء تخلص تھا۔ حکیم انور علی صاحب لکھنوی کی اہلیہ تھیں۔ نہایت فاضل خاتون تھیں۔ صاحب تذکرہ بہارِ بے خزاں نے لکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں اور تینوں میں شعر کہتی تھیں۔ باسٹھ برس سے زیادہ عمر پائی[2]

تمہارا ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہو نازک میں ناتواں ہوں

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھکو خاک
اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

سوتے میں شب جو پیچ کھلے زلفِ یار کے
دعوے دروغ ہو گئے مشکِ تتار کے

شمشاد گرد سایۂ قامت چمن میں ہے
خورشید و مہ شعاع ہیں رخسارِ یار کے

سب بے وجہ بوئے شراب کی منہ میں نہیں ضیا

---

[1] غالب ۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
[2] "اذکارِ خواتین"

چوسے ہیں تم نے ہونٹ کسی بادہ خوار کے

میں نے پوچھا قتل مجھکو کیجئے گا کسطرح　　بولے غفلت سے کبھی کا ہے نگاہِ تیز سے

بہو بیگم :۔ نام معلوم نہیں۔ بہو بیگم خطاب تھا۔ نواب یوسف علیخاں والیٔ رامپور کی محل خاص تھیں شعر کہنے کا فطری ذوق تھا، باکمال خاتون تھیں۔ تذکرہ چمن انداز میں اُن کے یہ دو اشعار ملتے ہیں۔

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا　　آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس ترکِ قمر سے

پر خوف یہی دل میں مرے آیا کہ ہے ہے　　نازک ہے نہ دب جائے کہیں بارِ نظر سے

عابدہ :۔ نواب امراؤ بیگم نام اور عابدہ تخلص تھا۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کی دختر اور نواب محمد زین العابدین فوجدار ریاست جے پور کی اہلیہ تھیں۔ صاحب علم و فضل خاتون تھیں۔ سنا ہے کہ ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اُردو اور ایک مثنوی متعلق شکار آپ نے چھوڑے ہیں مگر آپ کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ صاحب تذکرۃ الخواتین نے "تذکرہ چمن انداز" سے دو شعر نقل کئے ہیں جس سے موصوفہ کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۸۶ھ نکلتی ہے ان میں جویا مرحوم نے ان ہی کے مصرعہ کو تضمین کیا ہے

یہ کرامت آپ کی ہے جویا کہ خود فرما دیا　　"تا قیامت رحمت خلاقِ باری قبر کو"

کشتہ ہیں ما سے لاغری ہم رنگ گندم گوں جو　　ہے شکن گندم کی بس کافی ہماری قبر کو

پارسا: ۔ آپ نواب میرزا محمد تقی خاں ہوس کی دختر تھیں۔ ہوس نواب آصف الدولہ کے قریبی عزیز تھے اور درباری مصاحبین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ صاحب تذکرہ چمن انداز کا بیان ہے کہ پارسا کی شادی تمام عمر محض اس وجہ سے نہیں کی گئی کہ ہوس کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ کوئی انکا داماد ہو۔ ان کے یہ دو شعر اب موجود ہیں۔

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا — یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا
جلتا نہیں ہے ابلق ایام ایک چال — اکثر یہ بدرکاب بنا اور بگڑ گیا

شرم ۔ شمس النساء بیگم نام اور شرم تخلص تھا۔ کلیم قمر الدین تلمیذ خواجہ وزیر کی صاحبزادی تھیں۔ بنارس مولد تھا مگر سکونت لکھنؤ میں رہی کلام میں فحاشی زیادہ ہے۔

جو تیری کاکل مشکیں کی بو صبا لائی — دماغ عرش پہ اس خاکسار کا پہنچا
مثال غنچہ تو کیوں دل گرفتہ ہے اے شرم — خوشی ہو خط ترے اب گلعذار کا پہنچا
دشمن ہوا وہ جان کا کہ جس سے دوستی — سچ ہے مثل کسی کا کوئی آشنا نہیں
سو طرح کی جفا تری اے نازنیں سہی — اس پر بھی قدر تجھ کو نہیں تو نہیں سہی

پہلے ثابت کریں اس وحشی کی تقصیریں دو
کیوں مرے پاؤں میں پہناتے ہیں زنجیریں دو
دونوں زلفوں کا تری آیا جو وحشت میں خیال
پڑ گئیں پاؤں میں میرے وہیں زنجیریں دو

سانی کہا قاصد نے کہ لایا ہوں میں پیغام وصال
آج خلعت مجھے پہناؤ کہ حجابؔ گیریں دو

دردِ دل دور ہوا سینہ کی سوزش بھی گئی
شربتِ وصل میں تیرے ہیں یہ تاثیریں دو

یا بہلنے سے بلائیں اُسے یا خط ہی لکھیں
شرم کیا خوب یہ سوجھیں ہمیں تدبیریں دو

گر پڑوں یار کے قدموں پہ اگر پی ہے شراب
ہاتھ آیا ہے بہانہ مجھے بیہوشی کا[۵]

جیتے جی نہ آیا اسے کچھ دھیان ہمارا　　مرجانے پہ کیا نکلے گا ارمان ہمارا

کوئی نا آشنا نہیں ایسا　　ملے ہیں آپ آشنا کیا خوب

وصل میں شرم وحیا شرم کو مشکل ہے بہت
کثرتِ شوق سے ہو جاتا ہے دشوار لحاظ

حجابؔ : عسکری بیگم نام اور حجابؔ تخلص تھا۔ ملا محمد زماں اصفہانی کی پوتی اور محمد علیخاں مسیحا کی شاگرد تھیں شعر وشاعری سے شغف تھا۔ اکثر مشاعرے بھی اپنے مکان پر کراتی تھیں۔ تذکرۃ الخواتین میں ان کا صرف ایک

غالبؔ　　ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

شعر ملا ہے جس سے ان کی ادبی سنجیدگی اور شاعرانہ ذوق کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

رات کو آئیں گے ہم صاف یہ معمّہ ہے | وعدۂ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

شیریں:- نواب شاہجہاں بیگم سابق فرمانروائے بھوپال کا شیریں تخلص تھا۔ آپ کا خطاب رئیس دکّاور اعظم طبقہ اعلائے ہند کرون آف انڈیا زمرۂ ریاست ہائے ہند تھا۔

آپ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں پیدا ہوئیں اور ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں تخت پر جلوہ گر ہوئیں۔ علوم حاضرہ سے واقف تھیں، عالی ہمت، خوش ذوق اور علم پرور خاتون تھیں۔ علما و فضلا کی بہت قدر و منزلت کرتی تھیں۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتی تھیں۔ فارسی میں شاہجہاں اور اردو میں شیریں تخلص کرتی تھیں۔ پہلا دیوان اردو کا ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں طبع ہوا تھا۔[1]

آتی ہے ہوا سرد گھٹا اٹھتی ہے گھنگھور | منگواؤ صراحی و مے و جام ہمارا
ہلکی سی رکاوٹ نہیں اب ہے نظر لطف | آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا
فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے | کام آیا بہت یہ دل ناکام ہمارا
کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر | اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا[2]

---

[1] جناب نجم الغنی صاحب کو آپ کی شعر گوئی سے انکار ہے ملاحظہ ہو "بحر الفصاحت" باب سرقہ

[2] لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف ÷ ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہیں اسلام کے — احسنؔ

قابلِ پابوس کیا ہم بھی نہیں ہیں آپ کے　　کیا خطا کی ہم نے گر چوما قدم کو کیا ہوا
عرش تک جاتا تھا یا اب کان تک آتا نہیں　　ہمنشینو میرے نالے کے اثر کو کیا ہوا [1]
دردِ فراق ہی میں سدا مبتلا رہے　　دنیا میں اسطرح بھی اب ہم تو کیا رہے [2]
لطف کیا پاؤ گے تنہا دلِ شیدا لیکر　　دیکھئے سیر بھی کچھ یاس و تمنا لے کر
غم سے مرتا ہوں نہ شرماؤ اجل آئی ہے پر　　کوئی زندہ نہ کرے نام تمھارا لے کر
جھوٹی قسموں کے دلاسے تو نہ دو شیریں کو　　دل بھی پھیرا ہے کبھی تم نے کسی کا لے کر

مستور:- مستور بیگم نام اور مستور تخلص تھا لکھنؤ کے ایک متموّل خاندان کی تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ صرف ایک شعر ملا ہے۔

خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت　　رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

عفت:- نجم النسا نام اور عفت تخلص تھا۔ مولوی مقصود عالم مقصود

---

[1] غالب ؎　نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خواجہ احسن اللہ بیاں ؎
عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں　　رحم آتا ہے بیاں اب مجھکو اپنی آہ پر
[2] دولہن حرم نواب آصف الدولہ ؎
دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی　　عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

ساکن پٹنہ کی شاگردہ تھیں۔ صاحب دیوان گذری ہیں اب صرف یہ ایک شعر ملا ہے۔

ہم جو اے جانِ جہاں تم سے بچھڑ جاتے ہیں
صدمے ہوتے ہیں قلق ہوتے ہیں گھبراتے ہیں

مطلوب:۔ فضل النساء نام اور مطلوب تخلص تھا۔ شملہ کی رہنے والی تھیں۔

کیوں نمک پاش نہ ہو زخم جگر پر ہر دم :: مسکرانا ترا اے رشکِ قمر وصل کی رات

اللہ اللہ ری مدہوشی جامِ الفت :: جان و تن کی نہ رہی کچھ بھی خبر وصل کی رات

پاؤں میں وحشی کی ہے زلفِ جنوں کا حلقہ :: آنکھ دکھلاتا ہے پھر حلقۂ زنجیر عبث

نظرِ لطف سے اُن کو تو کبھی دیکھا کر :: کیا گذرتی ہے ترے چشم کے بیماروں پر

لطیف:۔ لطیف النساء نام اور لطیف تخلص تھا۔ پٹنہ عظیم آباد وطن تھا۔ اُردو، فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ اُردو کا صرف ایک شعر ملا ہے۔

یہ طفلِ اشک مرے جس گھڑی مچلتے ہیں :: تو پھر ہزار سنبھالو نہیں سنبھلتے ہیں

معشوق:۔ حیدری خانم نام اور معشوق تخلص تھا۔ فیض آباد کی رہنے والی تھیں صرف ایک شعر ملا ہے۔

پان کھا کے جو کہیں تھوک دیا اس گل نے :: رشک یاقوت بنے باغ کے کنکر پتھر

نظیر[1] : لکھنؤ کی ایک عفت مآب خاتون تھیں، زیادہ حال معلوم نہیں۔

کیا کہیں تم سے ہم کہ کیا ہیں ہم	پاکدامن ہیں پارسا ہیں ہم
تو جو اغیار کے پہلو میں یہاں رہتا ہے	مجھ پہ تنہائی میں پہروں خفقان رہتا ہے

ماہ :- منجھلی بیگم نام اور ماہ تخلص تھا۔ وطن لکھنؤ تھا۔ دو شعر ملے ہیں جن سے لکھنؤ کا رنگ صاف ظاہر ہے۔

گر مقابل عارضِ جاناں کے آکر دم آئے گل
شرم سے بلبل کو پھر ہرگز نہ منھ دکھلائے گل

کاکل ہیں میرے دل کو گرفتار کر چلے	کالی بلا سے ہائے مجھے مار کر چلے

کنیز :- کنیز فاطمہ نام اور کنیز تخلص تھا۔ آپ ایک تعلیمیافتہ اور خوش ذوق خاتون تھیں۔ ۱۹۱۰ء (۱۳۰۷ھ) میں متھرا ڈالی گنج میں رہتی تھیں۔

رضواں تری جنت مجھے درکار نہیں ہے	طیبہ کا ترے باغ میں اک خار نہیں ہے
سر پر جو ترا سایۂ دیوار نہیں ہے	شاہا مجھے فردوس بھی درکار نہیں ہے
کس دل میں تری حسرتِ دیدار نہیں ہے	خواہاں ترا کون اے شہِ ابرار نہیں ہے
یا شاہ ٹھکانا ہے مرا آپ کے ہاتھوں	بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے[2]

---

[1] آپ کا نام اذکارِ خواتین میں نظیر اور تذکرۃ الخواتین میں نظیرن لکھا ہے۔

[2] یہ مصرعہ میر انیس کا ہے۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے ایک نہایت دلدوز تصویر (بقیہ اگلے صفحہ)

روشن ہیں چراغوں کی طرح داغِ محبت — تربت میں اندھیرا مری زنہار نہیں ہے
اس دل کو کنیزؔ اہلِ وفا کہتے ہیں پتھر — جس دل میں دلا سے شہ ابرار نہیں ہے

شریرؔ :- مس میری فلورا سارکس نام اور شریرؔ تخلص تھا۔ ان کا آگرہ سے تعلق تھا۔ جناب بزمؔ اکبر آبادی کی صبیہ تھیں۔ ان کا سنہ پیدائش غالباً ۱۸۹۵ء / ۱۲۹۱ھ ہے۔ ۱۹۱۱ء / ۱۳۰۸ھ میں رامپور تھیں۔ اور مثنا صاحب بزمؔ سکریٹری سے اصلاح لیتی تھیں۔ اسوقت عمر سولہ سال کی تھی۔ خوش مذاق اور خوش گو شاعرہ تھیں۔ رامپور میں ان کو اختر جہاں بیگم کا خطاب ملا تھا۔ اسی عمر میں نواب صاحب رامپور کی ایک غزل کو تضمین کیا تھا جو درج ذیل ہے۔

یہ جو سینے میں عار دیکھئے کب تک رہے — دشمنِ جاں وہ نگار دیکھئے کب تک رہے
قلب میں اس کے غبار دیکھئے کب تک رہے — ہم سے خفا ہے جو یار دیکھئے کب تک رہے
غیر کا یہ اعتبار دیکھئے کب تک رہے

[پچھلے صفحہ سے] اس واقعہ کی کھینچی ہے کہ شہدائے کربلا کا قافلہ مدینہ سے روانہ ہونے کو ہے حضرت بی بی صغریٰ جانے کے لئے بیتاب ہیں مگر بوجہ علالت ان کو اجازت نہیں ملی ہے۔ لہذا بیکسی کے عالم میں وہ حضرت علی اصغرؔ کو مخاطب کر کے اپنا دردِ دل کہتی ہیں۔ وہ بند جس میں اوپر والا مصرعہ آیا ہے یہ ہے:-

تم جاتے ہو اور ساتھ میں جا نہیں سکتی — تپ ہے مجھے چھاتی سے کبھی چپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی — رکھ لوں تمھیں اماں کو کبھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے — تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

پہلوئے عاشق سے جب تم نے نکالا تھا دل — ہم نے بھی لے کے رہا خوب سنبھالا تھا دل
ہائے مگر کیا کریں جانے ہی والا تھا دل — پہلے تڑپتا رہا نازوں کا پالا تھا دل

ہو گیا بے اختیار دیکھئے کب تک رہے

موسمِ گل کی بہار دیتی ہے کیا کیا مزے — سارے درختوں نے بھی بدلے ہیں کپڑے نئے
شاخوں پہ پھر بلبلیں کرنے لگیں چہچہے — غنچے چٹکنے لگے پھول مہکنے لگے

جوش پہ فصلِ بہار دیکھئے کب تک رہے

پہلے تو معلوم بھی مجھکو نہیں تھی یہ شے — مست بنا اب ہوا بات نصیحت کی ہے
ایک نظر نے مگر کر دیا قصہ ہی طے — آنکھیں تری دیکھ کر پی ہے محبت کی مے

عشق کا ہم کو خمار دیکھئے کب تک رہے

قلب ہے بیکل یہاں آپ کا ملنا ہے دو — رحم کی دیکھوں نظر کرتے ہیں کب تک حضور
ہو گیا اس کا یقیں مجھکو یہ اے رشک حور — صدمۂ فرقت سے جاں جائیگی اک دن ضرور

سینہ میں دل بیقرار دیکھئے کب تک رہے

ہو کے جگر خوں یہاں آتے ہیں رنگِ شباب — رشک سے اغیار کے جل کے ہوا دل کباب
سر پہ ہے ناحق لیا ہجرِ بتاں کا عذاب — عشق ہے ایسی بلا جل کے ہوا دل کباب

اپنے گلے کا یہ ہار دیکھئے کب تک رہے

مست ہیں سب بلبلیں باغ ہے پھولا پھلا — سبزۂ تر نے جدا فرش ہے اپنا کیا
ساتھ ہو وہ غنچہ لب سیر کا جب ہے مزا — آئی چمن میں بہار چلتی ہے بادِ صبا

شاخ کا گل ہے سنگھار دیکھئے کب تک رہے

سبز شجر دیکھکر خوش ہے ہر اک باغباں — ایسا کھلا بار بار ملتا ہے موقع کہاں

حسن عروس بہار پھولوں کی نیرنگیاں　　دیکھنے کا باغ کے آج ہی کل ہے سماں
بلبل شیدا انشا دیکھئے کب تک رہے

دیکھو یہ تم لے شریر وہ نہیں باز آئیگا　　ہم کو نہیں اعتبار اس کے کسی قول کا
وعدہ ہوا ان کا وفا رشک محقیں کیا ہوا　　دیکھتے ہو اس کی راہ جھوٹا ہے وہ پُر دغا
وصل کا یہ انتظار دیکھئے کب تک رہے

—•✻•—

دورِ حاضر

دورِ حاضر

(الف)

اختر :- محترمہ اختر بیگم قریشی بی-اے-بی-ٹی- دہلوی

محترمہ انور تنبیر الدین، بی-اے-بی-ٹی نے محترمہ اختر قریشی بی-اے-بی-ٹی کے جو حالات رقم فرما کر ارسال کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

"محترمہ اختر قریشی بی-اے-بی-ٹی نے ایک نہایت ہی معزز ممتاز اور روشن خیال خاندان میں پرورش سنبھالا۔ آپ کے والد ماجد دہلی میں محکمہ آثار قدیمہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اختر بیگم کی پیدائش دہلی ہی میں ہوئی۔ اور یہیں پلی بڑھیں۔ بچپن ہی سے آپ نہایت تیز طبع۔ ذہین اور خوش مزاج تھیں۔ چار سال کی عمر میں آپ کو قرآن شریف پڑھنے بٹھایا گیا۔ اور پانچویں سال اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں آپ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث ہمیشہ اپنی ہم جماعتوں میں ممتاز رہیں۔ اور ہر سال انعامات حاصل کرتی رہیں۔ اسکول کے جلسوں وغیرہ میں آپ ہمیشہ نظمیں سناتیں، تقریریں کرتیں جس کے باعث آپ طلباء اور اساتذہ دونوں میں ہر دلعزیز تھیں۔

مضمون نگاری، شاعری اور تصویر کشی کا آپ کو بچپن سے بیحد شوق تھا۔ چنانچہ بچپن میں اپنی استعداد سے بڑھ کر مختلف موضوعات پر مضامین اور کہانیاں لکھا کرتیں اور اپنے ماموں، چچا اور والد کے دوستوں کو دکھا کر خراج تحسین حاصل کرتیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی سے آپ نے اور بھی زیادہ ترقی کی۔ اور اپنے فرصت کے اوقات میں اُردو اور انگریزی کے مضامین لکھتی رہتیں۔

دہلی کے کوئن میری گرلز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنیکے بعد آپ اندر پرستھ گرلز کالج میں داخل ہوگئیں۔ کالج کی فضا میں آپکے ذہن رسا نے خوب ترقی کی۔ درسی تعلیم کے علاوہ آپ اکسٹرا کریکولر ایکٹیوٹیز[1] میں نمایاں حصہ لیتی رہیں۔ کالج میں داخل ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد آپکو مضمون نگاری کے انعامی مقابلے میں اول انعام ملا۔

چونکہ تقریر کرنے میں آپ کو ابتدا سے ملکہ حاصل ہے اسلئے کالج کے اردو اور انگریزی مباحثوں میں آپ کا نام ہمیشہ رکھا جاتا۔ تقریر کی روانی اور جوش۔ بلند پروازی اور شستگی صاف اور بلند آواز جو ایک قابل مقرر کے اوصاف ہیں آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کو متعدد مرتبہ کالج سے نمائندہ بنا کر مباحثات میں حصہ لینے اور تقریریں کرنیکے لئے بھیجا گیا۔ جہاں آپنے اکثر میڈل اور انعامات حاصل کئے۔

---

[1] غیر نصابی مشاغل

علاوہ ازیں آپ کو سوشل جلسوں میں بھی تقاریر کرنے کیلئے بلایا جاتا ہے۔ انتظامی قابلیت آپ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کالج میں آپ اکثر مباحثات کی صدارت کرتیں اور کالج کے ایسوسی ایشن کی سکریٹری تھیں۔

بی۔اے پاس کرنیکے بعد آپ بی۔ٹی کرنیکے واسطے علیگڑھ ٹریننگ کالج میں داخل ہوئیں۔ وہاں آپنے ذہانت اور معلوماتِ عامّہ کے امتحان میں اوّل انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ دہلی میں محکمۂ تعلیم کے فرائض انجام دینے پر مامور ہوگئیں۔

آپ کی تقریریں بارہا آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوچکی ہیں۔ زیادہ تر آپ اپنے پسندیدہ موضوع سائیکولوجی[۱] اور جدید طریقہ ہائے تعلیم اور خانہ داری کے امور پر روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم کے علاوہ آپ دستکاری میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل ایکزیبیشن[۳] علیگڑھ میں آپنے بہترین دستکاری پر فرسٹ پرائز (ایک سونے کا تمغہ) حاصل کیا۔

فرصت کے اوقات میں انگریزی اور اُردو میں مضامین اور افسانے لکھنا آپ کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ان مضامین کو شائع کرانا آپ کا مقصد نہیں۔ البتہ کبھی کبھی ادبی رسائل کی ایڈیٹرز کی

ؐ انجمن ۲؎ نفسیات ۳؎ مسلم تعلیمی نمائش

خواہش پر آپ کے مضامین شائع بھی ہو جاتے ہیں۔
کتابوں سے آپ کو عشق ہے۔ آپ کے پاس انگریزی اور اردو کی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے۔
آپ شوقیہ طور پر انگریزی اور اردو میں نظمیں بھی لکھتی ہیں۔ لیکن حد درجہ مشغولیت کے باعث آپ کو ادبی کاموں کی طرف توجہ کرنے کا زیادہ موقعہ نہیں ملتا۔ حال ہی میں آپ نے ایک ڈرامہ "نور" تصنیف کیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔
آپ اپنی قوم کی سچی ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ اور مسلمان خواتین میں بیداری پیدا کرنے کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔
ان صفات کو دیکھتے ہوئے قوی امید کی جاسکتی ہے کہ آپ ایک روز آسمانِ ادب پر درخشندہ ستارے کی مانند چمکیں گی۔ اور آپ کے علمی و ادبی کارناموں کی بنا پر قوم آپ کی ہستی پر فخر کریگی!
آپ اختر شیرانی کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں، کلام میں جذبات کی ترجمانی و رنگینی ہے، آپ کے نغمے رومان پرور فضاؤں میں بہتے نظر آتے ہیں۔ طرزِ ادا صاف ہے گو اس میں ابھی پختگی نہیں لیکن اگر مشقِ سخن جاری رہی اور آپ برابر کہتی رہیں تو اردو کی ایک اچھی شاعرہ ثابت ہوں گی۔
ذیل کا کلام خود محترمہ اختر قریشی کا انتخاب ہے جو آپ نے ازراہِ عنایت اس تذکرہ کیلئے ارسال فرمایا ہے:۔

بھولے فسانے

مری ناکامیاں جب میرے دل کو توڑ دیتی ہیں
مری دلسوز اُمیدیں مجھے جب چھوڑ دیتی ہیں
مری بربادیاں جب آس میری توڑ دیتی ہیں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

بساطِ آسماں پر ماہِ دلکش جب دمکتا ہے
ستاروں کا منور عکس پانی پر چمکتا ہے
تمناؤں کا شعلہ میرے سینے میں بھڑکتا ہے
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

کبھی محشر بپا کرتی ہیں موجیں آبشاروں میں
کبھی میرا گذر ہوتا ہے اونچے کوہساروں میں
کبھی جب کوکتی کوئل ہے دلکش شاخساروں میں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

جب آدھی رات کو سارا جہاں خاموش ہوتا ہے
فضا کا ذرہ ذرہ نیند سے مدہوش ہوتا ہے
ترا دلکش تصور جب مجھے بے ہوش ہوتا ہے

دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

صبا کے چھیڑنے سے پھول جب دم مسکراتے ہیں
طیورِ خوش نوا جب گلستاں میں گیت گاتے ہیں
خیالاتِ پریشاں مجھکو اشکِ خوں رلاتے ہیں
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

خیالِ عیشِ رفتہ اب تو ماضی کا فسانہ ہے
مگر پیشِ نظر اب بھی وہی رنگیں زمانہ ہے
وہی تیرا تصور اور الفت کا ترانہ ہے
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

گزشتہ راحتوں کی داستانیں مجھ سے مت پوچھو
مری مہمِ خلش کی کاوشوں کو مجھ سے مت پوچھو
تصور کس کا ہے اخترؔ بس اس کو مجھ سے مت پوچھو
دلِ غمگیں کو کچھ بھولے فسانے یاد آتے ہیں

حمیرا کی یاد میں

(جواب دنیا میں نہیں ہے)

دلِ غمگیں میں تصور ہے ترا شام و سحر
شب کو خوابوں میں مگر تو ہی نظر آتی ہے

تیرا پیکر ہے نہاں خندۂ گل میں شاید
تو مجھے کلیوں کی نکہت میں نظر آتی ہے

یا کہ تاروں میں چھپی بیٹھی ہے دنیا سے پرے
یا تو گھنگھور گھٹاؤں کی خبر لاتی ہے

ہے تصوّر میں مرے پیکرِ نورانی ترا
تو مجھے چاند کے ہالے میں نظر آتی ہے

یا کہ تو خوشۂ پروین میں روپوش ہوئی
چھپ کہاں جاتی ہے تو؟ جب کہ سحر آتی ہے

دلِ مہجور کی تسکین کو آ رشکِ قمر
آ کہ دنیا سب مجھے تاریک نظر آتی ہے ؎۱

؎۱ مؤلف احقر

"کسی تصورِ رنگیں سے"

(۱)

خمارِ خواب سے تارے بھی اونگھتے تھے جب
کسی تصورِ رنگیں سے گفتگو کی ہے
ذرا کہ غنچے بھی جھومتے تھے جب
کسی کے روئے نگاریں کی جستجو کی ہے

(۲)

کسی کی آنکھوں سے بہتی ہوئی بہاروں کو
چمن میں نرگسِ بیمار نے بھی دیکھا ہے
کسی کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے ستاروں کو
سحر کے تارۂ بیدار نے بھی دیکھا ہے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

مطربہ ؎

آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا
ہو چلی ہے کیا سہانی اب فضا
اس سہانی رُت میں تو اے مطربہ
دکھ بھرے لہجے میں کوئی گیت گا

(بقیہ پچھلے صفحہ سے)

(۳)

ترے خیال سے برسوں رہا ہوں گرمِ سخن
کبھی کبھی تو ستاروں سے گفتگو کی ہے
کبھی بہ بزمِ فلک گاہ در بہارِ چمن
کہاں کہاں نہ تری میں نے جستجو کی ہے

(۴)

کبھی تو پوچھ تباہی کا میری افسانہ
کبھی تو حالتِ دل آ کے پوچھ لے دل سے
تری ہی یاد سے وابستہ ہے وہ دیوانہ
کہ جس کی یاد کو تو نے بھلا دیا دل سے

"ج"

؎ خان صابر خلیلی کی نظم "مطربہ" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

وہ مہرِ عالمتاب چھپا — تو شام نے خیمہ تان دیا
اور ذرہ ذرہ عالم کا — ظلمت کی اوڑھ رہا ہے ردا
خاموشی کا ہے رنگ جما — ہر جانب ہے اک سناٹا
خوابیدہ ہے فطرت اس کو
ٹھوکر سے لے کی جگا دے جا
اے مطربہ ساز بجائے جا

وقت دیتا ہے تجھے پیغامِ جوش
اس جہاں پر چھا گیا ہے کیف سا
اس تغیّر سے تو ہو کیسے بے خبر
چھیڑ سازِ درد بیٹھے سُر میں گا

آنئی برسات ہم مل کر منائیں
دل پہ میرے چھا گئی غم کی گھٹا
ہیں پھوہار اشکوں کی برساؤں اگر
بجلیاں آنکھوں سے اپنی تو گرا

میرے دل کی ہے کسی کو کیا خبر
کوئی سمجھے دل کا میرے راز کیا
کوئی جانے کیا کہ کیوں ہوں نوحہ گر
مطربہ للہ غمگیں لے میں گا

[پچھلے صفحہ سے]

ترے ساز میں ہیں کیا کیا نغمے
سرتا سر سوز فزا نغمے
پُرشور و تلاطم زا نغمے
آفت ہیں ہوش ربا نغمے
دلکش نیرنگ نما نغمے
کرتے ہیں حشر بپا نغمے

دریائے الست کی طغیانی ہیں
روح کو خوب بہائے جا

.... اے مطربہ ساز بجائے جا

اب ہم کو سنا دلچسپ نوا
ہاں چھیڑ کوئی نغمہ ایسا
جو سوز و اثر میں ہو ڈوبا
جو بجلیوں کا ہو گہوارہ
تن من میں دے اک آگ لگا
ہستی کا دے سب ساز جلا

سرد آہوں کا مری ہے کیا سبب؟
کھوئے سے رہنے کی آخر وجہ کیا؟
کیوں پریشانی سی ہے شام و سحر؟
کیوں خلش سی دل میں رہتی ہے سدا؟
کاش سمجھے مطربہ تو دل کا راز
کاش پوری کردے میری التجا
کانپتے ہاتھوں سے بربط تھام کر
سوز کی اک شمع ہر دل میں جلا
چھیڑ دے اس دم یہ کا کوئی راگ
ٹھیک ہے ہاں بس ابھی سُر ہیں ذرا
ڈال شانوں پر تو زلفیں کھول کر
انکھڑیوں کے جام بھی چھلکائے جا

[پچھلے صفحہ سے] جو آگ نوا میں مضمر ہے
بھڑکائے جا بھڑکائے جا
.... اے مطربہ ساز بجائے جا

ہے چشم قیامت ساز تری ہے کاکل سحر نواز تری
جادو سے نگاہِ ناز تری نیرنگ نوائے راز تری
پُر افسوں ہے آواز تری لے تیری اے غمّاز تری

اس آتشیں لے میں گائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا
.... اے مطربہ ساز بجائے جا

(بہار جاوداں مطبوعہ پنجاب اکاڈمی ۳۶ء صـ۱۱۶ تا صـ۱۲۱)

پھونک دے ہستی کو میری سوز سے
سرمدی لَے سے مجھے بیخود بنا
روح میری مطربہ بیدار کر
جوش سے پھر میں بھی ہوں نغمہ سرا
ساز اور آواز دونوں ساتھ ہوں
مطربہ اخترؔ ہوں دونوں ہم نوا
دکھ بھرے بھیجے ہیں گائیں گیت پھر
جیسے لہراتی ہے متوالی گھٹا

کسی سے

یہ ناممکن جفاؤں سے تری مایوس ہو جاؤں
یہ ناممکن کہ ناکامی سے میں مانوس ہو جاؤں
تری بے اعتنائی مجھ کو برہم کر نہیں سکتی
مری آزاد فطرت غم سے سرخم کر نہیں سکتی
یہ تیری بے رخی بھی باعثِ وحشت نہیں ہوتی
تری یہ فتنہ انگیزی رہ کلفت نہیں ہوتی
تری وابستگی کی غیر سے پرواہ نہیں مجھ کو
تری اس بیوفائی کا ذرا شکوہ نہیں مجھ کو
نہ مجنوں کی طرح صحرا نوردی پر ہوں آمادہ

نہ میں دشت و بیاباں کا نہ تنہائی کی دلدادہ

مرے نزدیک تیشہ مار کر مرنا نہیں بہتر

ہیں راہِ عشق میں فرہاد کی طرح نہیں ابتر

جنونِ عشق میں فریاد کرنے سے بھی کیا حاصل؟

خود اپنی زیست کو برباد کرنے سے بھی کیا حاصل؟

ہوائیں جب بہار و کیف سے لبریز ہوتی ہیں

فضائیں جب مرا صبر و سکون و ہوش کھوتی ہیں

جہاں جب چاندنی میں نور سے معمور ہوتا ہے

زمیں کا ذرّہ ذرّہ نیند سے مخمور ہوتا ہے

مری ننھی سی کشتی نقرئی لہروں پہ بہتی ہے

شراب و شعر میں جب روح میری کھوئی رہتی ہے

ترا دلکش تصوّر ہے میرے پیشِ نظر ہر دم

تری رعنائیوں کی یاد ہے شام و سحر ہر دم

تخیّل میں مرے ہر دم ہے گو تو دور ہے مجھ سے

مرے خوابوں کی جنّت ہے کہ پھر کیا دور ہے مجھ سے

مری ہستی کا مقصد تو مری روحِ رواں تو ہے

مرے دل پر نشاں ہے پھر بھی آنکھوں سے نہاں تو ہے

میں چپکے چپکے تیرا نام لے کر آہ بھرتی ہوں

فسوں آمیز تنہائی میں شب کی یاد کرتی ہوں
چمکتی نقرئی لہریں منوّر چاند اور تارے
تلاطم خیز موجیں، شوخ کلیاں اور شجر سارے
کہیں ایسا نہ ہو، ان پر عیاں ہو رازِ الفت کا
میں ڈرتی ہوں نہ چھڑ جائے کہیں یہ سازِ الفت کا
تمنّا ہے یہی اخترؔ کہ خاموشی سے جل جاؤں
مجسّم عشق بن جاؤں میں شمع بن کے جل جاؤں

اخترؔ۔ محترمہ ح، بیگم اخترؔ صدیقی

آپ سندیلہ کی رہنے والی ایک حنفی المذہب، پردہ نشین خاتون ہیں، آپ زیادہ تر غزلیں لکھتی ہیں۔ خاتونِ مشرق اور عصمت وغیرہ میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے، کلام کا رنگ بہت صاف ہے۔ آپ کے اشعار میں سادگی سلاست اور روانی موجود ہے۔

غزل

بار بار اعتبار کرتے ہیں — تجربہ ایک بار کرتے ہیں
جو گنہ بے شمار کرتے ہیں — رحمتیں آشکار کرتے ہیں
جب نظر سوئے یار کرتے ہیں — آنکھوں آنکھوں پیار کرتے ہیں
جھوٹے وعدے ہزار کرتے ہیں — ہم یقیں بار بار کرتے ہیں

ہجر میں ذکرِ یار کرتے ہیں — یوں خزاں کو بہار کرتے ہیں
دیکھکر حسنِ بے نقاب ان کا — سجدے بے اختیار کرتے ہیں
جن کو ہے ناز تیری رحمت پر — عصیاں لیل و نہار کرتے ہیں
وہ رہیں خوش یہ ہے دعا میری — جو مجھے بیقرار کرتے ہیں
کیا غرض ہم کو دیر و کعبہ سے — سجدہ ہم سوئے یار کرتے ہیں
فرق باقی نہیں من و تو کا — اپنی ہستی کو پیار کرتے ہیں
شمع پر مر رہے ہیں پروانے — یوں فدا جانِ زار کرتے ہیں
سوئے در آنکھیں گوش بر آواز — اُن کا یوں انتظار کرتے ہیں
ان کے تیروں کا زخم کھاکے جگر — شکریہ بار بار کرتے ہیں
اب بھی آجا کہ دم ہے آنکھوں میں — نزع میں انتظار کرتے ہیں
غم مناتے ہیں مرگ دشمن کا — وہ مجھے سوگوار کرتے ہیں
گریہ سے کشتِ دل ہوئی شاداب — ہم خزاں کو بہار کرتے ہیں
آپ اپنے پہ رشک آتا ہے — کہ تمنائے یار کرتے ہیں

جان دیتے ہیں ہجر میں اختر
لیجئے اختصار کرتے ہیں

سیدہ سردار "اختر"

اختر۔ محترمہ سیّدہ سردار بیگم

سیّدہ سردار بیگم نام اور اختر تخلص ہے آپ اپنے آپ کو حیدرآبادی لکھتی ہیں، سکونت زیادہ تر کانپور رہتی ہے۔ آپ خان بہادر شیخ عبدالغنی صاحب گورنمنٹ آرمی کنٹریکٹر و رئیس نصیرآباد کی زوجہ ہیں۔

سیّدہ سردار اختر صاحبہ کو اردو ادب سے ایک گہرا لگاؤ ہے، آپ اردو کی ایک قابلِ قدر ادیبہ، زبردست مقررہ اور نہایت خوش گو شاعرہ ہیں۔ ادب کے علاوہ آپ کو سیاسیات سے بھی گہری دلچسپی ہے اور آپ کی زندگی زیادہ تر قومی خدمات میں صرف ہوتی ہے، مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں آپ کی تقریر سے متاثر ہو کر مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے آپ کو خطیبۂ ہند کا خطاب دیا تھا۔ جو اب عموماً آپ کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے آپ یو۔پی سول ڈفینس کاؤنسل کی ممبر بھی ہیں۔ کلام اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

محترمہ سیّدہ سردار اختر دورِ حاضر کی ایک نہایت زبردست اور گرامی قدر شاعرہ ہیں، آپ نے ادب کی افادی حیثیت کو سمجھ لیا ہے اور شاعری سے پیغام و اصلاح کا کام لیا ہے آپ کے کلام پر علامہ اقبالؒ کا بہت اثر پڑا ہے اور اس رنگ کی نہایت کامیاب اور پختہ مثالیں آپ نے پیش کی ہیں، علامہ اقبالؒ کی طرح آپ بھی "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کی قائل ہیں، آپ اسلامی و مشرقی تہذیب و معاشرت کی مبلغ ہیں اور مغرب کی حیاسوز

معاشرت کو قابلِ نفرت سمجھتی ہیں۔ آپ نے اپنی مشرقی بہنوں کو اس کی نہایت دلدوز تعلیم اپنے کلام کے ذریعہ دی ہے۔ تبلیغ و تعلیم دراصل روحِ شاعری کے منافی ہے مگر آپ کے یہاں اس قدر شاعرانہ لطافت موجود ہے کہ یہ تلقین و ہدایت بجائے گراں گزرنے کے بہت دلکش ہو گئی ہے اور اس سے نفسِ شاعری کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس رنگ میں آپ نے جس پایہ کا کلام پیش کیا ہے اس کی مثالیں نہ صرف اُردو شاعرات میں بلکہ خود اُردو شاعری میں بھی کمیاب ہیں۔ آپ کے کلام میں بڑی زندگی اور صداقت ہے زندگی پر آپ کی نظریں ناقدانہ پڑتی ہیں، آپ نے زندگی کے حسن و قبیح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے جذبات میں بہت گہرائی متانت اور سنجیدگی ہے۔

آپ کے یہاں قوم و ملّت کی محبت بھی موجود ہے اور حبِ ملک و وطن بھی! کیف و اثر، جذبات کی گہرائی، اور صداقت آمیز ترجمانی سے پیدا ہوتا ہے، اور محترمہ کے کلام میں اس کی بھی بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں، علوِ خیال، نفاستِ جذبات اور جوش کلام محترمہ کے خاص جوہر ہیں۔ جوش کلام دراصل دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو بڑے بڑے اور پُر شوکت الفاظ سے پیدا کیا جاتا ہے اور دوسرا جذبات کی شدّت اور طبیعت کے جوش سے پیدا ہوتا ہے پہلی قسم کا جوش ایک مصنوعی جوش ہے جس کا اثر سطحی ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا جوش جو صحیح معنوں میں جوش ہے پہلی قسم سے نسبتاً زیادہ مشکل، زیادہ موثر اور زیادہ پائندہ ہوتا ہے، محترمہ کے کلام میں سچے جوش کی عمدہ مثالیں

موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "وطن کا سپاہی" پیش کی جا سکتی ہے۔
ساتھ ہی ساتھ محترمہ غزل سے محترز یا متنفر نہیں۔ آپ نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ گو آپ کی غزلیں اتنی بلند نہیں جتنی آپ کی نظمیں ہیں۔ آپ کی ہستی پر اُردو شاعرات کی دنیا بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

سنگا پور میں ایک مسلم دوشیزہ کو محوِ رقص دیکھکر

حسن کی عریانیاں باعثِ فخر و کمال　　عظمتِ انسانیت آہ یہ تیرا زوال
کاش کہ ملتا مجھے جلوۂ ماضی ترا　　آہ ودیعت ہوا مجھکو ترا عہدِ حال
سنگ خرد بار عقل ہو ہی گیا کامیاب　　آ ہی گیا آخرش شیشۂ ہستی میں بال
کتنی اداؤں کے ساتھ آج ہے محوِ خرام　　گردنِ اخلاق پر خنجرِ تہذیبِ حال
جلوۂ افرنگ کی آہ یہ افسوں گری　　کل کہ جو شے تھی حرام آج وہ شے ہو حلال
حسن کہاں حسن کا صرف ہے وہم و فریب　　عشق نہیں عشق کا صرف ہے اک اختلال
حسن میں ہے اب کہاں دلکشی و زندگی　　پست ہی ذوقِ نظر مردہ ہی ذوقِ جمال
عشق کو افسوس ہے حسن کی تقدیر پر　　ایک نگاہِ ہوس قیمتِ نازو جمال
سازِ رمِ ذوق میں ربطِ پر شوق میں　　اب نہ سرودِ نیاز اب نہ فغانِ ملال
پی کے مئے مغربی ہو نہ بہت جوش میں　　ہوش میں آ ہوش میں تیرا نہیں یہ کمال

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ آہ!
موت سے پہلے ترا سانحۂ انتقال

نذرِ ہوس بار یاب شوقِ نظر کامیاب　　آہ لٹے اس طرح دولتِ حسن و شباب

جلوۂ عریاں نہیں ذوقِ نظر کے لئے
حسن جسے کہتے ہیں وہ تو ہی زیرِ نقاب

حسن کا مرکز ہے عشق حسن کا مظہر ہے عشق
کیسا تر و تازہ ہے شاخ میں اپنی گلاب

عشق کا آئین اور، حسن کا آئین اور ہے
اس کو تبسّم گناہ، اس کو تبسّم ثواب

کس کی نظر کھا گئی کس کی ادا لے اڑی
عشق کا خونیں جگر حسن کا رنگیں نقاب

نغمۂ حاضر سے ہے قلب پریشاں بہت
مطرب ماضی شوق چھیڑ دے اپنا رباب

ہے مرا خواب ہو، نغمۂ اللہ ہو
اور مری آرزو زندگی اضطراب

خود کو بھی ہشیار کر، مجھ کو بھی ہشیار دیکھ
اشہد ان لا الٰہ ہے مری تعبیر خواب

اشہد ان لا الٰہ میری نواؤں میں ہے[1]

میری نواؤں میں ہے میری اداؤں میں ہے

حق سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز
مجھ کو سنا دیجئے پھر وہ نوا ہائے راز

ذوقِ طلب ہے تو پھر سود و زیاں سے گزر
راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز

آ ہی گئی تھی آج نیند سنگ درِ یار پر
بیخودیٔ آرزو عمر ہو تیری دراز

پھر دلِ بیتاب کو چاہئے سوز و گداز
مطرب آتش نفس چھیڑ دے اب اپنا راز

کہہ چکے سب حالِ دل بارگہِ دوست میں
اختر خاموش چھیڑ، تو بھی حدیثِ نیاز

---

[1] علامہ اقبال سے
شوق مرا لَے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے
[بال جبریل]

تحفۂ علم

علم کے میخانہ میں ہو میگسارِ زندگی — علم ہے اک جاوداں کیف و خمارِ زندگی
علم سے قوموں کا بنتا ہے مزاجِ ارتقا — علم ہے اک نعمتِ پروردگارِ زندگی
علم سے کھلتی ہیں کلیاں آرزوئے شوق کی — علم ہے اک مژدۂ فصلِ بہارِ زندگی
علم کر دیتا ہے قوموں کو جہاں میں سربلند — علم ہے اک جادۂ عز و وقارِ زندگی
آج جو قومیں حصولِ علم سے ہیں فیضیاب — عہدِ حاضر میں وہی ہیں تاج دارِ زندگی
علم نے آ کر بنایا مقصدِ دردِ حیات — علم سے پہلے کسے تھا اعتبارِ زندگی
ہند کی اے صنفِ نازک آشنائے علم بن — ہر ادائے علم ہے آئینہ دارِ زندگی
علم اگر تجھ میں نہیں تو زندگانی بھی نہیں — خواستگارِ علم ہو اے خواستگارِ زندگی

ناشناسِ علم! کیوں تیری نظر محدود ہے
علم تو انسانیت کا اولیں مقصود ہے

کھول آنکھیں کر خدارا اپنی ہستی پر نظر — کس قدر محدود ظلمت ہیں تری شام و سحر
تجھ میں ذوقِ علم کی کوئی تڑپ باقی نہیں — کس قدر چھایا ہے تیرے جہل کا تجھ پر اثر
تیرے گلشن میں نہیں تہذیبِ رفتہ کی بہار — تیرے دامن میں نہیں ہے عہدِ حاضر کا ثمر
منزلِ مقصود کو دنیا نے حاصل کر لیا — اور تو اب تک گرفتارِ فریبِ رہگذر
ہوشیار اے بادہ نوشِ جہل پیہم ہوشیار — چونک خوابِ بیخودی سے اے اسیرِ بام و در
تیرے جلووں سے کبھی تھا بزمِ مشرق کو فروغ — کیوں بھلا دی تو نے اپنی مشعلِ علم و ہنر
کھو دیا افسوس تو نے زمزمِ سینا کا خروش — رضیہ و سلطانہ کا تجھ میں نہیں جوش و اثر

اپنے اوپر رحم کر بیدار ہو، بیدار ہو تیرا شیرازہ نہ ہو جائے کہیں زیر و زبر
تیری بیداری کلیدِ قفلِ بابِ ہند ہے
تو جمالِ ایشیا ہے آفتابِ ہند ہے

وطن کا سپاہی

بصد ناز و تمکیں بصد کج کلاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وطن جس کا ایماں، وطن جس کا پیارا وطن کے مقدر کا روشن ستارا
جواں بازوؤں پر ردا پارہ پارا جبیں سے نمایاں مگر نورِ شاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

وہ تھرا اُٹھی ظلم و طاقت کی دنیا وہ گھبرا اُٹھی کبر و نخوت کی دنیا
وہ گرما اُٹھی عزم و ہمت کی دنیا وہ لہرا اُٹھا پرچمِ بے گناہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

صبا دل کشائے چمن ہو رہی ہے کلی آج گرمِ سخن ہو رہی ہے
منوّر فضائے وطن ہو رہی ہے مبارک فروغِ مہِ نیم ماہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

بہن کی خموش التجاؤں کو لے کر پریشاں دلہن کی وفاؤں کو لے کر
دلِ افگار ماں کی دعاؤں کو لے کر رواں بحرِ ہمت میں ہے مثلِ ماہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

نہ رتبہ کی خواہش، نہ شہرت کا طالب نہ زر کی تمنا نہ دولت کا طالب
محبت کا بندہ، محبت کا طالب زسرتا قدم مژدۂ خیر خواہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

ہر اندیشہ رخصت، ہر اندیشہ باطل خوشا عزم راسخ، زہے شوقِ کامل
تصدق ہر اک گام ہمت پہ منزل سلامت یہ رہرو، مبارک یہ راہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

شجاعت نے پایا، حضورِ شجاعت شجاعت کو آیا سرورِ شجاعت
وہ چمکا فضاؤں میں نورِ شجاعت وہ چھٹنے لگی بزدلی کی سیاہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

جفا کیا ہے روحِ جفا کانپتی ہے خوشا ابتدا، انتہا کانپتی ہے
زمیں کانپتی ہے، فضا کانپتی ہے عدو کی صفوں میں مچی ہے تباہی
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

عزائم کی تصویر، ہمت کا پیکر نظر جوہرِ تیغ کے آئینے پر
ہر اہلِ وطن کو مبارک، ہو اختر وطن کی محبت کی "زندہ گواہی"
وہ آیا، وہ آیا، وطن کا سپاہی

شاعرہ کی دعا

نشاطِ کیفِ غلامی سے بے نیاز کرے مرے وطن کو خدا حریت نواز کرے
حیاتِ قوم کے معنی ہیں ہستی شاعر خدا کچھ اور میری عمر کو دراز کرے

سرورِ شوق سے پھر ہو چاک سینۂ گل کلی بھی آنکھ گر گلشن میں نیم باز کرے
چمن تو کیا ہے زمانہ کی آنکھ کھل جائے مری نوا کو کہاں تک اثر نواز کرے
ابھی نہیں ہے کوئی سوزِ نغمہ سے آگاہ کچھ اور سینۂ ہندوستاں گداز کرے
شفا مآب ہوں بیمارِ بے حسی وجود مرا سخن اثر کار چارہ ساز کرے
مری نوا ہی کے پردے میں مطربِ کونین وہ نغمہ چھیڑ مری شعریت بھی ناز کرے
ہوں اہلِ شوق کو اس سے بصیرتیں حاصل مری نگاہ جو کچھ انکشافِ راز کرے
ہر ایک دستِ طلب یوں بڑھے کہ اپنے لئے درِ کمالِ سعادت کو پھر سے باز کرے
ہر ایک زباں پہ شورِ انا کے نغمے ہوں جو دل ہے عظمتِ دار و رسن پہ ناز کرے
وہ مجھ کو بخشے سوزِ دروں کہ جو اک دن چراغِ خانۂ غربت کو شعلہ ساز کرے
جبینِ غزنوی جھک جائے میرے قدموں تک جہاں میں پادشہی عظمتِ ایاز کرے
مری صدا میں ہو وہ مستیٔ اذانِ سحر ہر ایک ذرے کو جو محوِ نماز کرے
نفس نفس کو مرے دے وہ جذبِ شوق کہ جو نگاہِ قوم کا رخ جانبِ حجاز کرے

عجب نہیں کہ دعا سن لے میری اے اختر
درِ قبولِ خدا مجھ پہ آج باز کرے

غمِ دوست

اے غمِ دوست بتاؤں تری قیمت کیا ہے تو سلامت ہے تو پھر مجھ کو ضرورت کیا ہے
عمر گذری اسی احساسِ محبت میں مگر آج تک یہ بھی نہ سمجھے کہ محبت کیا ہے
سر بسجدہ درِ جانانہ پہ ہو جا اختر اور اربابِ محبت کی شرافت کیا ہے

مری ہے اور اختر آرزو کیا

کسی کھوئے ہوئے کی جستجو کیا　　کسی بچھڑے ہوئے کی آرزو کیا
ترے رخسارِ رنگیں کے مقابل　　گل و گلزار ہیں ہے رنگ و بو کیا
نمازِ عاشقاں ہیں اے عزیزو　　تیمم کس کو کہتے ہیں وضو کیا
نہ آئے آج تک تو روزِ محشر　　وہ آئیں گے ہمارے روبرو کیا

پہنچ جاؤں شہ لولاک کے پاس
مری ہے اور اختر آرزو کیا

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سہی مگر　　بیخودِ سیرِ کائنات اپنی طرف بھی اک نظر
اٹھی بھی آنکھ ہوگئی جوشِ الم سے آج تر　　میں نے اٹھائی کیوں نگاہ عالمِ درد میں اُدھر
یوں نہ پہنچ سکیگا تو اُس کی حریمِ ناز میں　　عشق کی تیغ تیز سے عقل سے پہلے جنگ کر
شکل حسیں دکھائے جا پردہ کو درمیاں اٹھا　　شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر
میرے تمیزِ شوق کو ایک زمانہ چاہیئے　　تیرا لہو بھی ہے سرد میری نوا ہے گرم تر
آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے　　وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز اور میں انہی سے بیخبر

تیری فغاں نے کردیا سینۂ گل کو چاک چاک
اختر خوش نوا خموش، اختر خوش نوا ٹھہر

اختر۔ محترمہ م۔ج بیگم

م۔ج بیگم نام اور اختر تخلص ہے۔ آپ گورکھپور کی رہنے والی ہیں۔
کلام کا رنگ پختہ ہے۔ اشعار نہایت پُرکیف و پُراثر ہیں۔

اوڑھائی کیوں رنگ و بو کی چادر فریبِ ہستی نے آدمی کو
جب اس کی محدود ہو چکی حد، تو خاک حاصل ہو زندگی کو

میں اپنے ذوقِ خدا پرستی کو ایسے مرکز پہ لا رہی ہوں
جہاں نہ دیر و حرم کے بندے ذلیل کرتے ہوں بندگی کو

قسم ہے ذوقِ عمل کی تجھکو، قدم بڑھا اضطرابِ ہستی
تلاش طلب کی نہیں ہے جس میں وہ خاک پائیگا زندگی کو

چراغِ ہستی جلا رہی ہوں، ہوا کی تیزی کا ڈر نہیں ہے
کہ میرا ذوقِ یقیں بجھانے نہ دیگا محفل کی روشنی کو

نظر میں کوئی سما رہا ہے، تمام ہستی پہ چھا رہا ہے
چھپے چھپے لٹ رہی ہوں اختر بچاؤں کیسے میں زندگی کو

ادا۔ محترمہ عزیز جہاں

اُردو کی اس ممتاز اور گرامی قدر شاعرہ نے بدایوں کی ادب پرور فضاؤں
میں آنکھ کھولی ہے آپ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن مسز بی۔حق نے
ارسال فرمائے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

عزیز جہاں بیگم نام اور اداؔ تخلص ہے۔ قاضی بدرالحسن مرحوم (سپرنٹنڈنٹ محکمۂ زراعت) بدایونی کی تیسری صاحبزادی ہیں تاریخ پیدائش اگست سنہ ۱۹۲۴ء ہے۔ شاعرہ ابھی دنیا کی قید و بند سے آزاد ہے باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ ماں کی قابل تربیت نے گھر پر تعلیم دلا کر سنہ ۱۹۴۴ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کروایا۔ اردو کے مضمون میں امتیاز خصوصی حاصل کیا۔ آجکل فارسی اور ہندی سے شوق ہے۔

شاعری کی عمر پانچ سال ہے سنہ ۱۹۳۸ء تک جناب اختر شیرانی سے استفادہ کیا۔ پھر حضرت جعفر علیخاں اثر لکھنوی سے اصلاح لی اور انکے کشمیر چلے جانے کے بعد بھی ان کا دامن نہ چھوڑا۔ بالآخر سنہ ۱۹۴۱ء میں اثر صاحب نے فرمایا "بیٹی اب تمھیں اصلاح کی ضرورت نہیں" (مسرلی۔حق)

یہ نوخیز و نودمیدہ کلی آبروئے گلستاں ہے، اس نوعمر گرامی قدر شاعرہ کی ہستی پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

محترمہ اداؔ کے یہاں روحِ شاعری صحیح معنوں میں جلوہ گر ہے، شاعری قافیہ پیمائی، اور انتخابِ الفاظ کا نام نہیں، شاعری نظم و غزل، قصیدہ و مثنوی کا نام نہیں۔ شاعری نام ہے ترجمانیٔ جذبات کا، اور محترمہ اداؔ کے یہاں ذاتی اور شخصی طور پر محسوس کیئے ہوئے نہایت شدید جذبات کا ایک سمندر ہے جو موجیں مارتا نظر آتا ہے جس نے آپ کے کلام کو اس قدر پُرتاثیر، اس قدر دلدوز، اور اس قدر لطیف بنا دیا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثالیں ابھی شاذ ہیں! اور اس سلسلہ میں آپنے اس قدر پختہ آرٹ کی

مثالیں پیش کی ہیں کہ آپ کو حیاتِ انسانی کے جذبۂ لطیف کی شاعرہ کہا جا سکتا ہے۔

محترمہ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے، جذبات کی صحیح ترجمانی کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب دنیائے ادب کا ایک نہایت مشکل مرحلہ ہے، اور محترمہ اس میں بطورِ احسن کامیاب ہیں آپ کی زبان میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے اس میں بڑی سلاست و شستگی، بڑی صفائی اور روانی موجود ہے، بعض بعض جگہ محترمہ اساتذۂ سلف کی طرح تکرارِ الفاظ سے بڑا کیف و لطف پیدا کر دیتی ہیں اور اس تکرار سے جذبات میں بڑی شدت اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تکرار وجدانی اعتبار سے شعر کو بہت بلند اور پُراثر بنا دیتی ہے اس کی اکثر عمدہ مثالیں محترمہ کی نظم "خیر مقدم" میں موجود ہیں تشبیہات و استعارات پر محترمہ کو بڑی قدرت حاصل ہے آپ کی تشبیہات نادر، لطیف اور پُرکیف ہوتی ہیں ان میں بڑی تازگی اور شاعرانہ نازک خیالی موجود ہے، اس قسم کی کچھ اچھی مثالیں آپ کی نظمیں کرمک شب تاب، جھیل، بہار کا پہلا پھول وغیرہ ہیں۔

منظر نگاری میں انسانی جذبات کی کامیاب آمیزش محاکات کا ایک کارنامہ ہے۔ اور محترمہ کے یہاں اس قسم کی بھی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں اس سلسلہ میں آپ کی نظم "جوہی کی کلیاں" پیش کی جا سکتی ہے۔

محترمہ کے کلام پر سب سے زیادہ اور سب سے گہرا اثر اختر شیرانی کا پایا جاتا ہے آپ کے نغمے رومان پرور اور رومان انگیز کیفیات سے معمور ہیں،

محترمہ نے اس رنگ کی اس قدر پختہ اور کامیاب مثالیں پیش کی ہیں کہ ان کا حریف تلاش کرنا مشکل ہے۔ اختر شیرانی کے علاوہ آپ آثر لکھنوی کے رنگ سے بھی متاثر ہوئی ہیں اور کلام میں اکثر آثر کی تاثیر اور سادگی کے نمونے موجود ہیں۔ کہیں کہیں علامہ اقبالؒ کے رنگ کی بھی جھلک آپ کے یہاں ملتی ہے۔ آپ شاعراتِ حاضرہ کی صفِ اوّل میں ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

سطورِ ذیل میں محترمہ کے کلام کا جو انتخاب ہے اس میں "خیر مقدم" "یادِ ماضی"۔ غزل: "جوش کہاں تڑپ کہاں لذتِ جستجو کہاں"۔ "پروین کے نام" "احساسِ اولیں" "بہار کا پہلا پھول"۔ "جھیل"۔ "تعبیرِ نو"۔ "کرمکِ شب تاب" خود محترمہ آزاد کا انتخاب ہے۔ جو انھوں نے اس کتاب کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ بقیہ کلام راقم السطور کا انتخاب ہے۔

"خیر مقدم"!

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کئے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے ان کو میہماں کئے ہوئے[1]
سرورِ عیش "تلخیِ حیات" نے بھلا دیا
دلِ حزیں ہے بیکسی کو حرزِ جاں کئے ہوئے

---

[1] غالبؔ ؎ مدّت ہوئی ہے یار کو میہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

بہارِ حسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے
کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے
سکونِ دل کی راحتوں کو آج ان سے مانگ لوں
سکون دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے
حدیث آہِ نیم شب سناؤنگی سناؤں گی
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کئے ہوئے
وہ آرزوئے دل کی ہمتیں بڑھائیں شوق سے
غرورِ عشق بے نوا کو کامراں کئے ہوئے
وفورِ شوق و بےخودی، ٹھہر ٹھہر دلِ حزیں!
نگاہِ شوق و بےخودی کا امتحاں کئے ہوئے
تجلیاں لئے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو لامکاں کئے ہوئے
وہ آئیں گے تو آئینگے جنونِ شوق ابھار نے
وہ جائیں گے تو جائینگے تباہیاں کئے ہوئے
متاعِ صبر و ہوش کو لٹاؤں ان کی راہ میں
وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کئے ہوئے
میں ان کی بھی نگاہ سے چھپا کے انکو دیکھ لوں

کہ ان سے بھی ہے آج رشک بدگماں کیے ہوئے[1]

وقارِ عشق تو سہی کریں وہ اعترافِ غم

نظر کو دل کی دھڑکنوں کا رازداں کیے ہوئے

سر نیاز دبائے ناز ابتدائی عشق کی

اب اٹھائے بیخودی ہے سرگراں کیے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں

نظر کو وقفِ انتظارِ دل ستاں کیے ہوئے

یادِ ماضی

آغوشِ فلک میں ہیں جھلکتے ہوئے تارے

یا ساغرِ زر ساقیٔ مہوش نے سنوارے

کشتی ہے یہ پھولوں کی چمن میں کہ مہِ نو

بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے

تاروں بھرا آکاش ہے یا نیند کی دیوی

پیشانیٔ زیبا پہ افشاں کو سنوارے

---

[1] غالب کا رشک کچھ اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ؛ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

جگر مرادآبادی نے شعر مذکور کے پہلے مصرعہ کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے :۔

فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

دل تھا تو لاکھ جلوے تھے دل جو نہیں تو کچھ نہیں
آئینے کو آئے گی بہار دعوتِ رنگ و بو کہاں!
دامنِ گل ہے عنبریں اس میں تو شک نہیں ادا
نکہتِ رائیگاں کہاں گیسوئے مشکبو کہاں

پروین کے نام

خدا کرے تجھے ہم تابِ مہر و مہ پروین
مثالِ انجمِ رخشندہ سرفراز رہے

سبق لے گوہرِ تاباں سے تیری معصومی
جہانِ حرص و ہوا میں بھی پاکباز رہے[1]

یہ کائنات کہ مدفن ہے آرزوؤں کا
تو اس دیار میں مثلِ نوائے ساز رہے

خدا سے چشمِ حقیقت نگر ملے تجھ کو
کہ تو کبھی نہ اسیرِ حق و مجاز رہے

سرشکِ چشمِ مصیبت زدہ پہ کانپ اٹھے
کسی کے دل کو دکھانے سے احتراز رہے

ترے دماغ کو وہ عزمِ استوار ملے
کہ تیری راہ میں کوہِ گراں گداز رہے

دلِ ایاز کو بخشے مذاقِ آزادی
نیاز میں بھی اک اندازِ مشقِ ناز رہے

عطا ترے دلِ نازک کو ہو وہ سوزِ حیات
کہ تیرے دم سے تری قوم سرفراز رہے

مٹائے ہند سے تفریقِ حاکم و محکوم
تو وہ کلی ہو گلستاں کو جس پہ ناز رہے!

---

[1] علامہ اقبال ؒ ۔ حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

احساسِ اوّلیں

ایک موہوم اضطراب سا ہے — اک تلاطم سا، پیچ و تاب سا ہے
اُمڈے آتے ہیں خود بخود آنسو — دل پہ قابو نہ آنکھ پر قابو
دل میں اک درد میٹھا میٹھا سا — رنگ چہرے کا پھیکا پھیکا سا
زلف بکھری ہوئی پریشاں حال — دل ہے ناشاد اور جی بے نڈھال
سینے میں اک چبھن سی ہوتی ہے — آنکھوں میں اک جلن سی ہوتی ہے
رنج سیرِ چمن سے ہوتا ہے — خفقاں انجمن سے ہوتا ہے
سر میں پنہاں تصوّرِ موہوم — دل میں اک آرزوئے نامعلوم
ایک نالہ سا ہے بغیر آواز — ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز
روح میں انتشار سا کیا ہے — دل کو یہ انتظار سا کیا ہے
کیوں یہ حالت ہے بیقراری کی — سانس لی یا کسی نے چٹکی لی

گھٹ کے رہ جاتے ہیں صدمے سہتے ہیں
کیا محبت اسی کو کہتے ہیں؟[1]

---

[1] اسی جذبہ کو حضرت روشؔ صدیقی نے بھی اپنی ایک نظم "محبت" میں ادا کیا ہے ملاحظہ ہو:

محبّت

(۱)

کبھی مدہوشیوں سے الفت ہے — کبھی خاموشیوں پہ حیرت سی ہے
کبھی ایک ایک شے کی حسرت ہے — کبھی ایک ایک شے سے نفرت ہے

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

بہار کا پہلا پھول

ہے زیبِ شاخِ حسنِ گلستاں کہیں جیسے — اک پھول جانِ کیفِ بہاراں کہیں جیسے
یا خامۂ مصورِ رنگیں نگار کا — وہ نقشِ اولیں کہ پریشاں کہیں جیسے
ابرِ کرم کا قطرۂ اول گہر بکف — افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جیسے
طفلی کا ایک گام سوئے منزلِ شباب — سرنامۂ صحیفۂ ارماں کہیں جیسے
اک حرفِ آرزو جیسے شوقِ گنہ کہیں — اک منفعل نگاہ پشیماں کہیں جیسے

---

(۲)

اک خلش سی چھپی ہوئی دل میں — کوئی "لیلیٰ" حجابِ محمل میں
اک مسافر کنارِ منزل میں — یا کوئی شمع قلبِ محفل میں

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

(۳)

کبھی دیوانگی میں ہشیاری — کبھی وارفتگی میں خودداری
کبھی تخئیل کی سحرکاری — کبھی ہر شے سے عزم بیزاری

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

(۴)

ایک شعلہ سا اور بھڑکتا ہے — ایک جلوہ سا اور لپکتا ہے
ایک نغمہ سا اور کھٹکتا ہے — ایک نقشہ سا اور بہکتا ہے

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

(۵)

کبھی مجبور کار ہو جانا! — کبھی بے اختیار ہو جانا
آپ ہی بے قرار ہو جانا — خود بخود اشکبار ہو جانا

اے خدا! کیا یہی محبت ہے؟

عصیاں کی بزمِ تیرہ میں اک نور کی کرن اہلِ نظر بھی حاصلِ ایماں کہیں جسے
یا آرزوئے عشقِ نہفتہ کی قلب میں پہلی تڑپ جراحتِ مژگاں کہیں جسے
کھویا ہوا سا خوابِ جوانی بہار کا تجدیدِ اضطراب کا ساماں کہیں جسے
یا جستجوئے جلوۂ رنگینِ دوست میں وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جسے

یا اوّلیں سرشکِ محبت سرِ مژہ
محرومیٔ نشاط کا عنواں کہیں جسے

کرمکِ شب تاب

(قطعہ)

شبِ سیاہ میں روشن ہے شمع جگنو کی
دیا غریب کا جس طرح ٹمٹماتا ہوا
ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے پنکھڑی گل کی
رکا ہوا سرِ مژگاں ہے قطرہ آنسو کا
فضائے ساکن و تیرہ میں جس طرح کوئی
لرز رہا ہو فلک سے گرا ہوا تارا
سزا کے خوف سے یا ایک لمحہ کو جیسے
گناہ گار کے دل میں خیال رحمت کا

جھیل

آغوش میں زمیں کے یہ جھیل سو رہی ہے

یا چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے
صحرا کی نازنیں کا یا یہ دلِ حزیں ہے

دنیا کے جھنجھٹوں سے جو آشنا نہیں ہے
دیدار کو ہے کتنی مضطر ماہِ فلک نشیں کے

آنسو ٹھہر گیا ہے رخسار پر زمیں کے
مسحور ہیں فضائیں کتنی خموش ہے یہ

جنّت کی حور کوئی مینا بدوش ہے یہ
کیفِ شراب میں ہے ڈوبا ہوا نظارا

سویا ہوا نظارا، کھویا ہوا نظارا
پتّوں کی آڑ لے کر مہتاب جھانکتا ہے

یا تو عروسِ شب نے گھونگٹ اُلٹ دیا ہے
محوِ خرامِ دلکش دوشیزۂ شباب ہے

سبزے کی جنبشوں میں اک دل دھڑک رہا ہے
ہو ہو کے مست بجو نذریں چڑھا رہی ہے

شبنم کی شاہزادی موتی لٹا رہی ہے
برنائیاں نچھاور عکسِ مہِ جواں پر

اک چاند ہے زمیں پر اک چاند آسماں پر
لہروں کی سلوٹوں میں کچھ پھول کانپتے ہیں

بستر جو پُر شکن ہے پہلو بدل رہے ہیں

تاروں کا عکس دلکش ہے سطحِ مرمریں پر
افشاں چُنی ہوئی ہے پیشانیٔ حسیں پہ
لرزاں ہے کس لیے یوں ہائے کیوں شکن جبیں پر
کیا یاد آ رہا ہے؟ کیوں ہو رہی ہے مضطر؟
کیوں دل دھڑک رہا ہے، یوں بیقرار کیوں ہے؟
سوئے فلک نگاہِ حسرت شعار کیوں ہے؟
"مضطر ہوں اس لیے میں ناساز ہے سکوں اب
تقدیر کا ہے منشا بیچین ہی رہوں اب
تارہ سمجھ کے ایک اک ذرّے کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اسکو ڈھونڈتی ہوں
تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان و آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں
عہدِ نشاط گذرا وہ دل نہ سرخوشی ہے
پھر لوٹ آئے شاید بس آس یہ لگی ہے
لیکن تو اے حسینہ! یوں غم نواز کیوں ہے
پُرنم سرشکِ خوں سے یہ چشمِ ناز کیوں ہے
اُمید کے محل کو پل میں گرا دیا ہے
تجھکو بھی کیا کسی نے دل سے بھلا دیا ہے"

تعمیرِ نو!

محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک　　شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک
دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی　　سرگشتہ رہیگا صفتِ جام کہاں تک
کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رخِ تاباں　　سرشار ترے سودائے لبِ بام کہاں تک
گیسوئے سیہ تاب و رخِ صاعقہ پرور　　یہ مرگ و حیاتِ سحر و شام کہاں تک
لیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کہیں دوچار　　خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک
رخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود　　ناداں! گلۂ گردشِ ایام کہاں تک
کب تک ترے سینے میں خلش تیرِ مژہ کی　　یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک
اے ذرۂ ناچیز! خجل مہر کو کر دے　　افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہاں تک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہِ دام کہاں تک

تنہا مجھے رہنے دے!

دل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے　　مجبورِ محبت کو مجبور ہی رہنے دے
امید کی دنیا کو بے نور ہی رہنے دے　　معصومِ محبت کو مسحور ہی رہنے دے
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

دل پھول کی صورت ہے مرجھا کے نہ رہ جائے　　آغوشِ تمنا میں لہرا کے نہ رہ جائے
ڈر ہے کہ یہ حیراں شرما کے نہ رہ جائے　　ترسا کے نہ رہ جائے تڑپا کے نہ رہ جائے
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

محدود ہی رہنے دے معصوم کی دنیا کو ناشاد ہی رہنے دے مغموم کی دنیا کو
برباد ہی رہنے دے مظلوم کی دنیا کو پامال ہی رہنے دے محروم کی دنیا کو
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

اک پریم پجارن کو سنسار سے کیا مطلب مدہوشِ محبت کو ہشیار سے کیا مطلب
بیگانۂ دنیا کو آزار سے کیا مطلب دیوانۂ فطرت کو افکار سے کیا مطلب
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

ایوانِ محبت میں رہزن کا گزر کیوں ہو؟ تقدیس کی جنت پر ظلمت کا اثر کیوں ہو؟
اک طائرِ بیکس کو صیاد کا ڈر کیوں ہو؟ نادانِ گلِ صحرا پہ گلچیں کی نظر کیوں ہو؟
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

اُمیدکے خرمن کو آہوں سے جلانا کیا شمعِ رہِ منزل کو شکوں سے بجھانا کیا
خوابیدہ تمنا کو نالوں سے جگانا کیا معیارِ محبت کو نظروں سے گرانا کیا
جس حال میں بھی میں ہوں تنہا مجھے رہنے دے

عیدِ نظارہ

مژدہ نگاہِ شوق کہ عیدِ نظارہ ہے پلکیں کسی کی راہگذر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی سو طرح ہم کدے کو بھی اپنے سجاؤں میں
خورشید کی جبیں سے کرن مستعار لوں مہتاب سے ضیا کی جواں مانگ لاؤں میں
دامانِ ابرِ تیرہ سے گو سمیٹ لوں قوسِ قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں
باغِ ارم سے آرزوے رنگ و بو کروں روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں

شبنم سے اشکہائے گہر تاب چھین لوں
غنچے کے لعلِ لب سے تبسم چراؤں میں

بلبل سے پاکبازیٔ الفت طلب کروں
معصومیٔ شباب کو پھولوں کی چھاؤں میں

جذبِ وفا و ہمتِ پروانہ چاہیے
بہرِ گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں

ظلمت میں ہو نہ نور فشاں ماہِ نیم ماہ
بہرِ نثار ساغرِ انجم منگاؤں میں

وہ اور میرے گھر میں ہوں مہمان خوش نصیب
گلہائے اشکِ سرخ سے دیپک جلاؤں میں

آنکھوں کو میری دولتِ دیدار ہو نصیب
خود کو نہ انکے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں

وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیثِ غم
بلبل کی طرز نغمۂ رنگیں اڑاؤں میں

جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہو اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں لُٹ جاؤں میں

اے اضطرابِ شوق سنبھلنے دے اسقدر
ہاتھوں پہ رکھ کے دل کو پئے نذر لاؤں میں

اور اسکے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلع آدا کا سناؤں میں

اے چشمِ مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انہیں بھی جگاؤں میں[1]

---

[1] فیض احمد فیض

مرگِ سوزِ محبت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم

خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم

ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

[بقیہ اگلے صفحے پر]

جوہی کی کلیاں

بہارِ خلد منظر جلوہ گر ہے
ہجومِ سبزہ تا حدِّ نظر ہے

ہوائے مست ہے بہکی ہوئی سی
فضائے عنبریں مہکی ہوئی سی

سکوتِ شب تحیّر آزما ہے
جمالِ ماہ کیفیت فزا ہے

ہوائے نرم و نازک جیسے آہیں
کہ خوابِ نازکی بے ربط سانسیں

سپہرِ نیلگوں اور نورِ اختر
کہ اوڑھی ہے جسے فطرت نے چادر

فلک سے مہ کی بے تابانہ کرنیں
وفورِ شوق سے مستانہ کرنیں

برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں!
زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں

ستارے آسماں سے گر پڑے ہیں
کہ جوہی کے شگوفے کھل رہے ہیں

نزاکت آفریں رعنا سمن بر
تخیّل کے نشاط انگیز پیکر

کتابِ حسن کا عنوان رنگیں
جواں فطرت کا ارمانِ بہاریں

جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے
عرق آلود روئے نازنیں ہے

یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں
جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں

بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں
مئے عشرت کی متوالی ہوئی ہیں

برائے نذر شاعر خونِ دل سے
یہ گلدستہ بنایا ہے زمیں نے!

پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم (نقشِ فریادی، ص ۱۰۸-۱۰۹)

محترمہ نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن مقام شکر ہے کہ انھوں نے "آزاد نظم" کی صحیح اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس عریانی اور فحاشی سے احتراز کیا ہے جو "ترقی پسند" ادیبوں کے ہاتھ میں آکر "آزاد نظم" [1] کا ایک جز بن گئی ہے۔ ذیل میں محترمہ کی اس قسم کی ایک نظم پیش کیجاتی ہے۔

بیزاری

زیست ایک خواب طربناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی ایک دلنشیں آواز سہی
فرش مخمل بھی ازرو سیم کی جھنکار بھی ہے
جنت دید بھی ہے عشرت گفتار بھی ہے
چشم ستار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی

---

[1] اردو میں "بلینک ورس" (Blank Verse) یا "آزاد نظم" دراصل انگریزی ادب کی منت کش ہے اور ردیف و قافیہ کی قیود سے بغاوت کا نتیجہ ہے "آزاد نظم" اگر صرف ردیف و قافیہ ہی سے آزاد رہتی تو غالباً شعراء کی یہ کوشش مستحسن ہوتی لیکن اکثر "ترقی پسند" شعراء و ادباء کے ہاتھوں میں آکر یہ چیز صرف صوری حیثیت سے ردیف و قافیہ ہی سے نہیں بلکہ معنوی حیثیت سے مشرقی تہذیب معاشرت، اخلاق و مذہب کی قیود سے بھی آزاد ہوگئی ہے۔ اس

قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلّی، یہ گرانبارِ سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا در باز نہیں

[پچھلے صفحہ سے] وقت "آزاد نظم" کے سب سے بڑے علمبردار ن م۔ راشد مصنف "ماورا" ہیں "آزاد نظم" کے علمبرداروں میں ن م۔ راشد کے ساتھ عموماً فیض احمد فیض مصنّف "نقش فریادی" کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فیض نے آزاد نظمیں لکھی ہیں، لیکن نسبتاً کم لکھی ہیں۔ "نقش فریادی" میں صرف چند آزاد نظمیں ہیں لیکن وہ بھی صوری و معنوی "آزادی" کی اس شدت سے عاری ہیں جو راشد کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے جیسا کہ "نقش فریادی" کے دیباچہ میں خود فیض نے لکھا ہے "ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں ہلکا سا تصرّف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے اور بس" اس لئے "نقش فریادی" کے فیض کو اس معنی میں "آزاد نظم" کا علمبردار کہنا جس میں "ماورا" کے راشد کو کہا جاتا ہے، نہ صرف غلط بلکہ فیض پر ایک بیجا اتہام ہے۔ فیض کا "نقش فریادی" جذباتی شاعری کا ایک بلند پایہ زبردست اور شاندار نمونہ ہے۔ یہاں "آزاد نظم" سے میری مراد وہ "آزاد نظم" ہے جس کی مثالیں راشد اور متبعینِ راشد [باقی اگلے صفحہ پر]

جسم آسودہ سہی، روح مگر ہے بیتاب
اک بے نام تغیّر کے لئے
درد کی ٹیس سہی، لذتِ جاوید نہیں

[پچھلے صفحہ سے] پیش کر رہے ہیں۔ مجھے اس میں کلام نہیں کہ انکے یہاں خیالات کی گہرائی و سنجیدگی موجود ہے مگر اس کے باوجود یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا و مذہب سے بغاوت، اخلاق کے قدیم معیاروں سے تصادم، نفسانی خواہشات کی ترغیب و ہوس پرستی کی خواہش، اور مغربیت کی غلامانہ تقلید انکی شاعری کی ممتاز اور نمایاں خصوصیات ہیں۔ چند مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

خدا و مذہب سے بغاوت

"دریچے کے قریب" جو راشد کے مبصّر اور مقدمہ نگار کرشن چندر کے خیال میں "فکری اور فنّی اعتبار سے راشد کی بہترین نظم ہے" وہ ایک پرانی مسجد کے بلند مینار کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:۔

اس مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی،
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے،
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

نغمۂ اُمید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود

[پچھلے صفحہ سے] ایک عفریت — اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی"

["ماورا" صفحہ ۱۰۶]

یا مثلاً نظم "فطرت اور عہدِ نو کا انسان" میں انسان فطرت سے کہتا ہے :-

"شکوہ ہے زندانیٔ اہرمن و یزداں نہیں
ان سے بڑھکر کچھ بھی وجہ کاہشِ انساں نہیں" ["ماورا" صفحہ ۵۴]

اسکے مقابلہ میں فیض اپنے تمام "نقشِ فریادی" میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

سیکھی ہیں مرے دلِ کافر نے بندگی — ربِّ کریم ہے تو تری رہگزر میں ہے

["نقشِ فریادی" صفحہ ۱۰۱]

اسکی جرأتِ معصیت کی حد یہ ہے کہ

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

["نقشِ فریادی" صفحہ ۸۶]

اخلاق کے قدیم معیاروں سے تصادم

"آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حسن بیچارے کو دھوکا سا دئے جاتا ہے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبارِ تسلسل
یہ حیاتِ جامد

[پچھلے صفحہ سے] ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے!
ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب"

["ماورا" نظم "حزنِ انساں" ص۹۵]

"رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انھیں
یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
لو آگئی ہیں وہ بن کر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جنکا کیا تھا خوں میں نے
مگر یہ جتنی اذیت بھی دیں مجھے کم ہے
کیا ہے روح کو اپنی بہت زبوں میں نے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
اک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اداس

(پچھلے صفحہ سے) اسے نہ ہونے دیا میں نے ہمنوائے شباب
نہ اس پہ چلنے دیا شوق کا فسوں میں نے
اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
"گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے"

["ماورا" نظم "مکافات" صفحہ ۵۸]

فیض نے اس سلسلہ میں صرف اتنا کہا ہے — اور بجا طور پر کہا ہے:-

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے، پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دھکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

["نقش فریادی" نظم "چند روز" اور "مری جان" صفحہ ۱۰۵-۱۰۶]

فواحشات کی ترغیب و ہوس پرستی کی خواہش

"اس کا چہرہ اس کے خدوخال یاد آتے نہیں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال

[پچھلے صفحہ سے] اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

["ماورا" نظم "انتقام" ص ۱۱۶]

"روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں،
آ، اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں،
صبح جب باغ میں رس پینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے!"

["ماورا" نظم "اتفاقات" ص ۸۳]

"دیکھ اس جذبات کے نشے کو دیکھ،
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو گئی!
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے [بقیہ اگلے صفحہ پر]

کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش ــــ ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی

[پچھلے صفحہ سے] مجھ کو اپنی روح کی تکمیل کر لینے بھی دے!"
ــــــــ ["نادرا" نظم "طلسمِ جاوداں" ص۲۷]

"تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بیکراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضاء مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
["نادرا" نظم "بیکراں رات کے سناٹے میں" ص۱۱]

لیکن یہاں بھی فیض نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا :ــ
"لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے"
ــــــــ ["نقشِ فریادی" نظم "موضوعِ سخن" ص۱۲۱]

یا

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے ہے اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آنکلے

(پچھلے صفحے سے)　　زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ"
["نقشِ فریادی" نظم "آج کی رات" صفحہ ۹۸]

مغرب پرستی

قہوہ خانہ کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں،
آج کی شب تیرا لرزدانہ درود!
عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب
تیری آنکھ اور میرا دل
عنکبوت اور اسکا بیچارہ شکار!"
["ماورا" نظم "آنکھوں کے جال" صفحہ ۹۵-۹۶]

"آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اسے جانِ کہ میں،
ہوں دراِ فرنگ کا ادنیٰ غلام
["ماورا" نظم "شرابی" صفحہ ۱۱۳]

ایک لمحہ کے لئے
میرے تاریک گھروندے میں اُجالا ہو جائے

اَدا محترمہ ف بیگم :-

آپ اپنا پورا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ ف۔ بیگم نام اور اداؔ تخلص ہے آپ کی جائے ولادت لکھنؤ ہے مگر تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی آپ حضرت جلیلؔ کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو، فارسی، عربی کی تعلیم خانگی طور پر پائی اور اچھی قابلیت حاصل کرلی۔ شاعری کا ذوق اور ادبی رجحان اور دلچسپی اوائلِ عمر ہی سے ہے۔ نظم و نثر دونوں میں اچھی مہارت ہے:-

---

[پچھلے صفحہ سے] یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، ورنہ "آزاد نظم" کی تائید و مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن ان بحثوں سے قطع نظر، ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے، اہلِ زبان اور صاحبِ نظر اصحاب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوم کی طرح زبان کی بھی ایک زندگی اور ایک انفرادیت ہوتی ہے جو اس قوم کی تہذیب و تمدن، اس کے اخلاق و معاشرت، اس کے رسم و رواج اور اسکے افکار و خیالات سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ کسی ایک زبان کے نازک اور لطیف خیالات کی کماحقہٗ کوئی دوسری زبان متحمل نہیں ہو سکتی اور یہ کوشش اس سے کم مضحکہ خیز نہیں ہوتی جتنی مشرقی فضاؤں کی پروردہ خاتون کو مغربی سایہ پہنا کر اس کو خالص مغربی عورت سمجھ بیٹھنے کی ہوتی ہے۔ "ح"

جب فضا میں سکوت ہوتا ہے ذرّہ ذرّہ جہاں کا سوتا ہے
جب فلک پر گھٹائیں چھاتی ہیں بجلیاں کوند کر ڈراتی ہیں
اور جب کوئی خوف کھاتا ہے رخِ رنگیں کو ڈھانپ لیتا ہے
مجھے معلوم ہوتا ہے ایسا کہ تمھاری جبیں کی ہے یہ ضیا
محو پہروں اسی میں رہتی ہوں دل کو تسکین یوں ہی دیتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

ادیب محترمہ شبیر خالدہ

آپ موجودہ دور کی ایک خوشگو شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر زنانے رسائل خصوصاً عصمت اور خاتونِ مشرق میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے کلام سے آپ کے اعلیٰ ذوق اور خوشگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلام میں بڑا کیف و سرور اور جذبات کی فراوانی ہے۔

اے نسیمِ صبحدم اے باعثِ آرامِ جاں تیری نکہت آفریں رفتار سے ہوں شادماں
تیرے جھونکوں کو دماغ و دل ہی سمجھے انبساط دردِ دل ہجراں کشیدہ جو تھا محرومِ نشاط
حسرتِ دیدار ہر دم خوں رلاتی ہے مجھے تیرے آنے سے کسی کی یاد آتی ہے مجھے
صبح کا دلچسپ منظر تازگی بخشِ نظر ہے تو اس نظارہ سے میں ہیں ڈوبی کس قدر
پُر فضا اونچے پہاڑوں سے طلوعِ آفتاب ہے نمایاں تیرے ہر انداز سے کیفِ شباب
وہ تمنائے بہار آمودہ میرے دل میں ہے کچھ اثر وا ماندگی کا پہلے ہی منظر میں ہے
حسرتوں کا گھر بنا ہے دل پہ کچھ پژمردگی بن گئی ہوں میں سراپا مرکزِ افسردگی

دل شکستہ ہوگیا اتنی پڑھیں ناکامیاں
پھر بھی ہی جیتا ہوں کا رنگ چہرے سے عیاں

دیدیا ہمت نے میری مجھکو افسردہ جواب
اور انداز سکوں میں ہے نشان اضطراب

ہو رہے ہیں خوب ہی جھونکے تر عرق شمیم
ہو اگر تیرا گزر کوچہ میں اسکے اے نسیم

اپنے دامن میں لئے پھرتی ہی خوشبودار پھول
نذر کر دینا مری جانب سے بھی دو چار پھول

لیکن ایسے پھول جو افسانۂ جذبات ہوں
الفت صادق ہیں جو دیوانۂ جذبات ہوں

جن کی ہر اک پنکھڑی پہ ہو کھنچی تصویر دل
ہر رگ و ریشہ پہ ہو جسکے لکھی تحریر دل

اسیر

رحمت بیگم المتخلص بہ اسیر ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب حیدر آبادی کی دختر اور رحمت اللہ شریف صاحب حیدر آبادی اول تعلقدار کی شریک حیات ہیں ۔ تعلیم خانگی طور سے ہوئی شعر گوئی کا اچھا ذوق ہے گو کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔ رسالہ شہاب میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے' پاکیزہ و سنجیدہ ہوتا ہے خیالات میں بلندی اور جدت پائی جاتی ہے' اسی طرح آپ کے مضامین پُر از معلومات اور مفید ہوتے ہیں' زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہوتا ہے' کلام کا نمونہ یہ ہے :-

فکر فردا ہے نہ اب ہم کو خیال دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

بڑھ گئی ہیں بحر آزادی کی طوفاں خیزیاں

اک سفینہ وہ بھی اب طوفاں سے ہم آغوش ہے

دعوتِ دیوانگی دیتی ہے یہ وارفتگی
موجِ صہبائے تفکر بھی جنوں بردوش ہے

مائلِ تقلید کیوں ہے آجکل ذوقِ سلیم
چشمِ بینا بند ہے اور عقل بھی روپوش ہے

کس قدر پابندیٔ آئینِ فطرت سے اسیر
روحِ آزادی کا یہ جذبہ جراحت کوش ہے

وہ ماہِ انور کی ضیا — وہ نور کی سیمیں ردا — اوڑھے ہوئے ہے ساری فضا
اک ایک ذرّہ ارض کا

ہے دشت میں تیری ضیا — صحرا میں تابانی تری — صحنِ چمن میں بھی وہی
ہے نور افشانی تری

اظہری محترمہ اظہر سلطانہ منتظم

اظہر سلطانہ نام اور اظہری تخلص ہے بھوپال کی رہنے والی اور دورِ جدید کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے:-

سنہری کرن شب گوں آسماں پہ — ہویدا ہوا نور سارے جہاں پر
ہوا فرش گستر وہ اب شبنم زر کا — کہ شبنم پہ ہوتا ہے دھوکا گہر کا
وہ کوئل درختوں پہ کرتی ہے کوکو — ہے قمری بھی گلشن میں کہتی تو ہی تو

اذانوں کا ہے شور اب مسجدوں میں
اُٹھا شورِ ناقوس بھی مندروں میں

وہ دیکھو چلے مسجدوں کو نمازی
جگاتا ہے دیوی کو ان کا پجاری

سہانا سماں صبح کا تو نے کھویا
بہاریں مناظر کا بھی لطف کھویا

کہاں تک تجھے اطہری کہہ سنائے
جو سوئے سو کھوئے جو جاگے سو پائے

انجار

ملکۂ دکن حضرت دولہن پاشا بیگم صاحبہ کا تخلص ہے، دکن کی تاریخ میں آپ سب سے پہلی ملکہ ہیں جنھوں نے اردو شعر کہے۔ آپ کا جو کلام شائع ہوا ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں تاثیر، پختگی، زبان کی سادگی وصفائی اور خیالات کی بلندی موجود ہے۔

ان کو عہدِ وفا کی لاج نہیں
دردِ دل کا کوئی علاج نہیں

دوہی دن میں بدل گیا وہ رنگ
کل جو تھا لطف مجھ پہ آج نہیں

درد دینے لگا مزا دل کو
اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

سچ ہے اب خسروِ دکن کے سوا
کوئی شایانِ تخت و تاج نہیں

سارا عالم ہے بندۂ اخلاق
کوئی سلطاں سا خوش مزاج نہیں

آفتاب

آفتاب جہاں نام اور آفتاب تخلص ہے دہلی کی ایک صاحبِ ذوق اور

عفت مآب خاتون ہیں۔ اکثر زنانہ مشاعروں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ ذیل کی غزل ایک مشاعرہ ہی کی غزل ہے جو محترمہ نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی جو بصدارت محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی منعقد ہوا تھا۔

آپ کا شاعرانہ مذاق سنجیدہ و بلند ہے، زبان شستہ اور صاف لکھتی ہیں، جذباتی اعتبار سے بھی آپ کا کلام قابلِ قدر ہے:-

خوشی کا ذکر کیا، غم کا گلا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نہیں ملتا محبت کا نشاں بھی — یہ بدلی ہے زمانے کی ہوا کیا
گناہِ عشق کی ہیں مرتکب ہم — ذرا دیکھیں وہ دیتے ہیں سزا کیا
تصور میں وہی باتیں ہیں اُن سے — جدا ہو کر وہ ہوتے ہیں جدا کیا
کرم کرتے نہیں چلئے نہ کیجے — ستم کی لذتوں کا پوچھنا کیا
ڈرے میری بلا سیلابِ غم سے — خدا جب آشنا ہے ناخدا کیا
نہیں کچھ اعتبارِ زندگانی — مگر دل میں تمنائیں ہیں کیا کیا
مسرت ہے، نہ الفت ہے، نہ راحت — الٰہی تیری دنیا کو ہوا کیا

جہاں ہو آفتابِ عالم آرا
وہاں کی روشنی کا پوچھنا کیا

اکبری محترمہ اکبری خانم۔ بیرا گلینیاں

رسالہ عصمت کی شاعرہ ہیں، زیادہ تر مذہبی و اخلاقی مضامین نظم کرتی ہیں۔ ذیل کی مناجات آپ کے مخصوص رنگ کا ایک نمونہ ہے:-

ایک گنہگار کی دعاء

کریں التجا کس سے ہم اے خدا — نہیں دوسرا کوئی تیرے سوا

سوا تیرے مشکل کشا کون ہے — غریبوں کا والی بتا کون ہے

تو فرمانروا ہم ہیں فرماں پذیر — ہم افتادہ بیکس ہیں تو دستگیر

کیا ہم نے یہ جان و دل سے قبول — کہ سچا ہے تو اور تیرا رسول

ہمارا یہ ایمان بالغیب ہے — کہ تو سب کا معبود لاریب ہے

بھلا کیونکہ ہو یہ ہماری مجال — نہ مانیں ترا حکم اے ذوالجلال

مگر نفس غافل کے مکر و فریب — لیے لیتے ہیں عقل و صبر و شکیب

جہاں پھونکا اک وسوسہ کان میں — تزلزل پڑا دین و ایمان میں

پڑا جس گھڑی معصیت کا حجاب — نہیں سوجھتا کچھ ثواب و عذاب

کٹی ہائے غفلت میں عمر عزیز — نہ کی نیک و بد میں کبھی کچھ تمیز

کیے فعل ہم نے بہت ناسزا — ہوئی ہم سے واقع خطا پر خطا

ہے افسوس پاس اک بھی خوشہ نہیں — سفر دور کا اور توشہ نہیں

مدد میری اے میرے رحمٰن کر — مری سخت مشکل کو آسان کر

رکھوں ایسا محبت میں ثابت قدم — کہ غافل نہ ہوں تجھ سے میں ایک دم

نہ ہوں یا کہ دنیا سے جاؤں گذر — نہ نکلوں ترے حکم سے ذرہ بھر

ہیں دنیا میں جو مہرباں و شفیق — یہ سب جیتے دم کے ہیں اپنے رفیق

نہ پوچھے گا تربت پہ آ کر کوئی — کہ اے خستہ تن کیا ہے حالت تری

مگر تجھ سے امید ہے اے خدا		کہ ہر حال میں تو ہے مونس میرا
نہ رسوا مجھے اے خدا کیجیو		میری شرم محشر میں رکھ لیجیو
نہ تکیہ عمل پر ہے بالکل مجھے		نبیؐ کا فقط ہے توسّل مجھے
خطائیں میری عفو کر اے کریم		کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

خطائیں میری بخش دینا تمام
طفیل حبیبؐ علیہ السلام

آما

شریمتی لیلا دیوی نام اور آما تخلص ہے۔ آپ لاہور کی رہنے والی ہیں۔ اردو سے بڑا لگاؤ ہے اور اس میں اکثر کہتی رہتی ہیں۔ آپ کا کلام صاف ستھرا اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ زبان عمدہ لکھتی ہیں۔ مولانا راشد الخیری کی وفات پر آپ نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے کچھ بند مندرجہ ذیل ہیں:-

ختم دنیا نہ کبھی ہوگا یہ رونا تیرا		اشک غم سے ترے رخسار کو دھونا تیرا
ہائے ایسے اجڑے چمن بیچ میں ہونا تیرا		جسکو بھایا کبھی بیکار نہ ہونا تیرا

اٹھ گیا کیسا قلمکار قلم کا افسر
داغ ہے راشد خیری کا ادب کے دل پر

صنف نازک کیلئے کیسے اٹھائے صدمے		رات دن ایک کئے کیا کیا مضامین لکھے
غم نسواں کے وہ حضرت مرقد میں پہنچے		اب وہیں سنگے نہ دیکھیں کبھی ہم مر کے

کس طرح بھولیں گے احسان تمہارے خیری

اب کسے کہہ کے پکاریں گے ہمارے خیری

دفتر ہند کی موجودہ مصیبت کیلئے پیش خالق وہ آپ پہنچے ہیں برأت کیلئے

انجم

عارفہ بیگم نام اور انجم تخلص ہے۔ اکبر آباد کی رہنے والی ہیں۔ آپ جوش ملیح آبادی کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں۔ کلام میں سادگی و صفائی ہے۔ آپ کے یہاں محاکات اور منظر نگاری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں، کلام میں بڑی روانی ہے۔

سیر کشمیر

ہماری نگاہیں کدھر جا رہی ہیں
یہ کیا دیکھتی ہیں کہ اترا رہی ہیں

رسا ہے اپنی نظروں کا اوج رسائی
بہشت بریں کی خبر لا رہی ہیں

یہ کشمیر کا گلستاں اللہ اللہ
بہاریں فرشتوں کو للچا رہی ہیں

یہ اتوار کا دن بھی یوم طرب ہے
وہ گلشن کی شہزادیاں گا رہی ہیں

جدھر دیکھئے صورتیں پیاری پیاری
حسینان جنت کو شرما رہی ہیں

یہ معلوم ہوتا ہے وہ شبزہ پریاں
خراماں خراماں چلی آ رہی ہیں

نہ دیکھو ہٹا لو نظر اس کے رخ سے
حیا و ادا آنکھیں جھکی جا رہی ہیں

یہ پُر کیف منظر ہے کیا روح پرور
نگاہیں نگاہوں کو شرما رہی ہیں

یہ گردش میں ہیں اپنی مستانہ آنکھیں
کہ گلزار میں جام چھلکا رہی ہیں

دلہن کی طرح باغ آراستہ ہے — ہوائیں درِ خلد سے آ رہی ہیں
سلاطینِ اسلام کی سیرگاہیں — جو بربادیوں کی تباہی رہی ہیں
لطافت میں ڈوبی ہوئی ہیں ابھی تک — مشامِ تمنا کو مہکا رہی ہیں
خواتینِ مغلیہ کی پاک شکلیں — یہاں مدتوں جلوہ آرا رہی ہیں
کہ جن کی تمنائیں موجیں ہوا کی — سر اپنا پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں

انجم

عقیلہ خاتون نام اور انجم تخلص ہے سیکری کی رہنے والی ہیں آپ کا کلام کبھی کبھی عصمت اور خاتونِ مشرق وغیرہ رسالوں میں شائع ہوتا ہے سادگی وصفائی آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔

یادِ ماضی

یاد ہے مجھکو مرا گذرا زمانہ یاد ہے — محفلِ عشرت کا وہ رنگیں فسانہ یاد ہے
آہ وہ شوخی شرارت آہ وہ بچپن کے دن — وہ سکوں پرور زمانہ اور وہ دورِ مطمئن
آہ وہ ساون کی رت وہ گیت گانے جھولنا — ہر سہیلی کا وہ لڑنا اور لڑ کر بھولنا
شاد رہتی تھی سدا اور رنج و غم کافور تھا — دل مرا بچپن کی مے سے جب کبھی مخمور تھا
مثلِ گل بزمِ چمن میں مرکزِ الفت تھی میں — واسطے ماں باپ کے سرمایۂ عشرت تھی میں
یاد بچپن کی مجھے جس دم ستاتی ہے بہت — چشمِ مضطر اشکِ خوں بھر بھر بہاتی ہے بہت

کیا ہوا اب یا الٰہی آہ وہ دلکش سماں!
یاد سے جس کی ہوئی جاتی ہے انجم نیم جاں

انور

انور جہاں بیگم نام اور انورؔ تخلص ہے۔ آپ جناب سراج الدین صاحب سابق دوم تعلقدار حیدرآباد دکن کی دختر ہیں۔ اورنگ آباد میں قیام ہے۔ تعلیم خانگی طور پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی ہے آپ کی منقبت "پیشکش امام مظلوم" اچھی نظم ہے، اور معنوی و لفظی حیثیت سے بہت پُرشوکت ہے۔ اس نظم سے محسن کاکوروی کا رنگ جھلکتا ہے۔

پیشکش امام مظلوم

اے شہِ تشنہ لب و راحتِ جانِ زہراؓ　　اے جگر بندِ علیؓ فخرِ حجاز و بطحا
اے حسینؓ مدنی سرورِ ریاضِ احمدؐ　　صدفِ بحرِ کرامات کے دُرِ یکتا
ساقیِ کوثر و تسنیم مکینِ فردوس　　کسقدر رتبہ عالی تمہیں حق نے بخشا
وارثِ خلقِ حسنؑ حاملِ حسنِ نبویؐ　　چشمۂ رحم و کرم شاہِ شہیدانِ بلا
نورِ ایمان سے پُرنور جبینِ انور　　عشقِ اللہ سے معمور دلِ حسرت زا
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے خاموش رہا　　کیا قناعت تھی تری پیکرِ تسلیم و رضا
صبرِ ایوبؑ کی تصویر دکھا دی تو نے　　اپنے ہاتھوں سے جواں لختِ جگر دفن کیا

دورِ خزاں

چمن کے چپہ چپہ سے ہویدا رنگ بربادی
نہ باقی اب وہ رعنائی نہ رنگینی نہ شادابی
سموم بادِ صرصر سے گلستاں بن گیا صحرا

غضب کا چھا گیا گلشن کے بام و در پہ سناٹا
روانی تھم گئی موجوں کی چشمے خشک ساکن ہیں
جو گلشن رشکِ گلزارِ جناں تھے اب وہی بن ہیں
شمیمِ روح پرور شعلۂ آتش بنی یکسر
شجر ہائے گلستاں خاک کر ڈالے شرر بن کر
شعاعِ مہرِ تاباں نے لگا دی آگ سبزے میں
نسیمِ صبح گاہی خاک برسر جس کے ماتم میں
نگاہِ یاس سے تکتے ہیں طائر اپنی ویرانی
کہیں کس سے ستم کش دورِ گردوں کی ستم رانی

آہ

میمونہ بیگم نام اور آہ تخلص ہے آپ نے نامپلی زنانہ کالج میں تعلیم پائی اور وہیں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ کلام میں واقعہ نگاری، اور واردات قلب کی ترجمانی ہے۔ گو ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ہر گھڑی تم کو یاد کرتی ہوں — ہر گھڑی آہ سرد بھرتی ہوں
گاہ جیتی ہوں، گاہ مرتی ہوں — شکرِ پروردگار کرتی ہوں
دن تو جوں توں گزر ہی جاتا ہے — شب کو تارے شمار کرتی ہوں
ہیں پریشانیوں میں بھی ہر دم — دم تری دوستی کا بھرتی ہوں
دل میں جو ہے زباں پہ کیا لاؤں — بات کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں

پھول کھلتے ہیں باغِ حسرت کے — جب کبھی آہِ سحر بھرتی ہوں
گاہ تارے، تو گاہ تارِ نفس — رات بھر میں شمار کرتی ہوں
زندگی موت سے بھی بدتر ہے — سو کے جیتی ہوں اُٹھ کے مرتی ہوں
امتحاں کیسا اور کہاں کا سبق — میں فقط تم کو یاد کرتی ہوں

آہ کے ساتھ ہے تمھاری یاد
یاد کے ساتھ آہ کرتی ہوں

(ب)

باطن

آپ کا نام حبیبی بیگم اور تخلص باطن ہے۔ آپ کا تعلق ریاست حیدرآباد سے ہے۔ اردو کے علاوہ آپ فارسی اور عربی میں بھی اچھی قابلیت رکھتی ہیں، قرأت سے بھی واقف ہیں۔ "حمایت الاسلام" کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی ہے جس میں فرائض اور اخلاق کا تذکرہ ہے۔ اردو شاعری کا بھی ذوق ہے ؎

خاک کا پتلا ہے باطن آدمی — دل کو دیکھے آزمایا کون تھا
شاہِ دکن کی ہم پہ عنایت عظیم ہے — اہلِ دکن کے ساتھ محبت عظیم ہے

بانو محترمہ جہاں بانو بیگم ایم۔اے حیدرآبادی

محترمہ جہاں بانو بیگم حیدرآباد کی ان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کی علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل

کرلی ہے ۔ ان کے والد ابو رضا بیرسٹر مرحوم حیدرآباد میں ناظم فوجداری بلدہ، اور ان کے دادا مولوی دلیل الدین صاحب احترام جنگ اورنگ آباد کے صوبہ دار، اور مجلسِ مالگذاری کے رکن تھے،

جہاں بانو بیگم صاحبہ کے نانا مرزا نصر اللہ خاں المخاطب دولت یار جنگ مرحوم نہ صرف مشاہیر ایران سے تھے ۔ بلکہ سرکار نظام کے اعلیٰ عہدہ دار اور بلند پایہ مورخ اور ادیب تھے ان کی کتابیں "تاریخِ دکن" اور "داستان ترکتازانِ ہند" فارسی زبان کی قابلِ قدر کتابیں ہیں ؛

محترمہ جہاں بانو بیگم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۹۱۳ء میں ہوئی ۔ آپ کی تعلیم ابتدا سے زنانہ ہائی اسکول نام پلی میں ہوئی ۔ بی ۔ اے اور ام ۔ اے کی ڈگریاں جامعہ عثمانیہ سے حاصل کیں جب آپ ام ۔ اے میں زیرِ تعلیم تھیں، اس وقت کلیہ اناث حیدرآباد میں لکچرار کی خدمت پر مامور ہوگئی تھیں ۔

آپ کو بچپن سے علمی ماحول نصیب ہوا ۔ خاندانی روایات کے بموجب لکھنے پڑھنے سے خاص شغف رہا ۔ گویا وراثتاً آپ کو علم کی خدمت گزاری ودیعت ہوئی تھی ۔

اردو زبان کی خدمت آپ نثر، نظم، تقریر، اڈیٹری اور تدریس وغیرہ کے ذریعے کرتی ہیں ۔ آپ عصمت کی مشہور مضمون نگاروں میں سے ہیں، نظم کم لکھتی ہیں مگر خوب لکھتی ہیں، خیالات کی بلندی، اسلوب کی صفائی اور پاکیزگی، لطافت اور رنگینی آپ کے کلام میں موجود

ہیں، آپ کے خیالات پر علامہ اقبالؒ کا بھی کافی اثر پڑا ہے:

تضمین بر نظم شبلی

تنگ آیا ہوں زندگانی سے — اپنی قسمت کی بے زبانی سے
شورش و کاوشِ جہانی سے — ہے تمنا کہ چھوٹ جاؤں میں
جس طرح بوئے گل ہو گل سے جدا

جیسے محفل وداعِ یار کے بعد — جیسے پروانہ شمعِ زار کے بعد
جیسے دل رخصتِ قرار کے بعد — ہوں پریشان کدھر کو جاؤں میں
ہو گئے اب اپنے باغ و گل سے جدا

نکہت و بوئے گل گلوں کے ساتھ — عشوۂ برق بادلوں کے ساتھ
دردِ دل پر زغم دلوں کے ساتھ — کیا کہوں تجھ سے اپنی حالتِ زار
ساتھ تیرے مری خوشی بھی رہی

صبح ہستی آشنا رے شامِ ہستی ہو چلی — پھر تباں کی درخشانی میں پستی ہو چلی
شاہ انجم چھپ گیا تاروں کی بستی ہو چلی — اور مسلط چار سو یک گونہ مستی ہو چلی
شام کے آغوش میں پھر تیاں روپوش ہو — شب کی تاریکی میں دنیائے عمل بیہوش ہو

صبح کا نکلا ہوا اب کارواں منزل میں ہے — یعنی شب محوِ خوابِ جانفزا منزل میں ہے
ایک نقطہ بلبل نواسنجِ فغاں محفل میں ہے — اور اک ہیجان برپا اس دلِ بسمل میں ہے[1]

[1] علامہ اقبالؒ ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک ؛ اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

ربط باہم دونوں میں دیرینہ ہے نالے ایک ہیں
کشتگانِ غم ہیں اپنے دل کے چھالے ایک ہیں

ہیں رہِ غم کے مسافر اپنی منزل دور ہے
مرحلے طے کرنے ہیں راہِ عمل بے نور ہے[1]

لن ترانی کی صدا باقی ہے کوہِ طور ہے
یاں تنازع للبقا کا جاوداں دستور ہے

اے کہ سن گر آسنہ وے منزل مقصود ہے
حرکت لا منتہا ہی راز ہستی بود ہے

سونے والے جاگ غفلت سے سحر ہونے کو ہے
پھر ہم آغوشِ تجلی برگ بر ہونے کو ہے

قافلہ کا کوچ پھر اے بے خبر ہونے کو ہے
تو پڑا سوتا ہے کیوں آ کیا دیر ہونے کو ہے

بدر - محترمہ بدر النسا حیدرآبادی

بدر النساء نام اور بدر تخلص ہے - مولوی آغا یاور علی صاحب ناظم کورٹ آف وارڈ ریاست حیدرآباد کی شریکِ حیات ہیں، تعلیم خانگی طور پر ہوئی ہے، نثر اور نظم دونوں لکھتی ہیں، کلام کا انداز یہ ہے :-

سنبھل اے عندلیبِ زار بیتابی سے کیا حاصل
چمن میں رہ گئی فصلِ بہار آہستہ آہستہ
بدر آواز آتی ہے کفن سے کشتۂ غم کی

---

[1] اس بند اور آخری بند کے خیالات پر علامہ اقبالؒ کا اثر نمایاں ہے اس بند کو پڑھ کر علامہ اقبالؒ کے عمل اور خودی کا درس یاد آ جاتا ہے اور آخری بند میں علامہ کی امید کی جھلک [illegible]

لحد پر ڈالے لیے منت غبار آہستہ آہستہ[1]

بدرؔ۔ محترمہ بدر جہاں قریشی

بدر جہاں نام اور بدرؔ تخلص ہے۔ آپ کا وطن نور جہ ہے۔ شعر و شاعری کی طرف فطری رجحان ہے آپ کا ذوقِ سلیم اور مذاق ستھرا ہے۔ آپ کے کلام میں رومانیت کے چھینٹے بھی ملتے ہیں۔

لطفِ شام

شام کی کالی زلفوں میں اک تارا جھلمل کرتا ہے
پیشانی پر بندی ہے یا شب کا حسن نکھرتا ہے

دل کی الجھن ختم ہوئی، مدہوش جوانی سے کہہ دو
منزل رہ رہ کر کاٹے، دریا کی روانی سے کہہ دو

رنگِ مشکیں چھایا ہے اک بوئے عنبر مہکی ہے
غنچہ غنچہ بیخود ہے، پتی پتی مہکی ہے

فطرت اپنے نازوں کے پالوں کو لوری دیتی ہے
دن بھر کا غم، غم کی کلفت گویا چھینے لیتی ہے

بیدار چلو کچھ دل بہلائیں باغ کے رنگیں گوشوں میں
قدرت کی گلکاری دیکھیں پودوں اور گلبوٹوں میں

---

[1] آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزار ما بس نازک است شیشہ دل در کنار ما
یہ فارسی شعر شاہزادی زیب النسا مخفی کا بتایا جاتا ہے۔

فنا کیا، زیست کیا، رازِ بقا کیا　　جب اسکے ہیں پھر اس کا پوچھنا کیا
نہیں منت کشِ سحرِ مسیحا　　دیا ہے اس نے دردِ لا دوا کیا
ہوئی مدہوش اک ساغر میں محفل　　یہ مے شیشہ میں تھی نورِ خدا کیا
نہیں دنیا میں کوئی محرمِ راز　　سناؤں حال دل اپنا بھلا کیا[1]
سمجھ لو دولتِ کونین پالی　　ملا ہے یہ دلِ درد آشنا کیا
نگاہیں کر رہی ہیں رازِ دل فاش　　ترے خاموش رہنے سے ہوا کیا
فنا میں ہے بقا کا راز پنہاں　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
وفا ہی اٹھ گئی دنیا سے جب بدر
پھر اپنے اور پرائے کا گلا کیا

بشیر - محترمہ بشیر النساء حیدرآبادی

بشیر النساء نام اور بشیر تخلص ہے، مولوی ضامن علی صاحب کنٹریکٹر کی شریکِ حیات ہیں، حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ خانگی طور سے تعلیم پائی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہے۔ کلام میں لطافت اور پاکیزگی موجود ہے آپ اکثر زنانہ جلسوں میں بھی نظمیں سناتی ہیں، آپ عصمت کی مخصوص شاعرات سے ہیں۔

---

[1] محترمہ نے یہ غزل دہلی کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی جو ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی زیرِ صدارت ہوا تھا۔

[2] غالب سے آشنا غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا ؛ ورنہ کسکو میرے افسانہ کی تابِ استماع

ہوا خواہانِ دولت نے ارادت کا ثمر پایا
بہار آئی سنہری رُخ پہ پھولوں کے نکھار آیا

زبرجد سے مزیّن تختہ ہائے مرغزاراں ہیں
کہیں قمری کے نغمے ہیں کہیں طاؤس رقصاں ہیں

سپیدی چھا رہی ہے لاجوردی آسمانوں پر
چلی ہیں رات کی تاریکیاں انجم کے شانوں پر

طیورِ خوش نوا شاخِ شجر پہ چہچہاتے ہیں
تبسّم ریز ہیں غنچے گلِ تر کھلکھلاتے ہیں

کدورت دل سے دھوتی ہیں یہ موجیں جوئبار کی
طیورِ صبح کی تانیں، صدائیں آبشاروں کی

گیاہِ سبز پہ بکھرے ہوئے شبنم کے موتی ہیں
عروسانِ بہاری صبحدم موتی پروتی ہیں

عجب پُرکیف عالم ہے عجب دلچسپ منظر ہے
مسرت بانٹنے میں منہمک قدرت سراسر ہے

محسنِ اعظم

راشد الخیری ادیبِ پاک ہیں روشن ضمیر
آج تک ہے تیری ہستی آپ ہی اپنی نظیر —
تیرے زرّیں کارناموں پہ ہے نازاں زندگی

تو نے دی ہندوستاں کو خانگی آسودگی

آہ وہ دورِ تباہی وجودِ خانہ سوز
یاد ہے وہ عہدِ رفتہ کا سبق ہم کو ہنوز
صنفِ نازک نام ہے جن ناتواں افراد کا
ہر زمانے میں رہا جس کو گلہ بیداد کا
ظلم کیا کیا ڈھائے اس پر جذبۂ خودکام نے
کب رکھا آسودہ اس کو گردشِ ایام نے
الغرض کیا زمانہ اس پہ گذرا ناگہاں
بادۂ غفلت سے جب سرشار تھا ہندوستاں
تختۂ مشقِ ستم تھی موردِ آفات تھی
ایک مٹی کا کھلونا یعنی عورت ذات تھی
خود شریکِ زندگی سے آدمی کو عار تھا
خاک آلودہ سراسر دامنِ زرتار تھا
علم کی تحصیل سم اس کے لئے لاریب تھا
خواہ کچھ پڑھ لے مگر لکھنا سراسر عیب تھا
ایک کمسن طفل کی گھڑکی سے ڈر جاتی تھی وہ
زندگی بھر اس طرح گھٹ گھٹ کے مر جاتی تھی وہ
تھا ستم کا دور دورہ دادرس کوئی نہ تھا
شمعِ محفل تھی فروزاں ہم نفس کوئی نہ تھا

گھر جہنم بن چکے تھے جہل کی بیداد سے
ایسے میں اک غمگسار اٹھا جہاں آباد سے
مرحبا اے راشد الخیری ادیبِ حق شناس
برگزیدہ تیری ہستی پاک تھا تیرا قیاس
مرحبا اے حامیِ نسواں شفیقِ بے کساں
اے سزاوارِ عقیدت نازشِ ہندوستاں
اے پرستارِ صداقت قابلِ صد احترام
آج تک زندہ ہے اور جاں بخش ہے تیرا پیام
اے ادیبِ پاک طینت، اے حکیمِ دادرس
کتنے موزوں وقت پر تو نے بجایا ہے جرس
تیرے دردانگیز نالے کارگر بے سر ہوئے
تیرے دلکش ساز سے آباد ہندی گھر ہوئے
خامہ فردوس آفریں تھا اور نوائیں خانہ ساز
تیری ہر اک آہ سمجھاتی رہی فطرت کے راز
حق و باطل، خیر و شر سے باخبر تو نے کیا
ظلمِ استبداد کو زیر و زبر تو نے کیا
تو نے بخشی ہے حقوق و حریت سے آگہی
پھونک دی تو نے گھریلو زندگی میں زندگی
خون رو رو کر رلایا سنگ دل افراد کو

تیری آہوں نے تپایا ہے دلِ فولاد کو
طبقۂ اہلِ قلم گم شعبدہ کاری میں تھا
اور تو تنہا خواتین کی طرفداری میں تھا
کوششیں تیری رہیں دردِ درخشاں کے لئے
وقف کردی زندگی امدادِ نسواں کے لئے
تیری جاں سوزی برائے طبقۂ مظلوم تھی
تیری تحریروں کی دنیائے ادب میں دھوم تھی
لکھنے والوں سے جدا لکھنے کا تیرے ڈھنگ تھا
رنگ آمیزی پہ تیری اک زمانہ دنگ تھا
تیری صبح و شام سے ہے بربادانِ زندگی
تیری صبح و شام و شب ہے زندگی پائندگی
توڑے ہیں بندِ غلامی تیری تحریکات نے
گر بنپنے کے سکھائے تیری تصنیفات نے
تیری دلسوزی کا نسوانی ادب ممنون ہے
جس کی رگ رگ میں رواں تیرے جگر کا خون ہے
زندۂ جاوید تیرے کارنامے اور پیام
صنفِ نسواں پر سدا واجب ہے تیرا احترام
آج اے غمخوارِ نسواں بے نیازِ غم ہے تو
دامنِ رحمت میں شاداں محسنِ اعظم ہے تو

بیگم اسمٰعیل

آپ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کی شریکِ حیات تھیں۔ اور اشرف زمانی نام تھا۔ آپ نے مئی ۱۹۴۳ء میں اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔ آپ کے دل میں بڑا قومی و اسلامی درد تھا۔ ادب سے آپ کو خاص شغف تھا۔ آپ کے ادبی کارنامے اور قومی جذبات قابلِ یادگار رہیں۔ آپ میرٹھ میں ایک حمیدیہ زنانہ اسکول قائم کر گئی ہیں۔ شعر بھی کہتی تھیں آپ کے کلام سے بھی قومی و ملی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا
تو کل دولتِ دارین کا طبل و نشاں ہوگا
خدا کے واسطے اے مسلمِ خوابیدہ اٹھ تو بھی
ترا یہ خوابِ غفلت ایک دن خوابِ گراں ہوگا
مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساسِ خودداری
نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اے خواہراں ہوگا
اگر ہو جائے پیدا تیرے دل میں جذبۂ خدمت
تو اے خاتونِ مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا
ق
کہ تیری گود میں پلتی ہے قومِ مسلمِ عالی
توجہ سے تری ہر فرد فردِ رفتگاں ہوگا

بیگم افضال

آپ ڈاکٹر محمد افضال حسن صاحب کی شریکِ حیات ہیں۔ کلام

اکثر خاتونِ مشرق میں شائع ہوتا ہے۔ اکثر اسلامی شاعری کرتی ہیں اور حفیظ جالندھری کے "شاہنامہ اسلام" کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔

تعمیرِ حرم

اٹھائی جارہی تھیں جب خدا کے گھر کی دیواریں
تو معمارانِ بیت اللہ نے سوچا کہ کیا مانگیں
دعا آئی لبوں پہ یہ دعا اے خالقِ اکبر
تری رحمت ہو اس گھر پر یہاں کے رہنے والوں پر
کرم سے تیرے اس صحرا میں ایسا شخص پیدا ہو
کہ جس کی ذات الطافِ خداوندی کا چشمہ ہو
جو بیت اللہ کے آداب انسانوں کو سکھلائے
طریقے جو عباداتِ خداوندی کے بتلائے
جو قلب و ذہنِ انسانی کو اک تابندگی بخشے
جہانِ کُن فکاں کی روح کو اک زندگی بخشے
وہ اُمّی جو کتابِ زندگی پڑھتا ہوا آئے
خدائی علم و حکمت کی یہاں تعلیم فرمائے
ہوئی مقبول معمارِ حرم کی یہ دعا ساری
کہ بطحا سے ہوا وہ چشمۂ لطفِ خدا جاری
جو ساری نوعِ انسانی کا رہبر اور ہادی ہے
وہ جس کے فیض سے شاداب ہر صحرا و وادی ہے

جو حامل ہے کتاب اللہ و قانون الٰہی کا
وہی ہے رہنمائے آخری ساری خدائی کا
لوائے الحمد جس کے ہاتھ میں ہو گا قیامت میں
اسی کی بس سنی جائے گی انساں کی شفاعت میں

بیگم رضا

آپ محترم جناب رضا صاحب کی شریک زندگی ہیں اور صادق منڈی میں مقیم ہیں۔ خاتون مشرق کی شاعرہ ہیں۔ کلام کا رنگ پختہ ہے۔ اس میں جذبات کی گہرائی، صداقت جوش اور اثر موجود ہے۔ آپ کی غزلیں بہت پُر کیف ہوتی ہیں۔

علاجِ گردشِ لیل و نہار کر نہ سکی

خزاں نصیبی کی حد ہو چکی کہ سنتی ہیں
کبھی تصورِ فصلِ بہار کر نہ سکی

فریب خوردہ طبیعت تیرے وعدوں پہ
سنا کیا ہا مگر اعتبار کر نہ سکی

تڑپ تڑپ کے کٹی عمر سوزِ حسرت میں
کبھی یہ دردِ جگر آشکار کر نہ سکی

فلک نے چین دیا دل کی آرزوؤں کو
علاجِ گردشِ لیل و نہار کر نہ سکی

نہ چین لینے دیا دل کی بیکلی نے مجھے
یہ ٹیس مجھکو فراغت شمار کر نہ سکی

بیگم رسوا

آپ حضرت رسوا رنگپوری کی زوجہ ہیں، کلام میں پختگی و متانت ہے

خیالات بلند اور طرزِ بیان پاکیزہ و لطیف ہے۔

فنا ہو کے مجھے لطفِ بقا معلوم ہوتا ہے
جدھر آنکھیں اُٹھاتا ہوں خدا معلوم ہوتا ہے

بلالے ہاں بلالے بیکسی گورِ غریباں کی
کوئی بہری لحد کو ڈھونڈھنا معلوم ہوتا ہے

الٰہی خیر پھر مجھکو کسی کی یاد آئی ہے
جگر میں آج درد اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

ابھی ٹوٹی ہوئی امید میں کچھ جان باقی ہے
ابھی اے ہمنشیں کچھ آسرا معلوم ہوتا ہے

وہی کعبہ میں ہے رسوا وہی بتخانہ میں بھی ہے
ہمیں تو ذرے ذرے میں خدا معلوم ہوتا ہے

بیگم عروج

آپ حضرت عروج بدایونی کی شریکِ حیات ہیں، خاتونِ مشرق کی شاعرہ ہیں، عموماً نعتیہ مضامین نظم کرتی ہیں۔ کلام میں صفائی و روانی موجود ہے۔

نعت

بشر کیا لکھ سکے گا نعت پُر عظمت محمدؐ کی
خدا قرآن میں کرتا ہے خود مدحت محمدؐ کی

نہ کیوں روشن تریں ہو عزت و حرمت محمدؐ کی
عیاں ہے سورۂ والشمس سے صورت محمدؐ کی

تمنا خون بنکر دوڑتی پھرتی ہے رگ رگ میں
مری ہستی کی گویا روح ہے الفت محمدؐ کی

ھو اللہ احد کا نعرہ سنکر بت ہوئے اوندھے
تعالی اللہ چھائی اس طرح ہیبت محمدؐ کی[۱]

اسامہؓ سے انسؓ سے اور بلالؓ و زیدؓ سے پوچھو
کہ ان سب پر رہی ہے کس قدر شفقت محمدؐ کی

کھلے جنت کے دروازے بڑھے رضواں بھی لینے کو
گنہگاروں کو لیکر آئی جب رحمت محمدؐ کی

بشر کی کیا حقیقت ہے وہ مخدومِ دو عالم ہیں
کیا کرتے تھے جبرئیلِ امیں خدمت محمدؐ کی

ہوئی معراج پہنچے عرش پر خالق سے باتیں کیں
یہ عزت ہے محمدؐ کی، یہ رفعت ہے محمدؐ کی

قسم کھا کر کہا ہے نحن اقرب کہنے والے نے
وہ مجھ سے دور ہے جس پر نہیں رحمت محمدؐ کی

(پ)

پروین

زینت پروین نام اور پروین تخلص ہے، بدایوں کی رہنے والی ہیں، عموماً

---

(۱) علامہ اقبالؒ ؎ کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے (شکوہ)

اخلاقی و اصلاحی مضامین نظم کرتی ہیں۔

معصوم بچوں سے خطاب

صنعتِ صانعِ قدرت کا کرشمہ تم ہو — حسنِ معصوم کا معصوم نمونہ تم ہو
سارے گھر کے لئے دلچسپ تماشہ تم ہو — پر میں واقف ہوں کہ ناواقفِ دنیا تم ہو

اس لئے فرض ہے مجھ پر کہ دعا دوں تم کو
اور پھر عالمِ دنیا بھی دکھا دوں تم کو

چادرِ فاطمہ زہرا کا ہو سایہ تم پہ — پرتوِ عصمتِ مریمؑ ہو ہمیشہ تم پر
نظرِ خاصۂ خاصاں ہو خدایا تم پر — لطفِ باری تعالیٰ ہو ہمیشہ تم پر

قوم کی اپنی روایات تمھیں یاد رہیں
فاطمہ بی بیؑ کی عادات تمھیں یاد رہیں

گلشنِ علم کی نوخیز کلی بن کے رہو — دُرِ انجم کی شعاعِ ازلی بن کے رہو
صفحۂ زیست کا عنوانِ جلی بن کے رہو — اپنے بیگانوں کی نظروں میں بھلی بن کے رہو

حسنِ انوار سے تسخیر دوبالا ہو جائے
نورِ عادات سے گھر بھر میں اُجالا ہو جائے

باعثِ زینتِ کاشانۂ انجم بن کر — اور نسیمِ چمنستاں کا تبسم بن کر
بربطِ خلق کا پاکیزہ ترنم بن کر — شکلِ معصوم کا دلچسپ تکلم بن کر

حسنِ سیرت کا سبق سیکھ کے ماں سے اپنی
ساری دنیا کو سنا دینا زباں سے اپنی

پروین - محترمہ عابدہ خانم

حالات اور کلام کے لئے دیکھئے "نسرین"

پنہاں - محترمہ سپہر آرا خاتون المخاطب بہ رابعہ بریلوی

آپ کے حالات آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے اپنی نگرانی میں لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں -

"محترمہ رابعہ خاتون پنہاں بریلوی دختر دوئم مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی پی - آئی آفس الہ آباد ۷ اگست ۱۹۰۶ء کو بمقام سہارنپور تولد ہوئیں - بریلی کے ایک شریف اور ممتاز خاندان کی چشم و چراغ ہیں - فارسی - اردو اور انگریزی کی تعلیم کافی حد تک اپنے والد مرحوم سے گھر پر حاصل کی - دس سال کی عمر میں مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی - آپ کی نثر ابتدا ہی سے آپ کے ستھرے - پاکیزہ اور سنجیدہ دماغ کی آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی آپ کا سوادِ خط بھی بہت پاکیزہ ہے - رسائل نے آپ کا عکس سوادِ خط بھی شائع کیا ہے ۱۹۲۱ء سے شاعری کا ذوق فطری منصۂ شہود پر آیا - ابتدا ر شاعری ہی سے فارسی سے زیادہ شوق رہا اور ابتدائی فارسی غزلیں اور نظمیں ایسی تحریر کیں کہ استادانِ وقت نے لوہا مان لیا - ابتداءِ ذوق میں قبلہ ماجد علی صاحب سے اصلاح سخن حاصل کی - ایک سال بعد قبلہ نے آپ کو طالب علی صاحب ایڈو کیٹ الہ آبادی کی شاگردی میں دیدیا -

چنانچہ دو سال طالب علی صاحب ایم اے ایل۔ ایل۔ بی الہ آبادی نے اصلاحِ سخن و نثر کی۔ پھر جناب نے نثر و نظم کا پروانۂ معراج دیدیا اور عنروزت اصلاح سے بالا کر دیا۔ آپ کا اُردو۔ فارسی کلام شروع ہی سے پختہ اور عمیق رہا۔ شروع زمانہ سے نظمیں۔ غزلیات اور افسانے وغیرہ برابر ملک کے چیدہ رسائل و اخبارات میں نہایت اعزاز و افتخار کے ساتھ شائع ہوتے رہے

سنہ ۱۹۲۵ء میں محترمہ اپنے عزیز والد صاحب قبلہ کی وفات سے بہت دل شکستہ ہو گئیں۔ اور اسی سال الہ آباد سے اپنے وطنِ مالوف بریلی تشریف لے آئیں۔

جنوری سنہ ۱۹۲۸ء میں آپ کی شادی آپ کے خاندانی عزیز جناب صوفی صغیر حسن صاحب ایم اے۔ بی۔ ٹی پرنسپل اسلامیہ کالج الہ آباد سے ہوئی جن کے ساتھ آپ کچھ عرصہ دہلی مقیم رہیں اور آج کل الہ آباد میں قیام پذیر ہیں۔ یہ شادی آپ کی والدہ صاحبہ اور آپ کے دیگر اعزا نے اپنے حسبِ منشا کی اور بفضلہٖ تعالیٰ آپ نے اپنی حسبِ طبیعت نہایت عالی دماغ اور لٹریری شوہر پایا۔

اپنے والد کی یاد میں آپ نے سنہ ۱۹۲۹ء میں ایک منظوم مجموعہ بعنوان "اشکِ خونیں" شائع کرایا تھا جس سے آپ کے اس عشق کا جو آپ کو والد صاحب مرحوم سے تھا، پتہ چلتا ہے۔

آپ کے نظموں اور افسانوں کے مجموعے عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔

آپ ابتدائے عمر سے نہایت متشرع اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں پشتری پردہ کو پسند فرماتی ہیں۔ آپ کو دستکاری سلائی کھانا پکانا۔ اور جملہ امور

خانہ داری میں کافی درک ہے۔ آپ کے پانچ بچے ہیں جس میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ آپ کے خصائل نہایت پاکیزہ ہیں۔ آپ رفیق القلب، خوش طبع، خوش خلق اور ہمدرد ہیں اور زنانہ سوسائٹی میں آپ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔"

محترمہ رابعہ خاتون پنہاںؔ کا شمار موجودہ دور کی چند مخصوص اور ممتاز ترین شاعرات میں ہے۔ آپ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی کی بھی اچھی شاعرہ ہیں[۱]۔ کلام میں پختگی موجود ہے، جذبات اور وارداتِ قلب کی ترجمانی پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ بڑی خوش فکر اور خوش گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے اشعار نہایت لطیف و پُرکیف ہوتے ہیں اور آپ کی قادر الکلامی کا پتہ دیتے ہیں۔ آپ کی زبان پُروقار ہے۔ اس میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہے۔ ابھی اُردو شاعرات میں اس قدر بلند اور عمدہ کہنے والی خواتین کم ہیں۔

۱؎ محترمہ پنہاںؔ کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:-

گفتند کہ از عشق طبیباں رستہ نکوتر — گفتم کہ با درد طبیبش رستہ نکوتر

گفتند دریں راہ خبر ہیچ نہ آید — گفتم کہ ز دانستہ ندانستہ نکوتر

گفتند کہ چشمش ہمہ دم خون جگر ریز — گفتم کہ ز آتش غم خستہ نکوتر

دلا از رمز ہستی باخبر زی

نہ سودائے سکوں بیگانہ تر زی

خود محترمہ نے اپنے کلام کا جو انتخاب ارسال فرمایا ہے یہ ہے:—

تجلّیوں نے نقاب اُٹھا۔ لبوں پہ آیا حسیں تبسّم
نوید آئینۂ تخیّل تجھے وہ بیخود بنا رہے ہیں
عزیزِ خاطر ہے باغباں کی قفس کے خوگر بھی ہو گئے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے فصلِ گل میں نشیمن اپنا لٹا رہے ہیں

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

[پچھلے صفحہ سے] لیلۃ المعراج

نہادہ بہ فرقِ فلک تاجِ امشب شدہ بحرِ انوار مواج امشب
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

عطا کردہ تابش بہ عقدِ ثریا ضیائے منزہ دہد اختراں را
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

بہ فردوس رنگیں پیامِ مسرت چمن در چمن اہتمامِ مسرت
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

بہ اطرافِ گردوں بہارِ تجلّی بہ قرصِ قمر لالہ زارِ تجلّی
بہ بیں جلوۂ نورِ معراج امشب

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

مژدہ باد اجذبۂ خاموشیِ شوق ۔۔۔ اک تجلّی آج زیرِ بام ہے
پیچ و تابِ زلف پیچاں خم بہ خم ۔۔۔ کون کہتا ہے جنوں ناکام ہے
کارواں کیا نزدِ منزل آگیا ۔۔۔ آستاں پر کیوں ہجومِ عام ہے
شیشۂ میںا میں پنہاں برق ہے ۔۔۔ حسنِ پُرفن آج زیرِ دام ہے

نیاز و ناز[1] نامقبول دونوں ۔۔۔ نہ سمجھی ہیں کہ ہے تیری رضا کیا
جبینِ حسن پہ سرخی سی دوڑی ۔۔۔ نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا

---

[1] روش صدیقی ؎ تمنّا خطا جرمِ ترکِ تمنا ؛ خطا کاریاں ہیں خطا کاریاں ہیں

(پچھلے صفحہ سے)

جمالش زینتِ دل بود شب جائیکہ من بودم ۔۔۔ بہ چشمم دہر باطل بود شب جائیکہ من بودم
ز فیضِ جنبشِ ابروئے آں شوخ کماں سازی ۔۔۔ دلِ من نیم بسمل بود شب جائیکہ من بودم
نگاہم بر تجلّائے رخِ آئینہ رخسارے ۔۔۔ سرم بر پائے قاتل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو از رہ رو کاملِ طریقِ عشق و الفت را ۔۔۔ سرِ طوار منزل بود شب جائیکہ من بودم
خودش را من ندانستم چہ بودم صد سرا صوفی ۔۔۔ گلِ صد برگ محفل بود شب جائیکہ من بودم
دلم پرداخت با یادِ جمالِ دوست او با من ۔۔۔ وجودِ غیر باطل بود شب جائیکہ من بودم
چناں دل محو مستا زد ز یادم کیفِ دوشینہ ۔۔۔ دلم نخچیرِ قاتل بود شب جائیکہ من بودم
ز فیضِ نرگسِ مستانِ ساقی شد بپا محشر ۔۔۔ جہانِ بیخبر دل بود شب جائیکہ من بودم
خطِ زنگیں کہ بر پیشانیِ بسمل کشیدہ تیغ ۔۔۔ نشانِ عشقِ کامل بود شب جائیکہ من بودم
خمِ زلفِ نگارِ کرد پنہاں طرفہ اعجازے ۔۔۔ خیالم در سلاسل بود شب جائیکہ من بودم

نہ جانے کیا سمجھ کر ہنس پڑے ہیں　　یہ ہے تمہیدِ ذوقِ اعتنا کیا
نہ ہونا بھی بقدرِ یک نفس ہے　　ہماری ابتدا کیا۔ انتہا کیا
جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں　　خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا[1]

---

[1] یہ ایک طرحی غزل کے کچھ اشعار ہیں۔

[پچھلے صفحہ سے] محترمہ کی یہ غزل بہت بلند اور قابلِ تحسین و ستائش ہے مگر اس زمین میں جو امیر خسرو کی نکالی ہوئی ہے خود امیر خسرو کی غزل آج بھی اپنا حریف تلاش کر رہی ہے۔ ملاحظہ

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم　　بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم
پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے　　سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم
رقیباں گوش بر آواز او در ناز و من ترساں　　سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اسی زمین میں شاہ تراب علیؒ اور اوحدیؒ نے بھی اچھی غزلیں لکھی ہیں۔

شاہ تراب علیؒ کی غزل یہ ہے۔

نہ ہوشم بود و نے دل بود شب جائیکہ من بودم　　نمی دانم چہ محفل بود شب جائیکہ من بودم
رقیباں در پیش بودند من دور از درش ہیہات　　چہ حسرتہا کہ حاصل بود شب جائیکہ من بودم
نشد از زلفِ خونخوارش مجال بوس رخسارش　　بہ مخزن مار حائل بود شب جائیکہ من بودم
بدل ہرگز نہ آید بازہ از کوئش کسے یا رب　　بہ لیلیٰ چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم

ذیل کا مزید انتخاب راقم الحروف کا کیا ہوا ہے

آہ وہ ایامِ عشرت آہ وہ لیل و نہار — واپس آسکتے نہیں ہیں زندگی میں نہیں
دورِ خوش کامی گیا عہدِ نشاط اُڑ گیا — بن گئی بزمِ مسرت آہ اک ماتم سرا
زندہ اب وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں — آہ وہ عہدِ مسرت مل نہیں سکتا کہیں
چشمِ ارماں خونچکاں قلبِ تمنا بیقرار — آہ اُمیدیں ہیں یوں ماتم زدہ و سوگوار
کیا خبر تھی اسطرح لٹ جائیگا یہ کارواں — کیا خبر تھی درپئے آزار ہے یوں آسماں
آہ یہ عصرِ مسرت خواب سا ہو جائے گا — حشر تک اسکا تصور آہ یوں تڑپائیگا

(پچھلے صفحہ سے) ترا آب از تیرِ مژگانش جہانے نیم جاں می شد
عجب انبوہِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

اور اوحدیؒ کی غزل یہ ہے:-

نقاب از روئے او وا بود شب جائیکہ من بودم — ز جنبش شور و غوغا بود شب جائیکہ من بودم
ہمہ مستی و مدہوشی حریفاں را کہ بود آخر — ز چشمِ ساقیٔ ما بود شب جائیکہ من بودم
ز پیشِ شمعِ رخسارِ نگارِ ما چو پروانہ — ز ہر سو رقصِ دلہا بود شب جائیکہ من بودم
غم و خمخانہ و ہم بادہ و ہم جام و ہم مطرب — ہماں آں دلبرِ ما بود شب جائیکہ من بودم

ز جامِ لعلِ او چوں اوحدی پیرِ مغاں ساقی
ہمہ مدہوش و شیدا بود شب جائیکہ من بودم

فغانِ پنہاں

وہ دن کہاں ہیں یارب جب ہم بھی شادماں تھے
جب ہم نوا ہمارے یہ ارض و آسماں تھے
رنگینیٔ عدن سے معمور تھا گلستاں!
نکہت فروشِ گل تھے اشجار گل فشاں تھے
تھیں عنبریں ہوائیں مخمور تھیں فضائیں
قطراتِ ابرِ رحمت سبزہ پہ دُرفشاں تھے
نہروں کا وہ ترنم، موجوں کا وہ ترا کم
اس زمزمہ پہ نازاں ہاں نغمۂ خیاں تھے
صبحیں صباحت افزا شامیں تھیں عطر آرا
راتیں مہ منوّر دن شمس ضوفشاں تھے

(اشکِ خونیں صفحہ ۲۰،۱۹)

بیکسی کی ایک دنیا دیدۂ لبریزِ خوں　　آہ انفاسِ دلِ مضطر ہیں محرومِ سکوں

(اشکِ خونیں ص ۳۵)

ہاں پدر کا غم یتیمِ مضطرب کے دل سے پوچھ　　حسرتِ منزل کسی گم کردہ منزل سے پوچھ
لذتیں دردِ تپش کی دیدۂ بسمل سے پوچھ　　آہ ناکامی کی حسرت سعیِ لاحاصل سے پوچھ

(اشکِ خونیں ص ۳۵-۳۶)

میری قسمت کی طرح اُف تم بھی اب خاموش ہو　　میں سمجھتی تھی کہ تم غمخوار ہو غم کوش ہو

میری حسرت کی طرح تم پر اُداسی چھا گئی دل تمھارا اُف نہ میری آہ کچھ تڑپا گئی
یہ خموشی یہ سکوت اُف کس خطا کی ہے سزا کچھ تو بتلاؤ مجھے بہرِ خدا بہرِ خدا
کی تمھاری گفتگو نے بھی خموشی اختیار رہ گئی خاموش ہو کر آہ چشمِ بیقرار

[اشکِ خونیں صفحہ ۳۶-۳۷]

الہ آباد سے

اے الٰہ آباد اے بیت السکوں دار الاماں زینتِ گردونِ گرداں گردشِ ہندوستاں
اے کہ تیرا نام تھا سرمایۂ صد آرزو ذات تیری گوہرِ امید کی تھی آبرو
اے کہ تیرا ذکر نورِ دیدۂ مشتاق تھا اے کہ تو قلبِ حزیں کا وجہِ صد تسکیں رہا
اے کہ تھیں تیری ہوائیں نکہتِ بستاں فروش اے کہ تھیں تیری فضائیں گلشنِ رضواں فروش
اے کہ دریا تھے ترے تسنیم و کوثر آشنا قطرہ قطرہ جن کا رشکِ چشمۂ حیواں تھا
اے کہ تیرے خار تھے گلہائے جنت آفریں تھی گیاہِ خشک رشکِ گلبنِ غنچہ نشیں
اے کہ تیرے روز روشن تھے جہانِ انبساط جن کے ہر لمحے سے عنبر پاش تھی بوئے نشاط
اے کہ تھیں راتیں تری اک نغمۂ نورِ سکوں جن کی خاموشی طمانیت کا تھی حسن فسوں
جنت آگیں تھیں شامیں تیری برسات کی بادۂ کوثر سے اُٹھتی تھیں گھٹائیں رات کی
اے کہ تیری فصلِ گل تھی رشکِ صبحِ جناں لالہ و گل سے ٹپکتی تھی شرابِ ارغواں
اے کہ تیرے ذرہ ذرہ میں تھا اک نورِ نشاط اے کہ ہر ذرہ میں تھی دنیائے مسرور نشاط
یاد بھی تجھ کو کبھی آتا ہے اے رنگیں ادا سرفروشانِ رہِ الفت کا اندازِ وفا
یاد بھی آتا ہے اے بستانِ جنت آشنا نغمۂ جذبِ محبت بلبلِ مہجور کا

یاد بھی آتی ہے تجھکو اے گلِ جنت فروش
اپنی جاں افزا شمیم و نکہتِ اُلفت فروش

یاد بھی آتی ہے تجھکو اے فلکِ رفعت کبھی
اپنے خورشیدِ منزہ کی درخشاں روشنی

محفلِ عیش و مسرت کچھ تجھے آتی ہے یاد
شمعِ خورشیدِ آستاں کی ضوئے نورِ خندہ زاد

یاد ہیں کچھ خاتمِ جذبِ وفا کے دل نشیں
وہ نقوشِ الفت و صدق و محبت آفریں

جن کی ہر تابش میں تھی دنیائے رنگینِ وفا
جس کے ہر لمحہ میں تھی صدق و محبت کی ضیا

آہ لیکن اے تغافل آزما غفلت نواز
کس قدر جانسوز ہے تیرا طریقِ بے نیاز

کر دیئے نذرِ فراموشی وہ رخشندہ گہر
جن کے ضو پر اہلِ دل قربان کر دیتے تھے سر

توڑ ڈالا شیشۂ خورشید آرائے وفا
جس کی تابش پر فدا کرتے تھے دل اہلِ صفا

آہ وہ پیمانِ اُلفت آہ وہ عہدِ وفا
تو نے سنگِ بے نیازی سے شکستہ کر دیا

”اہلِ دل نقشِ وفا کو یوں مٹا دیتے نہیں“
دولتِ صدق و صفا کو یوں لٹا دیتے نہیں

ہے کسی کے سر میں الفت کا جنوں اب تک وہی
ہے دلوں میں آج تک شمعِ وفا کی روشنی

ہاں پرستارانِ اُلفت آج تک بیتاب ہیں
تیرے شوقِ دید میں اُف ماہیِ بے آب ہیں

ہے ابھی تک دل میں برپا یہ ہجومِ آرزو
کاش آ جائے کہیں سے تیری عنبر بیز بو

جنبشِ تیغِ اجل کی یہ ستم آرا جفا
تیری جنت زا فضاؤں سے جدا یوں کر دیا

دور گردوں نے چھڑایا اُف تری آغوش سے
دور پھینکا آہ تجھ سے گردشِ ایام نے

شکل تیری کاش پھر اک بار آ جائے نظر
یہ تجلی دیدۂ بیتاب کو کر دے قمر

کاش تیری خاک سے آنکھوں کی پھر تابش بڑھے
دل ہر اِک جنت بنے اُف پھر ترے دیدار سے

غم کا دریا موجزن ہے بحرِ محسوسات میں
اشکِ خونیں کا تلاطم قلزمِ جذبات میں

جوشِ غم سے طاقت گھٹتا رہتی ہے تمام
السلام اے مرکزِ جذبِ تمنا السلام

(اشکِ خونیں صفحہ ۴۰ و ۴۴)

ہلالِ رمضاں

مژدہ باد اے مومنانِ تشنہ کام
جلوہ افگن ہوگیا ماہِ صیام

چشمِ روشن ہے تجلّی آفریں
مرجعِ تنویرِ محرابِ جبیں

جنبشِ مژگاں ہے پیغامِ سرور
عکسِ ابرو بارشِ امواجِ نور

ہیں لبِ نازک تبسّم آشنا
جلوۂ رخسار ہے تقدیس زا

آگیا ماہِ مبارک مژدہ باد
قلب و دل ہیں کس قدر مسرور و شاد

السّلام اے مخزنِ فیضِ عطا
السّلام اے معدنِ صدق و صفا

السّلام اے رحمتِ ربِّ کریم
السّلام اے لطفِ رحمٰنِ رحیم

عظمتِ توحید کے سرمایہ دار
برکتِ تقدیس کی رنگیں بہار

ہیں جلو میں رحمتیں جلوہ نشاں
ہر قدم سے قدس کی تابانیاں

نوبہارِ گلشنِ اسلام ہے
یا خدا کا بہتریں انعام ہے

ہے دوائے دردمندانِ حزیں
مرہمِ تسکینِ قلبِ غم نشیں

منبعِ راحت ہے بہرِ عاشقاں
مژدۂ رحمت برائے عامیاں

قاصدِ رنگیں لقائے دوست ہے
تو پیامِ دلربائے دوست ہے

متصل کرتا ہے تو معبود سے
روحِ ساجد کو درِ مسجود سے

قربِ بندوں کو خدائے پاک کا
دامنوں میں تیرے ہوتا ہے عطا

برکتیں ہیں ہر قدم سے جلوہ بار
رحمتیں ہیں ساتھ تیرے بیشمار

ہیں پیامِ لطف یہ لیل و نہار
شانِ رحمت ہر طرف ہے آشکار

بخشش مولا کا ہوتا ہے وفور   رحمتِ رحمان کرتی ہے ظہور
جوش میں آتا ہے دریائے کرم   بخششیں ہوتی ہیں یاں ہر لحہ رقم
عفو ہوتی ہیں خطائیں روز و شب   رحمتیں ہوتی ہیں حاصل بے طلب
اے مہ تقدیس پرور والسما   تو رہے اسلام پر رحمت فزا
برکتیں تیری تجلی زار ہیں   تا قیامت گلشنِ اسلام میں
مومنوں کو اے خدا توفیق ہو   وہ بجا لائیں ترے احکام کو
منحرف ہرگز نہ ہوں اسلام سے   حبِّ مذہب ان کی رگ رگ میں رہے

ہے دعا پنہاں کی اے ربِّ جہاں
نورِ ایماں سے رہے دل ضوفشاں

شبِ ماہ

حُسن کی شفاف لہریں مصدرِ صد خامشی   ایک سکوتِ مستقل برسا رہی ہے روشنی
منبع انوارِ تاباں ہے بساطِ آسماں   ہو گیا ہے ماند رنگِ ارغوانِ کہکشاں
جلوہ آرا ہے بصد اندازِ محبوبی قمر   عارضِ روشن میں امواجِ تجلی منتشر
ہر ادا سے اک سکوتِ دلربا جلوہ نما   ہے نگاہوں کا توجہ بھی باندازِ حیا
ڈھل گئے ہیں نور کی موجوں سے رخسارِ فضا   ذرہ ذرہ مرکزِ تنویر ہے آئینہ سا
ہے بساطِ سبزۂ رنگیں جوابِ آسماں   سرد اور شفاف قطرے ہیں گلوں پہ دُرچکاں
نازنیں پودوں کی شاخیں بے خبر ہیں محوِ خواب   جھک گئی ہے نیند سے نرگس کی چشمِ سیم تاب
ہے ردائے نور میں ملفوف نظمِ کائنات   ایک سنجیدہ سکوں میں غرق بزمِ شش جہات

غرق بحرِ نور میں ہے دامنِ بزمِ فلک
پڑ گئی پھیکی کواکب کی ضیا افشاں جھلک

چشمِ نازاں کا توجّہ نازشِ تنویر ہے
خندۂ لب ہائے رنگیں کیف کی تفسیر ہے

ہر قدم پر ہو رہی ہے اک متانت سی نثار
جنبشِ ابروئے محرابی ہے حسنِ صد وقار

ہیں سبک رفتار امواجِ نسیمِ مشکبار
پتّی پتّی پر تو انوار سے تابش نثار

چٹکے چٹکے کچھ شگوفے کھل رہے ہیں ناز سے
نسترن ہے عطر افشاں دلربا انداز سے

ہے تجلّی ریز جس سے شبنمی تاروں کا نور
سرنگوں پتّوں پہ ہیں بکھری ہوئی روشن سطور

پتّیاں چمپا کی کیفِ نوم سے مخمور ہیں
دامنِ مژگاں ہیں لیکن نکہتیں مستور ہیں

سیم گوں چشموں کی موجیں محوِ راحت ہو گئیں
نیلوفر کی نرم کلیاں بے خبر سی سو گئیں

زرفشاں آئینۂ جو میں ہیں رخسارِ قمر
چاندنی پھیلی ہوئی ہے پارہائے آب پر

اے مہِ تاباں یہ تیرا طرزِ رفتارِ خموش
بہرِ گوشِ قلب ہے پیغامِ عرفان و سروش

گوشِ دل سنتا ہے آوازِ درائے کارواں
چشمِ بینا دیکھتی ہے نقشِ پائے رفتگاں

ڈھونڈتی ہے روح راہِ ارتقائے زندگی
چاہتا ہے دل کہ حاصل ہو حقیقی خرّمی

قلب کی گہرائیوں سے یہ نکلتی ہے دعا
روح کی وابستگی کو مطلقاً کر دے جدا

تابشِ عرفاں دلِ تاریک پر ہو جلوہ گر
قلبِ پنہاں میں ہو ضو افگن جمالِ منتظر

رک گیا ہے دامنِ ساحل میں اب آبِ رواں
ہو گئیں ساکن کنارِ جو کنول کی ڈالیاں

نو عروسِ نازنیں جیسے باندازِ ادا
موجزن پانی میں ہے یا ایک دریا نور کا

یہ نگاہوں کا تحیّر یہ سکوتِ متّصل
سرِّ پنہاں منکشف ہوتے ہیں پیشِ چشمِ دل

قلب پر کھلتے ہیں اسرارِ تماشائے حیات
منحرف کرتی ہے دل کو زندگیِ بے ثبات

راحتِ اصلی کو ہوتی ہے نظر کی جستجو
آنکھ کو بے کیف آتے ہیں نظر یہ رنگ و بو

اس حیاتِ منتشر سے اے خدائے لایزال
کر عطا جذبِ حقیقت سے حقیقی اتصال

مست کر دے روح کو سکرِ خمارِ معرفت
چشمِ دل ہو محوِ دیدارِ نگارِ معرفت

ہے آہ درد و سوز کی دنیا لئے ہوئے
طوفانِ اشکِ خونِ تمنا لئے ہوئے

میں ایک طرف ہوں شکلِ خزاں پائمالِ یاس
اک سمت وہ بہار کا جلوہ لئے ہوئے

مجنوں سے تو حقیقتِ صحرائے نجد پوچھ
ہے ذرّہ ذرّہ جلوۂ لیلیٰ لئے ہوئے

عشقِ جنوں نواز چلا بزمِ ناز میں
اک اضطرابِ شوق کی دنیا لئے ہوئے

میری تو ہر نگاہ ہے وقفِ عبودیت
وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا لئے ہوئے

اے اجل تجھ کو مبارک ہوں یہ ظلم آرائیاں
لوٹ لے دل کھول کر ظالم یہ گلزارِ جہاں

ہے مرتّب اپنی ہستی سے ترا دریائے ظلم
ہے ہمارے خون سے لبریز یہ مینائے ظلم

میری بربادی میں مضمر تیرا رازِ زندگی
سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی

آہ ہو جائے شکستہ کاش یہ تارِ نفس
ہو کہیں آزاد یہ مرغِ گرفتارِ نفس

کر دے اے بادِ اجل گل اب مری شمعِ حیات
میرے روزِ زندگی کی کاش اب ہو جائے رات

کاش پہنچے تجھ تلک میرا پیامِ اشتیاق[1]
کاش سن لے آج تو بھی قصۂ دردِ فراق

---

[1] یہ اشعار ایک نظم سے لئے گئے ہیں جو موصوفہ نے محترمہ خاتون اکرم کی ذات پر لکھی تھی۔

کیا کہوں تیری جدائی نے کیے کیا کیا ستم
ترجمانِ قلبِ مضطر ہے مری مژگانِ غم
تیرا جانا اک قیامت ہو دلوں کے واسطے
روح فرسا کیا کہوں کس درجہ تیرا ہجر ہے
قلبِ مضطر، چشمِ نم، سینہ تپاں مثلِ شرر
جنبشِ مژگانِ تر برساتی ہے خونِ جگر

تہنیت

آسمانِ نیلگوں پر ضو فشاں ہے ماہتاب
سلکِ گوہر کی طرح بکھری ہے سلکِ کہکشاں
ٹمٹماتے ہیں ستارے جس طرح چشمِ حباب
ہے فضا ساکن، زمیں خاموش، ساکت آسماں

پائیں کے سیگوں غنچے بھی ہیں سوئے ہوئے
ہے تقاطرِ شبنمِ گلریز کا گوہر تراش
برگ گلہائے حسیں اک کیف میں کھوئے ہوئے
اک شعاعِ نور سی ہے آسماں سے سیم پاش

رک گئیں امواج، ساکن ہو گیا آبِ رواں
نیلوفر آغوشِ جو میں سو رہا ہے بے حجاب
جھک گئیں خاموش چشمے کے کنارے ڈالیاں
عکسِ مہ سے اک تجلی ہے تہِ دامانِ آب

اک فضائے کیف آور میں یہ بزمِ رنگ و بو
محفلِ رنگیں میں جوشِ شوق و سامانِ طرب
ذرّہ ذرّہ سے نمایاں انبساطِ آرزو
پتّہ پتّہ گل بداماں گل بدوش و گل بکف

مرحبا جوشِ تمنّا حبّذا شوقِ سرور — عشرتِ رنگیں سے ہے تابش فزا تارِ نظر
مرتعش ہے قلب کے پردوں میں اک کیفِ طہور — ہے شبِ امید میں عکسِ تجلّائے سحر

آرزوئے دیرینہ امیدوں کی بر آئی ہے آج — عشرتِ شامِ تمنّا رشکِ صبحِ عید ہے
لے رہی ہے رونقِ شب صبحِ فردا سے خراج — فضلِ ربانی کی شامل اس طرح تائید ہے

ہو مبارک آپ کو اے ہمنوایانِ چمن — محفلِ عشرت فروزاں جلسۂ شوق آفریں
ہو مبارک آپکو اے نکتہ سنجانِ سخن — مجلسِ شعر و ادب بزمِ لطیف و دلنشیں

یہ گلستاں حشر تک گل ریز و گل افشاں رہے — اہلِ گلشن کی نوائیں آسماں افراز ہوں
یہ چمن زارِ ادب پنہاں طرب ساماں رہے — اب دعا ہیں اہلِ محفل میری ہم آواز ہوں
تا ابد بزمِ سخن ہو ربِّ عالم پُر بہار — گل بدوش و گل بداماں گل بکف گل در کنار

---

۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو دہلی میں ایک زنانہ مشاعرہ ہوا تھا یہ نظم اس کے آغاز میں پڑھی گئی تھی۔

ت

تسنیم

جمیلہ خاتون نام اور تسنیم تخلص ہے۔ ملیح آباد کی رہنے والی ہیں۔ آپ دورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز و حسرت ہے۔ اشعار جذبات کے ترجمان اور کیفیاتِ قلب کے آئینہ دار ہیں۔

زندگی کو ایک بحرِ بیکراں پاتی ہوں میں　　ان کے ہاتھوں مٹ کے عمرِ جاوداں پاتی ہوں میں

خود بخود دل ہو گیا دونوں جہاں سے بے نیاز　　اب زمینِ عشق گویا آسماں پاتی ہوں میں

چھٹ چکے سے دل بجھا رہتا ہی تیری یاد میں　　چاندنی راتوں میں اشکوں کو رواں پاتی ہوں میں

سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبینِ شوق میں　　اے حقیقت تیرا نقشِ پا کہاں پاتی ہوں میں

اب بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں کسی کی یاد میں　　عندلیبِ زار کو جب نوحہ خواں پاتی ہوں میں

اپنا اے تسنیم اس دنیا سے گھبراتا ہے دل
یاں کی ہر شے کو نقطہ وہم و گماں پاتی ہوں میں

ث

ثریا

احمد النساء بیگم نام اور ثریا تخلص ہے۔ سید ظہور الحق صاحب سابق مہتمم دائرۃ المعارف (حیدرآباد دکن) کی دختر ہیں۔ محترمہ احمد النساء کی پیدائش ۲۷ رمضان ۱۳۳۴ھ یوم جمعہ کو ہوئی۔ ابتدائی فارسی اور اُردو تعلیم

گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ تعلیم المعلمات میں شریک ہوئیں۔ پھر مدرسہ فوقانیہ اندرونِ شہر سے عثمانیہ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر کلیہ اناث میں تعلیم پائی۔

اردو زبان کی ادبی خدمت نظم نگاری، تراجم، اور مضمون نگاری کے ذریعہ کر رہی ہیں۔ شمالی ہند اور حیدرآباد کے رسالوں میں کلام اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ شاعری میں آپ کو اپنے والد سے تلمذ حاصل ہے کلام میں صفائی موجود ہے۔ اسلوبِ بیان صاف اور سادہ ہے۔

آپ فارسی میں بھی کہتی ہیں جلسوں وغیرہ میں بھی اکثر نظمیں سناتی ہیں۔ ذیل کی غزل آپ نے بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل پر لکھی ہے مگر وہ رنگ نبھ نہیں سکا۔

یں فلک کی آنکھ میں خار تھی میں زمیں کے دوش پہ بار تھی
نگہِ زمانہ میں عار تھی، اسی غم میں سینہ فگار تھی

ترے لطف نے مجھے چن لیا، مرے دل کی بات کو سن لیا
میرا عیب چھوڑ کے گن لیا، مرے گن کو اور بھی دھن لیا

ترے لطفِ عام نے بے صلہ، مجھے اپنی بزم میں دی جگہ
ترا لطفِ عام ہی بے شبہ ہے مرے سکون کا واسطہ

تری آرزوئیں تمام ہوں، تجھے عمرِ خضر کی ہو عطا
تو ہمیشہ پائے ترقیاں، رکھے نیک نام تجھے خدا

دل ہے تمھاری جانب نظریں اِدھر اُدھر ہیں
سمجھے نہ کوئی تاکہ منظورِ میری تم ہو

سچ ہے پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہِ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

ثریا

ثریا تسلیم نام اور ثریا تخلص ہے۔ بی۔ اے تک تعلیم پائی ہے ؛ دورِ جدید کی ایک خوش ذوق و خوش گو شاعرہ ہیں۔ آپ کے اشعار بلند ہوتے ہیں۔ آپ کے یہاں غیرت، خودداری، اور خیالات کی بلندی موجود ہے۔ آپ کا اسلوب بیان پاکیزہ اور زبان شستہ ہے۔

رودادِ تخیل

اُمید سے تو جنتِ رقصاں نہ طلب کر
بن یاس مگر جنبشِ گریزاں نہ طلب کر

محنت ہے جہنم تو سمجھ لے اسے گلزار
گلزار ہے عشرت تو گلستاں نہ طلب کر

شیرینیِ احسان کی ہے تلخی سمِ قاتل
اس زہر کو لے بندۂ احساں نہ طلب کر

آنکھوں سے ڈھلکتے رہیں گر خون کے آنسو
عمان سے بھی تو گہرِ غلطاں نہ طلب کر

جل بجھ تو اسی آگ میں جو دل سے لگی ہو
خرمن کیلئے شعلۂ رقصاں نہ طلب کر

تو ولولۂ شوق کی منزل سے گزر جا
منزل کیلئے جادۂ حیراں نہ طلب کر

بجلی کے خزانے ہیں تیری قلبِ تپاں میں
حاسد کیلئے برقِ خراماں نہ طلب کر

گر موجِ قناعت تیرے ساحل ہی سے ہو جو
دولت سے اُمنڈتا ہوا طوفاں نہ طلب کر

رہتا ہے سبکبار تو آئینِ عمل سے — سرمایۂ اندوہ فراواں نہ طلب کر
تدبیر کے ہر پھول میں فردوسِ عمل ہے — تقدیر کے غم میں گل و ریحاں طلب کر

ثریا

محترمہ عائشہ حسین ثریاؔ کاکوری کی شاعرہ ہیں، کلام اکثر عصمت، خاتونِ مشرق، ایشیا وغیرہ رسالوں میں چھپتا ہے۔ آپ محاکات خوب لکھتی ہیں۔ آپ کا بڑا جوہر منظر نگاری میں جذبات کی آمیزش ہے، طرزِ ادا نہایت لطیف و پُر کیف ہے۔

چشمہ

آکاش کے نیلے دامن کے — تاریک و منور سایوں میں
سرسبز زمیں کے سینے پر — قدرت کے حسیں کہساروں میں
پھولوں کی رنگیں بستی سے — کھیتوں کے حسیں میدانوں میں

فطرت کے حسیں ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

کہسار کے سنگیں سینے کا — بے چین سا رازِ سربستہ
رخسار پہ کوہی میت کے ان کے — اک اشک ہوں چشمِ فطرت کا[1]
قدرت کے دوش پہ گیسو ہوں — بکھرا سا اور سمٹا یا سا

[1] محترمہ اداؔ بدایونی نے بھی اپنی نظم "جھیل" میں جھیل کے لئے یہی تشبیہ اختیار کی ہے ع "آنسو ٹھہر گیا ہے رخسار پر زمیں کے"

فطرت کے حسیں ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

کل دنیا سپنوں میں گم ہے　　　اور سانس کی بھی آواز نہیں
سوتے ہیں نوا سنجانِ چمن　　　مصروفیتِ پرواز نہیں
کچھ محفل سونی سونی ہے　　　وہ نغمہ نہیں وہ ساز نہیں

تاروں کی چپ چپ چھاؤں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

اس وقت فضا کی مدہوشی　　　پُر کیف ہوا کے جھونکوں سے
مہتاب کی زریں کشتی کو　　　تاروں کی چمکتی آنکھوں سے
پوشیدہ زمیں پر لاتی ہے　　　کھینے کو سنہری کرنوں سے

ہر ذرّہ رشک سے تکتا ہے
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

ثروت :-

ثروت جمیل نام۔ اور ثروت تخلص ہے۔ آپ کا تعلق مظفر نگر سے ہے۔ آپ کے دل میں قوم و ملت کا بڑا درد ہے۔ کلام میں بڑا جوش و کیف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ حالیؔ اور خصوصاً اقبالؒ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کا کلام قومی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

راہ گم کردہ کو پھر راہ دکھا دے یارب　　　موجِ گم گشتہ کو دریا سے ملا دے یارب
کون ہے "پھر یہ زمانے کو بتا دے یارب　　　بندۂ حق کو غلامی سے چھڑا دے یارب
ظلمتِ کفر کا ادبار مٹا دے یارب　　　شمعِ خاموش کو پھر آج جلا دے یارب

رشکِ خورشید تو ذرّے کو بنا دے یارب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یارب

پھر سرِ دوشِ ثریا ہو مقامِ مسلم　　　غیرتِ مہرِ صبا بارہ ہو نامِ مسلم
مے توحید سے لبریز ہو جامِ مسلم　　　پھر صنم خانۂ ہستی ہو غلامِ مسلم
کندۂ دہر ہو پھر نقشِ دوامِ مسلم　　　کاش پھر زندۂ جاوید ہو نامِ مسلم

مردِ مومن کو پھر آزاد بنا دے یا رب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یا رب

ناخدا سے ہوئے بیگانہ جو اہلِ کشتی　　　کون تھے آہ رسولِ مدنی بھول گئے[1]
اس قدر مست ہوئے پی کے غلامی کی شراب　　　اپنا افسانۂ شیشہ شکنی بھول گئے
نشۂ عیش میں غافل ہیں مجاہد تیرے　　　پھر تلوار پہ تشنہ دہنی بھول گئے

رازِ توحید مسلماں کو بتا دے یا رب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یا رب

زخم کھا کھا کے جو دشمن کو دعا دیتے تھے　　　آج باہم وہی لڑ لڑ کے مرے جاتے ہیں
جن کے سینوں میں تھا گنجینۂ ضبطِ الفت　　　حال پر اپنے وہ اغیار کو ہنسواتے ہیں
خونِ مسلم کے ہوئے خود ہی مسلماں پیاسے　　　اپنے گھر آگ لگانے میں مزے آتے ہیں

خانہ جنگی کو ہماری تو مٹا دے یا رب
بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یا رب

---

[1] علامہ اقبال ؒ

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد　　　می شناسی عصرِ ما، با ما چہ کرد
عصرِ ما، ما را ز ما بیگانہ کرد　　　از جمالِ مصطفٰے بیگانہ کرد
(مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" صفحہ ۲۳)

جوش میں کاش پھر آجائے مسلماں کا لہو ‏ توڑ دیں بندِ غلامی تیرے آزاد غلام

ماہ و انجم کو گلے اُٹھ کے ملا دیں باہم ‏ حرّیتِ اُلفت و توحید کا ایک پیغام

تیشۂ حق سے کریں قطع حصارِ باطل ‏ ظلمتِ دہر میں ہو روشنی شمعِ کلام

قلب پر تمغۂ ایمان لگا دے یا رب

بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یا رب

عرصۂ جہد میں سرگرمِ عمل ہو مسلم ‏ مردہ دل قوموں کو پھر دولتِ جانبازی دے[1]

خلقِ اسلاف کی تقلید میسر ہو ہمیں ‏ پالے خواہش کو پھر ہمتِ آبائی دے

لپکے فرہاد ترے در پہ کھڑی ہے ثروت ‏ روحِ مسلم ہے گرفتار پھر آزادی دے

دستِ الطاف پھر اس سمت بڑھا دے یا رب

بختِ خوابیدۂ مسلم کو جگا دے یا رب

ج

جمال جمالہ۔ محترمہ بلقیس جمال بریلوی

محترمہ بلقیس جمال دورِ جدید کی ایک نہایت ممتاز اور قابلِ فخر شاعرہ ہیں

---

[1] علامہ اقبال ؒ سے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے ؛ برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے (شکوہ)

آپ کا شمار دورِ حاضر کی ان شاعرات میں ہے جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے آپ کی ہستی اُردو شاعری کیلئے قابلِ فخر ہے۔ آپ کے کلام کا رنگ پختہ ہے مایوس و خونچکاں جذبات کی ترجمانی آپ کا خاص جوہر ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے قدرت کی باریکیوں کا بھی خوب مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی نظمیں مناظرِ فطرت کی مصوّری کا دلآویز نمونہ ہوتی ہیں۔ آپ کی تاریخی، قومی، ملی، اخلاقی، جذباتی اور رومانی نظمیں بہت پُرکیف ہیں اور شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔

آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے آپ کے جو حالات اپنی زیرِ نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

"محترمہ بلقیس جمال بریلوی دخترِ سوئم شیخ مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ پی۔ آئی۔ آفس الہ آباد ۸ دسمبر ۱۹۰۹ء کو بریلی میں پیدا ہوئیں۔ اور طفولیت میں اپنے والد کی جائے ملازمت الہ آباد چلی گئیں۔ ۸ سال کی عمر میں قرآن شریف اور اُردو وغیرہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکی تھیں پھر فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنی ہمشیرہ محترمہ رابعہ خاتون نہاں بریلوی سے حاصل کی، ۹ سال کی عمر میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ شروع ہی سے آپ کی تحریر کا خاص ادیبانہ رنگ تھا۔ چنانچہ اوّل دن ہی سے ملک کے جملہ اخبار و رسائل نے نہایت ذوق و شوق و امتیاز کے ساتھ آپ کی تحریریں شائع کرنا شروع کیں۔ طبیعت بچپن ہی سے شاعرانہ تھی۔ اور اوائل عمر سے جذبات میں درد اور سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کے جملہ افسانے حزنیہ اور دردناک ہوتے تھے

صغر سنی میں اساتذہ کا بیشمار کلام نوکِ زبان تھا۔ جسے آپ کے والد صاحب مرحوم اپنے صاحبِ ذوق دوستوں کو سنوا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ سمرنا فتح ہونے پر اسلامی جذبات سے برانگیختہ ہو کر قصیدۂ اوّل کی شکل اختیار کی۔ اور اسی وقت سے شاعری کی بھی ابتدا ہو گئی۔ نثر کی اصلاح تو خود والد صاحب قبلہ فرماتے تھے لیکن چونکہ وہ عروض سے ناواقف تھے اس لئے آپ نے غزلوں اور نظموں کی اصلاح قبلہ ماجد علی صاحب مرحوم و مغفور کے سپرد فرما دی۔ استادِ مرحوم نے کچھ عرصہ کے بعد اپنے بھتیجے سید طالب علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈووکیٹ الہ آبادی کی شاگردی میں دے دیا چنانچہ دو سال قبلہ طالب علی الہ آبادی نے نظم و نثر کی اصلاح دی اور پھر سندِ کامل دے دی۔

۱۹۲۵ء میں آپ کے والد صاحب نے وفات پائی۔ اور آپ اپنی والدہ صاحبہ کے ہمراہ بریلی تشریف لے آئیں۔ جہاں دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کی شادی مولانا حافظ عبد الجلیل صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل سے ہو گئی جن سے آپ کے والد مرحوم کچھ عرصہ گزرے خود رشتہ فرما چکے تھے۔۔۔ حافظ صاحب مرحوم آپ کے والد کے قریبی عزیز تھے۔ آپ کے والد نے آپ کا رشتہ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ بعد شادی آپ اپنے عزیز شوہر کے ہمراہ کچھ عرصہ مظفر نگر اور پھر میرٹھ میں مقیم رہیں جہاں وہ وکالت کرتے تھے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۰ء کو آپ کے رفیقِ زندگی نے اچانک داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور عرصہ تین سال سے جب سے آپ کے شریکِ زندگی نے ساتھ چھوڑا ہے

آپ کی دماغی حالت اس شدید صدمہ کی وجہ سے ازحد مضروب ہے۔ اور آپ کے علمی و ادبی مشغلے سب مردہ ہو گئے ہیں۔ آپ کا کلام اوّل دن سے ازحد مقبول ہوا۔ چونکہ ابتدا ہی سے رنگین و پُرسوز تھا۔ ملک کی بیشتر شاعرات نے آپ سے اصلاحِ سخن حاصل کی اور آپ کی شاگردی اختیار کی آپ کی نظموں کے دو مجموعے "آئینۂ جمال" اور "قوس قزح" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اور آپ کے افسانوں کے مجموعے زیرِ اشاعت ہیں۔ آپ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور مشرقی تہذیب کی پرستار ہیں چنانچہ شرعی پردے کو پسند فرماتی ہیں۔ اسی وجہ سے باوجود کوشش و جستجو آپ کا فوٹو کبھی کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔ آپ کے پانچ بچے ہیں جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ آپ نہایت رقیق القلب، دردمند اور خوش مزاج ہیں طبیعت سادگی پسند اور تصنع سے مبرّا ہے۔"

خود محترمہ کا انتخاب جو آپ نے اس تذکرہ کے لئے عنایت فرمایا ہے یہ ہے:-

بلا جنوں کو جو پیغامِ خار پیمائی	دہانِ دشت سے آوازِ الاماں آئی
عدم سے جوششِ وحشت لیں تاوجود آئی	کہاں سے کھینچ کے مجھکو قضا کہاں لائی
نقاب اُٹھا کے مری آہ ان کی پلکوں میں	نگاہِ ناز سے کچھ بجلیاں چرا لائی
یہاں تو گوشۂ دل ہی میں جانے کیا دیکھا	کہ ہم طوبیٰ پہ کرتے ہیں خار پیمائی

جمالِ نازکی جانب نگاہ کیوں اُٹھے
نظر کو ان کی ہے اندیشۂ مسیحائی

قلب جب آئینۂ آغاز ہے — آنکھ کیوں نا آشنائے راز ہے
کشمکش ہے کفر و ایماں کی فضول — آخری آنسو کشودِ راز ہے
لغزشِ پیہم کی پردہ داریاں — چشمِ ساقی کا نیا انداز ہے
نقشِ سجدہ ہے سرِ منزل جہاں — بس وہیں بابِ حریمِ ناز ہے
کب ہوئی ضائع متاعِ دردِ دل — میرا اک آنسو بقائے راز ہے

نگاہ و تمنا کی خاموش وسعت — کھنچی آ رہی ہے دو عالم کی دولت
اٹھا دو ذرا آنکھ سے میری پردہ — دکھا دو مجھے حاصلِ دردِ اُلفت

تارہیں اشک کے پِروؤں میں — گوہرِ سیم تاب آ تو سہی
میری آنکھیں ہیں بحرِ اشک رواں — دُرِّ مکنوں خطاب آ تو سہی
چاند ہو ماند چاندنی پھیکی — غیرتِ ماہتاب آ تو سہی
لالہ و گل پہ اوس پڑ جائے — بالبِ خوش گلاب آ تو سہی
پانی پانی ہو دیکھ کر شبنم — دُرِ دنداں کتاب آ تو سہی
پردۂ دل تجھے چھپائے گا — تو کبھی بے نقاب آ تو سہی

سرِ محشر وہ کہتے ہیں تو ہے کون؟ — جبیں سے مٹ گیا نقشِ وفا کیا
کسی کی جستجو منزل بہ منزل — جوالہ اس جنوں سے فائدہ کیا

تربت پہ چڑھیں پھول نہ بتی نہ دیا ہو — اک داغ ابھر آئے جو ان سب سے سوا ہو
آئینۂ دل چھپ ہوا ایک ضرب سے ٹھوکی — ٹوٹے ہوئے ہر ٹکڑے میں تو جلوہ نما ہو

در پردہ یہ عالم ہے کہ ہر آنکھ نے دیکھا　　ظاہر میں یہ پردہ نہ کوئی دیکھ رہا ہو
پیمانۂ ہستی بھرے ہونٹوں سے لگا کر　　ارشاد یہ ہوتا ہے کہ سرزد نہ خطا ہو

سطورِ ذیل میں محترمہ کا مزید انتخاب کلام درج کیا جاتا ہے جو راقم السطور نے کیا ہے
آیا فضائے گل میں پیغامِ زندگانی　(۱)　کلیوں کی خامشی کو بخشی نئی جوانی

نمونہ فارسی کلام

بہ دستِ ظلمتِ شب ہائے غربت　　سوادِ ماہِ منزل می فروشم
نگاہِ ناز در چشمِ نہاں شد　　کہ من قاتل بہ بسمل می فروشم

چشمِ غمازِ نہاں ایوائے دلداری نہ کرد　　راز پنہانی زِ رنگِ اشک پُر آب آید بروں[۱]
چوں تماشائے دو عالم در نظر پوشیدہ　　اے چرا تا رِ نگاہت از حجاب آید بروں

تبسم ہائے گوناگوں بہ چشمت برق اندازے　　بہ دانم خندۂ تقدیرِ من در پردۂ نازے
پریشاں گشتہ ام از دردِ بیداری بہ خواب آیم　　بہ دیدم کنجِ تنگِ ظلمت آرائے بلا سازے

نوٹ :- [۱] اس زمین میں سب سے مشہور غزل مولانا جامی کی ہے جس کا مطلع یہ ہے
ایں قدر مستم کہ از چشمم شراب آید بروں　　وز دلِ پُر حسرتم بوئے کباب آید بروں
اس زمین میں بسمل نے بھی اچھی غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے :-
تا کجا از چشمِ تر ماہم خونِ ناب آید بروں　　کاش از پہلوئے دل پُر اضطراب آید بروں "مج"

پُرکیف وادیوں میں شاخوں کی گُل فشانی — شبنم نوازِ غنچے اک حُسنِ ارغوانی

(۲) کلیوں کی بےحسی کو بادِ صبا نے توڑا — سبزہ کی خامشی میں نغمہ سا کچھ ہے پیدا
پتّوں نے ہلکے ہلکے اک مست راگ گایا — مدہوشِ کیف ہو کر شاخوں نے ساز چھیڑا

(۳) پھر رفتہ رفتہ گونجا اک میٹھا ترانہ — رنگینیٔ فضا سے آئی صدائے نغمہ
تھا ہمنوائے الفت ہر ذرہ اور قطرہ — تھا ہم صدائے عشرت ہر نخل ہر شگوفہ

(۴) رنگِ چمن کو یارب حسنِ فضا مبارک — غنچوں کو صبحِ نو میں تازہ ہوا مبارک
کلیوں کی خامشی کو نغزِ صبا مبارک — پھولوں کو بلبلوں کی رنگیں نوا مبارک

(۵) یارب بصد تمنا یہ عرضِ مدعا ہے — دن پھیر دے الٰہی خاموش التجا ہے
یہ عمرِ نو جبالہ لذت کشِ دعا ہے — ناکامِ آرزو کو تیرا ہی آسرا ہے

"مولانا راشد الخیری کی وفات پر"

عجب غمناک ہے اے زندگی اب تیرا مستقبل
فسانہ دورِ ماضی کا خدارا مت سنا اے دل
ہیں بحرِ یاس کی موجیں، نظر آتا نہیں ساحل
ٹٹولوں راہ اب کیسے ہوئی گُل مشعلِ منزل
پکاریں آہ اب کس کو نہیں ہے ناخدا کوئی
اجل تجھ کو مبارک ہو تیرا یہ ذوقِ بےدردی

تصوّرِ خاتون[1] میں

کیفِ غم میں خاک ہے جامِ شرابِ زندگی
آبشارِ درد ہے بحرِ سرابِ زندگی

دیکھ آنکھیں کھول کر اے محوِ خوابِ زندگی
جاں بلب یادِ اجل میں ہے حبابِ زندگی

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ آمد و شد بے خبر
دم زدن میں ہوگا برہم آہ خوابِ زندگی

منتشر ہو جائیں گے سب نغمہائے انبساط
جس گھڑی ٹوٹا کوئی تارِ ربابِ زندگی

یاسمیں شبنم بداماں گل گریباں چاک ہیں
منظرِ حسرت ہے نیرنگِ شبابِ زندگی

آسمانِ زیست پر دکھلا کے جلوہ دوپہر
گوشۂ مرقد میں ڈوبا آفتابِ زندگی

خاک اڑتی ہے گلوں کی بلبلیں خاموش ہیں
مختصر سا ہے یہی بابِ کتابِ زندگی

وقفِ ناکامی ہے اک اک ذرۂ بزمِ جہاں
کون کہہ سکتا ہے میں ہوں کامیابِ زندگی

کھیل ہے بچوں کا سازِ زندگی کا مشغلہ
موت کی آنکھوں سے دیکھے کوئی خوابِ زندگی

موت نے خاتونِ اکرم کی اشارہ کر دیا
دل کی حسرت آفریں آنکھوں کو بینا کر دیا

آہ اے خاتونِ اکرم جلوہ فرمائی تری
یاد ہے آنکھوں کو وہ تصویرِ رعنائی تری

بنتِ ہستی کی ادائیں مرتسم ہیں قلب پر
جلوہ گر آنکھوں میں ہے جذبات فرمائی تری

لوحِ دل پہ نقش ہائے تازہ تر منقوش ہیں
بحرِ جاں میں آج تک ہے موج افزائی تری

تو نے رازِ دہرِ فانی آشکارا کر دیے
حاصلِ صد زندگانی تھی حیا زائی تری

آشنائے لذتِ حرماں تھی چشمِ پرحجاب
درد میں ڈوبی ہوئی ہر جذبہ آرائی تری

---

[1] محترمہ خاتون اکرم صاحبہ

یہ جمالِ مضطرب ہے آہ بیزارِ حیات کاش ملجائے اسے بھی نقش پیمائی تری
کشمکش ہائے زمانہ سے بہت بیچین ہوں
کب تلک یوں زہر نوشِ عالمِ فانی تری؟

یہ میرے بعد اے صیاد رنگِ گلستاں ہوگا لہو روئیں گے غنچے گل کا دامن دھجیاں ہوگا
ستارے ڈوبتے ہیں شمع کا بھی سانس آخر ہے خدایا کون اب رازِ نہاں کا رازداں ہوگا

چلے تلاش میں اسکی رہِ طلب میں مگر کچھ ایسے کھوئے کہ اپنی خبر بھی پا نہ سکے
جفائے اہلِ وطن کی یہ انتہا ہے جمالؔ ستم تک اپنے وطن کی ہم آہ کہا نہ سکے

انتخاب از "قوسِ قزح"

رنگیں شام ہے عالم آرا منظر ہے کچھ بھیگا بھیگا
رنگِ شفق ہے ہلکا ہلکا گلشن گلشن، صحرا صحرا

ساغرِ میگوں ہے ہر ذرّہ بادۂ کوثر ہے ہر قطرہ
صحنِ چمن ہے کیف کا دریا مست ہوئی ہے ساری دنیا

موجِ ہوا میں ہے اک نغمہ موجودات ہے غرقِ صہبا
قوسِ قزح کا دیکھ کے جلوا حیرت میں ہے چشمِ بینا

اُف یہ دھنک کا جلوۂ رنگیں ہر وادی ہے دامنِ گلچیں
سرخ لبوں میں بادۂ شیریں آنکھیں رنگیں عارض سیمیں

ناز بداماں محشر آگیں — دامن رنگیں، پلّو زرّیں
آنکھوں میں اک جامِ تبسم — پتلی میں آرامِ تبسم
ابرو میں اک دامِ تبسم — زلفوں میں اک شامِ تبسم
ہونٹوں پہ پیغامِ تبسم — سرتاپا الہامِ تبسم

(۱۹۳۸ء)

"گنگا کنارے"

جب غم کا اندھیرا چھاتا ہے — جب دنیا سے گھبراتی ہوں
دل میرا جب بھر آتا ہے — جب یاس زدہ ہو جاتی ہوں
جی شورش سے گھبراتا ہے — ہر بات سے جب اکتاتی ہوں
خود پاؤں مرا اٹھ جاتا ہے — گنگا کے کنارے آتی ہوں

(۱۹۴۹ء)

"پیغامِ عمل"

آ سکوتِ شام میں پھر نالہ پیہم کریں — آ لبِ خاموش کو پھر واقفِ ماتم کریں[1]
آہ دل کا شمعِ محفل کو بنا دیں رازدار — کرمکِ سوزاں کو سوزِ زیست کا محرم کریں
کھینچ لیں سینے سے پھر پوشیدہ نوکیں تیر کی — زخمہائے چاکِ دل شرمندۂ مرہم کریں
آ سرِ گلشن ہیں زخمِ غنچہ محتاجِ رفو — بلبلوں میں پھر بپا ہنگامۂ ماتم کریں

---

[1] علامہ اقبالؒ

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کردیں (بانگِ درا)

سیم گوں کلیوں کو رنگِ زندگی ہر رنگ دیں ¹ برگہائے خفتہ کو بیدار خوابِ غم کریں

اک شعاعِ نور چمکائیں جبینِ ماہ پر
ثبت کر دیں ایک آنسو آستینِ ماہ پر (صہ ۳۲)

شمع

آ، کہ تجھ میں جذب ہو کر میں بنوں جذبات نوش
آ کہ تیری مستیاں ہیں میری مخموری کا جوش
آ کہ تیرے زمزمے ہیں میری ہستی کا خروش
آ کہ تجھ میں سب مرے نالے ہیں تجلیات پوش
تیرے نغموں میں نہاں ہے رمز و اسرارِ حیات
تیری آہوں کا دھواں ہے آبروئے حسیات
دونوں مل کر جل بجھیں افسانۂ بیہوش میں
یعنی دونوں خاک ہو جائیں شرر جوش میں
دونوں خاکستر ہوں آتش خانۂ خاموش میں
پھونک دیں ہستی کو اپنی الفتِ مدہوش میں
آگ جو تجھ میں ہے وہ میرے دلِ غمگیں میں ہے
لاگ جو تجھ میں ہے میری آہِ آتش چیں میں ہے (صہ ۳۶)

---

¹ علامہ اقبالؒ

اس چمن کو سبقِ آئینِ نمو کا دے کر قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں [بانگ درا]

"پروانہ"

میں محوِ سوز و ساز ہوں خروشِ دل گداز ہوں
قتیلِ چشمِ ناز ہوں شہیدِ صد نیاز ہوں

میں نغمۂ خموش ہوں پیامِ سوز و جوش ہوں
شرر کدہ بدوش ہوں نوائے خوں فروش ہوں

کہانیٔ غمِ جہاں فسانۂ شرر چکاں
تباہیوں کی داستاں شرر چکان و خوں فشاں

غمِ دوامِ عشق ہوں کہ صبح و شامِ عشق ہوں
شہیدِ نامِ عشق ہوں کہ اک پیامِ عشق ہوں

جو ہے تلاشِ بیخودی نوائے دماغِ آدمی
تلاش کردہ زندگی کہ جو فقط مجھے ملی

میری حیاتِ مشتعل ہے ایک سوزِ مستقل
یہی جہانِ آب و گل یہی ہے جاں یہی ہے دل

فزوں ہے سوزشِ جگر دہک رہے ہیں بال و پر
نظر اٹھا، اٹھا نظر ہے شمع میری منتظر

لگی ہے آگ سر بسر
سلام! عمرِ مختصر

(۲۶ تا ۲۹)

"نغمۂ تمنّا"

اے برقِ تاباں جلوے دکھا جا
اے ساقیٔ جاں ساغر پلا جا
اے نغمہ ساماں نغمے سنا جا
بیخود بنا جا، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
غمزوں کا مسکن چشمِ تمنّا
جلووں سے روشن ہو دل کی دنیا
ہو جائے گلشن سبزہ بھی صحرا
اے حُسنِ رعنا، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
پردے اُٹھا دے او پردہ ساماں
جلوے دکھا دے او جلوہ افشاں
کافر بنا دے او کفر ساماں
اے سحرِ عُریاں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
آنکھوں کی سُرخی میخانہ ساماں
پتلی کی بجلی اک قلب لرزاں
رخ کی تجلی، ایمن بہ داماں

حسنِ فراواں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
بیدار کردے اسے صبحِ سیمیں
ہشیار کردے اے صورِ شیریں
سرشار کردے ساقیٔ رنگیں
اے حسنِ تمکیں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
پُر نور کردے اے ماہِ رخشاں
مخمور کردے اے کیف ساماں
مسحور کردے اے سحرِ عریاں
اے کیفِ عُریاں، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا
او جانِ دلبر کب تک یہ غمزہ
او شوخ کافر کب تک یہ عشوہ
ہے سنگِ در پر سجود جمالہ
او وجہِ سجدہ، آنکھوں میں آجا
آنکھوں میں آجا، دل میں سما جا

(ص ۲۹-۳۰)

"صبحِ نیاز"

جذبات ہیں اندوہگیں　　احساس ہے غم آفریں
ارمانِ دل، دل کے مکیں　　اور حسرتیں پہلو نشیں
برباد ہے قلبِ حزیں　　ویراں ہے روحِ آتشیں
تیری نوا ہے دل نشیں　　رازِ محبت کی امیں
آ، دل میں لے ناز آفریں　　جھکنے کو ہے میری جبیں
ہاں اے مؤذن دے اذاں
(ص ۳۲-۳۳)

ویران ہے یہ سینہ　　طوفاں زدہ سفینہ
طوفاں اٹھانے والے
اب آن کر بچالے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی
اے ناخدا دعا لے
برباد دل کی بستی　　ساکت ہے سازِ ہستی
عالم ہے ایک ہُو کا
بے نکہت و رنگ و بو کا
پھر بھی دلِ حزیں ہے
کاشانہ آرزو کا
ہاں پھر ہو جلوہ افگن　　دونوں جہاں ہوں روشن

"معصوم جادو"

اک حورِ صحرا، معصوم صورت　　اک حُسنِ سادہ روحِ ملاحت
اک شوخ جلوہ، کیفِ لطافت　　اک نورِ رعنا، جانِ نزاکت

تصویرِ جنت، سادہ نگارا
بوئے نزاکت، نازک ستارا

پُرکیف رنگت ساری گلابی　　صبحِ قیامت رُخ آفتابی
مخمورِ اُلفت آنکھیں شرابی　　شانِ نزاکت لب ماہتابی

سادہ ادائیں ممنونِ عفت
رنگیں نگاہیں مرہونِ عصمت

(پچھلے صفحے سے)

پھر لرزشِ تبسم
تھرائیں جس سے انجم
ذرّے ہوں وجد ساماں
کونین میں تلاطم
تو سامنے نکل آ　　اے مہرِ عالم آرا
عالم میں نور بھر دے
دل رشکِ طور کر دے
ہاں ہاں نظر اُٹھا کر
ہستی کو چُور کر دے

"تج" ۱۱

محوِ جراحت پلکوں کے نشتر وقفِ قیامت بدست ٹھوکر

ہونٹوں میں حسبِ بہلویں گاگر اُف یہ قیامت دامانِ جو پہ

یہ ہجومِ صحرا اکفر لب جو

دیکھا جمالہ معصوم جادو

تیری محبت

تجھ کو اپنے نافۂ گیسوئے پیچاں کی قسم
تجھ کو اپنے دوش پر زلفِ پریشاں کی قسم

تجھ کو اپنے سرمۂ چشمِ غزالیں کی قسم
تجھ کو اپنے جلوۂ بیباک و رنگیں کی قسم

تجھ کو میرے جذبۂ و جوشِ تمنا کی قسم
تجھ کو اپنے عشوۂ و اندازِ رعنا کی قسم

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سُن
داستانِ دردِ تاریخِ دلِ بیمار سُن

تیری اُلفت مرہمِ زخمِ دلِ مجبور تھی
تیری اُلفت روح و جانِ عاشقِ رنجور تھی

تیری اُلفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی
تیری اُلفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی

تیری اُلفت کا مغنی تھا ہر اک تارِ نفس

نام لینی تھی ترا تحریک آوازِ نفس

اس نے دیکھی ہیں لہو آمیز راتیں ہجر کی
اس نے دیکھی ہے مرے احساس کی آشفتگی

اونگھنے لگتے تھے تارے جب بیابانِ خواب سے
تیری الفت جاگ اٹھتی تھی کنارِ خواب سے

سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں
تیری الفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں

چاندنی راتوں کی کیف آگیں تجلیات میں
تیری الفت تو بھی تھی غمخانۂ جذبات میں

الغرض تیری محبت تھی مرا سرِّ حیات
کائنات الفت تھی مجھکو تیری الفت کائنات

آہ اب کیونکر سناؤں عاشقی کا ماجرا
کس طرح الفت کو تیری مجھ سے پھر لوٹا گیا

رخصت اے صبحِ جمالِ آرزوئے تشنہ کام
السلام اے مرکزِ حسنِ تمنا السلام

صفحہ ۴۸ تا ۴۶

(ح)

حافظہ

افسر النساء بیگم نام اور حافظہ تخلص ہے۔ دکن کی شاعرہ ہیں۔ رسالہ عصمت

ہیں اکثر کلام چھپتا ہے۔ زخلص خاصی کہہ لیتی ہیں، کلام سے خوشمشقی ظاہر ہوتی ہے۔

بیٹھے بیٹھے آگیا اک دن خیال [illegible]س کے آنے سے ہوا بیحد ملال
یاد تڑپانے لگی ماں باپ کی قدر جن کی زندگی میں کی نہ تھی
چل بسے دنیا سے آیا ہوش تب رنج کرنا اس گھڑی تھا بے سبب
جا کے قبرستان میں مل لیجئے حالِ دل کچھ اپنا کہہ سن لیجئے
الغرض شہرِ خموشاں کو رواں ہو گئی میں دل کو تھامے ناتواں
جب پڑی مرقد پہ پیاروں کے نظر خاک میں سوئے پڑے تھے بے خبر
ایک برچھی آن کر دل پر لگی تھام ہاتھوں سے کلیجہ میں جھکی

حجاب۔ محترمہ شہزادی تیمور جہاں۔ دہلوی

شاہزادی تیمور جہاں حجاب مغلوں کے قافلۂ رفتہ کی ایک پس ماندہ مسافر ہیں، ان مغلوں کی یادگار۔ جن کے دامن میں ہماری زبان کی تربیت ہوئی تھی جن کی آغوش میں ہماری شاعری نے پرورش پائی تھی۔ وہ مغل جن کے دور میں ہندوستان نے اپنی عظمت کا سب سے پُر شوکت خواب دیکھا تھا۔ مگر جو آج گردشِ زمانہ کے ہاتھوں خود ایک خواب بن چکے ہیں!۔ محترمہ حجاب اس دودمانِ مغلیہ کی چشم و چراغ ہیں، ماضی کے اس پُر شوکت خواب کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہیں!

محترمہ کے موصولہ حالات درج ذیل ہیں:۔

حجاب نواب تیمور جہاں بیگم بنت شاہزادہ مرزا سلیم محمد شاہ مرحوم خاندان شاہی کی چشم و چراغ ہیں۔ انکے نانا شاہزادہ مرزا سلیمان شاہ صاحب اور دادا شاہزادہ مرزا کیوان شاہ [illegible] علی الترتیب سرپرست معزول خاندانِ تیموریہ شاہی رہے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر سے شعر کہتی ہیں۔ ابتداء نظم سے ہوئی غزلیں بھی کہتی رہیں اور کافی مشق بہم پہنچائی۔ زنانہ مشاعروں میں غزلیں اور نظمیں خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں۔ اکثر خطوط میں خیالات رنگ برنگ کے گلدستے ہوتے ہیں۔ انگریزی بے تکلف بولتی ہیں فرقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت و حقوقِ نسواں کی بہت شدت سے حامی ہیں۔ مختلف زنانہ کانفرنسوں اور تعلیمی کمیٹیوں میں سرگرمی سے شریک ہوتی ہیں تقریر اور تحریر کے علاوہ قدمے، درمے، سخنے [illegible] کوشاں رہتی ہیں۔ ارکانِ اسلام کی پابند اور اسلامی تہذیب کو ہر مسلمان کے لئے ضروری سمجھتی ہیں ان کے شوہر شاہزادہ مرزا دارا بخت صاحب بنارس کی رائل فیملی کے معزز رکن ہیں۔

تیمور جہاں حجاب کی طبیعت میں ایثار۔ ہمدردی۔ رحم و صداقت ہے۔ دنیا کی نمائشی چیزوں سے نفرت کرتی ہیں۔"

محترمہ کا آبائی وطن دہلی ہے مگر چونکہ آپ کے شوہر مرزا دارا بخت (جو محکمہ اکسائز میں انچارج ہیں) فی الحال بسلسلۂ ملازمت بریلی میں ہیں اس لئے محترمہ بھی فی الحال بریلی مقیم ہیں۔

محترمہ موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ روشن دماغ اور بالغ نظر خاتون ہیں

انگریزی۔ اردو۔ فارسی تینوں زبانوں میں آپ کو دستگاہ حاصل ہے۔ اور تینوں زبانیں آپ بے تکلف استعمال کرتی ہیں۔ مسائلِ حاضرہ سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور خصوصاً تعلیم کی اشاعت کے لئے آپ بہت کوشاں رہتی ہیں۔

محترمہ کا درجہ شاعری میں بہت بلند ہے۔ آپ موجودہ دور کی ایک نہایت ممتاز، خوش گو اور گرامی قدر شاعرہ ہیں۔ آپ کا کلام بہت سنجیدہ اور پُروقار ہے اور اس میں پختگی موجود ہے۔ جذبات کی بے دھڑک نمایش (اگر وہ ناپختہ کار صناع کے ہاتھوں عمل میں آئے) اُن جذبات کو بے وقار اور چھچھورا سا بنا دیتی ہے[1]۔ علاوہ ازیں اخلاقی اعتبار سے بھی یہ چیز قابلِ اعتراض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ جذبات کی اس قسم کی نمایش سے ارادۃً محترز رہتی ہیں۔ آپ کے کلام میں نہایت سنجیدگی و شائستگی موجود ہے۔

آپ کے یہاں قومی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں سے خصوصاً ان کی طرزِ ادا سے ہیں آپ علامہ اقبال کے رنگ سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ جس دل میں مغلیہ خون اب تک دوڑ رہا ہو ظاہر ہے کہ وہ ان پُرشوکت مغلوں کی تباہی پر کیا کچھ نہ دُکھا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کی بربادی اور مسلمانوں کی زبوں حالی آپ کے مرغوب موضوع بن گئے ہیں۔ اس سانحہ پر آپ کی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں اور دل تڑپ تڑپ اُٹھتا ہے۔ آپ نے اس

---

[1] اس نکتہ کو میر نے اس طرح ادا کیا ہے:-

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ ٭ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

سوز و گداز کا اظہار اکثر نظموں اور رباعیوں میں کیا ہے جن میں سچے جذبات کی تپش و حرارت موجود ہے' آپ پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

محترمہ کا وہ مسدس جو سطورِ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے' اس قسم کی ایک عمدہ نظم ہے' طرزِ ادا میں علامہ اقبال کا پُر شوکت رنگ جھلکتا ہے' خیالات میں ارتقائی مدارج صاف نظر آتے ہیں۔ پہلے اس لٹے لٹائے برباد قافلہ کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا اظہار ہے' پھر ان کو اُن کی وہ دیرینہ عظمت و شوکت یاد دلائی گئی ہے جس کو آج وہ خود بھی بھول چکے ہیں' اس موجودہ پستی اور دیرینہ عظمت کی یاد سے ان کی طبیعت میں ایک جوش اور خون میں گرمی پیدا کرنے کے بعد اُن کو دعوتِ پیکار و عمل دی گئی ہے اور آخر میں اُمید کی ہمت افزا جھلک ہے۔

محترمہ نے نظم کے علاوہ غزل اور رباعی پر بھی قلم اُٹھایا ہے' جذبات کی شائستگی سنجیدگی آپ کی غزلوں میں بھی قائم ہے۔ خصوصاً آپ کی رباعیاں نہایت پُر کیف اور بلند پایہ ہیں۔

خود محترمہ نے راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں اپنی شاعری کے متعلق غالباً غیر ارادۃً کچھ اظہارِ خیال فرمایا ہے جو آپ کے نظریۂ شاعری اور آپ کے کلام پر ایک اچھا تبصرہ ہے' خود محترمہ کے الفاظ میں سنیئے :-

"شعر دلی ترجمانی کا نام ہے جب واقعاتِ حیات ضمیر اور تخیلات کے خلاف ٹکر کھاتے ہیں تو ایک نغمہ اس قسم کا پیدا ہوتا ہے جس میں زبان کے

ساتھ آرٹ مشتمل ہو۔ اسی آواز کی لہروں کا نام شعر ہے۔ یہی چیز میرے
کلام میں آپ کو ملے گی۔ میرا بیشتر کلام قومی رنگ میں ہے۔ تغزل کے رنگ کا
دوسرا نام گل و بلبل کا قصہ ہے۔ مگر میں اس قسم کی شاعری عورتوں کے لئے
پسند نہیں کرتی۔ کبھی کبھی غزل جو لکھتی ہوں تو کوشش کرتی ہوں کہ عریاں
اشعار نسوانی خودداری کے خلاف سانچے میں نہ ڈھلنے پائیں۔ گو تغزل کی
صورت چاشنی کے بغیر پسند نہیں آسکتی لیکن طرزِ بیان اس کا مہذب ضرور
ہونا چاہیئے ...‘‘

سطورِ ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے وہ خود محترمہ کا مرسلہ انتخاب ہے
افسوس ہے کہ محترمہ اپنی مسلسل بیماریوں اور پریشانیوں کے باعث مزید انتخاب
ارسال نہیں فرما سکیں۔

سپاس

عہدِ تیمور کا اک خوابِ جوانی تم ہو — صفحۂ دہر کی گم گشتہ کہانی تم ہو
جورِ صیاد کی اک زندہ نشانی تم ہو — ساری دنیا کے لئے سوزِ نہانی تم ہو

تم وہی ہو جو کبھی صاحبِ لشکر تم تھے
مالکِ تخت تھے تم زینتِ افسر تم تھے[1]

خوابِ دلکش کی جہاں بن ہوسِ خام ہو تم — عشرت و عیش کے آغاز کا انجام ہو تم
صبحِ امید کی جو دور ہو وہ شام ہو تم — منزلِ جاہ کی اک کوشش ناکام ہو تم

[1] ع: تختِ فغفور بھی ان کا تھا سریرِ کَے بھی (علامہ اقبالؔ ’’جوابِ شکوہ‘‘)

جس کی قسمت میں ہے افلاس وہ تقدیر ہو اب
عالمِ یاس کی اک بولتی تصویر ہو اب

بوئے گل کی طرح عالم میں پریشاں ہو تم　　نرگسِ باغ صفت دیدۂ حیراں ہو تم
چمنِ دہر میں وہ بلبلِ نالاں ہو تم　　جس کی پرسش نہیں دنیا میں وہ انساں ہو تم[1]

تم کو وہ دورِ زمانے نے مٹا رکھا ہے
رنج و اندوہ کا ہر لحظہ مزا چکھا ہے

جن کی کل لونڈی تھی دولت یہ ہے حالت انکی　　جن کے کل بجتے تھے ڈنکے یہ ہے نوبت انکی
جو کہ تقدیر بناتے تھے یہ ہے صورت انکی　　آج ہے گردشِ قسمت سے بری گت انکی

ہائے تقدیر نے دنیا کا قرینہ الٹا
جام لبریز ہے مینا کا خزینہ الٹا

تاجِ زریں کی ضیا رہتی تھی جن کے سر پر　　تخت طاؤس تھا قدموں سے مزین یکسر
جن کے خدام نے دنیا کو دیا زیور و زر　　پھرتے ہیں کاسہ گدائی کا لئے وہ در در

سیکڑوں آ کے جہاں راج و مہاراج ہوئے
آج وہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہوئے

گر ہے ہمت تو نہ یوں وقفِ فغاں ہو جاؤ　　ایک دل ایک جگر ایک زباں ہو جاؤ

---

[1] طرزِ ادا کی ہم رنگی ملاحظہ ہو۔ اقبال ؎

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو　　(جوابِ شکوہ)

بحرِ مواج بنو اور رواں ہو جاؤ　　مثلِ خورشید زمانے میں عیاں ہو جاؤ

قطرے مل جائیں جو آپس میں تو دریا ہوگا
قوم کے درد کا اس طرح مداوا ہوگا[1]

کب یہ ممکن ہے کہ وہ راہبرِ منزل ہو　　جس کے پہلو میں نہاں حرص و ہوا کا دل ہو
سوچ تو پھر خدا دل میں ذرا قائل ہو　　حق پرستی نہیں نازشِ باطل ہو

جان اور مال دو تم اپنی ہی عزت کے لئے
زندگی وقف کرو قوم کی خدمت کے لئے

قوم کے واسطے تم اپنا مٹا دو تن من　　تاکہ آجائے گا پھر فضلِ خدا کا دامن

---

[1] علامہ اقبالؒ نے بھی ایسے موقع پر کچھ اس سے بھی زیادہ پُرشوکت آواز میں مغرور و سرکش زمانے کے ستائے ہوؤں کو للکار کر اس طرح تعلیمِ پیکارِ عمل اور دعوتِ انقلاب دی ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم　　صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر　　تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں　　اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل　　یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو　　لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو　　خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

سعیٔ موجود ہے تیمور ہے حق کا مخزن لہلہاتا ہے یہاں جلوۂ قدرت کا چمن

برعالی سے ملے گر تو ہمت عالی رکھو
ہوس و حرص سے گر سینہ کو خالی رکھو

غزل

مری تقدیر کی گردش نہ جائے گی خدا کب تک
رہے گی یوں ہی ناکام اثر میری دعا کب تک

کیا معدوم کیوں اہل جہاں چشم مروت کو
رہے گی دور تم سے کافر و طرز وفا کب تک

الٰہی اس وفا دشمن کو توفیق کرم دیدے
رہے یارب یہ ہستی پائمالِ مدعا کب تک

مری آنکھوں میں بادل ہے سفیدی ہے سیاہی ہے
خدا جانے یوں ہی برسا کریگی یہ گھٹا کب تک

نہ سونے دیں گے مدفن میں ترے تیمور افسانے
بیاں کرتی رہیگی شمع حال جاں گزا کب تک

جو ظلم و جور سے پرہیز رکھتا ہے زمانے میں
وہ محشر میں یقیناً سرخرو اور شادماں ہوگا

نہ ہو آلودہ حرص و ہوس، ہرگز نہ بن طامع

اگر دل سے رہا قانع تو شاہِ خسرواں ہوگا

اعانت تو نے گر کی بےکسوں کی اور یتیموں کی
خدا کے فضل سے دونوں جہاں میں کامراں ہوگا

نہ گھبرا اے حجاب خستہ دل بس صبر بہتر ہے
تری بگڑی بنا دے گا خدا جب مہرباں ہوگا

رُباعی

عبرت کدۂ دہر کے والی ہم ہیں — افسوس کہ وقفِ پائمالی ہم ہیں
تیمور کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے — اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

دیگر

تھے کبھی سلطنتِ ہند کے ہم بھی حقدار — رشکِ اسکندر و قیصر تھا ہمارا دربار
بدلی قسمت نہ رہا عہدِ حکومت تیمور — وہی ہم آج ہیں رنجور و اسیرِ افکار

حجاب

حمیدہ خانم نام اور حجاب تخلص ہے، لاہور کی شاعرہ ہیں، قدیم رنگ میں غزل لکھتی ہیں، کلام میں خیال آفرینی و زبان بندی زیادہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب یہ رنگ بھی بہت مقبول تھا، مگر اب اس کو عموماً ترک کیا جا رہا ہے۔

رازِ ہستی

راز ہستی میرے بھی کچھ ایسے لکھوائے گئے
پڑ گئے ہیں زخم دل میں کاتبِ تقدیر کے

دشتِ الفت میں قدم کیونکر بڑھیں تدبیر کے
کچھ بتا اے ہٹنے والے پردۂ تقدیر کے

اہلِ دل سمجھے ہوئے تھے اپنا اپنا دل جسے
حشر میں دیکھا تو پیکاں تھے تمہارے تیر کے

میتِ بیمارِ ہجراں دیکھنے سے فائدہ
نقش کچھ دھندلے سے ہیں بگڑی ہوئی تقدیر کے

دل کے نالے نارسا ہوں لیکن اتنا ہے حجاب
حوصلے بڑھنے نہ دوں گی میں بھی چرخِ پیر کے

حجاب

فخر النساء نام اور حجاب تخلص ہے۔ شاہجہانپور کی رہنے والی ہیں
اردو کی کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ کلام میں رنگینی و لطافت ہے۔ طرزِ ادا
پاکیزہ ہے۔ آپ نے اکثر مشاعروں میں بھی حصہ لیا ہے۔ ذیل کی غزل
محترمہ نے بیاد اشفاق رسول صاحب مرحوم تعلقدار سندیلہ کے
مشاعرے میں خود پڑھی تھی۔

کہاں ممکن ہے پوشیدہ غمِ دل کا اثر ہونا

لبوں کا خشک ہو جانا بھی ہے آنکھوں کا تر ہونا
غضب دل کر جدا مجھ سے ترا اے فتنہ گر ہونا

ستم نالوں کا پُر تاثیر ہو کر بے اثر ہونا
جگر میں درد لب پر نالۂ وحشت اثر ہونا

عیاں کرتا ہے اک شاب پری کا دل میں گھر ہونا
غضب نالہ کشی اک صاحبِ عصمت کے کوچہ میں

ستم اے دل کسی پردہ نشیں کا پردہ در ہونا
وہ اُن کا چپکے چپکے مسکرانا خون رونے پر

وہ میرا دل ہی دل میں واصفِ رنگِ اثر ہونا
نہیں علت سے خالی بیٹھنا دشمن او ستم پیشہ

یہ منھ میری طرف ہونا تری نظریں اُدھر ہونا
غضب ہے دل کا رہ رہ کر تڑپنا میرے پہلو میں

سکھا دیتا ہے طائر بسملِ تیرِ نظر ہونا
جو تنہا پاس منزل دل کو شایاں ہے محبت میں

تو آنکھوں کو ہے لازم دیدۂ حسرت نگر ہونا
جو تجھکو اپنے چشمِ شوق کی پتلی سمجھتا ہے

ستم ہے اس سے پوشیدہ ترا اے شل نظر ہونا
ستم کی جور کی بیداد کی کافی شہادت ہے

جدائی میں مرا بیتاب بے خود بے خبر ہونا

وہ تڑپانا کسی بیدرد کا مجھ کو نڈر ہو کر
وہ میرا اڑتے ڈرتے شاکیٔ دردِ جگر ہونا
جو اک سوتے ہوئے فتنے کو چونکا ہیں گے غفلت سے
ان آنکھوں میں مناسب ہے قیامت کا اثر ہونا
حجاب آ کر سندیلہ میں جو شاعر جمع ہوتے ہیں
مزا دیتا ہے کیا کیا مجمعِ اہلِ ہنر ہونا

حزیں

صابرہ سلطان نام اور حزیں تخلص ہے، تاریخ پیدائش فروری ۱۹۱۹ء ہے۔ آبائی وطن میرٹھ ہے۔ والد کا نام محمد اللہ تھا۔ جو ڈھائی سال کی عمر ہی میں آپ کو داغِ یتیمی دے گئے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد چند سال سنبھل میں اپنے نانا کے پاس گزارے۔ اس کے بعد سے اب تک علی گڑھ، میرٹھ، لاہور، دہلی، اجمیر وغیرہ رہ چکی ہیں۔ فی الحال کانپور میں مقیم ہیں۔

تحصیلِ علم کا بچپن ہی سے شوق تھا مگر قدیم ایشیائی تہذیب اسکول کی تعلیم کے خلاف تھی۔ خاندانی بزرگوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ گھر ہی پر بغیر کسی اُستاد کی مدد کے پڑھنا شروع کیا؛ اور اس طرح اتنی ترقی کی، آج آپ ملک کی ایک قابلِ قدر ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔

اُردو ادب کا بھی شروع ہی سے ذوق رہا۔ پچھلے چھ سات سال سے

مختلف رسائل میں مختلف ناموں (عموماً شکیبا کے نام) سے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کے خیالات اور نثر نگاری کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ خطوط نگاری آپ کا محبوب مشغلہ ہے اور اس میں آپ کو بڑا کمال حاصل ہے۔ ادبی حیثیت سے ان کا پایہ بلند ہوتا ہے۔ آپ کے خطوط بے تکلف، عبارت آرائی، سادہ نگاری اور پُر خلوص اندازِ تحریر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں آپ نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیبِ عالم کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اب ادیبِ فاضل کے امتحان میں شمولیت کا ارادہ ہے۔ طبیعت بہت حساس پائی ہے۔ مگر اس کے باوجود مزاج میں ضبط، تحمل اور بردباری بہت ہے۔

شاعری کا ذوق فطری ہے مگر آپ طبیعت سے مجبور ہو کر شعر کہتی ہیں۔ دوسروں کے لئے نہیں کہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کلام کو منظرِ عام پر لانے سے ہمیشہ محترز رہتی ہیں۔ کسی مشاعرہ میں حصہ نہیں لیتیں۔ کسی رسالہ میں اپنا کلام شائع نہیں کراتیں۔ راقم الحروف کو بھی بہت کچھ اصرار کے بعد اپنے مختصر حالات اور اشعار ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

محترمہ حزیں کا شاعرانہ ذوق بہت بلند ہے۔ آپ کا کلام جذبات نگاری کی کامیاب اور دلکش مثال ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے اور درد و اثر

بھی یاس و حسرت بھی ہے اور امید و آرزو بھی۔ آپ کے جذبات میں بڑی تازگی اور شدت ہے، طرزِ ادا بہت شستہ، صاف اور پرکیف ہے۔ جذباتی اعتبار سے آپ کا کلام نہایت بلند اور پُرکیف ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک کامیاب اور خوش گو شاعرہ ہیں۔

محترمہ کا مختصر مرسلہ کلام درج ذیل ہے:-

"میری داستاں سُن لے"

تجھے قسم ہے مری بیقرار آہوں کی
تجھے قسم ہے مری اشکبار آنکھوں کی
تجھے قسم مری دیوانہ وار باتوں کی

ابیِ قلبِ حزیں! میری داستاں سن لے

ہے ایک جوششِ باراں سا آج آنکھوں میں
ہے ایک خوابِ پریشاں سا آج آنکھوں میں
ہے ایک تہیۂ طوفاں سا آج آنکھوں میں

ابیِ قلبِ حزیں! میری داستاں سن لے

تجھے قسم ترے افسانہ ہائے رنگیں کی
تجھے قسم ترے لمحات ہائے زریں کی
تجھے قسم مری شب ہائے تار و غمگیں کی

ابیِ قلبِ حزیں! میری داستاں سن لے

ترے حضور میں کرلوں میں شرحِ ایبتِ غم

تو آج سن لے مری خونچکاں حکایتِ غم
خدا گواہ! نہیں ہے مجھے شکایتِ غم
امینِ قلبِ حزیں میری داستاں سن لے

یہ میرا نالہ، کہیں تیرا ہی ترانہ نہ ہو
مری حکایتِ غم تیرا ہی فسانہ نہ ہو
یہ حرفِ شوق کہیں رازِ محرمانہ نہ ہو
امینِ قلبِ حزیں! میری داستاں سن لے

غزل

یہ ربط و ضبط کہاں تک نبھائے جاؤں میں
کہ دل کا خون ہو اور مسکرائے جاؤں میں

وہ اک نگاہ جو ہستی پہ چھائی جاتی ہے
تمہیں بتاؤ کہاں تک چھپائے جاؤں میں

ستارے شام ہی سے جھلملائے جاتے ہیں
کہو تو اپنی کہانی سنائے جاؤں میں!

جو کوئی سنتا رہے بیٹھ کر پسِ پردہ
تمام عمر اسی طرح گائے جاؤں میں

لبوں پہ دم ہے مگر ان کا حکم ہے یہ حزیں
کہ داستانِ محبت سنائے جاؤں میں

آج ان کو بُلا رہی ہوں میں
اپنی دنیا بسا رہی ہوں میں
پھر تصوّر میں ہیں یہ راز و نیاز
کوئی روٹھا منا رہی ہوں میں
ان کے قدموں پہ آج رکھ کے جبیں
قصۂ غم سُنا رہی ہوں میں

اے حزیںؔ انتظارِ دوست میں آج
دل کو ساکت سا پا رہی ہوں میں

شیرازۂ حیات ہے پھر منتشر سا کچھ
آنکھوں میں پھر ہے خواب پریشاں سا آجکل
ہاں پھر کوئی خیال یہ چھایا ہوا سا ہے
برپا ہے میری زیست میں طوفاں سا آجکل
پھر آرزو یہ ہے کوئی پوچھے حدیثِ غم
آنکھوں میں ہے تہیۂ طوفاں سا آجکل
پھر امتیازِ وصل و فراق اٹھ گیا کہ ہے
کچھ دن سے کوئی قلب میں مہماں سا آجکل

کیوں روزگار برسرِ پیکار ہے حزیںؔ
کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں سا آجکل

حمیدہ۔ دہلوی۔

حمیدہ سلطان احمد حمیدہ۔ دہلی کی ادیبہ اور شاعرہ ہیں، نہایت باذوق اور ادب نواز خاتون ہیں، نثر و نظم دونوں کا رنگ پختہ اور سنجیدہ ہے آپ ادبی خدمات میں بڑی خوشی اور سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو جو پہلا آل انڈیا زنانہ مشاعرہ نشر ہوا تھا اس کی روحِ رواں آپ ہی تھیں۔ اس کے بعد دہلی میں ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو

لیڈیز کلب میں جو زنانہ مشاعرہ ہوا تھا وہ بھی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔
آپ ایک خوش ذوق و خوش فکر شاعرہ ہیں۔ آپ کے اشعار صاف و
لطیف ہیں، طرزِ ادا میں سادگی، ندرت و جدّت ہے۔

ذیل کی طرحی غزل محترمہ نے دہلی میں زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی
جو ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو لیڈیز کلب میں ہوا تھا۔

محبت بھی ہے جرأت آزما کیا — غمِ دل ان سے کہہ دوں برملا کیا
بقا کیا ہے، محبت میں فنا کیا — ترے کشتوں سے اس کا پوچھنا کیا
اشاروں میں یہ کیوں عہدِ محبت — نگاہوں سے یہ پیمانِ وفا کیا
تصوّر میں یہ مبہم سی شبیہت — ہے یہ بھی کوئی اندازِ حیا کیا
تمہیں دیکھیں گے چشمِ روح سے ہم — ان آنکھوں سے تمہارا دیکھنا کیا
سب اس کی راہ تکتے ہیں چمن میں — نسیمِ لالہ و گل کیا، صبا کیا
جنونِ بندگی کا عکس ہیں سب — خودی کیا، بیخودی کیا، اور خدا کیا
شکستِ آرزو ہے اور مسلسل — ہماری زندگی کا پوچھنا کیا؟

غمِ آغازِ الفت ابتدا ہے
حمیدہ شوقِ مرگ انتہا کیا

۱؎ مؤلف احقر — پھر تمنا کا خون ہوتا ہے / کیا یہی زندگی کی غایت ہے؟ [illegible]

حمیدہ :-

حمیدہ خاتون نام اور حمیدہ تخلص ہے، دورِ حاضر کی ایک خوش فکر شاعرہ ہیں نظمیں خوب لکھتی ہیں - آپ موجودہ دور کی ایک اچھی ادیبہ اور افسانہ نگار بھی ہیں -

خوشی کے چہچہوں سے دور یہ سنسان بستی ہے　　یہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی برستی ہے
قیامت کی سیاہی ہے قیامت کا اندھیرا ہے　　زمیں کو ہر طرف وحشت سے تاریکی نے گھیرا ہے
زمیں پر خشک پتوں کی اچانک سرسراہٹ سے　　جھجک اُٹھتے ہیں انسانی قدم اپنی ہی آہٹ سے

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے چھانے سے
لرزجاتا ہے دل ہر گام پر رستہ نہ پانے سے

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پہ مت جاؤ
حقیقت سے تمہیں آگاہ کرتی ہوں ادھر آؤ

یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
زمانہ گر نشاں ان کا مٹاتا ہے مٹانے دو

جو سچ پوچھو تو کتنی رشک کے قابل یہ حالت ہے
تہِ بسترِ ان کو کتنا چین ہے کتنی فراغت ہے

نہ دنیا کے بکھیڑے ہیں مصیبت ہے، نہ بیماری
نہ آپس کی عداوت ہے، نہ چالاکی، نہ عیاری

میسر ہے یہاں عالم کی سب فکروں سے آزادی
خموشی اور سکوں کا گھر ہے یہ ویران آبادی

یہاں کی سرزمیں اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں غمناک روحوں کو دوامی عیش حاصل ہے

یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہمِ تسکیں مہیّا ہے
یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے

شکستہ خاطروں کی آخری منزل ہے یہ بستی
تھکے ہارے ہوؤں کی جاوداں محفل ہے یہ بستی

حور ۔ میرٹھی

گوہر اقبال نام اور حور تخلص ہے ۔ میرٹھ وطن ہے، جناب نذیر احمد صاحب میرٹھی کی دختر ہیں ۔ آپ کا تعلق زبیری خاندان سے ہے ۔

گوہر اقبال حور ایک بلند پایہ اور قابلِ قدر شاعرہ ہیں آپ کا کلام مختلف رسائل میں چھپتا ہے اور کافی مقبول ہو چکا ہے آپ نہایت قادر الکلام اور خوش گو خاتون ہیں ۔ آپ کے کلام میں جوش، رنگینی، رومان پروری، جذبات کی ترجمانی، ندرت اور جدت موجود ہے، آپ کے دل میں قوم و ملّت کا درد بھی ہے اور اس رنگ کی بھی عمدہ نظمیں آپ کے یہاں ملتی ہیں آپ شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہوئی ہیں ۔ اور آپ نے شاعری سے پیام و اصلاح کا بھی کام لیا ہے ۔

جہانِ عشق کا ہر ذرّہ انتظار میں ہے
میں دیکھتی ہوں جیسے تیرے انتظار میں ہے

ہم اس خیال میں اب سر جھکائے بیٹھے ہیں
کشش جبیں میں ہے کیا آستانِ یار میں ہے

مستقبل

اے شاہدِ دورِ نہاں!
تو ہے محیطِ دو جہاں اے شاہدِ دورِ نہاں!
افکارِ ماضی سے اگر فرصت کبھی پاتی ہوں میں
وابستگیٔ حال سے رہ رہ کے گھبراتی ہوں میں
پھر تجھ کو شب کی خلوتوں میں ڈھونڈھنے جاتی ہوں میں
اور دور ہوتا ہے کہیں نظروں سے تیرا آشیاں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں

آہستہ آہستہ مری تخئیل میں آتا ہے تو
تسکین میں ڈوبے ہوئے نغمے سے برساتا ہے تو
اور میری نظروں میں بھی یوں منسر جاتا ہے تو
جیسے ہجومِ ابر سے تارا چمک کر ہو عیاں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

ہونٹوں کی رنگینی میں صبحِ لالہ ساماں کے ہجوم
آنکھوں میں چھپائے ہوئے خوابِ درخشاں کے ہجوم
شب رنگ زلفوں میں لئے ابرِ بہاراں کے ہجوم
اکثر میری تخئیل پر ہوتا ہے تو جنت نشاں
.. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

جب زندگی کو ہر طرف سے گھیرے شامِ ملال

جب ظلمتوں میں حال کی پیدا نہ ہو رنگِ جمال
سلمائے صبحِ آرزو ہو جائے جب غم سے نڈھال
اس وقت تو آتا ہے امیدوں کا لیکر کارواں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

اکثر مرے کھوئے ہوئے نغمے سناتا ہے مجھے
بن کر مرا خوابِ سکوں تو راس آتا ہے مجھے
تو ہر قدم پر جلوہ ہائے نو دکھاتا ہے مجھے
حیراں رکھتی ہیں مجھے تیری تنوع خیزیاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

رہ رہ کے آتا ہے نظر رہ رہ کے کھو جاتا ہے تو
پھر شامِ زارِ ذہن میں چھپ چھپ کے سو جاتا ہے تو
میں ڈھونڈتی ہوں ہر طرف اور محو ہو جاتا ہے تو
تو کھیلتا ہے سطح سے بن بن کے سحرِ بے نشاں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

ظلمت بداماں ہے کبھی اور جلوہ ساماں ہے کبھی
تو خوابِ شیریں ہے کبھی خوابِ پریشاں ہے کبھی
تو ہے کبھی پیشِ نظر، نظروں سے پنہاں ہے کبھی
ہر رنگ سے میرے تخیل میں تو ہے جلوہ کناں
.. .. .. اے شاہدِ دورِ نہاں!

قوم و وطن کی پستیاں کرتی ہیں جب دل کو خراب
تو کیف زا خوابوں کی دنیا سے اُٹھاتا ہے نقاب
پیشِ نظر لاتا ہے پھر دورِ وطن کو کامیاب
اور بخش دیتا ہے نگاہوں کو وقارِ جاوداں
" " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

لپٹی ہوئی تیرے قدم سے ہے اُمیدِ ارتقا
ہے ذرّے ذرّے سے ترے خاکِ وطن کو آسرا
اور تیری آمد میں ہے اندیشۂ جنگ و وفا
تو ہے کبھی شامِ الم اور ہے کبھی صبحِ جناں
" " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

تو کارزارِ دہر کا نقشہ دکھاتا ہے کبھی
جوشِ عمل کے پُراثر نغمے سناتا ہے کبھی
اور تو کبھی آتا ہے بنکر جسم میں روحِ رواں
" " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

ہے مسکراہٹ میں تری روپوش خورشیدِ وطن
تیرے ہی جلووں میں نہاں ہے صبحِ تجدیدِ وطن
وابستہ آنچل سے ترے دامانِ امیدِ وطن
پردوں میں تیرے جلوہ گر اوجِ وطن کی کہکشاں
" " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

تو ارتقائے قوم کا اک مستقل پیغام ہے
امن و سکونِ دہر کی تمہیدِ خوش انجام ہے
اور انقلابِ دور میں بربادیٔ آلام ہے
آتا ہے سرافرازیوں کا بن کے عہد کامراں
" " " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

برسائے گا تیرِ الم، یا تو مسرت لائے گا
تو نور بن کر آئے گا، یا نار بن کر آئے گا
کس کو خبر ہے دہر پہ کس رنگ میں چھا جائے گا
روپوش ہے تو کس قدر اے زندگی کے رازداں
" " " " اے شاہدِ دورِ نہاں!

نوائے عمل

جاگو - جاگو - بہنو جاگو

سورج سر پر آن چڑھا ہے ۔۔۔ سارا زمانہ جاگ اٹھا ہے
ہر فرقہ حق مانگ رہا ہے ۔۔۔ تم سوتی ہو قہرِ خدا ہے

جاگو - جاگو - بہنو جاگو

قوم ہے مردہ جان تمہیں ہو ۔۔۔ جینے کا سامان تمہیں ہو
شان ہے تم سے شان تمہیں ہو ۔۔۔ شانِ تمہیں ہو آن تمہیں ہو

جاگو - جاگو - بہنو جاگو

عہدِ غلامی موت سے بدتر ساری بلائیں ہیں لو سر پر
چھاؤ جہاں پر رحمت بن کر بہنو آزادی کا زیور

جاگو ۔ جاگو ۔ بہنو جاگو

فاقوں کی ماری بہنیں مائیں روٹی کے بدلے جو غم کھائیں
بھوکے بچے آنسو بہائیں کب تک دیکھو گی یہ وتنائیں

جاگو ۔ جاگو ۔ بہنو جاگو

ہم سے لگی ہیں قوم کی آنکھیں ہم سے بندھی ہیں ساری امیدیں
مل کے جو ہم میدان میں نکلیں بھارت کو آزاد کرا دیں

جاگو ۔ جاگو ۔ بہنو جاگو

آرزوئے موہوم

میں سوچتی رہتی ہوں یہ میری تمنا ہے
اے کاش کبھی ایسا اک دورِ محل آئے

اک پھول میں بن جاؤں

پھولوں کی لطافت ہیں شاخوں کی نزاکت ہیں

میں نرم ہتیں پھیلاؤں

پھر پھولوں کے خرمن پہ اور سبزہ کے دامن پہ

کچھ نکہتیں برساؤں

ایسا جو ہو تو شاید ممکن ہے کبھی شاید

راحت میں یہاں پاؤں

حاصل ہو سکوں دل کو اور کیفِ بقا مجھ کو
لیکن یہ نہیں ممکن دیکھو جو حقیقت میں

راحت نہیں دنیا میں
فانی ہی یہاں ہر شے

(۲)

میں سوچتی رہتی ہوں یہ میری تمنا ہے
اے کاش کبھی ایسا اک دورِ عمل آئے

اس بزم پریشاں سے
ظلمت کدہ ہستی سے اس گنجِ لطافت سے
اُڑ کر میں پہنچ جاؤں

مہتاب میں بن جاؤں ہر شام کو روشن ہوں
ہر صبح کو چھپ جاؤں

پھر بزمِ فلک پر سب تارے کریں جھلمل جب
ہنس کر میں نکل آؤں

اس دشتِ مصیبت پر گہوارۂ ظلمت پر
وہ نور میں برساؤں

کہ پھر مری کرنوں سے ہر ذرّہ چمک اٹھے
ہر قطرہ کو چمکاؤں

ایسا جو ہو تو شاید　　ممکن ہے کبھی شاید
راحت میں یہاں پاؤں

حیا میرٹھی :-

خورشید اقبال نام اور حیا تخلص ہے آپ گوہر اقبال حور کی حقیقی بہن اور جناب نذیر احمد صاحب میرٹھی کی دختر ہیں۔

محترمہ خورشید اقبال حیا موجودہ دور کی ایک نہایت سربرآوردہ اور ملبند پایہ شاعرہ ہیں آپ کے یہاں جذباتی، رومانی، قومی و ملی ہر قسم کی نظمیں ملتی ہیں جو نہایت پاکیزہ و لطیف ہیں آپ کے یہاں یاس و حسرت کی تڑپتی ہوئی تصویریں بھی ہیں اور امید و آرزو کی جنت بھی آپ کا اسلوب بیان نہایت پختہ اور شگفتہ ہے آپ کی نظموں میں بڑا کیف و اثر ہوتا ہے کلام میں جذبات کی سنجیدگی و وقار قائم ہے کیف و اثر بھی ہے اور کہیں کہیں فلسفیانہ جذبات کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔
آپ کا شمار موجودہ دور کی چوٹی کی شاعرات میں ہے۔

ایک امید تو بندھ جائے تسلی نہ سہی　　اور جو یوں بھی نہیں منظور تو یہ بھی نہ سہی
میں سمجھتی ہوں کہ موت آ نہیں سکتی شب غم　　دل میں باقی ابھی امید ہے ان کی نہ سہی

صبحِ امید

(۱)

کرنوں کا لے کے پرچم　　سورج افق سے نکلا
اور بے نقاب ہو کر　　رنگیں فضا میں نکھرا

پھر کوہسار پہ چمکے　　پھر آبشار پہ چمکے
پھر برگ و بار پہ چمکے

شاخوں کی گتھیوں میں　　کلیوں کا رنگ چمکا
سرسبز پتیوں میں　　پھولوں کا رنگ چمکا

(۲)

پھر صبحِ عید آئی　　کیف و سرور لے کر
رنگینیوں میں اپنی　　نور و ظہور لے کر
غنچے چٹک رہے ہیں　　گلشن مہک رہے ہیں
ذرّے چمک رہے ہیں

صوتِ رباب بن کر　　نغمے ہوا میں گونجے
موجِ شراب بن کر　　پھر سبزہ زار جھومے

(۳)

لیکن حیا تمھارے　　دل پر اثر نہیں ہے
خاموش یوں پڑی ہو　　گویا خبر نہیں ہے
چاروں طرف خوشی ہے　　عشرت برس رہی ہے
در اصل عید ہی ہے

یہ عید کی سحر ہے　　تم کیوں غم آشنا ہو
اٹھو خوشی مناؤ　　ایسا بھی رنج کیا ہے

بیانِ قصۂ قلبِ نزار کیوں نہ کروں — تجھی پہ درد ترا آشکار کیوں نہ کروں
مجھے جب آپ ہی اپنے سے اعتبارِ وفا — تو ہی بتا کہ ترا اعتبار کیوں نہ کروں[1]
وہ آنکھ جس کو دکھایا تھا تو نے روئے جمیل — ترے فراق میں اب اشکبار کیوں نہ کروں
وہ زندگی جو ترے سامنے ہو جانِ سرور — تجھے نہ پا کے اسے سوگوار کیوں نہ کروں

جو تو ہی مجھ کو نہ بھیجے کوئی پیامِ سکوں
قبائے صبر کو پھر تار تار کیوں نہ کروں

طلسمِ اُمید

تو رنج نہ کر مغموم نہ ہو اُمیدیں مجھ سے کہتی ہیں
اس یاس کے ریگستان سے پرے تسکین کی نہریں بہتی ہیں
ہر شے جب قطعاً فانی ہے اس دنیائے فانی میں
تغییر نہ ہوگا آخر کیوں ۔ پھر تیری غم سامانی میں
آخر اک دن بدرِ عشرت شب زار افق پر چمکے گا
یہ آج جہاں تاریکی ہے اک نور وہیں پھر برسے گا
عیش اور مسرت کی کرنیں پھر روح پہ تیری چھا جائیں گی
تاریک پڑی ہے جو بستی اس کو وہ پھر چمکائیں گی
پھر خوشبوؤں کے گہوارے میں آسودہ سکونِ دل ہوگا
واں بس مسرت ہوگی تری سرخوش رنگِ محفل ہوگا

[1] غالب: حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم ؎ اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

کوئی آنے والی ساعت عشرت لے کر آجائے گی

خوشیوں کی اک موجِ روشن بہجت لے کر آجائے گی

یوں جاگیں گی پھر آرزوئیں جیسے کہ شگوفوں کی دنیا

مسرور و شگفتہ پھر ہوگی یہ تیری روح وا ماندا

اس ویراں دل کی دنیا پر جنت کی بہاریں چھائیں گی

شیریں خوابوں کی جنت میں نورس کلیاں کھل جائینگی

ہر غم کے بعد اک راحت ہے دنیا والے یوں کہتے ہیں

آغاز میں رونا ہے جن کے انجام میں ہنستے دیکھے ہیں

خاتونِ وطن سے

چاہیے ذوقِ حصولِ علم و حکمت چاہیے
ساتھ ہی احساسِ دردِ قوم و ملت چاہیے

تابکے یہ ظلم و استبداد کی خود غرضیاں
تیرے ہر اک فعل میں کیفِ محبت چاہیے

سرزمینِ ہند کو حاصل ہو جس سے روشنی
ذہن و دل میں وہ تجلی صداقت چاہیے

ہو نہ ایسا عظمتِ ماضی پہ حرف آئے کہیں
تیرے ہر انداز میں شانِ متانت چاہیے

باغباں کہتے نہ پائے تجھ کو باغی تیتری
تجھ میں غیرت چاہیئے جوشِ حمیت چاہیے

ذرّے ذرّے کو جگا دے تیرا طوفانِ عمل
گرمیِ احساس و ذوق بے نہایت چاہیے

کر دے جو ناپید دنیا سے جمود و بےخودی
تیری رگ رگ میں وہ طوفانِ قیامت چاہیے

جور و استبداد کی زنجیر کو جو توڑ دے
دست و بازو میں وہ قوت و طاقت چاہیے

تیری ہستی کو جو لے پہنچے فرازِ عرش پر
تیرے دل میں وہ یقینِ فتح و نصرت چاہیے

ماہ و انجم کی ضیاء بھی جس سے ہو جائے خجل ؛ یوں فروزاں شمعِ استقلال و ہمت چاہیے

جس سے ہوں اصنامِ تہذیبِ خیالی سرنگوں ؛ تیرے شیشے میں وہ قوت وہ صلابت چاہیے

تجھ کو کرنی چاہیے مضبوط ملت کی اساس ؛ ہر رگِ دل میں تری احساسِ ملت چاہیے

تجھ پہ نازاں ہے صداقت تجھ پہ نازاں ہے وطن ؛ تیری ہر اک بات میں ایسی شرافت چاہیے

جہل اور افلاس کی مٹ جائیں جس سے ظلمتیں ؛ کم سے کم اتنا فروغِ آدمیت چاہیے

غور کر کے اپنے نصب العین کو تبدیل کر

مقصدِ آزادیٔ اقوام کی تکمیل کر

تمہاری یاد میں ہر نغمہ ہے فغاں اب بھی[1]

تمہاری یاد کی تازہ ہے داستاں اب بھی

غمِ فراق کی باقی ہیں تلخیاں اب بھی

یہ غم وہ ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا ؛ تمہاری یاد زمانہ بھلا نہیں سکتا

ابھی بدل نہ سکا تھا مزاج دنیا کا

کئے ہوئے ہے مقیّد رواج دنیا کا

تخیلات پہ اب بھی ہے راج دنیا کا

چلے گئے ہو ابھی سے ہمیں گلا بہت ہے ؛ الم کدے میں تمہاری ابھی ضرورت ہے

---

[1] یہ دو بند موصوفہ کی ایک نظم سے لیے گئے ہیں جو علامہ راشد الخیری کی وفات پر لکھی گئی تھی اور جس کا عنوان ہے ...

سکونِ شب اور بچپن کی یاد

سیاہیِ شب کی بڑھتی آرہی ہے
چراغِ شام کو دھندلا رہی ہے

مناظر پر خموشی چھا رہی ہے
سواریِ ظلمتوں کی آرہی ہے

حجابوں میں ہے دشت و کوہ و دریا
ہر اک شے پر خموشی چھا رہی ہے

ہوا ساکن ہے سبزہ سو رہا ہے
حسیں کلیوں کو بھی نیند آرہی ہے

شگوفے ڈالیوں پر جھک گئے ہیں
شگفتہ بیخودی سی چھا رہی ہے

شمیم و نکہتِ گل سو گئی ہیں
لچک شاخوں کی سوئی جا رہی ہے

ہری شاخیں نشہ میں نیند کے ہیں
ہر اک پتے کو بھی نیند آرہی ہے

چمن میں ہے سکوں اندوز بلبل
خموشی کی زباں سے گا رہی ہے

ہر اک وادی کا دامن بے صدا ہے
سکوں کا راگ ندی گا رہی ہے

صنوبر کے یہ لمبے گہرے سائے
نظر بھی جن میں کھوئی جا رہی ہے

عجب حیرت سی طاری ہے دروں پر
اُداسی مقبروں پر چھا رہی ہے

بساطِ سبزہ پر گر گر کے شبنم
پیامِ بے ثباتی لا رہی ہے

وہ ندی جس پہ سائے چھا گئے ہیں
سکوں کے ساتھ بہتی جا رہی ہے

متانت سے رواں ہے اپنی دھن میں
کوئی پیغام لے کر جا رہی ہے

نہ جانے اس کی منزل کس جگہ ہے
خدا جانے کہاں سے آرہی ہے

کہیں کوئی کنول یوں تیرتا ہے
کہ جیسے ننھی کشتی جا رہی ہے

کنول خاموشیوں کے جل رہے ہیں
ستاروں کی چمک دھندلا رہی ہے

ہے ان کی انجمن بے ہوش و بیدار
سکوں کی نیند ان کو آرہی ہے

کسی نے کوئی جادو کر دیا ہے — تجلّی ان کی سوئی جا رہی ہے
کوئی بادل کا بھولا بھٹکا ٹکڑا — ہوا نے جس کو ساکن کر دیا ہے
نہیں شاید فرشتے کا یہ بازو — سرِ پرواز میں پھیلا ہوا ہے
کوئی آنچل ہے یہ لیلیٰ شب کا — فضا میں پھیل کر جو رہ گیا ہے
گھنے پیڑوں کے پیچھے سے فلک پر — نکل کر ماہِ روشن آ رہا ہے
نہیں شاید فرشتہ ہے یہ کوئی — جو حیرت سے ٹھٹک کر رہ گیا ہے
اگرچہ اس کی کرنیں پڑ رہی ہیں — مگر پھر بھی کُہر سا چھا رہا ہے
ہر اک منظر پہ طاری ہے سکوں سا — سکوں اک خواب بن کر چھا گیا ہے
مگر اس وقت بھی میں ہوں پریشاں — کہ اک طوفان سا دل میں بپا ہے
وہ طوفاں جو محیطِ روح و دل ہے — تخیّل جس میں بھٹکا جا رہا ہے
نہ سوئے گی یہ میری تیرہ بختی — سکوں دنیا پہ چھایا ہے تو کیا ہے
مرے دکھ اور مری بے چینیوں کو — فضا کا یہ سکوں چونکا رہا ہے
مجھے پھر آ رہی ہے یاد دوشیں — فسانہ پھر وہی یاد آ رہا ہے
وہ بچپن! آہ میرا عہدِ شیریں — کہانی دل وہی دُہرا رہا ہے
تھیں جب اک کیف سے مخمور آنکھیں — وہ دورِ زندگی یاد آ رہا ہے[1]

---

[1] محترمہ کی اس نظم کے بعد علامہ اقبالؒ کی نظم "ایک شام" یاد آ جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش

اے سالِ نو

اے سالِ نو! اے سالِ نو

اے وقت کے نورِ خراماں حاصلِ دورِ نہاں
پھر صبح زارِ دہر میں تو بن کے سورج ہے عیاں
مدہوشیوں کی گود میں ہے گل طراز و گل فشاں

اے سالِ نو! اے سالِ نو

کچھ آرزوئیں حسرتیں رقصاں تری آمد میں ہیں
ہاں شوق کے آتشکدے پنہاں تری آمد میں ہیں
کچھ خواب امیدوں کے بھی لرزاں تری آمد میں ہیں

اے سالِ نو! اے سالِ نو

یہ سچ ہے کہ آیا ہے تو کچھ خواب دکھلاتا ہوا
اس غمکدے پر دہر کے نشہ سا برساتا ہوا
کیف سکوں ساماں لیے اور گیت سے گاتا ہوا

(پچھلے صفحہ سے) فطرت بیہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا [بانگِ درا صفحہ ۱۳۶]

اے سالِ نو اے سالِ نو

کس کو خبر ہے ساتھ تو لایا ہے غم کے قافلے
یا تیرے پردوں میں ہیں روپوش خوشیوں کے پرے
یعنی آیا ہے نویدِ امن و آزادی لیے

اے سالِ نو اے سالِ نو

اے کاش راس آئے ہمیں رعنائیاں لانا ترا
آغوشِ عالم میں باندازِ دگر آنا ترا
بنکر طلسمِ رنگ و بو دنیا پہ چھا جانا ترا

اے سالِ نو اے سالِ نو

شب ہائے ظلمت میں ہماری تو نیا خورشید ہو
گلہائے رنگا رنگ سے پر دامنِ اُمید ہو
یکسر مسرت جو ہو اس انجام کی تمہید ہو

بجا کہ رنج و مسرت پہ ہم نہیں قادر
پھر اس کا رنج ہی کیوں جو مقدر ہو موہوم
الٹ ہی دیتی ہے آخر جسے ہوائے اجل
ازل سے لازم و ملزوم ہیں حیات اور موت

یہ زندگی تو مگر صرف ایک خواب سی ہے
کہ حیثیت تو یہاں کی فقط سراب سی ہے
لطیف روح کے چہرے پہ وہ نقاب سی ہے
کہ چار روز کی یہ زندگی سراب سی ہے

پھر چمن میں آج غنچے چاک داماں ہوگئے
پھر سے جوشِ جنوں کے راز عریاں ہوگئے

سو نیوالے جاگ اُٹھے حشر کے ساماں ہو گئے
آج شاید وہ سوئے گورِ غریباں ہو گئے

منتشر ہیں رخ پہ او رکھبری ہوئی ہیں دوش پر
آپ کے گیسو مرا حالِ پریشاں ہو گئے

اے حیاؔ کہتے ہیں اس کو امتزاجِ حسن و عشق
ان کے جلوے میری آنکھوں میں نمایاں ہو گئے

حیاؔ (لکھنؤ)

کنیزِ فاطمہ نام اور حیاؔ تخلص ہے۔ آپ چودھری نعمت اللہ صاحب ایڈوکیٹ کی دختر ہیں۔ آپ کی شادی سندیلہ میں چودھری عبدالرحمن صاحب سے ہوئی ہے۔ آپ کے والد صاحب بہت زمانے سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ اس لئے عام طور پر ادبی دنیا میں محترمہ کو "لکھنوی" لکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن راقم السطور کے نام ایک خط میں محترمہ رقمطراز ہیں:۔

"لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ میں لکھنؤ کی ہوں۔ میرا وطن یعنی میرے والد صاحب قبلہ کا وطن ضلع بارہ بنکی قصبہ ستر کھ ہے۔"

محترمہ دورِ حاضر کی ایک نہایت ادب پرور اور ادب نواز خاتون ہیں۔ تمام تر زندگی ادبی مشاغل میں بسر ہوتی ہے۔ آپ لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ بھی نکالا کرتی تھیں۔ جس کا نام "حیا" تھا اور آپ خود ہی اس کی مدیرہ تھیں۔

افسوس ہے کہ باوجود سخت اصرار کے محترمہ نے اپنے حالاتِ زندگی ارسال نہیں فرمائے۔ اس سلسلہ میں آپ رقمطراز ہیں:۔

"دنیا میرے حالاتِ زندگی اور میری "بکواس" (شاعری) پر روشنی ڈالنی چاہتی ہے اور اس کے متعلق معلومات طلب کرتی ہے۔ حالاتِ زندگی نہ تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں نہ میں انھیں واضح طور پر قلمبند کر سکتی ہوں"...
اب سے پہلے ماہنامہ حیا لکھنؤ کے دورانِ ادارت میں ہندوستان کے وسیع طول و عرض سے خدا جانے کتنی بار میرے دور افتادہ قارئینِ کرام نے مجھ سے اپنے متعلق اور اپنی شعر گوئی کے متعلق سوانح نگاری کی فرمائش کی لیکن میرے لئے یہ تعمیلِ ارشاد ہر مرتبہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوئی.... مجھے اس کی ضرور ندامت رہی کہ اپنے بہت سے ادب دوست بھائیوں کی مکرر سہ کرر استدعاؤں کو میں رہینِ تشکر نہ کر سکی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دیانت کے ساتھ اس کا بھی اعتراف رہا کہ میں نے اپنی خاموش اور معنی خیز بے اعتنائی سے اپنے سراب آسا تشنگانِ ادب کو مایوس رکھا۔ بہرحال اس اظہارِ خیال سے میرا مطلب اپنی علمی بے بضاعتی کو ظاہر کرنا ہے....."

محترمہ دورِ حاضر کی ایک نہایت خوشگوار و قادر الکلام شاعرہ ہیں آپ کا کلام جذباتی اعتبار سے نہایت بلند و پُر کیف ہے۔ آپ کے یہاں کہیں کہیں نشاطیہ رنگ بھی ملتا ہے مگر یہ آپ کا مستقل رنگ نہیں۔ آپ کے کلام پر حزنیہ و المیہ رنگ چھایا ہوا ہے اور اس رنگ کی نہایت دلدوز مثالیں آپ کے یہاں موجود ہیں۔ زبان میں سادگی و پاکیزگی قائم ہے جو خلوص اور شدتِ جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ کے کلام پر اختر شیرانی کا اس قدر

کنیز فاطمہ 'حیا'

اثر پڑا ہے اور اسی رنگ میں آپ اس قدر بے تکلفی اور پختگی سے لکھتی ہیں کہ آپ کو بجا طور پر شاعرات کی دنیا کا اختر کہا جا سکتا ہے۔ معاملہ بندی آپ کے کلام کی خاص خصوصیت ہے۔ اس سلسلہ میں آپ جرأت اور مومن کے رنگ سے متاثر نظر آتی ہیں۔

آپ کا ہر ہر شعر رومانی فضاؤں میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ کلام میں جذبات کا ایک تلاطم ہے ــــ جذبات جو نہایت شدید طریقے پر محسوس کئے گئے ہیں اور نہایت صداقت کے ساتھ ادا ہو گئے ہیں۔ آپ کی شاعری وارداتِ قلب کی آئینہ دار ہے۔ شاعری اور اخلاقیات مختلف چیزیں ہیں اور ان کو مختلف نظریوں ہی سے دیکھنا چاہئے۔ شاعری شدّتِ جذبات کے پُرخلوص، مرتب و مسلسل، کیف آور اور وجد آگیں اظہار کے سوا اور کچھ نہیں اور اس کی عمدہ مثالیں محترمہ کے کلام میں موجود ہیں۔

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ محترمہ کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے اپنی شاعری پر اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے ہمیں مسرت ہے کہ ہمارا اصرار بیکار نہ گیا اور بالآخر محترمہ کو اگر حالاتِ زندگی پر نہیں تو اپنے کلام پر قلم اٹھانا ہی پڑا۔ آپ لکھتی ہیں:-

"آپ کے اصرار نے مجھے آخر قلم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ اگرچہ آجکل طبیعت بھی غیر حاضر ہے اور فرصت بھی نہیں۔ اس قسم کے بہت سے اور تقاضے اب بھی ہیں۔ خیر اب لوگوں کو شکایت کا موقعہ ہاتھ نہ آئیگا!"

آپ نے اپنے کلام پر جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ذیل میں شکریہ کے

ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

"شاعری کی ابتداء گیارہ سال کی عمر سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جو ابیات میں نے کہے ان میں اوّلیت میری ایک نظم "گلاب" کو حاصل ہے بالکل بچپن ہی سے مجھے پھولوں سے بہت شغف تھا اور خاصکر گلاب کے پھول سے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے گلاب ہی پر قلم اُٹھایا۔ یہ نظم تہذیب نسواں لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا کلام آئینہ۔ عصمت۔ زیب النساء رومان اور دوسرے رسائل میں شائع ہونے لگا۔ میرے ابتدائی اشعار میں تصوّف کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن مجھے یہ بات ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے اشعار کی بھی نہیں رہی۔ اور آورد کیلئے میری طبیعت نے مجھے پابند نہیں رکھا میں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ حکیمانہ اور مصلحانہ شاعری کو اپنا نقطۂ نظر قرار دوں بلکہ جیسا میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ جذبات میری شاعری کے معنوی پہلو کو اُجاگر کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں غزلیہ۔ نشاطیہ۔ حزنیہ اور المیہ جو کچھ کلام میرے قلم سے نکلا وہ سب تاثرات خارجی و داخلی کا پابند تھا۔

وقتی تاثرات نے مجھے جس قدر متاثر کیا بعض بعض اوقات بلا تکلف وہی خیالات موزوں ہو کر زبانِ قلم سے ٹپک پڑے۔ چنانچہ میں نے اپنی والدہ صاحبہ مرحومہ کی یاد میں "ماں" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ اس کی صاف اور روشن مثال ہے۔

مجھے اس کے کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ چند قدر دانانِ ادب
اگر میرے اکثر اشعار پر سر دھنتے ہیں تو بعض نقادانِ فن میرے اکثر اشعار
پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن بقول شخصے ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست
میں کبھی فنی نقطۂ نظر سے ایک شعر کو بھی پڑھنے کی روادار نہیں ہوں!
اور حقیقت یہ ہے کہ میں شعر گوئی کو محض اپنی دلچسپی اور ہیجانِ فکری کے لئے
آلۂ کار بناتی ہوں ـــــ بات یہ ہے کہ میں نہ تو خود شخصیت پرست ہوں
اور نہ کسی شخصیت پسند کو اچھا سمجھتی ہوں میں اس عقیدہ کی حامل ہوں کہ
شاعری کی سرحد میں ہر طبقہ اور شخصیت کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں، نہ
یہ عورتوں کی میراث ہے نہ مردوں کی جاگیر! بلکہ عام انسانی فطرت
کا ایک خاصہ ہے کہ اگر طبیعت میں موزونیت پیدا ہو جائے تو شعر مرتب
کر سکتا ہے۔ میری نظمیں اکثر جذباتی رنگ کے ماتحت ہیں اور اس پر
سنجیدہ اور زہد خشک کا دعوے کرنے والا ریاکار طبقہ اگر معترض ہو سکتا
ہے تو یہ اس کی آپ تنگ نظری اور کم فہمی ہے نہ کہ شاعری کا قصور!
مجھے کسی وقت بھی اس سے خوشی نہیں ہوئی کہ لوگ میرے اشعار کو پڑھکر
داد و تحسین دیں۔ میں سمجھتی ہی نہیں بلکہ میرا عقیدہ ہے کہ شعر اگر شعر ہے تو
وقت اور زمانہ خود اسے اپنی گود میں پروان چڑھائے گا ورنہ وہ زمانہ
کے ساتھ بے نام و نشان فنا ہو کر رہے گا اور بس!

میرے اشعار خود میرے نقطۂ نظر سے دو اقسام زبان کے حامل ہو سکتے
ہیں اوّل تو وہ جو فارسی آمیز ترکیبوں سے کہے ہیں اور ان کو میں کوئی درجہ

نہیں دیتی ہوں، دوسرے وہ جو موسیقیت، سلاست اور روزمرہ کے طرزِ بیان میں ادا کر دیئے گئے ہیں اور یہی وہ چند شعر ہیں جو محض تاثرات کے ترجمان ہیں — میرے کلام میں بے خیالی اور ربودگی کے ساتھ جو کچھ قلم برداشتہ رطب و یابس جمع ہو گیا ہے وہ خواہ متانتِ فکری سے گر گیا ہو لیکن صحیح معنیٰ میں خلوصِ بیان اور صداقتِ شعری کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ رہا تاثیرِ کلام اس کا پیدا کرنا میرا کام نہیں۔ طبیعت کچھ آمادگی کے لئے حاضر نہیں ہوتی ہے ورنہ اپنے کلام کا جستہ جستہ اقتباس پیش کرتی — بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست۔"

کنیز فاطمہ حیا لکھنؤ"

ذیل میں جو محترمہ کا کلام پیش کیا گیا ہے اس میں خود محترمہ کا مرسلہ انتخاب یہ ہے، شوہر کا تحفہ، ایسے ہیں، پیامِ عمل، — غزل، شرابِ ناب میں کب رنگ و بو نہیں باقی" بقیہ کلام راقم الحروف کا مزید انتخاب ہے

"شوہر کا تحفہ"

غذائے حسن مرا پیکرِ جمال مرا — چراغِ روح مرا مرکزِ خیال مرا
سرورِ قلب مرا کیفِ لازوال مرا — ہر ایک حال میں تنہا شریکِ حال مرا

اسی کے دم سے ہے راحت دلِ حزیں کیلئے
اسی کے در کے ہیں سجدے مری جبیں کیلئے

وہ اپنی پاک محبت کا زندہ افسانہ — وہ اپنی شمعِ حرم کا اسیر پروانہ

نشاطِ روح کا وہ حسن سحر کارانہ　　وہ اپنے جلوۂ پنہاں سے آپ بیگانہ
وہ گلستاں بکنار و بہار در آغوش
وہ جانِ میکدہ و لالہ زار در آغوش

وہ کہکشاں مرصّع کے تار لایا ہے　　متاعِ نورِ مہ زرنگار لایا ہے
وہ سلکِ گوہرِ تازہ بہار لایا ہے　　درِ خوشاب کا خوشرنگ ہار لایا ہے
بہشتِ حسن کی تنویر جس کا ہر موتی
بہارِ خلد کی تصویر جس کا ہر موتی

یہ ہارِ اُلفتِ باقی کی یادگار حسیں　　یہ ہارِ عقدِ ثریا کی سلکِ خوش آئیں
کسی کے رشکِ مسرت کا تحفۂ رنگیں　　کسی کے نقشِ محبت کا لازوال نگیں
شعاعِ مہرِ منوّر سے جس کا رشتہ ہے
مرے حسین مقدّر سے جس کا رشتہ ہے

گلے کا ہار ہے یا شرحِ مدعا ہے یہ　　مرا انیسِ شبستانِ پُرضیا ہے یہ
سفینۂ دلِ مضطر کا ناخدا ہے یہ　　سکونِ قلب کا اک نسخۂ شفا ہے یہ
ادائے حسن پہ صد جلوۂ خجل قرباں
یہ آرزو ہے کروں اس پہ جان و دل قرباں

رفیقِ جاں ہے یہ معصوم الفتوں کیلئے　　حریمِ دل ہے مرا اسکی عظمتوں کیلئے
یہ نذرِ شوق ہے میری مسرتوں کیلئے　　یہ کارسازِ غمِ دل ہے راحتوں کیلئے
ہے جس کی دید سوادِ نظر کی اک تصویر
یہ تحفہ اس کی وفاؤں کی معنوی تفسیر

ضیائے مسلکِ حق صد جلوۂ تاباں صدقے — مرا خیال تصدق مری زباں صدقے
حیا تمام محبت کی داستاں صدقے — یہ کائنات ہو قرباں دو جہاں صدقے

رہے یہ دل کے قریں ان کا دل نشیں تحفہ
نویدِ عشقِ فراواں بنے حسیں تحفہ

"ایسے میں"

سحر کے جھٹپٹے میں جب پرندے چہچہاتے ہیں
مناظر صبح کے جس دم رسیلے راگ گاتے ہیں
بہاروں کے جلو میں دلربا نغمے لٹاتے ہیں
حسیں غنچے چمن میں صبحدم جب مسکراتے ہیں
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

شفق جب چھا گئی ہے دامنوں سے کوہساروں کے
فضا میں تھرتھراتے ہیں ترانے آبشاروں کے
ہوا میں تیرنے لگتے ہیں نقشے جوئباروں کے
بیاباں جب بدل لیتے ہیں چولے سبزہ زاروں کے
تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

پری قوسِ قزح کی آسماں پر جب سنورتی ہے
ادائے دلبری سے رنگ کے سانچوں میں ڈھلتی ہے
صبا کے مشکبو جھونکوں سے نکہت لوٹ پڑتی ہے

بہار آکر چمن کی جب گلوں سے مانگ بھرتی ہے

تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

کنارِ آب کا نظارہ جب مدہوش ہوتا ہے

درخشاں ریت کا میدان جب زرپوش ہوتا ہے

کنول آبِ رواں کی زینتِ آغوش ہوتا ہے

حسیں لہروں کے دل میں جذبۂ پرجوش ہوتا ہے

تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

خنک راتوں کی جھینی جھینی جب جھنکار ہوتی ہے

ستاروں کی نظر جب واقفِ اسرار ہوتی ہے

کسی شاعر کی چشمِ روح جب بیدار ہوتی ہے

مرے پندار کے تاروں میں جب جھنکار ہوتی ہے

تم ایسے میں مجھے بیساختہ کیوں یاد آتے ہو

پیغامِ عمل[۱]

اُٹھیں پھر فصلِ گل میں آرزوؤں کو جواں کر دیں

چلیں پھر بلبلوں کو آشنائے گلستاں کر دیں

---

[۱] اس کے ساتھ علامہ اقبال کی نظم "سر عبدالقادر کے نام" (بانگِ درا) پڑھیے جس کا پہلا شعر یہ ہے

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

حوادث کے خس و خاشاک میں پیدا دھواں کر دیں
زمانے بھر پہ اپنی شعلہ سامانی عیاں کر دیں

چمن زادانِ خوش آواز کب تک چپ رہیں آخر
تقاضہ ہے یہ فطرت کا قفس پھر نغمہ خواں کر دیں

بہت خوابِ گراں میں سو چکے اب وقت آیا ہے
کہ اپنی عقل و دانش کو ہم اپنا پاسباں کر دیں

ثبوتِ زندگی دینا ہے پھر تہذیبِ حاضر کو
ہماری کوششیں پھر اس زمیں کو آسماں کر دیں

اگر دنیا میں رہنا ہے تو یوں دنیا پہ چھا جائیں
کہ اپنے ہر عمل کو زندگی کا ترجماں کر دیں

ضرورت ہے کہ ہم بیدار ہو کر دردِ قومی سے
بدل دیں فطرتِ غم ختم یہ آہ و فغاں کر دیں

سرشکِ بے بسی ٹپکے ہیں جو بے لوث آنکھوں سے
ستاروں کی طرح ان موتیوں کو ضو فشاں کر دیں

سناویں غنچہ و گل کو حکایت پائمالی کی
نگاہِ نغمۂ فطرت کو اپنا رازداں کر دیں

ترقی کے منازل چومتے ہیں پائے ہمت کو
اٹھائیں یوں قدم اک موجِ بیداری رواں کر دیں

وہ پابندی جو سکھلا دے ہمیں بے لوث قربانی

نثار اس قید پہ ہم سیکڑوں آزادیاں کر دیں
شگوفے اب تو علم باعمل کے کھلنے والے ہیں
ہوائے ذوق سے بیدار روحِ گلستاں کر دیں
نہیں ہے اس سے بہتر افتخارِ خدمتِ قومی
مٹیں تو یوں کہ مٹنے کو حیاتِ جاوداں کر دیں
حبا مرکز رہا ہے لکھنؤ علم و تمدّن کا
نہ کیوں نورِ عمل سے بھی اسے ہم ضوفشاں کر دیں

غزل

شرابِ ناب میں کب رنگ و بو نہیں باقی
وہ ربطِ شیشہ و جام و سبو نہیں باقی
چمن وہی ہے گھٹائیں وہی بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی
نزاعِ شیخ و برہمن ہے ہر گھڑی لیکن
حرم کی دیر کی وہ جستجو نہیں باقی
ہے کائنات کے ہر ذرّہ میں گہر ریزی
نگاہِ فکر کو خود جستجو نہیں باقی
ہے دلکشی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیتِ رنگ و بو نہیں باقی
شبابِ دہر کی اب بھی ہے وہ فراوانی
مگر خیال میں جوشِ نمو نہیں باقی
ہے دل میں درد بھی پہلو میں دل بھی ہے لیکن
کسی کے در پہ تڑپنے کی خو نہیں باقی
ہیں ساتھ آج بھی کچھ شورشیں مگر دل میں
سکت نہیں ہے جسارت کی خو نہیں باقی
حرم کی شمع فروزاں ہے آج بھی لیکن
تجسّسِ نظرِ شعلہ جو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں احباب اے حبا اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

اقرارِ محبّت

اُن کا اصرار ہے اُلفت کا تم اقرار کرو ہم کو جو چاہو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو
کہتے ہیں نازِ محبت دلِ بیمار کرو جانِ مہجوروں کو رہینِ غم و آزار کرو
غم کا اقرار کرو عشق کا اظہار کرو
ہم کو جو چاہو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

آپ جیتے دل ہی رہیں پاس نہ آنے کو کہیں پاس آئیں نہ کبھی ہم کو بلانے کو کہیں
گر کبھی بات کہیں وہ بھی رلانے کو کہیں خود ستائیں ہمیں اوروں سے ستانے کو کہیں
پھر تقاضا ہے کہ اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو جو چاہو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

حکم یہ ہے کہ کبھی غیر سے بولا نہ کریں جس سے تکلیف انہیں پہنچے ہم ایسا نہ کریں
سب سے روپوش رہیں ان سے ہی پردہ نہ کریں غیر کو خط نہ لکھیں غیر کا چرچا نہ کریں
ان کا اصرار ہے تم عشق کا اظہار کرو
ہم کو جو چاہو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

جی میں حسرت ہے سنائیں انہیں افسانۂ غم کبھی موقعہ ملے سب کچھ کہیں انکی ہی قسم
لیکن آتے نہیں سنتے نہیں رودادِ الم کتنے مجبور ہیں بتلائیں یہ ہے کیسا ستم
اس پہ طرہ ہے کہ الفت کا بھی اقرار کرو
ہم کو جو چاہو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رازِ الفت کا بہت ان سے چھپا رکھا تھا درد کو اپنے کلیجے سے لگا رکھا تھا
جذبۂ عشق کو سینے میں دبا رکھا تھا غم کا اظہار قیامت پہ اُٹھا رکھا تھا

ہے حد اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو

ہم کو پوچھو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رات دن ہم کو رلاتے ہیں الٰہی توبہ — اپنی فرقت میں ستاتے ہیں الٰہی توبہ

خواب الفت کا دکھاتے ہیں الٰہی توبہ — ایسی باتیں وہ بناتے ہیں الٰہی توبہ

پھر بھی تکرار ہے الفت کا تم اقرار کرو

ہم کو پوچھو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رازِ الفت کا ہماری نہ کھلا تھا جب تک — دردِ دل کا بھی نہ اظہار ہوا تھا جب تک

ہم نے حالِ دلِ مضطر نہ کہا تھا جب تک — اس قدر سوزِ دروں بھی نہ بڑھا تھا جب تک

ان کا اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو

ہم کو پوچھو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

چین لوٹا غم و آلام سکھایا ہم کو — مضطرب دن کو کیا شب کو رلایا ہم کو

ہجر میں ایک گھڑی چین نہ آیا ہم کو — خواب میں بھی کبھی جلوہ نہ دکھایا ہم کو

پھر بھی کہتے ہیں کہ الفت کا تم اقرار کرو

ہم کو پوچھو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

ایسے بے رحم ہیں انصاف کا بھی پاس نہیں — مہر کی ذرہ برابر بھی تو بو باس نہیں

ایسی بے مہری پہ بھی دل کو مرے یاس نہیں — اب تو جی آ چکا ہیں کہ جینے کی کوئی آس نہیں

اور خود آ کے کہیں عشق کا اظہار کرو

ہم کو پوچھو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

سوزِ ناتمام

آہ دلِ پُر اضطراب ضبط و سکوں سے کام لے — ہے دلِ پُر دغا ہے وہ اس کا سنبھل کے نام لے
مہر و وفا و عشق کا آہ نہ اب پیام لے — جوشِ جنوں سے باز رہ دامنِ صبر تھام لے

ختم ہے داستانِ غم رہ گیا سوزِ ناتمام
ہاں اسی سنگدل کو اب دے کوئی میرا یہ پیام

کر دیا میں نے دل سے محو سارا فسانہ عشق کا — ہائے چلا گیا بہت دور زمانہ عشق کا
اب نہیں مجھکو یاد ہے کوئی ترانہ عشق کا — لے گیا وہ ستم طراز دل سے خزانہ عشق کا

عشق کی آہ بندگی ختم ہوئی ہے آج سے
جور و جفا کی زندگی ختم ہوئی ہے آج سے

گرمیٔ عشق اب نہیں دل کو جو میرے پھونک دے — اب مرا جذبۂ وفا غیر خوشی سے لوٹ لے
چھوڑ دیا ہے آج ساتھ میرا نیاز و ناز نے — ہو گئی ہوں میں دستکش رنج و الم سے یاس سے

ہے مری ان سے التجا مجھ سے نہ نامِ عشق لیں
آہ مزید تحفۂ رنج و الم مجھے نہ دیں

یاد میں اب کرونگی میں موتی نہ اشک کے نثار — اب نہ کہونگی ان سے میں آہ مرا ہے دل فگار
اب نہ لکھونگی عمر بھر ان کو میں دل کا حالِ زار — اب نہ بناؤنگی کبھی میں انہیں دل کا راز دار

اے دلِ فتنہ زا بس اب اپنا قدم سنبھل کے رکھ
محفلِ سوز و ساز سے دور بہت نکل کے رکھ

اب نہ کرونگی ذکر میں عشق کی رسم و راہ کا — ہوگا بیاں نہ اب کبھی کوئی فسانہ چاہ کا
اب تو نہ ہوگا عمر بھر عہد کبھی نباہ کا — اب نہ سنیں گے حشر تک تذکرہ درد و آہ کا

ان کا اور ان کے پیار کا غم نہ مجھے ستائے گا
یاد جو آئے گی کبھی دل مرا بھول جائے گا

خوش ہوں کہ اب کبھی مجھے اپنا نہ وہ بنائیں گے — میں انھیں بھول جاؤں گی وہ مجھے بھول جائیں گے
ڈوبے ہوئے گداز میں گیت نہ اب سنائیں گے — عشق کی داستانِ غم اب نہ لبوں پہ لائیں گے

نام سمجھ کے نقشِ عشق قلب سے میں مٹاؤں گی
اُن کی طرح نہ غیر سے آہ میں دل لگاؤں گی

حکمِ قضا ٹلے گا کیا جب نہ ٹلا ہے آج تک — جیسے نوشتہ بخت کا مٹ نہ سکا ہے آج تک
جا کے کماں سے آئے تیر یہ نہ ہوا ہے آج تک — اور نہ خزاں کے دور میں پھول کھلا ہے آج تک

بس میرے دل کا حال ہے بالکل اسی طرح حیا
ٹوٹ کے جیسے آئنہ پھر نہ کسی سے جڑ سکا

انتظار

دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے — پرسشِ غم کرے تو کون آ کے نحیف و زار سے
جان بہ تنگ آ گئی اس دلِ بیقرار سے — اُٹھنے لگے ہیں شعلے پھر دیدۂ اشکبار سے

دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے
آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

اب تو بہار آ گئی اب تو خزاں بھی جا چکی — ہو گیا سالِ نو شروع تازہ بہار آ چکی
میرے نصیب کی بدی خوب مجھے ستا چکی — ہجر کا غم رلا چکا غم کی جفا مٹا چکی

پرسشِ غم کرے تو کون آ کے نحیف و زار سے

آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

دہر کا ہے وہی شباب اور وہی بہار ہے — چرخ پہ گل فشاں شفق خاک پہ لالہ زار ہے
باغ کا رنگ ہے وہی گل پہ وہی نکھار ہے — مجھ میں ہوا نہ کوئی فرق دل ہے کہ جاں فگار ہے
جان بہ تنگ آ گئی اس دلِ بیقرار سے
آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

وہ ہیں اگرچہ بے نیاز اور انھیں اس پہ ناز ہے — نقشِ قدم ہی گر ملے خم یہ سرِ نیاز ہے
بہہ گیا آنسوؤں میں دل پھر بھی ہوا طراز ہے — آ کہ انتظار میں چشمِ امید باز ہے"
اُٹھنے لگے ہیں شعلے پھر دیدۂ اشکبار سے
آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدتِ انتظار سے

حسن و شباب کا طفیل دل کو ارم بناؤ پھر — صدقہ ادا و ناز کا شانِ کرم دکھاؤ پھر
کر کے نگاہِ التفات دل کی لگی بجھاؤ پھر — ہم ہوں خوشی سے ہمکنار ساتھ خوشی کو لاؤ پھر
دامنِ صبر چھٹ چلا دستِ دلِ فگار سے
آنکھوں میں آ چلی ہے جاں شدتِ انتظار سے[1]

---

[1] مینا زبیری مارہروی (علیگ)
بچشمِ بیدار روح آمد ز تنگیٔ انتظار امشب
بیا کہ جانِ نزار مینا شکستِ جامِ قرار امشب

ایک آرزو

حالِ غمِ محبت کہنے کی آرزو ہے　　شرحِ گدازِ الفت کہنے کی آرزو ہے
روداد رنج و حسرت کہنے کی آرزو ہے　　تفصیل شامِ غربت کہنے کی آرزو ہے
پھر داستانِ فرقت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے[1]

دل سے بھلا کے مجھکو تم یاد کس لئے ہو؟　　میرے حریمِ دل میں آباد کس لئے ہو؟
ناشاد کر کے مجھکو دل شاد کس لئے ہو؟　　سچ سچ بتاؤ وقفِ بیداد کس لئے ہو
بیداد کی شکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

گر بھولنا تھا مجھ کو پھر پیار کیوں بڑھایا　　میرے سکونِ دل کو یوں کس لئے مٹایا
بیدرد تھے جب ایسے کیوں مجھسے دل لگایا　　دل سے لگا کے مجھکو پھر دل سے کیوں بھلایا
یہ حالِ پُر شکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

گو اب تمھارے دل میں میری جگہ نہیں ہے　　غیروں سے تم کو الفت زیبا ذرا نہیں ہے
بھولا ہوا ہوں اس سے نفرت روا نہیں ہے　　کیونکر کہوں کہ مجھکو تم سے گلا نہیں ہے
یہ درد بھری حکایت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

---

[1] محترمہ صابرہ سلطان حزیں

پھر آرزو یہ ہے کوئی پوچھے حدیثِ غم　　آنکھوں میں ہے تہیۂ طوفاں سا آج کل

اب کیا ہوئے وہ دن جب مجھ پر عنایتیں تھیں ۔۔۔ آنکھوں میں پیار تھا جب دل میں محبتیں تھیں
جب میری زندگی میں رقصاں حلاوتیں تھیں ۔۔۔ شاداب تھے شگفتہ دل میں مسرتیں تھیں

یہ داستانِ حسرت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

اللہ کیا ہوا اب وہ چاہ کا زمانہ ؟ ۔۔۔ وہ چاہ تھی کہ ان کا مقصد تھا آزمانا!
مقصود تھا ستانا مطلوب تھا رلانا! ۔۔۔ مجھکو نہ تھی خبر یہ آفت ہے دل لگانا

حالِ مآلِ الفت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

اے کاش وہ ہی رہتے ایام زندگی کے ۔۔۔ افسانے بھول جاتے ناکام زندگی کے
مٹ جاتے خواب ہو کر آلام زندگی کے ۔۔۔ کیسے گزاروں یہ دن بدنام زندگی کے

اب تو سلام رخصت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

کس سے کہوں الٰہی یہ دکھ بھرا فسانہ ۔۔۔ روٹھے وہ کیا کہ گویا روٹھا سبھی زمانہ[۱]
الفت کی ہوں بھکارن قدموں میں ہے ٹھکانا ۔۔۔ میری جبیں ہو اے کاش اور اُن کا آستانہ

پھر ماجرائے حسرت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

آجاؤ غم غلط ہو، دنیا کو بھول جاؤں ۔۔۔ افسانہ ہائے فرقت رو رو کے پھر سناؤں
بھولے ہوئے دنوں کی پھر یاد میں دلاؤں ۔۔۔ حسرت ہے خود بھی روؤں اور تم کو بھی رلاؤں

۱۔ بسمل سے بسمل کوئی بھی پوچھنے والا نہیں رہا ؛ وہ کیا بگڑ گئے مری دنیا بگڑ گئی

گذری ہوئی حقیقت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

التجا

آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں
دل کے ویرانے کو معمورِ مسرت کر لیں
گردشِ چرخ کو پھر خوگرِ بہجت کر لیں
عمرِ ناشاد کو سرمایۂ عشرت کر لیں
وقت باقی ہے ابھی آؤ کہ الفت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

میں پریشاں ہوں اور آئے نہ تمھیں رحم ذرا
اُف یہ انصاف کا خون آہ یہ الفت کا صلا
کہ ذرا سی بھی جو ہو بات تو ہو بیٹھو خفا
خیر روٹھے کو منانے میں بھی آئیگا مزا
آؤ پھر جمع ہوں اور دور کدورت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

آؤ دیکھو کہ سراپا غمِ پنہاں ہوں میں
شمع کی طرح سے اک شعلۂ سوزاں ہوں میں
دل شکستہ ہوں ستم کش ہوں پریشاں ہوں میں
درد شاہد ہے کہ منت کشِ درماں ہوں میں
تم جو آجاؤ تو سب دور شکایت کر لیں
آ بھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کر لیں

ایسے بیدرد کبھی دکھ کا نہ احساس ہوا
بزمِ اغیار میں ہنس ہنس کے کیا شکوہ مرا
آہ کس سے کروں محرومیٔ قسمت کا گلا
نہ سنو تم تو سنے کون فسانہ دل کا
تازہ پھر رسم و رہِ حرفِ حکایت کر لیں

آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کرلیں

مجھ سے گر تم کو گلہ ہے تو سناؤ مجھ کو　　　گر خطا مجھ سے ہوئی ہو تو بتاؤ مجھ کو
ہو خفا مجھ سے تو پاس آکے جتاؤ مجھ کو　　　غمِ دوری سے مگر اب نہ رلاؤ مجھ کو

نالۂ درد کو آہنگِ مسرت کرلیں
آبھی جاؤ کہ نئے سر سے محبت کرلیں

حرفِ شکایت

یہ کیا کہ مرے عشق کا چرچا نہیں کرتے　　　پہلے کی طرح اب مجھے رسوا نہیں کرتے
مکتوب میں ان کے نہیں کچھ حرفِ حکایت　　　تنہائی میں اب مرا شکوہ نہیں کرتے
سو آرزوئیں دل میں تھیں بیتاب تمھارے　　　کیوں مجھ پہ فدا اب دلِ شیدا نہیں کرتے
کیوں میرے کسی درد کا درماں نہیں ممکن　　　کیوں آہ مرے غم کا مداوا نہیں کرتے
اللہ ری بے مہری و بیگانگیِ عشق　　　اب بھول کے اظہارِ تمنا نہیں کرتے
یہ کیا ہوا اک دم سے جو بدلی نگہِ مہر　　　کیوں اب نظرِ شوق سے دیکھا نہیں کرتے
اک شکوۂ شیریں میں گزر جاتے تھے پہروں　　　اب کیا ہے جو الفت کا تقاضا نہیں کرتے
اے وائے دریغ آہ یہ محرومیِ قسمت　　　روٹھوں جو میں اب مجھ کو منایا نہیں کرتے
دے دے کے قسم اب نہیں لیتے کوئی وعدہ　　　خود وعدۂ فردا کو بھی ایفا نہیں کرتے
آنے کی خوشی اور نہ جانے کا کوئی غم　　　اب رسمِ محبت کا اعادہ نہیں کرتے
افسانۂ غم اپنا سناتے تھے شب و روز　　　اک قصۂ جاں کاہ سنایا نہیں کرتے
ہو جاؤں خفا گر تو مناتے تھے وہ پہروں　　　اب بہرِ تسلی کبھی شکوہ نہیں کرتے

یہ کیا مئے الفت میں نہیں جوش ذرا بھی
کیوں میری طرف چشمِ تماشا نہیں کرتے

اُف قصۂ الفت کو بس اک وہم سمجھ کر
ٹھکرا دیا انسان تو ایسا نہیں کرتے

افسانۂ زرّیں کو پامال بنایا
دل والے ان افسانوں کو بھولا نہیں کرتے

"یہ قصۂ پارینہ ہے اک خوابِ پریشاں"
یہ کہہ کے محبت کو مٹایا نہیں کرتے

یہ کیا کہ بھلاتے یہ بھی تم دل میں سمائے
اس طرح جلے دل کو ستایا نہیں کرتے

کہتے ہیں تصور میں وہ ماضی کی کہانی
کس روز حیا مجھ کو رلایا نہیں کرتے

غزل

نگاہِ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرہ ذرہ محبت کا رازداں ہو جائے

زباں سے کیجئے رسوائے ناز کیوں اس کو
وہ راز آنکھوں ہی آنکھوں میں جو بیاں ہو جائے

پھر اس کے رنج و غمِ دائمی کی حد ہے کوئی
جو اس جہاں میں گھڑی بھر کو شادماں ہو جائے

کسی سے کیا گلۂ جورِ آسماں کیجے
کہ جس زمیں پہ رہیں ہم وہ آسماں ہو جائے

عجب ہے محفلِ ہستی میں پاسِ رسوائی
گدازِ شمع مرے دل کی داستاں ہو جائے

ادھر بھی اک نظر اے ابرِ نو بہار کرم
ہماری حسرتِ دیرینہ بھی جواں ہو جائے

حیا ٹھکانا بھی کچھ ایسی دردمندی کا
کہ لب تک آئے نہ اک حرف اور فغاں ہو جائے

غزل

بڑھ گئی ہے کچھ زیادہ بیقراری ان دنوں
کر رہا ہے دل بہت فریاد و زاری ان دنوں

یاد پھر بچپن کی آتی ہے تمہاری ان دنوں
بڑھ گئی ہے وحشتِ دل پھر ہماری ان دنوں

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف — چاہیئے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں
پھر بہار آئی ہوئی اُمڈا ہے یادِ دوست میں — دل کرے زاری اور آنکھیں اشکباری ان دنوں
اک نگاہِ ناز نے یہ کر دیا ہے کیا سے کیا — دل کی رگ رگ میں بسی ہے بیقراری ان دنوں
آہ یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار — ہو گیا ہے خونِ دل آنکھوں سے جاری ان دنوں
کیا تقاضہ کیجئے ان سے نگاہِ لطف کا — بے نیازی ہے وہاں یاں سوگواری ان دنوں

چھوڑ دو اس بے وفا دنیا کو تم بھی اے حیا
کر نہیں سکتا ہے کوئی غمگساری ان دنوں

مجھے بھول جا

مرے لب سے آتی ہے یہ صدا — مجھے بھول جا مجھے بھول جا
مری یاد دل میں ذرا نہ لا — یہی مصلحت کا ہے اقتضا

مجھے تجھ سے کوئی نہیں گلا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

مرے دُور رہنے کا غم نہ کر — مرے چھوٹنے کا الم نہ کر
مجھے نامہ خوں سے رقم نہ کر — مرے دل پہ آفت یہ ستم نہ کر

مرا تذکرہ بھی نہ لب پہ لا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

میں رہینِ منّتِ یاس ہوں — ہوئیں مدّتیں کہ اُداس ہوں
غم آرزو کے میں پاس ہوں — میں الم کی لطف شناس ہوں

تجھے کیوں ہے ملنے کا آسرا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

ترا دل ہے رنج سے کیوں لہو
نہیں اب ہے مجھ میں رنگ و بو

تجھے کیوں ہے دید کی آرزو
ترے دل کو کیوں ہے یہ جستجو

ہے نصیب سے تجھے کیوں گلا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

تجھے چاہتا ہے دلِ حزیں
کروں لاکھ منہ سے نہیں نہیں[1]

ہوں ترے خیال سے میں قریں
ہیں کہیں ہوں اور مرا دل کہیں

ہے دلِ حزیں کا یہ مدعا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

مرے لب پہ بس ترا نام ہے
تری یاد سے مجھے کام ہے

مجھے چین صبح نہ شام ہے
مرا تجھ سے اب یہ پیام ہے

مرے عشق کا یہی دے صلہ
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

وہی دل ہیں شاہدِ ناز ہے
وہی سوز ہے وہی ساز ہے

وہی اپنے پہلو میں راز ہے
وہی عشق فتنہ طراز ہے

---

[1] فیض احمد فیض

آہ میں! اور تری چاہ نہیں!
اس تصنع سے تنگ آ گیا ہوں میں

(" نقشِ فریادی ص۴۲ ")

مری اب ہے تجھ سے یہ التجا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

جو نہ ختم ہو میں وہ رات ہوں　　جو نہ بن سکے میں وہ بات ہوں
کوئی ذات ہوں نہ صفات ہوں　　میں اسیرِ دامِ حیات ہوں

میں ہوں ایک نالۂ نارسا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

نہ وہ اب ہے لطفِ چمن جیا　　نہ رہا وہ ذوقِ سخن حبا
نہ وہ خوفِ چرخِ کہن رہا　　ہے سکوت میں ہمہ تن حبا

میں شکستہ ساز کی ہوں صدا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

شکایت

تمھیں نے کی تھی محبت کی ابتدا کہ نہیں　　تمھیں نے درسِ غمِ دل ہمیں دیا کہ نہیں
سکونِ روح کی محفل کو کر کے خود برہم　　ہمارے دل کو شناسائے غم کیا کہ نہیں
ہمارا طفلِ دل آگاہ تھا نہ حسرت سے　　لُبھا لُبھا کے نگاہوں سے چھل دیا کہ نہیں
یہ بے نیاز زباں اب کس لئے بتاؤ تو　　فسانۂ غمِ الفت مرا سنا کہ نہیں
تمام لطفِ محبت کی یادگاروں کو　　بس اک ذرا سی نہیں نہیں مٹا دیا کہ نہیں
نگاہِ گرم نے برسا کے بجلیاں پیہم　　ہرا بھرا چمنِ دل جلا دیا کہ نہیں
تمھارا وعدۂ باطل تھا اک فریبِ وفا　　ہمیشہ جھوٹا ہی ہم آسرا دیا کہ نہیں

وہ دل کی نذر وہ حسرت سے پوچھنا بھی یاد
قبول تحفۂ ناچیز کو کیا کہ نہیں

تمہارے غم کے عوض اپنا دل دیا ہم نے
وہی یہ دل ہے جو ٹھکرا دیا گیا کہ نہیں

نگاہ ملتے ہی روحوں کا ایک ہو جانا
وہ وقت آہ تمہیں محو ہو گیا کہ نہیں

کہا تھا "عہدِ محبت کبھی نہ بھولیں گے"
مگر یہ عہدِ محبت بھلا دیا کہ نہیں؟

نہ اُن سے کوئی شکایت نہ ہے زمانے سے
حبیا ہمیشہ رہو دُور دل لگانے سے

تصوّرات

نہ چھیڑ اے ہم نشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے
تصوّر سے کسی کے مجھ کو ہم آغوش رہنے دے
ہیں سرشارِ محبت ہوں مجھے مدہوش رہنے دے
ازل سے خوگرِ غم ہوں اسے غم کوش رہنے دے
نہ چھیڑ اے ہم نشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

نہ چھیڑ افسانۂ غم تو مجھے خاموش رہنے دے
دلِ محزوں میں پنہاں اُلفتِ پُر جوش رہنے دے
مسرّت ہے یہی میری مجھے غم کوش رہنے دے
تو مجھ محروم عشرت کو ستم بردوش رہنے دے
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

مجھے کیا واسطہ دنیا جو سرتاپا مسرّت ہے

غرض کیا مجھ کو گر دنیا صدائے سازِ عشرت ہے
میں اس کی یاد میں بس محو ہو جاؤں یہ حسرت ہے
اسی میں آہ پنہاں میری راحت اور مسرت ہے
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

مری آہ و فغاں رہتی بتاؤ بے اثر کب تک
مرے نالوں میں رہتا یہ دھواں کب تک شرر کب تک
کہ رہتا نخلِ امید آہ میرا بے ثمر کب تک
بھلاتا مجھ کو وہ غفلت شعار و بیخبر کب تک
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

سُنا ہے دھیان ان کو بڑھ چلا ہے ان دنوں میرا
میں غرقِ بحرِ حیرت ہوں کہ آخر کیوں ہوا ایسا
بھلا کر مجھ کو دل سے کیوں انھیں میرا خیال آیا
کہوں میں کچھ تو پھر ہوگا مرا اغیار میں چرچا
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

لگاوٹ کی ہیں باتیں پھر بڑھے گا حوصلہ دل کا
کہ پھر وابستہ ہو جائیگا اُن سے آسرا دل کا
یہ سوچا ہے کہ ہم ایسے نہ مانیں گے کہا دل کا
شکایت ہو، گلہ ہو، کچھ نہ سننا تم حیا دل کا
نہ چھیڑ اے ہمنشیں مجھ کو یونہی خاموش رہنے دے

نہ ہوتی حالِ دل کہنے کی گر ہمت تو اچھا تھا — نہ سنتے کاش وہ شرحِ غمِ الفت تو اچھا تھا
یہ پامالِ الم، مصروفِ غم میرا دلِ محزوں — نہ ہوتا آشنائے شادی و بہجت تو اچھا تھا
مری بیتابیٔ دل بڑھ گئی ہے الاماں کتنی — نکلتی گر نہ شوقِ دید کی حسرت تو اچھا تھا
وہ راحت بہ زباں ثابت ہوئیں کتنی حباب آسا — کبھی ہوتا نہ اتمامِ شبِ فرقت تو اچھا تھا
بڑھی پھر آرزوئے دل ہوا کیوں سامنا ان کا — مرے دل ہی میں رہ جاتی جو یہ حسرت تو اچھا تھا
ہوا کیوں التفات ان کا بڑھا کیوں حوصلہ میرا — نہاں پھولوں میں رہتی آہ گر نکہت تو اچھا تھا
سکوں سے ہے مجھے نفرت میں مایوسِ تمنا ہوں — مرے دل کو نہ ملتی گر کبھی راحت تو اچھا تھا
تمنا ہے فزوں ہوں شورشیں جذبِ محبت کی — دلِ مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا

رہیں غم کی شرر انگیزیاں یارب قیامت تک
حیاؔ غم سے نہ ملتی گر کبھی فرصت تو اچھا تھا

خ

خالدہ — محترمہ خالدہ بیگم جبلپور۔

محترمہ نے اپنے خود نوشتہ حالات جو ارسال کئے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں۔

"نام خالدہ بیگم، تخلص خالدہ، مقیم جبلپور۔ میرے والد محمود حسن صاحب مشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار گن کیرج فیکٹری جبلپور میں سپروائزر ہیں میرے دادا خان بہادر لطیف حسن صاحب مرحوم عرصہ تک ضلع بریلی میں تحصیلدار رہے تحصیل نواب گنج بریلی سے ۱۹۱۸ء میں پنشن

لیکن آنریری مجسٹریٹ اور منیجر کورٹ آف وارڈ کا کام کرتے رہے ۱۹۴۱ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔

"میری ابتدائی تعلیم مڈل کلاس تک اسکول میں ہوئی۔ فارسی کی تکمیل مکان پر ہوئی۔ دوران تعلیم میں شاعری کا شوق شروع ہوا عروض کی کتابیں مطالعہ سے گزریں۔ مگر یہ مقام (جبلپور) اردو کے واسطے قطعی غیر موزوں ہے، جہاں پر نہ کسی سے مشورہ سخن کیا جا سکتا ہے اور نہ یو۔پی کا سا ماحول ہی ہے۔ یہاں کی دفتری زبان تک ہندی ہے اور ہر شخص ہندی پڑھنے پر مجبور ہے۔ میں خاموشی سے مشق سخن کرتی رہی۔ میرا کلام اور مضامین نثر اکثر رسالہ خاتونِ مشرق میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے زائد ایک ایسی لڑکی کے اور کیا حالات ہو سکتے ہیں جو ابھی تک انفرادیت کے دور سے گزر رہی ہو۔"

محترمہ کے کلام کا انتخاب جو موصوفہ نے اس کتاب کے لئے راقم الحروف کو ارسال فرمایا ہے، درج ذیل ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ محترمہ کا انداز بیان پختہ اور کلام سنجیدہ ہے جذبات میں متانت و وقار موجود ہے۔ زبان صاف و سادہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئی ہیں:

مایوس آرزو ہے مجبور التجا ہے — دل ہے مگر وہ دل بھی اب دل نہیں رہا ہے
اللہ تو ہی حافظ آج اس کا سامنا ہے — لاکھوں قیامتیں ہیں اک جان مبتلا ہے
دل نذر کر دیا تھا اب جان بھی فدا ہو — وہ حسن ابتدا تھی یہ حسن انتہا ہے

خالدہ بیگم "خالدہ"

یہ بیخودی کا عالم، دیوانگی کا نقشہ میں دل کو ڈھونڈتا ہوں دل مجھکو ڈھونڈتا ہے
تجھ کو مری محبّت کا واسطہ بتادے آخر مجھے مٹا کر کیا بات چاہتا ہے

یہ غمِ محبّت، یہ ہجر ہجرِ جاناں
کیا خالدہ بتاؤں آفت کا سامنا ہے

پابندِ اختیار اثرِ اُف زباں نہیں وہ سُن کے کہہ رہے ہیں تری داستاں نہیں
یہ منظرِ حیات ذرا تو بھی دیکھ لے وہ بے نشانِ عشق ہوں جس کا نشاں نہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد غلط غلط کیا بات کہہ رہا ہے کہ جس کا گماں نہیں[1]
بیٹھا ہوں کچھ سمجھ کے اٹھونگا نہ حشر تک تو ہی بتا دے کیا یہ ترا آستاں نہیں

خوش ہوں میں خالدہ مرا انجام ہو بخیر
عمرِ رواں سے آگے کوئی کارواں نہیں

قربانِ محبّت ہوں تصویرِ مسرت ہوں
پھولوں کی میں نکہت ہوں دنیا کی میں جنّت ہوں

مشرق کی میں عورت ہوں

دریائے لطافت ہوں اک گوہرِ عصمت ہوں
اک رازِ حقیقت ہوں پروانے کی فطرت ہوں

---

[1] امیر مینائی ؎ وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

مشرق کی میں عورت ہوں

میں پیکرِ فطرت ہوں　　مانوسِ محبّت ہوں
سرمایۂ راحت ہوں　　میں حسنِ قیامت ہوں
مشرق کی میں عورت ہوں

شیریں کی صباحت ہوں　　لیلیٰ کی ملاحت ہوں
فرہاد کی غیرت ہوں　　مجنوں کی میں حسرت ہوں
مشرق کی میں عورت ہوں

شمشیرِ ہلاکت ہوں　　تفسیرِ قیامت ہوں
چنگیز کی خصلت ہوں　　محمود کی عادت ہوں
مشرق کی میں عورت ہوں

حضرتِ جگر کے ایک شعر کی تضمین

منہ میں زباں جو دی تھی تو دل کیوں دیا مجھے　　فطرت سے اپنی کس نے کیا آشنا مجھے
ان کی نگاہِ ناز سے کہنا پڑا مجھے　　مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

ایضاً

نگاہوں سے اپنی وہ نذر پا رہا ہے　　تبسّم کے ساغر وہ چھلکا رہا ہے
یہ دل جوشِ طوفاں سے گھبرا رہا ہے　　وہ حرفِ غلط ہے مٹا جا رہا ہے

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

ہر اک رنگ سے آزمایا گیا ہوں — چڑھا کر نظر سے گرایا گیا ہوں
بھری بزم سے میں اُٹھایا گیا ہوں[1] — کہاں پھر کہاں سے میں لایا گیا ہوں

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

تڑپ خالدہ دل میں ہوتی ہے اکثر — مصیبت میں ہر آنکھ روتی ہے اکثر
سنو دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اکثر — یہ شمع ہے وہ جل کے بجھتی ہے اکثر

محبّت کی دنیا نرالی ہے سب سے
انوکھی یہ بزمِ خیالی ہے سب سے

شوخیاں بن کے جو چھا جاتی ہیں نظرِ ساقی — ہے کوئی موج بھی ایسی ترے پیمانوں کی
زندگی میری کہیں حرفِ مکرّر تو نہیں — برق کیوں ڈھونڈھتی پھرتی ہے نشیمن میرا[2]
خود حسن سے اظہارِ آرزو کیا ہے — سمجھ رہا ہوں یہ اندازِ گفتگو کیا ہے[3]
دیوانگی میں تو میری نیت بھی دیکھ لے — کس درجہ احترام ہے عہدِ شباب کا

---

[1] شاد عظیم آبادی
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے — بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

[2] غالب ؎ :- یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ؛ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

[3] غالب ع :- تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے۔

خورشید امراوتی (برار)

اس شاعرۂ نادرہ کا نام خورشید آرا بیگم اور تخلص خورشید ہے نہایت عالم و فاضل خاتون ہیں۔ فارسی کی منتہی ہیں۔ آپ کا وطن امراوتی (برار) ہے۔ بہت عرصہ پہلے آپ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کر چکی تھیں۔ اور ومن کالج ناگپور میں پرشین پروفیسری کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

آپ کی طبیعت کا رجحان بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف تھا اور اب آپ ملک کی ایک مسلم الثبوت وقادر الکلام شاعرہ ہیں۔ آپ کا شمار گنتی کی ان چند خواتین میں سے ہے جن کی شاعرانہ قابلیت ہندوستانی خواتین کے لیے باعث فخر کہی جا سکتی ہے۔ ان کی بلند پایہ و موثر نظمیں بڑی قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کے کلام و زبان میں فارسی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ آپ کے خیالات نہایت بلند، سنجیدہ اور پُر وقار ہوتے ہیں، طرز ادا نہایت پختہ اور استادانہ ہے۔ کلام میں فلسفہ کا بھی امتزاج ہے اور ضرورتِ زمانہ کا بھی لحاظ۔ آپ نے نہایت کامیاب منظر کشی بھی کی ہے۔ جذبات نگاری پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

محترمہ خورشید آرا بیگم خورشید فارسی کی بھی ایک بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ مولانا رازق الخیری ایڈیٹر رسالہ عصمت آپ کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"...... بالعموم وہ فارسی میں لکھتی ہیں، انھوں نے تقریباً پانچ چھ ہزار اشعار اب تک فارسی میں کہے ہوں گے پُر شکوہ الفاظ

ہیں مناظرِ قدرت کی مصوّری، جذبات کی ترجمانی، درد و اثر، سوز و گداز ان کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔ عورتوں کے حقوق اور فرائض پر ان کی بیداری اور ترقی کے سلسلہ میں خورشید آرا بیگم صاحبہ کی نظمیں سب سے زیادہ شائع ہوئی ہیں۔"

زندگی

زندگی جبرِ فطرت کا پریشاں خواب ہے / زندگی مجبوریٔ انساں کی درد آگیں کراہ
زندگی ناکامیوں کی قسمتِ سیماب ہے / زندگی افسردہ ارمانوں کی غم پرور نگاہ
زندگی مایوسیوں کا روح فرسا اضطراب / زندگی پامالیوں کی آہِ وحشت آفریں
زندگی ہے کاہشوں کا کشمکش زا انقلاب / زندگی ہے نقطۂ پرکارِ افکارِ حزیں
زندگی تسکینِ برہم کی دعائے نا قبول / زندگی ناکامِ بہجت کا قیامِ مستقل
زندگی اک سعیٔ ناشکورِ جذباتِ ملول / زندگی تقدیرِ فاتروں کی امیدِ مضمحل
زندگی قدرت کا انساں سے زبردست انتقام / زندگی جنگِ عناصر کا مصائب زا سماں
زندگی ہے شورشوں کی داستانِ ناتمام / زندگی پاداشِ جرمِ آدمِ جنت مکاں
وہ گراں بارِ امانت ہے حیاتِ آدمی / محترز جس سے ہوئے تھے کوہ و افلاک و زمیں
مل گئی نادان و ظالم[1] کو سزائے الٰہی / ہو گیا خورشید وہ رنج و مصائب کا امیں[2]

---

[1] آیۂ پاک کے الفاظ "ظلوماً جہولاً" کا لفظی ترجمہ ہے

[2] محترمہ کی یہ نظم دیکھنے سے پہلے راقم السطور نے بھی اس جذبہ کو اس طرح ادا کیا تھا

زندگی ایک خوابِ وحشت ہے / زندگی اک سرابِ الفت ہے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

صرفِ فغاں ہو گئیں آج نوا ریزیاں
آنسوؤں میں کھو گئیں آہ کی بیتابیاں

جانتا ہوں میں آرزو کا مآل ... آرزو پھر بھی دل کی عادت ہے
دل کی رگ رگ سے خوں ٹپکتا ہے ... زندگی صد ہزار کلفت ہے
زندگی نالہ ہائے بے تاثیر ... زندگی گریہ ہائے حسرت ہے
زندگی داستانِ رنج و الم ... زندگی قہر ہے مصیبت ہے
زندگی بیکسی و محرومی ... زندگی سوز و دردِ فرقت ہے
زندگی نامرادیٔ پیہم ... زندگی کرب ہے اذیت ہے
ہر تمنا کا خون ہوتا ہے ... کیا یہی زندگی کی غایت ہے؟

کس کو جرأت کہ لب ہلائے جمیلؔ
زندگی شاہکارِ فطرت ہے

اسی مضمون کو ردیف و قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ اس زمین میں ایک اور جگہ بھی ادا کیا تھا۔ اس وقت صرف ایک شعر یاد ہے ؎

زندگی، زندگی نہیں یا رب! ... زندگی، زندگی کا ماتم ہے

میرے یہ اشعار ایک اضطراری لمحہ کی وقتی تخلیق ہیں جو میرے نظریۂ حیات کی طرف ہدایت نہیں کرتے۔ یوں نہ صرف یہ کہ میں اس نظریہ کا قائل نہیں بلکہ اس کو انسانی زیست کے مفاد اور حیات کی تکمیل مقاصد کے لئے ضرر رساں اور غلط سمجھتا ہوں، حیات بے پناہ امکانات کی جولانگاہ ہے اس کی تحدید انفعال در اصل ہماری کم کوشی و بے بصری کا نتیجہ ہے۔
"ج"

نقش سکوں ہو گئیں درد کی گہرائیاں
یاس سے خوں ہو گئیں ضبط کی ناکامیاں

آج سویدائے دل بن گیا داغِ الم
ہر نفس گرم ہے دودِ چراغِ الم
دودِ چراغِ الم وجہ سراغِ الم

عورت

(۱)

ازل میں سلسلۂ تخلیق کا سرعت سے جاری تھا
اور تکمیلِ مذاقِ زیست میں مصروف تھی فطرت
کمالِ آفرینش بے قرارِ کامگاری تھا
عطا کی جارہی تھی زندگی کو مضطرب قسمت

(۲)

مگر ناواقفِ رمزِ گداز و سوز تھا نغمہ
صباحت بے سحر اور رنگ و بوئے گل تہی داماں
خمار و کیف سے ناآشنا تھی فطرتِ صہبا
بہارِ شام سحر آئیں نہ تھی رنگینیاں ساماں

(۳)

جنوں سے عشق بیگانہ تھا فرقت بیقراری سے
تجلیاتِ حسنِ حشر پرور زیرِ پردہ تھیں
وفا و عزم تھے محروم ذوقِ استواری سے
ادا و عشوہ محوِ خواب امیدیں فسردہ تھیں

(۴)

نہ تھی معصومیت آئینہ دارِ عفت و عصمت
نہ تھی دوشیزگی ملبوسِ تقدیس و حیا پرور
نہ مقرونِ لطافت تھا خیالِ راحت و عشرت
نہ جذباتِ شباب و شاعری وجدانیت پرور

(۵)

نہ وارائے اثر آہ و دعائے صبح گاہی تھی
نہ حسیاتِ انسانی امین رنگ خودداری
نہ جوہرِ زندگی مرہونِ حسن بیگناہی تھی
تھا فقدانِ رفاقت سر بہ زانو شوقِ غمخواری

(۶)

کیا محسوس فطرت نے جمودِ ذوقِ اشیاء کو
ہوئی مجبورِ بیداری جذباتِ فسردہ پر
شبابِ حسن و رعنائی وفا و عزم و تقویٰ کو
کیا یک جا تبسم کی لطافت باریاں لے کر

(۷)

کیا عفت کو شامل اور بنایا اک حسیں پیکر
جو پیکر شعر و نغمہ تھا سراپا سوزشِ الفت
مجسم جذبۂ خودداری و شرم و وفا پرور
پھر اس کا نام لے خورشید فطرت نے رکھا "عورت"[۱]

---

[۱] محترمہ کی اس نظم کو علامہ اقبالؒ کی اس نظم کے ساتھ پڑھئے۔

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

[بقیہ اگلے صفحہ پر]

ہے موسمِ برشگال عریاں، فلک ہے ملبوسِ ابر در بر
فتادگی سے نسیمِ عنبر چکاں ہے مستِ خرام یکسر

[پچھلے صفحہ سے]

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینہ کی تمنا چشمِ خاتم سے

سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریمؑ سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکّب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

مہوّس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے محرم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

[بانگِ درا صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶]

صبح غنچے تبسم آگیں، سبک رو و نرم سیر طائر
تجلیٔ شام حسن پیرا ہے آہ وقت وداع نیّر

ہوا ہے بیدار حسنِ فطرت، فضا ہے رنگینیاں بداماں
رواں دواں نغمہ ریز نہریں، ہے جامِ گل میں شرابِ احمر

شفق سے رنگیں افق ہوئی ہے، جہاں پہ نشہ سا چھا رہا ہے
ضیا میں ہمدوش تیرگی ہیں، کہیں کہیں جلوہ زا ہیں اختر

ہیں مائلِ آشیاں عنادل، ہیں اہلِ عالم سکون خواہاں
کنارِ راحت میں سوئے رحمت، پئے سکوں شورشیں ہیں مضطر

جمالیات و تجلی آگیں، فضا ہے لیکن کنارِ چشمہ
خموش بیٹھی ہے اک دوشیزہ جمالِ رنگ و شباب پیکر

ہیں ساعدِ تابناک عریاں، شگوفہائے سمن بداماں
ہے موجِ نقرہ بدوش ہر دم حسین پیروں پہ سجدہ گستر

ہیں گیسوئے عنبریں پریشاں، نگاہ یکسو لگی ہوئی ہے
ہیں بے نیازِ نظارہ آنکھیں، ہیں خشک لب زرد رُوئے انور

سکوت کا بُت ہے یا الٰہی شبیہِ مایوسی و الم ہے
ہوئی ہے یا محویت مجسم، یا بیخودی کا جمیل پیکر

نگاہیں ساکن، زباں ساکت، ہے دل میں جذبات کا تلاطم
مثالِ سیماب ہر رگِ جاں، جگر میں غم کے لگے ہیں نشتر

گدازشیں آرزو کی دل سے ہیں کر عیاں رازِ سرِّ مخفی

ہیں مقتضیٔ وقت فہم و دانش نہ رکھ نہاں جذبۂ مضطر

اے غنچۂ باغ آفرینش، زبان خموشی نواز کب تک
تری تمنا بھی رہے گی نہاں کدہ دل میں راز کب تک[1]

درخشاں

محترمہ آر۔ کے۔ درخشاں بجنور کی مشہور شاعرہ ہیں، خاتونِ مشرق میں کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کی زبان صاف و سادہ اور اندازِ بیان پُر کیف اور پُر اثر ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

گدا تیرے در کا بنا چاہتی ہوں
محبت میں تیری فنا چاہتی ہوں

کہے اب وہ رودادِ غم آکے مجھ سے
تصور میں لیکن سُنا چاہتی ہوں

ہوا کس طرح قلبِ تاریک روشن
عیاں رازِ پنہاں کیا چاہتی ہوں

کہا آکے گلشن میں بلبل نے ہنس کر
میں پھولوں سے دامن بھرا چاہتی ہوں

ہوئی محفلِ شوق تاریک میری
تجھے دل میں جلوہ نما چاہتی ہوں

کہانی مرے غم کی بکھری ہوئی ہے
غمِ عہد یکجا کیا چاہتی ہوں

نہ دیکھے تصور میں بھی کوئی مجھ کو
لطافت میں ایسی چھپا چاہتی ہوں

گناہوں کا نظروں پہ اتنا اثر ہے
میں بحرِ خجل میں بہا چاہتی ہوں

درخشاں مرے شعر ہیں دل کے ٹکڑے
میں کاوش کا اپنی صلا چاہتی ہوں

---

[1] ساغر نظامی۔ ہاں تو لبِ خاموش کو نطق کی دے اجازتیں
نالہ سے یوں ہو نغمہ گر کہ گونج اٹھے فضائے ساز

دل آرا

دل آرا بانو نام اور دل آرا تخلص ہے۔ زبان سہل اور صاف لکھتی ہیں۔ محاورات بھی نہایت خوش سلیقگی سے استعمال کرتی ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

یاد ہیں وہ دن کہ جب آپس میں اک سنجوگ تھا　　کوئی صدمہ تھا نہ غم تھا اور نہ کوئی روگ تھا
یاد ہیں وہ دن کہ تھی گلزارِ اردو پر بہار　　اور چلا کرتی تھی اترا کر نسیمِ مشکبار
یاد ہیں وہ دن کہ اُردو کی ترقی کیلئے　　لکھنؤ اور شاہجہاں آباد دونوں ایک تھے
تھی انھیں دونوں کے دم سے جوئے اُردو کی بہا　　اور انھیں دونوں سے تھا جادوئے اردو کا نکھار
ان کے ہاتھوں ہی بنی سنوری تھی اُردو کی دلہن　　انکی کوشش سے ہی تھی آباد اس کی انجمن
لکھنؤ دلّی سے ہی اُردو کی آرائش ہوئی　　متحد کوشش سے ہی اُردو کی افزائش ہوئی
ایک دو دن سے نہیں صدیوں سے تھا یہ میل جول　　پر خدا جانے کہ بولے کس نے تھے بڑھ بڑھ کے بول
جن سے چرخِ فتنہ پرور کو بہانہ مل گیا　　تیرِ فرقت کیلئے عمدہ نشانہ مل گیا
ہو گئی دونوں میں رنجش پڑ گئی دونوں میں پھوٹ　　چرخ نے دستِ خزاں سے کہہ دیا گلشن کو لوٹ
جاگ اُٹھے فتنے کرم پرور فرشتے سو گئے　　لکھنؤ دلّی کے دل جو ایک تھے دو ہو گئے
لیلئ اُردو تری زلفیں پریشاں ہو گئیں　　ہاں تری رنگیں شعاعیں نذرِ زنداں ہو گئیں
دل فسردہ ہو گیا چہرہ فسردہ ہو گیا　　ہائے وہ اک رشکِ جنت پھول مردہ ہو گیا
ہائے وہ صدیوں کا دلّی لکھنؤ میں اتحاد　　ہائے وہ مدت کا کیفِ رنگ و بو میں اتحاد
کیا خبر تھی حادثوں کے ہاتھ سے لٹ جائیگا　　ساتھ جو مدت سے تھا وہ یک بیک چھٹ جائیگا
لکھنؤ کو گھر سمجھ کر شاعرانِ دہلوی　　جا کے رہتے اور بستے تھے بصد جوشِ دلی
متحد آپس میں تھے اک نیک مقصد کیلئے　　ہو نہ سکتے تھے جدا وہ ایک مقصد کیلئے

ہائے یہ کس کی فسوں سازی کا جادو چل گیا　　کیا فلک تیری نگاہِ بد کا جادو چل گیا
ہے زباں بھی ایک رنگِ شاعری بھی ایک ہے　　غور سے دیکھو تو طرزِ زندگی بھی ایک ہے
پھر بھی دونوں کے دلوں میں ہے جدائی ہائے ہائے　　گلشنِ اردو پہ کیسی آفت آئی ہائے ہائے
کاش اب پھر درمیاں سے رنگِ باطل دور ہو　　کاش پھر دونوں دلوں سے حدِّ فاصل دور ہو
کاش صنفِ نازنیں کا دل ذرا جرأت کرے　　مرد جس کو کر نہ سکتے ہوں اُسے عورت کرے
حق تعالیٰ سے دلِ آرا کی ہے روز و شب دعا　　دونوں مرکز ایک کر دے دونوں بچھڑوں کو ملا
پھر دلوں سے اے خدا زنگِ کدورت دور کر　　اب جو ناخوش ہیں انھیں پھر شاد کر مسرور کر

رازؔ

امت الشکور نام اور رازؔ تخلص ہے۔ آپ کی صرف ایک طرحی غزل دستیاب ہوئی ہے جو آپ نے لکھنؤ کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ یہ مشاعرہ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو محترمہ کنیز فاطمہ حیا کے مکان پر بیگم حبیب اللہ صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ آپ موجودہ دور کی ایک اچھی شاعرہ ہیں، زبان و بیان میں سلاست، صفائی اور شائستگی موجود ہے۔

سفینہ لا پتہ ہے ناخدا کیا　　مرے اشکوں کا طوفاں ہے بپا کیا
بہار آتے ہی کھل جاتے ہیں غنچے　　بدل جاتی ہے گلشن کی فضا کیا
وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے　　کسی سے ہم کریں جا کر گلا کیا
نظر آتی ہے صورت رہزنوں کی　　بنائیں ہم کسی کو رہنما کیا
چلے آتے ہیں میکش میکدے میں　　فلک پر جھوم کر آئی گھٹا کیا

اجل کا رات دن رہتا ہے کھٹکا　　نکالے دل کا کوئی حوصلا کیا
نہ لی کروٹ بشر نے راز مرکر　　گئی ہے کان میں کہہ کر قضا کیا

راز

محترمہ سیدہ جمیل راز مظفر نگر کی شاعرہ ہیں۔ آپ کا کلام اکثر خاتونِ مشرق میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے دل میں اسلامی و قومی درد ہے۔ آپ اقبال کی شاعری سے متاثر ہوئی ہیں۔ اگر آپ برابر لکھتی رہیں اور کلام و زبان میں تھوڑی اور پختگی پیدا ہو گئی تو آپ اردو کی ایک بلند پایہ شاعرہ ہونگی۔

خدا سے التجا

اے خدا اُمتِ عاصی پہ کرم کر اپنا　　تیرے بندے ہیں گنہ گار رحم کر اپنا
قوم مسلم تری گمراہ ہوئی جاتی ہے　　ناؤ اسلام کی بیدراہ ہوئی جاتی ہے
آہ مسلم کی وہ پہلی سی طبیعت نہ رہی　　اب تری اور ترے محبوب کی الفت نہ رہی
حالتِ امتِ عاصی میں بتاؤں کیونکر　　داستاں درد بھری آہ سناؤں کیونکر
شاہ اسلام کے ارشاد کو ہم بھول گئے　　انتہا ہے کہ تری یاد کو ہم بھول گئے
ہم تو وہ تھے کہ دو عالم کو ہلا دیتے تھے　　نام پر تیرے رگِ جاں کو کٹا دیتے تھے[1]
ناز اسلام کو تھا ان ہی مسلمانوں پر　　سر بسجدہ ہوئے بُت ان ہی ایمانوں پر[2]

---

[1] علامہ اقبالؒ ۔ نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے ؛ زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے　(شکوہ)

[2] علامہ اقبالؒ　کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے　(شکوہ)

ان کا بھولا ہوا افسانہ سنا دے ان کو
مئے توحید کا پھر جام پلا دے ان کو
آہ مقصود کی پھر شمع دکھا دے ان کو
کون تھے سیّدِ کونین بتا دے اُن کو
خوابِ غفلت میں ہیں مدہوش جگا دے ان کو
نالۂ دردِ دلِ راز سنا دے ان کو

رفعت

سکندر جہاں نام اور رفعت تخلص ہے لکھنؤ مولد و مسکن ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک قابل اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے لیکن جہاں اکثر دوسری خواتین انگریزی پڑھنے کے بعد مغربی تہذیب میں کھو جاتی ہیں اور اپنی تہذیب معاشرت، اپنے تمدن و مذہب ہر چیز سے کچھ بیگانہ اور متنفر سی نظر آتی ہیں، وہاں محترمہ سکندر جہاں رفعت بی۔ اے کرنے کے بعد بھی مشرقی تہذیب اور اسلامی تعلیمات و نظریات کی دلدادہ ہیں۔ آپ مغربیت کے اس تباہ کُن طوفان سے اپنی دوسری بہنوں کو بھی بچانے کی خواہشمند ہیں اور اپنے ان اصلاحی خیالات کا اظہار اکثر اپنی شاعری کے ذریعہ فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کے ذیل کے اشعار پڑھکر حضرت اکبر الہ آبادی کی وہ رباعیات یاد آجاتی ہیں جو انھوں نے پردہ کے متعلق لکھی ہیں۔

پردہ

اے مشرقی خاتون سُن
پردہ ہے تیری آبرو

چھوڑا اگر تو نے اسے بدنام ہو جائے گی تو
فطرت کا تو اک پھول ہے پردہ ہے اس کا رنگ و بو
دنیا ہی کی زینت نہیں ہے دین کی بھی زیب تو
اسلام کی گر ہے طلب ایماں کی ہے گر جستجو
عصمت اگر مقصود ہے پردے ہی میں پائیگی تو
پردہ ترقی میں تیری حائل نہیں اے نیک خو
ہر خدمتِ قوم و وطن پردے میں کر سکتی ہے تو
اے مشرقی خاتون سُن
پردہ ہے تیری آبرو

روشن آرا

محترمہ روشن آرا دہلی کی ایک قابل اور ہونہار خاتون ہیں۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہے نظمیں خوب لکھتی ہیں۔ زبان میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہے رنگ صاف اور اسلوب بیان پُر کیف ہے۔

اُردو زبان

دلربائے ہند اے اُردو زباں نغمۂ شیریں ہوا رطب اللساں
یادگارِ سطوتِ اسلامیاں نورِ چشمِ مادرِ ہندوستاں
بادۂ مے خانۂ جنت نشاں بادۂ رنگین جانِ مے کشاں
حاصل ہا شیریں کلامی زباں مایۂ صد ناز کشِ اہلِ جہاں

تجھ سے ہے آباد اپنا بوستاں

تجھ میں دل آویزیِ گلزار ہے
تجھ میں رنگ و کیفِ لالہ زار ہے
تیرا ہر گل آج عنبر بار ہے
اس لیے گلشن نزاتا تا رہے
تیرا ہر غنچہ دہانِ یار ہے
تیرا جو گل ہے گلِ بے خار ہے
تیرا دامن بحرِ گوہر بار ہے
تیرا سینہ معدنِ اسرار ہے

قبلہ ہر شاعر نثار ہے

ہے سراپا کیف تیرا ہر سخن
باعثِ وارفتگیِ انجمن
نازشِ لغمہ سرایانِ چمن
یعنی فخرِ نکتہ سنجانِ وطن
روح پرور، قاطعِ رنج و محن
شاہدِ اربابِ علم و اہلِ فن
تیرا ہر نکتہ عروسِ سیم تن
ماہ وش، حجلہ نشیں، غنچہ دہن

اور تو اس کا سب پیرہن!

ریحاں۔

حسن آرا نام اور ریحاں تخلص ہے۔ آپ عصمت کی شاعرہ ہیں کلام میں اسلامی رنگ نمایاں ہے۔ آپ کی زبان شائستہ اور پُر وقار ہے۔ کلام میں جوش و اثر موجود ہے۔ "نذرِ حسین علیہ السلام" کے عنوان سے آپ نے جو نظم لکھی ہے وہ خواتین کی شاعری کا ایک اچھا نمونہ کہی جا سکتی ہے یہ نظم نہایت بلند اور پُر شوکت ہے ہر شعر عقیدت و محبت سے لبریز اعلیٰ جذبات کا حامل ہے۔

نذرِ حسین علیہ السلام

تپشِ سوزِ محبت کی نہ دنیا سے کبھی تو نے
بجھا لی آبِ تیغِ ظلم سے دل کی لگی تو نے

دلِ قاتل میں لرزہ پڑ گیا تھا جب سنائی تھی
نگاہِ واپسیں میں داستانِ آخری تو نے

سرِ لاشِ پسر تیرے تبسم ہائے پنہاں پر
زمانہ محوِ گریہ ہے ہنسی تھی وہ ہنسی تو نے

جزاک اللہ مختارِ دو عالم ہو کے بھی رن میں
دکھا دی اہلِ عالم کو بشر کی بے بسی تو نے

نہ کیوں شاہا ترا ماتم سبق آموزِ عالم ہو
فنا ہو کر سکھائی ہے جہاں کو زندگی تو نے

قیامت تک کہے گی سجدہ گاہِ کربلا سب کو
سکھا دی ایک سجدہ سے جہاں کو بندگی تو نے

یقیناً غرق ہو جاتا سفینہ امتِ جد کا
مگر ہاں آبرو رکھ لی حسین ابنِ علی تو نے

یہ دنیا منحرف ہو جاتی ساری کلمہ گوئی سے
بنائے لا الٰہ از سر نو ڈال دی تو نے[1]

دلِ پُر درد میں اک درد پیدا ہو گیا ریحاں
عجب انداز سے یہ داستانِ غم لکھی تو نے

---

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ: سر داد نہ داد دست در دستِ یزید ؛ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؓ

رُتبیہ

ربیعہ خاتون نام اور رُتبیہ تخلص ہے آپ محترم رفیع حسن صاحب کی شریکِ حیات ہیں اور اسی نسبت سے ادبی دنیا میں مسز رفیع حسن کے نام سے مشہور ہیں گولکونڈہ (دکن) کی رہنے والی ہیں۔ پرانے رنگ تغزل میں لکھتی ہیں۔ کلام میں جذبات نگاری کم اور خیال بندی زیادہ ہے۔

"کیفِ ترنم"

ہے تصور کار فرما عشق کی تاثیر پر — آشیاں باندھا ہے بلبل نے گُلِ تصویر پر

گو مقید ہے قفس میں پر ہو شکوہ ہو گریز — کیا گلہ صیاد کا قانع ہے خود تقدیر پر

کاکلِ شبگوں کا ظالم کیا ہو تیرے تذکرہ — رشک ہے دار و رسن کو زلف کی زنجیر پر

نالۂ شبگیر بلبل کا اثر غنچوں میں دیکھ — ہے وفورِ شوق اس کا دفعتاً کرتا تیر پر

تھام لیتے ہیں جگر جو دیکھ جاتے ہیں وہ — کس غضب کا ہے اثر بیتاب ہا تقریر پر

طبع موزوں ہے رُتبیہ کچھ تری اشعار پر
دفعتاً کر دے فکر کو اور شاد ہو تشہیر پر

زیب۔ صاحبہ

آپ موجودہ دَور کی ایک خوش گو خوش فکر شاعرہ ہیں۔ اپنا نام اور تخلص ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ اُردو غزلوں اور نظموں کے علاوہ آپ سندھی رنگ میں بھی لکھتی ہیں۔ اور خوب لکھتی ہیں۔ آپ کی اس قسم کی نظموں میں سندھی شاعری کا سا رس اور شیرینیت ہے۔ جذبات میں بڑا کیف اور لوچ ہے

طرزِ ادا نہایت سادہ اور پُراثر ہے۔ آپ کی اس رنگ کی ایک نظم درج ذیل ہے:۔

من میرا ہے پریم کی بستی
پریم کا نام "میری ہستی"
جان کے بدلے پریت ہے سستی
یہ سنسار ہے پریم کا گیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

پریت کرے اور من کو گنوائے
پریت میں جیون اپنا تپائے
من ہارے پر میت نہ پائے
من کی ہار ہے پریت کی جیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

جب آنکھوں میں میت سمائے
اور کوئی پھر نظر نہ آئے
من میں میت بسے من چاہے
پریم نگر کی الٹی ریت

جس کے من میں بسے نہ میت

وہ کیا جانے پریت کی ریت

اُس نے پایا جس نے کھویا
پیت بنا کوئی میت نہ ہویا
جوگی ہو یا کوئی اتیت

جس کے من میں بسے نہ میت
وہ کیا جانے پریت کی ریت

زاہدہ ۔ محترمہ زہرخ ش مرحومہ (علیگڑھی)

محترمہ زہرخ ش کے حالات جو انکی بھانجی محترمہ ناجیہ اکرم شیروانیہ نے اس تذکرہ کے لئے خود تحریر فرما کر ارسال کئے ہیں درج ذیل ہیں :-

"نام زاہدہ خاتون ۔ نسل شیروانی پٹھان ۔ اس شاعرہ شعلہ نوا نے دسمبر ۱۸۹۴ء میں والد مرحوم آنریبل نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی خان بہادر کے ۔ سی ۔ آئی ۔ ای ۔ او ۔ بی ۔ ای ایل ایل ۔ ڈی کی قدیم سکونت گاہ بھیکم پور ضلع علیگڈھ میں جنم لیا اور جدید فرودگاہ "ظفر منزل" میں پرورش پائی (جو بھیکم پور سے تنزلاً پر واقع ہے)

زاہدہ خاتون شیروانیہ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا ۔ اُن کا کلام مختلف ناموں سے اکثر و بیشتر رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتا رہا ۔ مثال کے طور پر چند نام حسب ذیل ہیں :-

"سخن گو خاتون" "نادر خاتون" "ایک شریف بی بی" "ز۔خ۔ش"
وغیرہ۔ موصوفہ کو علمی دنیا زیادہ تر مؤخر الذکر نام سے جانتی ہے۔
ہماری شاعرہ جب تک حیات رہیں انھوں نے کبھی اپنے اصلی نام
مقام اور شخصیت سے دنیا کو روشناس نہ ہونے دیا بلکہ تا دمِ آخر
گوشۂ گمنامی ہی میں رہیں۔ باوجود اس کے کون ہے جو آج بھی ز۔خ۔ش
کے شاہکاروں سے واقف نہیں۔
مرحومہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اپنا زانوئے ادب کسی
استاد کے سامنے مدت العمر تہہ نہیں کیا۔ اور اپنی خداداد ذہانت کی
بدولت دنیائے ادب میں "استادِ سخن" بن کر چمکیں چنانچہ وہ خود کہتی ہیں

بے فیضِ تلمذ ہوئی استادِ سخن ہیں
یہ فخر ہے اس احقر خود ساز سے مختص

مرحومہ نام و نمود کی شائق نہ تھیں چنانچہ اکثر اشخاص نے مرحومہ
کے کلام کو ایک مرد کا کلام سمجھا اکبر الہ آبادی مرحوم کو بھی یہی شک
پیدا ہوا جس کو انھوں نے اپنے ایک خط کے ذریعہ ظاہر کیا۔ لیکن بعد
میں محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے توسط سے
یہ شک دور ہوا۔ موصوفہ نے ادبی دنیا کے اس حوصلہ شکن سلوک کو
بہت محسوس کیا اور کچھ عرصہ تک اپنا کلام شائع نہ کرایا۔ لیکن قدردانوں
کے پیہم تقاضوں نے مرحومہ کو پھر اس راہ پر گامزن کر دیا۔
ز۔خ۔ش ابھی چار پانچ سال ہی کی تھیں کہ مشیتِ ایزدی سے

شفقتِ مادری سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئیں۔ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری ان کے والدِ محترم کے کاندھوں پر آپڑی اور یہ انھیں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج نزہت رخ بش کے نام سے تمام ہندوستان واقف ہے۔ مرحومہ کی تعلیم قدیم مشرقی خاندانوں کی طرح گھر پر ہی ہوئی اُن کی تربیت کے لئے ایک ایرانی معلّمہ مقرر تھیں جن کا نام خرشندہ خانم تھا اور جو ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ فارسی شاعری میں ان معلمہ صاحبہ کو پوری پوری دسترس حاصل تھی چنانچہ نزہت رخ بش کے لئے فارسی زبان مادری زبان کے برابر حیثیت رکھتی تھی۔ اُن کی فارسی شاعری میں وہی یگانگت، تسلسل اور روانی پائی جاتی ہے جو ان کی اُردو شاعری کا جزو ہے۔

مرحومہ ایک دردمند اور حساس دل رکھتی تھیں۔ جوان بھائی کی موت، شفقتِ مادری سے محرومی وغیرہ یہ تو تھے خانگی سانحات جنھوں نے مرحومہ کو حد سے زیادہ سنجیدہ اور خوگرِ غم دائم الالم بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ مرحومہ کے دل میں قومی، ملکی، مذہبی اور طبقۂ نسواں کا درد بھی بدرجۂ اتم موجود تھا کیسے ممکن تھا کہ نزہت رخ بش جیسی شاعرہ رفتارِ زمانہ کا اثر قبول نہ کرتیں۔ چنانچہ اس بات کا شاہد خود مرحومہ کا کلام ہے۔

نزہت نہایت روشن خیال، حریت پسند، پکّی مسلمان اور مشرقی اخلاق و اطوار کا نمونہ تھیں۔ باوجودیکہ انھوں نے اپنے عزیزوں اور

مخصوص دوستوں کے علاوہ کبھی اپنے گھر سے قدم باہر نہ نکالا لیکن اخباری مطالعہ اور کُتب بینی سے وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا یورپ اور دیگر براعظموں سے بھی واقفیت حاصل کر چکی تھیں چنانچہ اُن کی نظمیں "ایلیا سے ہیرس" اور "جوشِ محبت" اس بیان کی تصدیق ہیں۔

وہ سماجی بندشوں سے بھی آزاد نہ تھیں۔ انھیں صرف تحریری آزادی کسی حد تک تھی لیکن تقریری نہیں۔۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خاندان شروانی تعلیم نسواں کے لحاظ سے زمانہ سے بہت پیچھے تھا۔ زاہدہ خاتون مرحومہ اور ان کی ہمشیرہ نکہت شروانیہ خاندان کی پہلی خواتین تھیں جنھوں نے اتنی تعلیم حاصل کی کہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کر سکیں۔ مگر باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے خاندانی رواج کے مطابق وہ نہ کسی عام جلسہ میں شریک ہو سکیں۔ اور نہ کسی خاص علمی مباحثہ وغیرہ میں جانے کی نوبت آئی۔ اگر اس صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ ز۔خ۔ش کے کلام کا مطالعہ کریں تو یقین ہے کہ آپ کی نظر میں اُن کی اور اُن کے کلام کی وقعت دو چند ہو جائے گی۔

مرحومہ نے اپنے والد کے مکان پر بعالم دوشیزگی ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو رحلت فرمائی۔ اور ہندوستان کی اس نو عمر قومی شاعرہ کو اُن کے خاندانی قبرستان میں مدفون کیا گیا۔

راقمہ: "ناجیہ اکرم شروانیہ"

محترمہ اسم بامسمیٰ خاتون تھیں۔ نہایت متشرع، عبادت گزار، خوش خلق، پاکباز سیرت، صاحب علم وفضل اور پردہ نشین تھیں۔ آپ نے عصرِ حاضر میں اپنی زندگی سے دنیا میں خاتونِ اسلام کا ایک صحیح نمونہ پیش کیا تھا جو ایمان کی دولت کے ساتھ ساتھ علم کی برکتوں سے بھی فیضیاب تھا۔ آپ کی اردو، فارسی اور عربی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ دینیات اور اسلامی تاریخ سے آپ کو شروع ہی سے شغف تھا۔

اس وقت تک آپ کے دو مجموعۂ کلام چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں "آئینۂ حرم" اور "فردوسِ تخیل" یہ دونوں کتابیں دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی مطبوعات ہیں۔ "آئینۂ حرم" ۳۹ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں آپ کا مشہور مسدس "آئینۂ حرم" اور چند دوسری نظمیں شامل ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۲۱ء کی طبع شدہ ہے۔ "فردوسِ تخیل" محترمہ کی وفات کے بعد سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کو محترمہ نے خود ہی مرتب کیا تھا اور خود ہی یہ نام تجویز کیا تھا۔ یہ ۲۸۳ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جو ۱۲۱ منظومات پر مشتمل ہے، اس میں آئینۂ حرم کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس کے مختلف حصوں کے عنوانات یہ ہیں۔ نذر۔ دورِ اول، دورِ ثانی، دورِ ثالث۔ مجمعِ احباب، بزمِ طرب، بزمِ عزا، حسنِ تضمین، بکھرے ہوئے موتی (قطعات، رباعیات، مفردات)

مگر ان دونوں کتابوں میں آپ کے حالات تو کجا آپ کا پورا نام تک درج نہیں ہے۔ ان دونوں کتابوں پر آپ کا نام صرف ز۔خ۔ش لکھا ہے۔

اس کے علاوہ مرحومہ نے اپنی اخلاقی غزلیات کا ایک ردیف وار دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔

اُردو کے علاوہ آپ فارسی و عربی میں بھی شعر کہتی تھیں۔ خصوصاً فارسی کی آپ ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ آپ تخلص کبھی زاہدہ اور کبھی نزہت کرتی تھیں۔ فرماتی ہیں ؎

لہ عربی اشعار کا نمونہ

(مرثیۃ الحمراء سے غازی انور پاشا کی مراجعت پر)

حَمِدْنَا لِخَلَّاقِنَا ذِی الْجَلَالْ　　قَدْ اَنْجَاکَ مِنْ شَرِّ اَهْلِ الضَّلَالْ
قَتَلْتَ الْخَبِیْثِیْنَ یَوْمَ الْقِتَالْ　　فَاَحْسَنْتَ اَهْلًا وَسَهْلًا تَعَالْ

کجا بودی! اے انورِ خوش خصال　　"کجا بودی! اے اخترِ نیک فال
کہ مہ رفتی و آفتاب آمدی"　　(فردوسِ تخیل ص۳۲)

فارسی اشعار کا نمونہ

خواہراں! تا چند مہرِ خامشی بر لب نہیم　　تا کجا بازار شکر بشکند تقریرِ ما
ہاں بفرمائید۔ اکنوں چیست تدبیرِ فلاح　　عدل جوید یا نہ جوید۔ فرقہ دلگیرِ ما
ہمچنیں باشیم در قعرِ مذلت سرنگوں　　یا کند جولاں بہ گردوں مرکبِ توقیرِ ما
تارکِ آئینِ شرعِ پاک خود صنفِ رجال　　آنکہ ہست از حکمِ رب فرمانِ وہ ما ہمہ را

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما
چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیرِ ما"　　(آئینۂ حرم ص۳۰۵)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پوچھتے ہیں جو مرا حالِ سخن کے نقّاد　　صاف کہتی ہوں سخن آرائی سے مجھکو ہے عناد
نہ میں نزہت سی ہوں آگاہ نہ میں زاہدہ سی　　خود فراموش ہوں آتا ہے فقط مجھکو یاد
(فردوسِ تخیل ص ۳۸۲)

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

کامِ غمخواراں بر آرد آہِ پُر تاثیرِ ما　　گشتہ گردد دبۂ حرماں عاقبت از تیرِ ما
حاجبِ بابِ اجابت بالیقیں خیزد ز خواب　　از دعائے صبح گاہ و نالۂ شبگیرِ ما
کرد باید بہرِ حریت جہاد بے قتال　　کر کند گوشِ حریفاں نعرۂ تکبیرِ ما
مایۂ نازِ زناں است امتثالِ امرِ رب　　کرد احمدؐ مدح دیں خواہرانِ پیرِ ما
حکمرانِ ما بلا شاہِ رسولاں است و بس　　آرے آرے غیرِ او ہرگز نباشد میرِ ما
آنکہ شُد پنہاں بہ قلبش الفتِ جنسِ لطیف　　آنکہ شُد پیدا ز قولش عزت و توقیرِ ما
طاعتش اسلامِ ما عشقِ رخش ایمانِ ما　　روئیتش فردوسِ ما خاکِ رہش اکسیرِ ما
ما و دست و دامنِ پیرِ خمستانِ حجاز
نیست یاراں طریقت غیر ازیں تدبیرِ ما　　(آئینۂ حرم ص ۱۳۱-۱۳۲)

"البلاغ المبین"

اے قوم! چند فارغ و بیکار بنشست　　غافل ز کید دشمنِ عیار بنشست
خواہم ز شرم چہرہ بپوشم مجاکِ گور　　ہرگہ شریکِ محفلِ اشرار بنشست
تقلیدِ پیرِ غرب دریغا شعارِ تست　　غافل ز اسوۂ شہِ ابرار بنشست
کج میروی بمنزلِ مقصود کے رسی　　باغی ز طوعِ قافلہ سالار بنشست

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور کبھی زرخ ۔ بھی تخلص کرتی تھیں،

سُبحانَکَ یا ذَالمجد پڑھے غُفرانَکَ اَللّٰھُمَّ کہے
ہر ذرّہ سبب لب زرخ ۔ پہ رہے اے یارِ خدا مذکور تیرا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

گاہے بدستِ خامہ کہ تیغ بے نیام — خواہم لسانِ حیدر کرار غنیمت
در بزم ہمچو دریا ذر پاش یا بمت — در رزم ہمچو ساحل ۔ خود دار غنیمت
گلشن جہان و تو گل توحید بوئے گل — اے گل! بپاکش عِلش خار غنیمت
اے تربت! اے کہ مخزن رازاست سینہ — خواہم زلب ہمیشہ گہر بار غنیمت

حُسنے نداشت شعر تو ۔ الا و لم ربوہ
شاعرانہ ۔ فسونگر و سحار غنیمت (فردوس تخیل صفحہ ۲۵۵)

"ذکرِ حبیب"

بیان عاجز ۔ دہاں قاصر ۔ زبان الکن ۔ بیاں کوتہ
ز وصفِ رب ۔ ز مدح شہ ۔ ز حمد ایں ۔ ز نعت او

دریں میداں چو من گنگ و خموش و عاجز و حیراں
دو صد رومی ۔ دو صد جامی ۔ دو صد سعدی ۔ دو صد خسرو

دماغ تو نگاہ تو ۔ زبان تو ۔ سرشت تو — فردوسِ تخیل صفحہ ۲۶۳
معارف داں معارف بیں ۔ معارف گو معارف جو

مسلم قوم اور خصوصاً مسلم خواتین کی زبوں حالی پر آپ کا دل بہت دکھا ہے اور انہی خواتین کی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور تمدنی اصلاح آپ کی شاعری کا ایک خاص موضوع بن گیا ہے۔ آپ تعلیم نسواں کی بھی زبردست

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

منوّر جاں۔ مطہر جسم۔ عنبر زلف۔ شکر لب
مسیحا دم۔ سلیماں جاہ۔ یوسف چہر۔ موسےٰ خو

رضا کیش و وفادار و رضا جوئی و وفا پرور
نکو چہر و نکو زلف و نکو چشم و نکو ابرو

نگہ جاں بخش و جاں افزا و جاں آسا و جاں پرور
ادا دل بر۔ عطا دل دہ۔ حیا دلکش۔ وفا دل جو

رضا کوش و رضا کیش و خدا بین و خدا بندہ
نکو رائے و نکو روئے و مبارک جاں مبارک خو

ز عشق تو۔ ز حسب تو۔ ز تغیر تو۔ ز تجوید تو
سرم جوشاں۔ لبم ساکت۔ دلم نالاں۔ کفم مملو

قتیل حسرت و یاوہ۔ غم و ہجر ترا باشد
مرض درماں۔ اجل عیشی۔ کفن خلعت۔ لحد مشکو

ز سوز آہ و درد عشق و رنج ہجر و داغ غم
بدل شور و بسر جوش و بچشم اشک و بلب یا ہو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

علمبردار تھیں مگر آپ اس انتہا پسند طبقہ میں شامل نہیں تھیں جو مغربیت کے سیلاب میں بہہ کر اپنی منزل فراموش کر چکا ہے۔ جہاں آپ نے قدیم اجاہل رجعت پسند اور وہم پرست طبقہ پر تنقید کی ہے وہاں انتہا پسند

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

قرار و۔ راحت و۔ آرام و۔ آسایش۔ نمی بینم
نہ بر بستر۔ نہ بر بالش۔ نہ ایں پہلو۔ نہ آں پہلو

نیابم مونس دیار و انیس و۔ دوست می بینم
گہے ایمن۔ گہے اسیر۔ گہے ایں سو۔ گہے آں سو

نمی ترسم بمو۔ رندو شراب و مست و سرگشتم گو
بہر ساعت۔ بہر ہنگام۔ در ہر خانہ۔ در ہر کو

شبے درد۔ رنج و حزن و غم بدل! کہ خوش نبود
تن بے جاں۔ رگ بے خوں ہم بے دُرِ گل بے بو

بہائے حسرت و ارماں و افکار و۔ الم مشکن
بہ فریاد و۔ بافغان و۔ بزاری و بہائے و ہو

طبیبا! چارہ ام جز مرگ و۔ درد و زخم و سم نبود
مہر خجلت مکن درماں۔ مرہم مدہ دارو

شہا۔ مائیم کج رفتار و۔ خوار و زار و بد سیرت
توئی ہادی۔ توئی شافع۔ توئی راحم۔ توئی خوشخو

بقیہ اگلے صفحہ پر

طبقہ کی گمراہی اور اس سے اپنی بیزاری کا بھی اعلان کیا ہے، قومی اور ملی رنگ آپ کی شاعری پر چھایا ہوا ہے مگر آپ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار پر نکتہ چینی کرتے وقت "سفیران فرنگی" کے خلاف کچھ لکھتے ہوئے آپ کا قلم جھجکتا تھا۔ معلوم نہیں کہ غور و فکر کے بعد محترمہ اس نتیجہ پر پہنچی تھیں یا اقتضائے وقت و مصلحت زمانہ کے اعتبار سے آپ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔

آپ کے کلام کا رنگ ناصحانہ ہے، خواتین کی درستیِ اخلاق کے متعلق آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اور خدا پرستی، اطاعتِ شوہر، تربیتِ اطفال، خانہ داری وغیرہ تمام نسوانی فرائض پر موثر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے مگر چونکہ پند و نصائح دراصل روح شاعری کے منافی ہیں جب تک کہ کہنے والا اتنے بلند پایہ کا شاعر نہ ہو کہ اپنی شعریت کی رنگینی میں ان ٹھوس اور خشک مسائل کو چھپالے، اس لئے گو اخلاقی اعتبار سے محترمہ کا کلام حد درجہ قابلِ قدر ہے پھر بھی جہاں تک صرف "شاعری" کا تعلق ہے اس میں زیادہ کیف، سرور، رنگینی اور ربودگی نہیں پائی جاتی۔

[بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے]

خیال و فکرت و قلب و دہانِ من ز مدح تو
پُر از حور و پُر از نور و پُر از طور و پر از لولو

مختصر یہ نہایت پُرگو شاعرہ تھیں۔ آپ نے ہر عنوان اور ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کے یہاں نظمیں، غزلیں، قصیدے، مسدس، قطعے بند، رباعیاں اور سہرے سب ملتے ہیں۔ آپ نے حمد، نعت و منقبت پر بھی قلم اُٹھایا ہے، عرفان و حقیقت کے مضامین بھی نظم کئے ہیں، تہنیت اور تعزیت پر بھی نظمیں لکھی ہیں آپ نے تاریخیں بھی کہی ہیں اور تضمینیں بھی نیچرل شاعری کی مثالیں بھی آپ کے یہاں موجود ہیں اور جذبات نگاری کی بھی، آپ نے معارف ملیہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور بصائر سیاسیہ پر بھی۔ آپ اپنی قومی، ملّی اور اخلاقی نظموں میں اقبالؒ کے رنگ سے متاثر نظر آتی ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے مخصوص رنگ کی مثالیں بھی جستہ جستہ آپ کے یہاں موجود ہیں۔

مسدس

اخلاقی، ملکی و ملّی شاعری (ناصحانہ رنگ)

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر
لب بہ پیوستہ لبِ شعلہ فشاں سے بہتر
صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر
دل ہے اسرار کے کہنے کو زباں سے بہتر
پھر بھی اک شے کے لئے حد ہے معین لوگو
ضابط درد ہو کب تک جگر زن لوگو

عہد سے تا بلحد ظلم اُٹھائے صدیوں
تیر پر تیر دلِ خستہ نے کھائے صدیوں

چپکے چپکے گہرِ اشک لٹائے صدیوں　　قصص حسرتِ دل دل کو سنائے صدیوں

ضعف غالب ہیں گر اس صبر و سکوں کا ثمرہ

سعی و تفتیش سے مل جائے تو میرا ذمہ

کھا گیا! آہ لب ہے سینہ میں مدفوں کب تک　　دل ہی دل میں گلۂ طالع واژوں کب تک

آستیں سے ہو نہاں دیدۂ پُرخوں کب تک　　غم کو پوشیدہ رکھے خاطرِ محزوں کب تک

حالِ دل کیوں نہ کہیں؟ منہ میں زباں رکھتے ہیں

ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم　　خستۂ جور ہیں ہم کشتۂ بیداد ہیں ہم

تختۂ مشقِ ستاں بازیِ صیاد ہیں ہم　　آدمی کا ہے کو ہیں پیکرِ فولاد ہیں ہم

ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر

اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

آتشِ ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر　　پھونک ڈالا ہے وہ تپ بیچ غموں نے اکثر

بے اجل مرتے ہیں نہ خانہ کے اندر گھٹ کر　　ہیں جو تنگی میں منافق کی لحد سے بدتر

"ڈاکٹر کہتے ہیں" در کھولو ہوا آنے دو"

"سنگدل کہتے ہیں" ہرگز نہیں مر جانے دو"

یادِ ایام کہ تھا تخت فدائے مسلم　　ڈھونڈتے پھرتے تھے نلک ارض رضائے مسلم

دلِ ہرقل کو ملاتی تھی ندائے مسلم　　تاجِ ایران تھا زیرِ کفِ پائے مسلم

رتبۂ انتم الاعلون[1] تھا اس کے لائق

---

[1] لا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ سست و غمگین نہ ہو۔ اگر تم مومن ہو تو (ضرور) علو مراتب حاصل کرو گے۔ (الآیہ)

قولِ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اس پہ ہے دال

ہم سے خالی نہ تھی یوں انجمنِ قال اقول | نہ گرا پاتا ہمیں صورتِ حرفِ معلول
عائشہ کے دہنِ پاک سے جھڑتے تھے جو پھول | آج تک ہیں وہ بہارِ چمنِ شرعِ رسول

عرصۂ جنگ میں بھی ہم نے کیے کارِ صحیح
صنفِ نازک سے نہ تھی خولہ سا بازو شجیع

کون مسلم؟ وہی فرمانبرِ شاہِ انساں | ہاں وہی مصلحِ اخلاقِ تباہِ انساں
ہاں وہی اوج وہ رابیتِ جاہِ انساں | ہاں وہی نور وہ بختِ سیاہِ انساں

ہاں وہی واقفِ عقلیتِ اسباب و علل
ہاں وہی واصفِ حریتِ افکار و عمل

مرد و زن مل کے اٹھا سکتے ہیں وہ اثقالِ بار | کانپ اٹھا جس سے دلِ ارض و سپہر دوّار
مرد و زن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار | جو خلیجِ متلاطم میں پڑی ہے بیکار

آؤ وحدت کی امانت کو اٹھا لیں مل کر
آؤ اسلام کی کشتی کو بچا لیں مل کر

شوقِ نظارۂ تھیٹر و بازار نہیں | مقصدِ حریت و علم یہ زنہار نہیں
حکم برداریِ شوہر سے بھی انکار نہیں | بخدا پردہ دری کے بھی روادار نہیں

ہے حیا بادشہِ علم کے سر کا افسر

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم کو اتمامِ نعمت سے مشرف فرمایا اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند فرمایا
(قرآن کریم)

قول مشہور ہے "اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر"[1]

سدِّ راہِ ستمِ فتنہ گراں ہے پردہ — خازنِ عصمت گنجِ نہاں ہے پردہ
مظہرِ شانِ خداوندِ جہاں ہے پردہ — جذبۂ غیرتِ مسلم کا نشاں ہے پردہ

اثرِ عصر سے محفوظ ہے پردے کا وجود
دور ہوں اس سے جو نا قابلِ برداشت قیود

مرد کا رتبہ گھٹانا نہیں ہرگز منظور — زن کو بے شبہ رضا جوئی شوہر ہے ضرور
لیکن اس کو تو فراموش نہ فرمائیں حضور — بطنِ عورت سے ہوا نورِ محمدؐ کا ظہور

یہ تنفر یہ حقارت کی نگاہیں کب تک
عرش جنباں ہوں خواتین کی آہیں کب تک

کچھ سنانے کیلئے آئی ہوں اس دم سن لے — کوئی سنتا نہیں تو ہی سخن غم سن لے
میرے آقا میرے پیغمبرِ اعظم سن لے — بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ[2] شہِ عالم سن لے

نکتہ چیں ہے غمِ دل ان کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالبؔ)

تو جب لے آمنہؓ کے نور نظر آیا تھا — دہر انوار سے معمور نظر آیا تھا
منظرِ قوتِ جمہور نظر آیا تھا — قیصرِ دل زدہ مقہور نظر آیا تھا

۱؎ علم بہت بڑا حجاب ہے (امام غزالیؒ کا قول)
۲؎ میرے ماں باپ تجھ پر قربان۔

پہلے آموختہ کبر بھلایا تو نے
پھر سبق عزت نسواں کا پڑھایا تو نے

سنگدل بھول چکے ہیں سخنِ استوصوا[1]
نہ قواریر[2] سے ہیں رفق پہ مائل سرِ مو

اتقوا اللہ[3] سے اب ان کا نہیں خشک لہو
نہ یہ پروا کہ محبِ زنِ مظلوم تھا تو

آہ کیا جوشِ کرم ہے ترے اس فرماں میں
"وہی[4] بہتر ہیں جو بہتر ہیں حقِ نسواں میں"

طلب العلم فریضۃ[5] سے ہیں اگرچہ آگاہ
رکھتے ہیں ایسی احادیث سے دل میں اکراہ

لوٹ دیتے ہیں ورق پھیر کے جلدی سے نگاہ
گر کہیں پاتے ہیں لا تمنعوا[6] اماء اللہ

یاد ایام کہ منکر ہوئے جب اس سے بلالؓ
ان سے پھر بات نہ کی باپ نے تا روزِ وصال

---

[1] اِستوصوا بالنساءِ خیراً الخ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو (الحدیث)

[2] رِفقاً بالقواریر شیشوں کو ٹھیس نہ لگاؤ (الحدیث)

[3] اتقوا اللہ فی النساء۔ فانکم اخذتموھن بامان اللہ الخ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ تم نے انھیں امان خداوندی میں لے رکھا ہے (الحدیث)

[4] خیارکم خیارکم لنسائکم (الحدیث)

[5] طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ طلب علم ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے (الحدیث)

[6] لا تمنعوا اماء اللہ عن مساجد اللہ۔ اللہ کی کنیزوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔ (الحدیث)

پردۂ شرع پر گر غور ہو ٹھنڈے دل سے　　پردۂ بیم کا شمہ بھی ہے مشکل سے
تھا شغف گرچہ تجھے حرب کامل سے　　مگر اغیار ہیں اس امر میں کچھ جاہل سے

کیا کہوں کس نے تری شرع کو بدنام کیا
ہائے افسوس تری قوم نے یہ کام کیا

یا نبی اپنے لب بستہ کو جنباں کر دے　　قُم باذنی سے تن عدل کو ذی جاں کر دے
مرد کو زن کے ستانے پہ پشیماں کر دے　　یعنی پھر باغچۂ قوم کو خنداں کر دے

پھیل جائے چمن دہر میں بوئے اسلام
غنچہ ساں سر بگریباں ہو عدوئے اسلام　　(آئینۂ حرم ص ۱۲)

تصادم رواج و شرع

"صوبۂ پنجاب میں لڑکیوں کو محروم الارث کرنے کا جو شریعت سوز رواج قائم ہے اس کو ۱۹۱۵ء میں قانونی استحکام بخشنے کی تجویز زیر بحث تھی خاکسار نے بھی بذریعہ اخبار حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا" (ن-ح-یش)

جو حق پرست تھا ہے وہی دنیا پرست آج　　مسلم شراب حرص ہوا سے ہے مست آج
روز جزا کی فکر دماغوں سے دور ہے　　جسطرح دل سے عظمت یوم الست آج
اسلام کے وجود میں ہے اختلاف رائے　　ہستی میں ہے مباحثہ نیست ہست آج
خودکام چاہتے ہیں کہ پائے رواج فتح　　شرع محمدی کو ہو رن میں شکست آج

رائج ہے زن کو ترکہ نہ ملنے کی رسم بد
ہو فیصلہ شریعت حقہ کا مسترد　　آئینۂ حرم ص ۲۲

معارفِ ملّیہ

کیا ہوئی اے مرے اسلام! وہ شوکت تیری
ہائے کس گوشہ میں روپوش ہے سطوت تیری

اے رسولِ عربی! اے شرف افزائے رسل
اب بھی قرباں ہے ترے نام پہ اُمّت تیری

جوش زن اب بھی دماغوں میں ہے سودا تیرا
جلوہ گر اب بھی دلوں میں ہے محبت تیری

حرزِ جاں اب بھی ہے قرآنِ مقدس اپنا
اب بھی محفوظ ہے سینوں میں امانت تیری

آج بھی مرجعِ آفاق ہے مولد تیرا
آج بھی مرکزِ دوّار ہے تربت تیری

تا کجا لب پہ رہے شورِ متٰی نصر اللہ
تا کجا جورکش دہر رہے ملّت تیری

اے مہِ فیض ابھی اندھیر مٹا سکتی ہے
طرفۃ العین میں اک چشمِ عنایت تیری

وفائی

خودی کہتی ہے شوقِ دیدِ جاناں میرے دم سے ہے
ندائے بیخودی ہے رونمائے حسنِ وحدت ہوں

کہا میں نے کہ جنّت پر رضائے دوست فائق ہے
رضائے دوست بولی "بے خبر! میں ہی تو جنّت ہوں

شہادت گاہِ الفت میں کھڑی ہوں سر بکف کب سے
نکل اے خنجرِ قاتل کہ مشتاقِ زیارت ہوں

کیا مجنوں کو رہبر منتخب صحرائے وحشت کا
مقامِ شرم ہے اب تک مقیمِ کوئے حکمت ہوں

(فردوسِ تخیل ص۱۶۹)

لذّتِ عرفاں

رنگِ فطرت ہے وجہِ حیرانی
عقل ہے اور جہائے نادانی

رازداں مدعا کو کہتے ہیں
حُسنِ الفت کا داغِ پیشانی

حُسنِ "باقی" نے دل کو کھینچ لیا
رخصت اے حسنِ ہستیٔ فانی

دل ہے وقفِ رجائے رحیم و کریم
جاں ہے نذرِ رضائے ربانی

اب میں سمجھی کہ ہے فنائے خودی
انبساطِ بہشتِ لافانی

غم نہ کر ہے نقیبِ ابرِ بہار
خشکیِ موسمِ زمستانی

دلِ صد پارہ کے اطمینان کو
دیکھی جائے گی سبحہ گردانی

کر سکے طے نہ ملکِ عرفاں کو
رومی و عنبری و کرمانی

دوریِ بزمِ دوست کے غم میں
محوِ افغاں ہے اک افغانی

عرش سے گر گئے یہ طائرِ قدس
رات کرتا تھا یوں خوش الحانی

کہ ہے انساں طلسمِ شانِ خدا
قدر اپنی نہ اس نے پہچانی

بند کیں اس نے جب ذرا آنکھیں　　کھل گیا راز بزم امکانی
چارہ روح فلسفی ہے نہ شیخ　　ایک وہمی ہے ایک خفقانی
کثرت این و آں ہیں وحدت دوست　　گنج نایاب شے کی فراوانی
شیخ! ایچ بیاں کا ڈر نہ کرے　　لا بیاں ہے یہ کیف وجدانی
منتک ہے اور شکایت ہجر
نزہت اور شکر لطف پنہانی　　(فردوس تخیل ص۱۲۱)

سلک مروارید

اسیر بیکاری دل و جاں اگر اُٹھ کے عزم دیار جاناں
تلاش کردہ متاع درماں جو حصہ ارباب درد کا ہے
"پسند کر گوشہ سلامت" یہ تجھ کو عارف کی ہے نصیحت
اُٹھ اور سلیماں کی ڈھونڈھ شوکت" یہ تجھ کو طائر کا مشورا ہے
کرامت و کشف خشک کب تک مراد فقر؟ اے رفیع مسالک
بن آب نہر بقا کا گا ہک خضر اگر تیرا آشنا ہے
ہمیشہ خواب سکوں سے دوری۔ ہمیشہ پاس نفس ہیں ساعی
یہ اصفیا کی ہے زندگانی۔ یہ زندگانی کا مدعا ہے[1]

---

[1] اقبال:-　　ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے　　(ضرب کلیم)

محاکاتی شاعری

برسات اور کسان

آبِ دریا میں کنول ہے؟ یا چمکتا ہے چراغ
خاکِ صحرا میں ہیں لالے؟ یا دہکتے ہیں شرار

اس طرف چڑیوں کا گانا اس طرف موروں کا ناچ
نیچے عنبر بیز گل - اوپر ہوائے مشکبار

دیکھتے ہی دیکھتے مستی کا یہ عالم ہوا
جیسے کر لے کوئی گل اندام حسین غسل اور سنگھار

یا الٰہی ہے کہ ہر گل میں پری سبز فام
اور نشاطِ حسن سے ہنس ہنس کے گاتی ہے ملہار

فاتحانہ کبر و خاموشی سے ہے نگرانِ خاک
یا ہے بگلوں کی طرف نگراں باندازِ وقار

اڑ رہے ہیں جو زمیں کو چھوڑ کر اس کی طرف
مثلِ فوجِ شہ صف اندر صف قطار اندر قطار

(فردوسِ تخیل صفحہ ۱۸۹-۱۹۰)

بی بی آمنہؓ کا بسترِ مرگ

مرا پیارا محمدؐ کہاں ہے؟ لاؤ ذرا — جمال مجھ کو مرے لال کا دکھاؤ ذرا
کنارِ شوق میں دل کے قریں بٹھاؤ ذرا — مرے لبوں سے وہ ننھے سے لب ملاؤ ذرا
میں اپنے پیارے کو جی بھر کے پیار تو کر لوں

دم وداع ذرا ہم کنار تو کر لوں

مرے ستارے! مرے چاند! میرے مہر مبیں
مزار میں بھی نہ بھولے گی یاد غمگیں

تری ادائیں، ترا حسن، اصبح و نمکیں
یہ تیرے عارض گلگوں یہ تابناک جبیں

یہ چشم مست و سیہ۔ یہ نگاہ دزدیدہ
یہ حلقہ بندی زلف دراز و پیچیدہ

ترا یہ جھوٹ سے چڑنا۔ دغا سے گھبرانا
یہ ہم سنوں کو صداقت کا رمز بتلانا

دم غضب یہ ترا شان حلم دکھلانا
ہنسی کے وقت فقط مسکرا کے رہ جانا

عجیب تیری ادائیں عجیب شانیں ہیں
عرب میں ورد زباں تیری داستانیں ہیں

چلی ہوں چھوڑ کے گدڑی میں گنج ہفت اقلیم
چلی ہوں چھوڑ کے اک لعل آیۂ در یتیم

نہیں کسی سے کچھ امید ہے تو ہم ہی بیم
کرم کرم مرے معبود! میرے رب کریم

ترے کرم سے یہ بچہ اگر جواں ہوگا
یقیں ہے قوت اسلام نا تواں ہوگا

سنی اگرچہ بہت اس نے شرح رنج و ملال
مگر ہوا متزلزل نہ پائے استقلال

یہ چھ برس کا سن اور ضبط نفس ہے کمال
بچائیو نظر بد سے ایزد متعال

لیا نے جاتی ہے ماں اس کی گنج زینت کو
تجھی کو سونپ رہی ہے تری امانت کو

فردوس تخیل ص ۲۱۱

جذباتی شاعری

پیام

دل فسردہ کو اب طاقت قرار نہیں　　　نگاہ شوق کو اب تاب انتظار نہیں
نہیں نہیں مجھے برداشت اب نہیں ہی نہیں　　　خدا کے واسطے کہنا نہ اب کی بار نہیں"
ہمیشہ وعدے کئے اب کے مل ہی جا آکر　　　حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں
دکھاتی اپنی محبت کو چیر کر سینہ　　　مگر نمود مرا شیوہ و شعار نہیں

مری بہن! مری محبوبہ! حب عجب شے ہے
جہاں میں خاک نہیں کچھ جو دوستدار نہیں

(فردوس تخیل صـــ ۲۸۲ تا ۲۸۳)

آ دیکھ مجھے

لذت دید کا چسکا ہے تو آ دیکھ مجھے　　　صاحب دیدۂ بینا ہے تو آ دیکھ مجھے
مری صورت ہے تماشا گہ یاس و امید　　　گر تجھے شوق تماشا ہے تو آ دیکھ مجھے
سب مری بات پہ کہتے ہیں کہ مختل ہے دماغ　　　تجھ کو دیوانوں کا سودا ہے تو آ دیکھ مجھے
مجھ سے بھی برسر پیکار ہے قسمت میری　　　دیکھنا جنگ کا نقشہ ہے تو آ دیکھ مجھے
رابعہ لب پہ ہے مرض غم سے مرا حال مرا　　　گر مزاج آجکل اچھا ہے تو آ دیکھ مجھے
لوگ پوچھیں گے مری صورت وحشت تجھ سے　　　مجھ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے

دیدنی ہے مری کیفیت ناگفتہ بہ
اس میں گر شبہ بجا ہے تو آ دیکھ مجھے

(فردوس تخیل صـــ ۲۸۵ و ۲۸۶)

الله الصمد[1]

ہاں یہی غم زدہ اک روز تھی بیگانۂ غم　　دور تھا سرحدِ تخئیل سے ویرانۂ غم
اس خرابے میں نہ تھی محرمِ میخانۂ غم　　لب تک آیا تھا نہ حرفِ لبِ پیمانۂ غم

ذکرِ غم قصّے کی مانند سنا کرتی تھی
لفظ افسوس کو جوں رسم ادا کرتی تھی

کیا بتاؤں میں یہ مرگ کہ وہ کیسا تھا　　کوئی اس سا نظر آئے تو کہوں ایسا تھا
بس مرے جی ہی کو معلوم ہے وہ جیسا تھا　　جیسے اس دہر میں جی سکتے نہیں ویسا تھا

ہیں تو ہیں اس کے لئے روتے ہیں بیگانہ و غیر
اس مسلماں کا ہیں ماتم کدہ میخانہ و دیر

دین کا پابند بھی تھا طبع کا آزاد بھی تھا　　فخرِ احباب بھی تھا نازشِ اجداد بھی تھا
ہمدم و ہم نفس و نزہت ناشاد بھی تھا　　بھائی بھی دوست بھی شاگرد بھی استاد بھی تھا

رشتۂ دل سے ہو یوں رشتۂ خوں مستحکم تر
ایسی الفت کی جہاں میں ہیں مثالیں کمتر

اتفاقاً جو کبھی ہجر ملا کرتے تھے　　پہلے گھنٹوں غمِ فرقت کا گلا کرتے تھے
دیکھنے والے تعجب سے سنا کرتے تھے　　ہو کے پھر متفق اللفظ کہا کرتے تھے

ایسی الفت کہیں دیکھی نہ سنی مشفق من
ہم نے ان آنکھوں سے کیا دیکھے نہیں بھائی بہن

موت پر زور نہ جینے کی توانائی ہے　　تابِ شیون ہے نہ یارائے شکیبائی ہے
باعثِ وحشتِ دل گوشۂ تنہائی ہے　　شرکتِ بزم میں دیوانے کی رسوائی ہے

---

[1] یہ ایک طویل نظم کے کچھ بند جو محترمہ نے اپنے بھائی جناب احمد اللہ خاں صاحب حیرانی کی وفات پر لکھی تھی۔ مرحوم کا … [illegible]

موت آہی نہیں چکتی کسی عنواں میری
ہائے اللہ کس آفت میں پھنسی جاں میری

طبع میں مادۂ نغز بیانی نہ رہا — زورِ آمد نہ رہا شوخیٔ روانی نہ رہا
الغرض خاک بھی جز سوزِ نہانی نہ رہا — جب مرا عارفِ اسرارِ معانی نہ رہا

جوش اسی کا تھا جو میرے سرِ پُرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا

(فردوس تخیل صـ۱۴۳ و ۱۴۴)

سنتے ہیں آج روٹھے ملتے ہیں آج چھوٹے
ہیں شکوہ سنج دونوں خونابہ بار دونوں

(فردوس تخیل صـ۲۹۲)

تاریخ گوئی

شادی

اے قلبِ حزیں تڑپ پہ کم کم — اے آہِ جگر خراش اِتھم تھم
شادی ہے بہن سعیدہ کی آج[1] — گھر گھر ہے نشاط و عیش کا راج
کیوں ہو نہ مجھے دلی مسرت — ہے مجھ کو دلہن سے ایک نسبت
دونوں کا ہے نصیب اِک ہی — وارفتۂ قوم وہ بھی ہیں بھی
ہے خواہشِ نزہتِ طبیدہ — مسعود ہو شادیٔ سعیدہ
زوجین رہیں اسیرِ اُلفت — ہو غم نہ سوائے رنجِ ملّت

اعدا کہیں رو کے مسنا الفرح
شادی ہو سعید - باعثِ فرح

(فردوس تخیل صـ۱۴۰ - ۱۴۱)

---

[1] سعیدہ بانو اہلیہ احسان الحق صاحب مرحوم ۱۴۳۱ھ ۱۳

کوکبِ مشرق

وفاتِ حضرتِ شبلی کی آمدہ تاریخ

کہو غروب ہوا "آہ - کوکبِ مشرق"

۱۹ ھ ۱۴ (فردوسِ تخیل صفحہ ۳۵۲)

حسن تضمین

تضمین براشعار غالب

دردِ الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری - ہائے ہائے
کیوں لگایا تیر وفا کا زخم کاری ہائے ہائے
تجھ سا بے فکر - اور کسی کی غمگساری ہائے ہائے
درد سے میرے ہو تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم! تیری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے

کچھ ہنسی تھا ؟ شرکتِ رنج و الم کا حوصلہ
آہ یہ - اک خوگرِ ناز و نعم کا حوصلہ
کیوں کیا بے قوتِ دل اس ستم کا حوصلہ
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

تھا مرا غم خوار بن کر پھولنا پھلنا محال
کٹ گیا آخر نہ تیرا نخلِ عمر؟ اے نونہال
آہ ناداں! کیوں نہ سوچا میری الفت کا مآل

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی بنی تھی میری دوستداری۔ ہائے ہائے

جیتے جی ہم تم رہے گر یک دل و یک جا۔ تو کیا
تا دمِ آخر۔ بھرا گر دم محبت کا تو کیا
عمر بھر پیماں رہا منتِ کشِ ایفا تو کیا
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری۔ ہائے ہائے

چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو تو نے راہِ خلد لی
تیرے زخمِ ناوکِ فرقت سے میں جیتی بچی
ہو چکی بس اعتمادِ دل کی سنجی کرکری
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری۔ ہائے ہائے

وا دریغا تھا دلِ بیمارِ غم کو آسرا
آبِ تیغِ ناز سے اک دن مجھے ہوگی شفا"
حسرت لے شوقِ جراحت! رخصت اے ذوقِ فنا
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

غم ہرے کرتی ہے وصلِ اشک بارِ بزشگال
مثلِ قسمت تار ہیں سیلِ بہار بزشگال

کب کھلے گا ہائے - ابرِ سایہ دارِ برشگال
کیسے کاٹوں ہائے میں شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خوکردۂ اختر شماری - ہائے ہائے

ایک دن وہ بھی تھا جب دم بھر کی فرقت تھی محال
آہ اک دن یہ بھی ہے جب رونما ہے انفصال
یہ الم کب تک سہوں؟ کب تک ہو جینا وبال
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل جس پر یہ ناامیدواری - ہائے ہائے

(فردوس تخیل ص۳۶۷)

رباعیات

جاں بلب ضعف سے ہوں لب کو ہلاؤں کیونکر
دسترس اس پہ نہیں خامہ اُٹھاؤں کیونکر
حال پوچھو نہ مرا خود ہی بتاؤ مجھ کو
ایسی حالت میں تمہیں حال بتاؤں کیونکر

(فردوس تخیل ص۳۷۴)

مسلمانو! کہا تم نے ہے زباں جیوں کی قربانی — درِ جاناں آؤ، پر آؤ کرو دیں جاں کی قربانی
موقر تھی خلیلؑ رب کی قربانی تحت دل — مگر ہے اور شئے شبیرؑ با ایماں کی قربانی

(فردوس تخیل ص۳۷۵)

اکبر کا رنگ

درگاہ میں کل جلسۂ سالانہ تھا میلاد کا
ایک سرجی یونہ ریک گویا ہوئے وقتِ دعا

کہلایا خادمِ قوم کا لیڈر بھی اب کہلاؤں میں
سی آئی ڈی کا کین ہو سی آئی ڈی ہر جا ہو

نہیں ملتے مجھے الفاظ کافی
جو ہوں سر جن سے خواہانِ معافی

دوا پینے سے پہلے اتفاقاً
زباں پر آگیا اللہ شافی

فردوسِ تخیل ص ۳۶۶

چھپ گیا انجام کار ابرِ خوبئے مہرِ تابدار
صبر اے قلبِ فگار آجائے گا بس خطِ یار

کل بھی حیرانِ زار بس خط کا انتظار
پھر نہ ہو یوں انتشار کاش اے پروردگار

فردوسِ تخیل ص ۳۶۹

زاہدہ

محترمہ چودھری خلیق الزماں صاحب ام۔ اے کی شریکِ حیات اور عصرِ جدید کی ایک بلند پایہ اور قابلِ قدر شاعرہ ہیں۔ آپ کی شاعری کی عمر تقریباً ۱۴۔۱۵ سال ہے۔ آپ کی غزلیں بہت دلدوز، پرکیف اور وارداتِ قلب کی آئینہ دار ہیں۔ غزلوں کے ساتھ آپ نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ عشقیہ شاعری کے علاوہ آپ کے یہاں قومی، ملکی اور سیاسی شاعری کے قابلِ قدر اور بلند پایہ نمونے بھی موجود ہیں پھر بھی تغزل آپ کا موضوعِ خاص ہے اور اس کی عمدہ مثالیں آپ کے کلام میں ملتی ہیں۔ محترمہ موجودہ دور کی ایک پختہ گو، خوش فکر اور کامیاب

شاعرہ ہیں۔

آپ کے خود نوشتہ سوانح حیات اور مرسلہ انتخاب کلام شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو شدید طوفان بادو باراں میں پیدا ہوئی۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں بعض جگہ گھٹنوں گھٹنوں تک پانی بہہ رہا تھا۔ مکانات گر رہے تھے۔ لوگ بے گھر ہو رہے تھے ادھر یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے خونی بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔ غرضیکہ ایک تلاطم تھا، شور تھا، ہنگامہ تھا۔ میری آشفتہ زندگی کا مسلسل ذہنی طوفان شاید اسی خارجی طوفان کا ایک گہرا اور ہمہ گیر پرتو ہو۔ ہوش سنبھالا تو یہ طوفان کبھی کا ختم ہو چکا تھا لیکن اپنے ہمہ گیر اثرات چھوڑ گیا تھا جنہوں نے میرے ذہن پر کبھی خوشگوار اور کبھی ناخوشگوار اثر ڈالا۔ ذہن کی اس بے چینی سے فرار کی راہ شاعری میں نظر آئی۔ گھر میں پہلے ہی سے شعر و سخن کا چرچا تھا۔ والد، چچا، ماموں سب اچھے غزل گو تھے چنانچہ شاید تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی پھر رسائل، اخبارات اور سخن سنج حلقوں سے قدر دانی کی تو ایک زمانہ تک غزل گوئی اور محض غزل گوئی زندگی کا مشغلہ رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اگر اس قسم کا کوئی دلچسپ اور جسب حال مشغلہ نہ ہوتا تو نہ جانے میرے ذہن و روح حقیقت و مجاز کی کن کن وادیوں میں سنگلاخ چٹانوں سے سر پھوڑتے رہتے۔

زاهده خاتون الزمان

میری غزلیں میری زندگی کی آئینہ دار ہیں (یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ میں فن برائے فن کی مطلق قائل نہیں) میرا غور و فکر، زندگی کے متعلق میں جو کچھ سمجھ سکی وہ سب ان میں موجود ہے، میرے دل کی کسک، میرے ذہن کی رنگینیاں، میرے ذوق کی ہمہ گیری سب آپ کو ان غزلوں میں ملے گی"

اب کہ رت بالکل ہی بدل چکی ہے اور زندگی کی گہرائیوں، پیچیدگیوں اور ہمہ گیریوں نے ہمارے سامنے بالکل نئے اور اچھوتے تقاضے پیش کرتے ہیں، میں نے بھی حیات کی للکار پر لبیک کہی ہے۔ چنانچہ میری اس طرف کی غزلوں میں حسن و عشق کے علاوہ بھی وہ کچھ ہے جس کی گنجائشیں غزل کو ختم نہیں بلکہ زندۂ جاوید کر رہی ہیں"۔ میں آزاد شاعری اور ان نئے تجربات کی جو آج اردو ادب میں ہو رہے ہیں، قطعاً مخالف نہیں لیکن اسی کے ساتھ غزل کی خوبصورتی، اس کے رس اور اُس کی ہمہ گیری کی بھی منکر نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نے غزل کو جو نیا مزاج دیا۔ وہ اسے لافانی بنانے کا تنہا ضامن ہے۔ غزل کے نہ مٹنے اور سدا بہار رہنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پروفیسر فراق گورکھپوری، خلیق ابراہیم، اور معین احسن جذبی ایسے کٹر ترقی پسند شاعر بھی نئے رنگ کے بہترین غزلگو ہیں اور ان میں سے پہلے دو حضرات کا جدید تنقید میں جو درجہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میں شاید بہت لکھ گئی، ہاں اتنا اور بتلا دوں کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء کو چودھری خلیق الزماں صاحب ایم۔ ایل۔ اے سے شادی ہوگئی، اب چار بچوں کی ماں ہوں، گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں، کبھی کبھی مسلم لیگ کے قومی کاموں میں حصہ لیتی ہوں اور وقت اگر خوش قسمتی سے کبھی مل جاتا ہے تو شعر و سخن سے دل بہلاتی ہوں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

"زاہدہ خلیق الزماں"

کچھ نہ ہوگی زینتِ شام و سحر میرے بغیر
یہ جہاں بن جائے گا ویران گھر میرے بغیر

بادۂ جور و ستم کی کیا ہوئیں سرمستیاں
کیوں پریشاں ہے وہ دزدیدہ نظر میرے بغیر

عام سجدوں سے کبھی سجدہ ہو سکتا نہیں
بن چکا کعبہ تمہارا سنگِ در میرے بغیر

سب تری سرمستیاں بے کیف ہیں ابرِ بہار
ہیچ ہے برسات کا موسم مگر میرے بغیر

گل ہنسے کلیاں کھلیں سبزے نے لیں انگڑائیاں
ہو رہے ہیں آپ لیکن چشمِ تر میرے بغیر

اہلِ دل ہیں اور تکلیفِ خمارِ ہوش ہے
بادۂ جوشِ جنوں ہے بے اثر میرے بغیر

عشقِ بے مایہ سے زینت ہے جہانِ حسن کی
اُٹھ نہیں سکتی تری نیچی نظر میرے بغیر

حسن بے حس عشق مضطر اور جہاں پُر انقلاب
آہ کب کرتی ہے تکلیفِ اثر میرے بغیر

عشق کی دنیا میں ہے اے دل تجھے سب اختیار
کام چل جائے محبت میں اگر میرے بغیر

آ ادھر آ میں بھی شامِ غم میں تیرا ساتھ دوں
لطف کیا رونے کا اے شمعِ سحر میرے بغیر[1]

---

[1] محترمہ نے "شمعِ سحر" کو دعوتِ گریہ دی ہے اور سعدی رح صاحب نے "بلبل مسکیں" کو، فرماتے ہیں،

بنالِ بلبلِ مسکیں اگر سرِ یاری ست
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں مجھکو فصلِ گل میں دیکھئے　　اُڑتے پھرتے ہیں ہوا میں بال و پر میرے بغیر
حسن کے گل کیا ہوئے خوبیاں کے جلوے کیا ہوئے　　کس لئے خالی ہے دامانِ نظر میرے بغیر

ترجمانِ دل ہے اک اک شعر اپنا زاہدہ
کون پا سکتا ہے یہ گلہائے تر میرے بغیر

—— لہ ——

ہوں کشتۂ نیرنگیِ دنیا کئی دن سے　　بے رنگ ہے تصویرِ تمنا کئی دن سے
پھر دل کے بنانے کا ہے سودا کئی دن سے　　کرتی ہوں بہم منتشر اجزا کئی دن سے
فرقت میں عجب حال ہے اپنا کئی دن سے　　ہے ذوقِ سکوں درپئے ایذا کئی دن سے
خود حاملِ نظارہ ہے نظارے کی حسرت　　اور حسن ہے خود حسن کا شیدا کئی دن سے
دن رات ہے نشترزنِ دل یاد کسی کی　　ہیں صبر و سکوں درپئے ایذا کئی دن سے
بڑھتی ہوئی وحشت میں تڑپنے نہیں دیتا　　کم ہو گئی کیا وسعتِ صحرا کئی دن سے
جلووں نے تری قیمتِ دل اور بڑھا دی　　سجدہ کے لئے آتا ہے کعبہ کئی دن سے
کیوں تم تو الگ ہو گئے دکھلا کے تجلی　　گردش میں ہے خونِ رگِ سودا کئی دن سے
اے حسن پراگندہ نہ کر دل کا صحیفہ　　ہیں منتشر اوراقِ تمنا کئی دن سے

لہ مؤلفِ احقر

اک آگ سی ہے دل میں فروزاں کئی دن سے
ہستی ہے مری شعلہ بداماں کئی دن سے
اب موت کا اس دل میں ہے ارماں کئی دن سے
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اُف عالمِ اُلفت کے دِلآویز مناظر — وحشت ہے عناں گیرِ تمنا کئی دن سے
قابو میں دل، آنکھوں پہ بھروسا نہیں ہے، نہ — ہے جلوہ نما حسنِ خود آرا کئی دن سے

اے زاہدہ کیا کہہ دیا اس مست نظر نے
دل بھی نظر آتا نہیں اپنا کئی دن سے

زرّیں

زہرہ خاتون نام اور زرّیں تخلص ہے۔ آپ کا خاندان بریلی کا ہے لیکن اب آپ لشکر گوالیار میں مقیم ہیں۔ محترمہ زرّیں، زینت بیگم صاحبہ عبرتؔ اہلیہ سید محمد عبدالحی صاحب کی دختر اور بلقیس فاطمہ بیگم کی ہمشیر خورد ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے)

راتیں مری بے خواب، مرے دن ہیں پریشاں
کچھ اشک کئی دن سے ہیں ان آنکھوں میں لرزاں
کچھ زیست سے اپنی ہوں کئی دن سے پشیماں
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی

اک بوجھ ہے دل پر کہ اٹھایا نہیں جاتا
اک خواب ہے آنکھوں میں بھلایا نہیں جاتا
اک نغمہ ہے ہونٹوں پہ کہ گایا نہیں جاتا
اے کاش مجھے پیار نہ کرتا کبھی کوئی "م"

آپ کے نانا خان بہادر محمد خوب داد خاں صاحب مرحوم بریلی کے ایک مشہور و معروف رئیس تھے اور چیف کمشنر آفس کلکتہ میں ہیڈ اسسٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھے۔ ؎۱

محترمہ زریں کے متعلق جناب خواجہ محفوظ حسین صاحب (لشکر گوالیار) رقمطراز ہیں:-

"زہرہ خاتون زریں ایک ترقی پسند خاتون ہیں نظم و نثر کا شوق ماحول کا پیدا کردہ ہے عزم و ارادہ میں استقامت ہے طبیعت جوشیلی پائی ہے دل میں ملت کا درد اور احساس ہے۔ شہرت اور ناموری سے گھبراتی ہیں"

شاعری میں آپ اپنی بڑی بہن محترمہ بلقیس فاطمہ بیکس کی شاگرد ہیں۔ کلام میں ابھی پختگی اور رنگ نہیں ہے لیکن اگر کہتی رہیں تو اچھا کہنے لگیں گی۔ محترمہ کا مرسلہ کلام درج ذیل ہے:-

ابر سے نکلا ہے کچھ کچھ آفتابِ زندگی　　رنگ پر آجائے گا اپنا شبابِ زندگی

ذرہ ذرہ میری ہستی کا درخشاں ہوگیا　　ضوفشانی کر رہا ہے ماہتابِ زندگی

ہوچکا بیدار اب قسمت کا میری شاہ باز　　رنگ لائے گا ضرور اب انقلابِ زندگی

دشمنوں کے ہاتھ آئیگی نہ میری خاک بھی　　ہوگیا اقبال میرا ہمرکابِ زندگی

۱؎ مرحوم کے حالات زینت بیگم صاحبہ عبرت نے اپنے تذکرہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ "ج"

دور رہتی ہوں ہمیشہ الجھنوں سے دہر کی　　کیوں نہ ہوگا پاک پھر میرا حسابِ زندگی

ذرّہ ذرّہ ہو گیا زریںؔ جمالِ حُسن سے

ہو گیا ہے پھر ضیا بار آفتابِ زندگی

آسماں پر ہے کیوں مسرّت آج　　پیارے تارے بھی جھلملاتے ہیں

دہر میں ماہ ہیں خوشی رقصاں　　غنچے کِھل کِھل کے مسکراتے ہیں

تا ثریّا ہے آج دَورِ خوشی　　جامِ عشرت لنڈھائے جاتے ہیں

جب گھٹا دل خوشی سے گاتے ہیں　　تب صنوبر بھی جھوم جاتے ہیں

آئی بادِ صبا بھی اِٹھلاتی　　اور پرندے بھی چہچہاتے ہیں

ہوئی بلبل چمن میں نغمہ سرا　　مور جنگل میں گیت گاتے ہیں

بزمِ عشرت فضا میں سب خوش ہیں　　اور پھولے نہیں سماتے ہیں

کوئی لکھ کر نوید لایا ہے　　کچھ خوشی کے ترانے گاتے ہیں

وجد میں ہے فضائے صحنِ چمن　　پھول ہنس ہنس کے رنگ لاتے ہیں

بن کے سلطان انجمن آرا　　بزمِ علم و عمل میں آتے ہیں

یعنی سلطان کی ہے بسم اللہ　　لوگ دولہا انھیں بناتے ہیں

لائی زریںؔ دعاؤں کا تحفہ　　جس کے الفاظ جگمگاتے ہیں

ہو کے مقبول بارگاہِ خدا

دیکھیے رنگ کیا دکھاتے ہیں

شب کو شبنم جو آئی شادی میں　　　خوان ہائے گہر بکھیر گئی
ڈالے سبزے کے موتیوں کے ہار　　　بخت خوابیدہ اس کے پھیر گئی
آئی مالن تلاش گل کے لئے　　　بھر کے دامن کو وہ دلیر گئی

نہ زخم دل بھی ابھی مندمل ہوئے تھے خدا　　　کہ ایک چوٹ پڑی اور شیشۂ دل پر

زہرا

زہرا؛ محترمہ ام زہرا ہاشمی مرحومہ بدایونی کا تخلص ہے۔ آپ عصمت کی مخصوص ومقبول شاعرات سے ہیں۔ جناب جام نوائی صاحب بدایونی کی شریک حیات تھیں۔ شادی کے بعد شوہر کے مذاقِ شاعری پر نظر کرتے ہوئے خود ذوقِ شاعری پیدا کیا اور پھر اس میں اس قدر ترقی کی کہ ملک کی ایک مشہور اور قابلِ قدر شاعرہ بن گئیں۔

آپ نہایت نیک طینت، پاک باطن، وفا شعار اور خدا ترس خاتون تھیں تعلقات زن وشوئی نہایت خوش گوار تھے، اور دونوں کو ایک دوسرے سے ازحد محبت تھی، ایک دفعہ جناب جام نوائی صاحب سخت علیل ہوئے اور حالت بہت خطرناک ہو گئی۔ اس وقت وفا شعار بیوی نے "بیمار شوہر کے سرہانے" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں وفا کے جوش میں درگاہ ایزدی میں دعا کی گئی تھی کہ الٰہ العالمین تو میرے شوہر کو اچھا کردے اور ان کے بدلے مجھے موت دے، یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ صرف یہ نظم ہی

مقبول نہیں ہوئی بلکہ یہ دعا بھی بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو گئی!
جام نوائی صاحب اچھے ہو گئے اور ام زہرا ہاشمی رفتہ رفتہ بیمار ہونے لگیں
شوہر کی تیمارداری میں انہماک کے باعث محترمہ کو خفیف سا بخار
رہنے لگا تھا جو بڑھ کر ورمِ امعاء و جگر میں تبدیل ہو گیا، اور بالآخر موت
کا باعث بن گیا۔

جب محترمہ ام زہرا ہاشمی کی حالت زیادہ خطرناک ہوئی تو جام نوائی صاحب
نے ایک نہایت پُردرد نظم "رحم کی بھیک" کے عنوان سے لکھی جس میں
خدا سے بیوی کی زندگی کی بھیک مانگی گئی تھی جو مرحومہ کی وفات کے
بعد عصمت بابتہ نومبر ۱۹۴۲ء میں چھپی تھی۔[۱]

---

[۱] اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

الٰہی ام زہرا ہاشمی پر رحم فرما دے　　تو اپنے صدقے کرم دور از قیاس و وہم فرما دے
نہ بن جائے سکونِ مستقل ماضی کی بیتابی　　نہ ہو تمہید خوابِ مرگ راتوں کی بیخوابی
اسے تو چھین لے مجھ سے نہ ایسا ہو کہیں یارب　　نہیں یارب نہیں یارب نہیں یارب نہیں یارب
میں اِتنفہ ہوں بنالے جوش لے مجھ پر جفا کی تھی　　میسر بدلے میں خود قربان ہونے کی دعا کی تھی
دعا سے میری اب اس کو عطا کر زندگی یارب　　مرے جذبِ محبت کو نہ ہو شرمندگی یارب
مری فریاد اگر رنگِ قبولیت نہ پائے گی　　تو کیا کیا نازشِ عشق و وفا کو شرم آئے گی
بھنور سے جن کی کشتی کو ابھی تو نے نکالا ہے　　وہی معصوم جن سے میری دنیا میں اجالا ہے
وہ پھر مایوسیوں میں آج تجھ سے لو لگائے ہیں　　وہ تجھ سے بھیک لینے کو بھکاری بن کے آئے ہیں

لیکن محترمہ کی حالت خراب ہوتی گئی محترم جناب جام نوائی صاحب لکھتے ہیں:-

"مرحومہ نے انتقال سے چھ روز پیشتر ۲۷ ستمبر ۱۹۴۲ء کو بڑی لڑکی کے عقد و رخصت سے فراغت حاصل کی تھی۔ اور مجھے مجبور کر کے عالمِ بیماری میں چارپائی پر پڑے پڑے خاص اہتمام و انتظام کے ساتھ بحسن و خوبی یہ فرض انجام دیا تھا۔ آخر وقت تک حواس درست رہے۔ مرنے سے دس منٹ قبل پلنگ، بستر، کپڑے ہر چیز تبدیل کرائی۔ تیمم کیا۔ سب کو تلقین صبر و شکر کی۔ یٰسین شریف پڑھوانے میں عجلت کی۔ اور صرف تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ کہہ کر جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔"

محترمہ کا انتقال ۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک کو ہوا۔ مرحومہ نے چار بچے چھوڑے۔

محترمہ اردو کی ایک قابلِ قدر شاعرہ تھیں۔ آپ کے کلام میں بڑا درد و اثر اور سوز و گداز ہے۔ طرزِ ادا نہایت دلکش و سنجیدہ ہے۔ آپ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔

میرے بعد[۱]

جانگسل ہے یہ تخیل کس قدر میرے لئے　　بعد میرے تم رہو گے نوحہ گر میرے لئے

۱؎ یہ وہ دردناک نظم ہے جو مرحومہ ام زہرا ہاشمی مغفورہ نے اپنے آخر زمانۂ علالت میں تحریر کر کے اس تکیے کے غلاف میں پوشیدہ کر دی تھی جو انھوں نے بزمانۂ علالت اپنے شوہر جناب جام نوائی بدایونی کے لئے اپنے ہاتھ سے کاڑھا تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

گھر میں آ کر جب عبادت جب نہ پاؤ گے مجھے
خاک اڑاؤ گے نہ کیا کیا در بدر میرے لئے

شدتِ غم میں بہیں گے سرخ آنسو آنکھ سے
خون روئے گی تمہاری چشمِ تر میرے لئے

دیکھ کر روتے تمہیں میری لرز جاتی ہے روح
ہے تمہارے دل پہ صدمہ کس قدر میرے لئے

کیا کرو گے بعد میں جب آج میرے جیتے جی
ہو پریشاں اور غمگیں اس قدر میرے لئے

کون سمجھائے گا تم کو موت ہے ہر ایک کو
بن نہ سکتے تھے قوانینِ دگر میرے لئے

وقت پر آئی کسی کی بھی ٹلی ہے دہر میں
تھا نہ یہ دستورِ فطرت خاص کر میرے لئے

میں سمجھتی ہوں مرا غم اور تم اور تابِ ضبط
صبر کرنا جس طرح بھی ہو مگر میرے لئے

میں ہوئی قربان تم پر فرض تھا میرا یہی
تم کو واجب ہے جیو تم عمر بھر میرے لئے

تم کو میری آرزو، میری محبت کی قسم
تم خدا نخواستہ جانا نہ مر میرے لئے

تم اگر روؤ گے میری یاد میں بچوں کی طرح
ہوویگا صدمہ بڑا یہ روح پر میرے لئے

میرے غم میں نالہ و فریاد و شیون کے عوض
مانگنا حق سے دعا با چشمِ تر میرے لئے

سوتے بیٹھتے رہنا بھیجے قرآن پڑھ پڑھ کر ثواب
بھیجنا ہدیہ سرِ شام و سحر میرے لئے

میرے بچوں سے محبت کرتے رہنا عمر بھر
جانتے رہنا انہیں نورِ نظر میرے لئے

زندگی بھر میں نے چاہا ہے تمہارا جان کر
چاہنا تم ان کو میرا جان کر میرے لئے

میں مری جاتی ہوں اس غم میں کہ یہ بچے مرے
بعد میں میرے کہیں پھریں نہ در در میرے لئے

(بقیہ حاشیہ) مرحومہ کے چالیسویں کے بعد یہ نظم برآمد ہوئی۔ مرحومہ بزمانۂ علالت آستانۂ پاک حضرت سلطان العارفینؒ پر شہر کے باہر گیارہ روز قیام کی غرض سے تشریف لے گئی تھیں غالباً وہیں کی فرصت اور تنہائی میں یہ نظم لکھی گئی تھی۔

میرے اپنوں سے نہ تم پیمانِ الفت توڑنا
اُن کو اپنا ہی سمجھنا عمر بھر میرے لئے

بعد میرے اتنا ہی چاہا دینا تم مجھ کو ثواب
بن سکے جس کے سبب جنت میں گھر میرے لئے

ہاں مگر ان میرے بچوں کا بہت کرنا خیال
رحم کرنا ان کے غمگیں حال پر میرے لئے

مجھ کو اپنی بُو کی حالت پر بہت افسوس ہے
اب یہ ہوگی اور غم شام و سحر میرے لئے

آہ یہ میری ضعیف اماں تمھاری والدہ
روئیں گی اب زندگی بھر کس قدر میرے لئے

کس طرح تڑپیں گے چاروں بھائی اور بھاوجیں
جب نہ پائیں گے مجھے پیشِ نظر میرے لئے

یہ خبر پردیس میں توڑے گی کیا غم کا پہاڑ
میرے منجھلے بھائی پیارے بھائی پر میرے لئے

دل پھٹا جاتا ہے میرا آہ میری بچیاں
کس قدر روئیں گی ہر ہر بات پر میرے لئے

ہائے سب سے چھوٹے بھائی کا کیا حال ہوگا میرے بعد
آہ پہنچیں گے صدمے کس قدر میرے لئے

اُف وہ میری آنکھ کا تارا مرا اچھے میاں
عمر بھر رکھے گا اپنی آنکھ تر میرے لئے

روئے گا بیتاب ہو ہو کر دھاڑیں مار کر
رکھ کے اپنا ہاتھ اپنے قلب پر میرے لئے

آہ! دل ہے کتنا ننھا سا مرے مہتاب کا
آہ یہ تڑپا کرے گا کس قدر میرے لئے

رات کو بیٹھے گا جب سو کر اُٹھ پکارے گا مجھے
دن میں دوڑائے گا ہر جانب نظر میرے لئے

کس سے اب افسوس کوئی بات پوچھے گی حبیب
اس پہ ہوگا کس قدر غم کا اثر میرے لئے

آہ پردیسی جمیلہ جو ہے اک مدت سے دُور
دفعتاً رہ جائے گی دل تھام کر میرے لئے

گھر میں ہر سو آپ نے برپا سی ہوگی جلوہ گر
آدمی کیا روئیں گے دیوار و در میرے لئے

میں نے اب تک دل کسی کا بھی دکھایا ہی نہ تھا
اب کہیں گے قدرتاً قلب و جگر میرے لئے

آہ یہ بیکار سی ہستی تو اس قابل نہ تھی
سب کے دل میں اک محبت تھی مگر میرے لئے

دیکھ لوں میں اپنی خورشید و ثریا کا بیاہ
زندگی دیکھے خدا سے عمر بھر میرے لئے

اور اگر ایسا نہ ہو تو تم کو میری ہی قسم　　فرض کر دینا ادا یہ جلد تر میرے لئے
چاہنا اپنے جگر پاروں کو میرا جان کر　　اب یہ بچے ہیں تمہارے تھے مگر میرے لئے
سب بتا دی ہیں تمہیں باتیں لکھوں اب اور کیا　　ظاہراً تنہا ہے سر پہ سفر میرے لئے
جو خطا مجھ سے ہوئی ہو بخش دو للہ تم　　جس طرح کرتے رہے ہو عمر بھر میرے لئے
میں تمہاری تھی تمہاری ہوں اور اس کے بعد بھی　　تم ہی ہو گے خلد و فردوس نظر میرے لئے
گر دعاؤں سے تمہاری مل گیا جنت میں گھر　　شغل ہو جائے گا اک شام و سحر میرے لئے
نام دوں گی اس کو "گل گاہ وفائے جاوداں"　　موجب صد آرزو ہوگا وہ گھر میرے لئے
میرے پاس آئیں گے بن بن کر گہر وہ اشک غم　　جو بہائے گی تمہاری چشم تر میرے لئے
میں بنا جاؤں گی ان موتیوں کی ہاریں　　اور سجے گا جا بجا وہ خوب گھر میرے لئے
دل بہل جائے گا کچھ تھوڑا بہت اس شغل میں　　یہ کڑی منزل بنے گی سہل تر میرے لئے
ہوگا اس گل خانے میں اس داغ سے روشن چراغ　　گل جو ابھرے گا تمہارے قلب پر میرے لئے
ہوگی شمع گھر میں اس درد محبت کی چمک　　جو تمہارے دل میں ہوگا عمر بھر میرے لئے
منتخب کر کر کے میں جنت کے گل سب لاؤں گی　　کام ہوگا یہ بہت دلچسپ تر میرے لئے
در پہ ہوں گے پھر استقبال ان سب کے لیے　　صف بصف شانہ بشانہ سر بسر میرے لئے
الغرض جب آ کے مل لو گے مجھ سے تم　　اور جب جنت میں ہوگی یہ خبر میرے لئے

"تم کو گل گاہ وفائے جاوداں" میں لاؤں گی
ساتھ میں حوروں کے نغمات مسرت گاؤں گی

محسنِ اعظم کی یاد میں

کہاں ڈھونڈیں تجھے اے فخرِ قوم اے راشد الخیری
تری رحلت سے اب تک آگ ٹپک ہے دل کے چھالے میں
تری تحریر تھی آئینۂ رودادِ مظلوماں
نمایاں دردِ قومی تھا ترے ہر ہر مقالے میں
تری سعیٔ عمل سے کی وہ شمع رہبری روشن
نظر آتا ہے سیدھا راستہ جس کے اجالے میں
پڑھایا یہ سبق ان بیکسوں کو تیری شفقت نے
گزر جاتی تھی جن کی زندگی فریاد و نالے میں
کہ دنیا کو کریں روشن مکاں کی قید میں رہ کر
ضیا بخشِ جہاں ہے ماہ جیسے رہ کے ہالے میں
حمایت نے تری کی برمحل ایسی مسیحائی
سنبھالے جس طرح بیمار کو کوئی سنبھالے میں
دلائے وہ حقوقِ زندگانی غم نصیبوں کو
پڑے تھے ایک مدت سے جو اپنا ٹالے پالے میں
بلندی پر بٹھایا ان کو لا کر قعرِ پستی سے
سکھائے "پیرا معانی" ہر نرالے رکھ لالے میں
ہوئی اس میں بھی کچھ سطحی نگاہوں کے لئے لیکن
جو تیرے دل میں تھا ویسا کہاں؟ داغ لالے میں

حیاتِ جاوداں ہے تیری تصنیفات کو حاصل
کتابت زندگی کی روح ہے تیرے رسالے میں
یہ کہہ کہہ کر زمانہ تاقیامت تجھ کو روئے گا
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

سالِ نو کا ترانہ

مبارک، مبارک، کہ بدلا زمانہ — مسرت کا پھر ہاتھ آیا خزانہ
چمن پر کھنچا ابرِ کاشت امیانہ — کلی کی چٹک کا بجا شادیانہ
اٹھو گائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

کہاں اب ہیں باقی فضائیں وہ گدلی — ترشح سے خاکِ چمن نے مدد لی
جوانانِ گلشن نے پوشاک بدلی — نیا ہے ہر اک پھول بوٹے کا بانا
اٹھو آگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

پھر آئی رخِ لالہ و گل پہ لالی — ہوئی دورِ سبزے کی پھر پائمالی
عروسِ چمن نے نئی وضع نکالی — کیا پھر سے زلفوں میں سنبل نے شانا
اٹھو آگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

نیا جام ہر ایک گل لے کے آیا — نیا رنگ اطرافِ گلشن پہ چھایا
نیا چشمِ نرگس نے انداز پایا — نیا بلبلِ خوشنوا کا ہے گانا
اٹھو آگائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

کہاں وہ تماشائے دورِ کہن ہے — کلی نو شگفتہ نئی اک دلہن ہے

سجی پھر نئے طور پر انجمن ہے غرض ہر طرف ہے نیا کارخانا

اُٹھو! گائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

رخِ شاہدِ غنچہ شبنم نے دھویا نئی آرزوؤں کے بیج بویا
نئے عطر میں گل کا دامن ڈبویا نئی نکہتوں سے ہے گلشن بسانا

اُٹھو! گائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

یہاں اب تو کچھ رنگ ہی اور ہوگا نرالا ہر اک بات کا طور ہوگا
نیا سال آیا، نیا دور ہوگا لٹے گا مضامینِ نو کا خزانا

اُٹھو! گائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

نئی شمع ہوگی، نئی نور باری نیا علم ہوگا، نئی دستکاری
نیا چشمۂ فیض پھر ہوگا جاری ہیں "عصمت" کو پھر کچھ نئے گل کھلانا

اُٹھو! گائیں پھر سالِ نو کا ترانہ

زہرہ۔ حیدرآبادی

محترمہ زہرہ بیگم زہرہ۔ ڈاکٹر عبدالرب صاحب حیدرآبادی کی دختر ہیں، آپ ادبی حلقوں میں بنت عبدالرب کے نام سے معروف ہیں اور اس نام سے آپ کے مضامین اور کلام زنانہ رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ خانگی تعلیم اور مطالعہ کے باعث آپ نے یہ شوق پیدا کیا ہے، آپ نے حفیظ جالندھری کے "شاہنامہ اسلام" کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں۔ کلام میں ابھی ترقی کی گنجائش

ضرورت ہے۔ نمونہ یہ ہے :۔

مشرکوں نے جو کیں گستاخیاں آنحضرتؐ سے
آپ نے ترکِ وطن کا کیا قصد اُکتا کر

وقت دوپہر کا، شدت کی تپش گرم ہوا
آپ اس دھوپ میں تنہا گئے صدیقؓ کے گھر

اور فرمایا کہ اے یارِ وفادار سُنو
تم بھی اب چھوڑنے کے واسطے تیار ہو گھر

اس قدر ان کو ہوئی اپنی معیت کی خوشی
آنکھوں میں آگئے صدیقؓ کے آنسو بھر کر

اور ادب سے یہ کیا عرض کہ ماں باپ فدا
خدمتِ پاک میں دو اونٹنیاں ہیں حاضر

زہرہ

محترمہ کے رابیف۔ خاتون المتخلص بہ زہرہ ملیبا کی رہنے والی ہیں،
آپ خاتونِ مشرق کی مخصوص شاعرہ ہیں۔ زندگی کے دلدوز واقعات
آپ کی نظموں کے مرغوب عنوانات ہیں۔ نظموں میں احساس و الش کا رنگ
جھلکتا ہے۔ اگر آپ اس قسم کی نظمیں لکھتی رہیں اور اس رنگ میں کچھ
اور پختگی پیدا کرلی تو شاعرات کی دنیا میں آپ کا کلام ایک نہایت
خوشگوار اضافہ ہوگا، اب بھی آپ کا کلام نہایت امید افزا اور قابلِ ستائش
ہے۔

تصویرِ حیات کے دو رُخ [1]

(ہمشیرہ کی قبل از وقت موت سے متاثر ہو کر)

موت کا پیغام ہے حسنِ شبابِ زندگی
کس قدر عبرت بداماں ہے ربابِ زندگی

---

[1] موصوفہ کی یہ نظم خاتونِ مشرق دہلی بابتہ ستمبر سنہ ۱۹ء میں ذیل کے نوٹ کے

خاک جب ہو جائے گا ورقِ کتابِ زندگی
کس لیے ناداں! ہے پھر مستِ شرابِ زندگی

دے رہا ہے موت کا پیغام سازِ زندگی
آ، کہ ذرّے ذرّے میں دکھلاؤں رازِ زندگی

زندگی جو ابتسامِ زیست کی تفسیر تھی
زندگی جو شوخیٔ قسمت کی اک تحریر تھی

زندگی جو آئینہ دارِ محبت تھی کبھی
در حقیقت آئینہ دارِ حقیقت تھی کبھی

زندگی جو کھیلتی تھی بہن کے آغوش میں
خواب کے عالم میں یعنی عالمِ بے ہوش میں

زندگی معصومیت جس کی فنا کی دید تھی
اک مجازی روشنی تھی اور صبحِ عید تھی

زندگی جس کے تکلم میں نہاں صد آبشار
زندگی جس کا تبسم باغِ رضواں کی بہار

(پچھلے صفحے سے) ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"شام کی تاریکی فضائے عالمِ ناسوت پر غالب آ رہی تھی، اُفقِ آسمان پر گلابی بدلیاں کی انجمن جگمگا اٹھی تھی۔ قدرت کے نظارے کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنے بام پر گئی۔ سامنے چند جا بجا ٹوٹی ہوئی قبریں نظر پڑیں جو عالمِ اسباب کی نیرنگیوں کو دیکھ کر ہنس رہی تھی، نظارۂ شام نے انھیں اور جاذبِ نگاہ بنا دیا تھا۔ یہاں ماں کے وہ لال زیرِ خاک پڑے تھے جن کی پرورش کسی زمانہ میں خونِ جگر سے ہوئی تھی۔ ہُو کا عالم تھا، بیکسی ٹپکتی تھی، حسرت برستی تھی، ہمدم تھا نہ ہمراز، خونِ دل سے بہنے لگا جب مجھے دھیان آیا کہ اس ماتم سرا میں میری مشفق ہمشیرہ بھی مدفون ہے۔ میں اپنے تاثرات کو بصورتِ نظم پیش کرتی ہوں۔ یقیناً یہ ان بہنوں کے لئے باعثِ تسلّی ہوگا اور وہ اسی سے کافی تسکین اندوز ہوں گی جو ٹوٹی ہوئی قبروں کی عبرت سامانیوں کو دیکھ چکی ہیں۔"

"زہرہ"

زندگی جلوت میں جو خاموش رہتی تھی کبھی
زندگی خلوت میں جو تانیں اُڑاتی تھی کبھی

زندگی جو کھیلتی تھی ہر نئے انداز سے
لوریوں کے راگ سے اُلفت کی سرآواز سے

"زندگی" وہ چین سے آرام کرتی ہے یہاں
ہُو کا عالم اور بیاباں رات آتی ہے جہاں

دیکھتی تھی دہر کی ظلمت میں تنویرِ حیات
ہے مگر نظروں میں زہرہ آج تصویرِ حیات

پیکرِ عصمت

شادی کے بعد رخصت کے وقت غربت کے عالم میں ایک بوڑھے باپ کی
اپنی بیٹی کو نصیحت م

رات کا پچھلا پہر ہے جھک چلا ہے ماہتاب
جھلملاتے ہیں ستارے خلق ہے مصروفِ خواب

ہو گیا کافور اب گردوں کے چہرہ کا نکھار
ہانپتی روندی ہوئی سڑکوں کا سویا ہے وقار

سنسناتی باغ میں موجِ نسیم آنے کو ہے
بلبلِ دیوانہ کو موجِ شمیم آنے کو ہے

ہے روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی نزدیک و دور
گا رہے ہیں نور کے سایہ میں خوش الحان طیور

ہو گئی ہے چاندنی شاخوں سے چھن کر پاش پاش
اور ہے پھولوں پہ شبنم کا غضب کا ارتعاش

شہر کے شور و شغب سے اور آزادی سے دُور
ایک میداں کے کنارے اور آبادی سے دُور

ہے پڑا اک جھونپڑا موسم کا منہ تکتے ہوئے
تلخیٔ دوراں کی پیہم جھڑکیاں کھائے ہوئے

عیش کے پیہم تخیل کا کبھی پالا ہوا
مفلسی کے سرد ہاتھوں کا کبھی مارا ہوا

جھلملاتا اک دیا کونے میں ہے جلتا ہوا
قصۂ رنج و الم کو ہائے دُہراتا ہوا

ایک بیٹی، باپ و ماں ہیں غرقِ سیلابِ محن
ہو گئی ہے درہم و برہم خوشی کی انجمن

صبح دم بیٹی کی رخصت کا تخیل بار بار
بے نوائی سے وہ اپنی اور بھی ہیں بے قرار

ایک چادر بھی نہیں بیٹی کو دینے کے لئے
دولتِ معصوم عصمت کو چھپانے کے لئے

جھک گئی ہے ہائے غربت پر تمنا کی جبیں
ہو کے حسرت لے رہی ہے سسکیاں خلوت نشیں

اک طرف سامان کچھ ٹوٹے ہوئے پھوٹے ہوئے
اور غربت کی مدد سے موت کے لوٹے ہوئے

اک طرف کونے میں جالے مکڑیوں کے جا بجا

اور بوڑھا باپ بھی ہے ایک طرف لیٹا ہوا

اک طرف اک پیکرِ پُرحُسن کی تصویر ہے
راحتِ جانِ پدر ہے، غم کی اک تفسیر ہے

چاند چہرے سے عیاں ہے، چال سے مستی عیاں
ہیں مگر رنج و الم کے داغ سینے میں نہاں

آنکھ شرمیلی، نظر نیچی، فدا جس پر حجاب
لے رہا ہے کروٹیں سویا ہوا دل میں شباب[1]

غم کے ہاتھوں عیش کی بازی ابھی ہاری نہیں
پھر بھی کوئی چیز دنیا کی اسے پیاری نہیں

ماں ہے اس کے سامنے مدہوش سی لیٹی ہوئی
اشکِ غم سے پیکرِ غربت کا منھ دھوتی ہوئی

ایک بیٹی کے بچھڑنے سے ہے ویراں ہر نظر
دل دھڑکتا، تھرتھراتے ہاتھ، پگھلا سا جگر

فرطِ غم سے ضبطِ غم کا باپ کو یارا نہ تھا
ایک بیٹی کے سوا کوئی اسے پیارا نہ تھا

دل میں پیدا آخری دیدار کا ارماں ہوا
ہانپتا کرتا ہوا بیٹی سے آ کر یوں کہا

---

[1] جوش ملیح آبادی ~ لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جیسے طوفانی سمندر میں ضیائے ماہتاب

اے مری نورِ نظر تو اس قدر روتی ہے کیوں
طائرِ روحِ حزیں کو اور تڑپاتی ہے کیوں

جانتا ہوں دل نشیں الفت سے تو مجبور ہے
دل کی راحت کے تڑپنے سے بہت رنجور ہے

جانتا ہوں اے سکونِ قلب کا ارماں ہے تو
دردِ دل کا ایک ہنستی کھیلتی درماں ہے تو

ہے مجھے تسلیم بیٹی تو مرا آرام ہے
دستِ قدرت کا مقدر بے بہا انعام ہے

فطرتِ مجبور نے لوٹا تیرے آرام کو
زندگی آلام ہے پہچان لے آلام کو

کیا کروں قدرت سے میں لاچار ہوں مجبور ہوں
اس حقیقت میں بھلا میں تجھ سے کب مجبور ہوں

فطرتِ مجبور پر تو بس مرا چلتا نہیں
ہائے بیٹی آج اس دل کا کنول کھلتا نہیں

گوشِ دل سے چند باتیں سن مری بیٹی ہو تو
جانتا ہوں میرے چھٹنے سے بہت روتی ہے تو

بارگاہِ آفرینش میں تجھے عزت ملی
عظمت و عفت کی تجھ کو بے بہا دولت ملی

تیری ہی فطرت سے قائم ہے سرورِ زندگی

تو جو چاہے تو بڑھا سکتی ہے نورِ زندگی
نبض چلتی ہے محبت کی تری آواز سے

ہے بہت مانوس انساں تیری نَے کے ساز سے
راحتِ جانِ پدر ! پروردۂ رحمت ہے تو

پیکرِ اُلفت ہے تو سرمایۂ راحت ہے تو
عالمِ امکاں میں سچ ہے باعثِ عزت ہے تو

مختصر سی بات ہے کہ پیکرِ عصمت ہے تو
اپنے شوہر کی اطاعت سے نہ گھبرانا کبھی

دیکھنا ہم مصیبت سے نہ دب جانا کبھی
ساتھ رکھنا شرم و استقلال کو ایمان کو

عمر بھر راہِ وفا میں، ساس کے فرمان کو
فکر کیا کچھ بھی نہیں تجھ کو چھپانے کے لئے

چادرِ عصمت ہے گر عزت بچانے کے لئے
زیورِ صبر و رضا خود باعثِ تزئین ہے

انکساری، بُرد باری باعثِ تمکین ہے
دیکھنا دھبّہ نہ آنے پائے تیرے نام پر

دیکھنا ہنسنے نہ پائے کوئی تیرے کام پر
جس گھڑی مرنا مرا رہ رہ تجھے تڑپائے گا

رشتۂ الفت مرا جب یاد تجھ کو آئے گا

میری باتوں کو نظر کے سامنے رکھ کر ذرا
غور کرنا کس قدر تو نے مرا کہنا کیا
گر ہے واقف تو مری ہر بات کے انجام سے
پھر سمجھنا میں بھی زیرِ خاک ہوں آرام سے
چھوڑ دے اے میری بیٹی میرا دامن چھوڑ دے
چار دن کی دل نشیں الفت کا رشتہ توڑ دے
میری باتوں پر عمل کرنا تو اے بیٹی مدام
اس سے حل ہو جائیں گے الجھے ہوئے سب تیرے کام
جھلملا کر پھر نظر آئے گا غربت کا چراغ
اور پائے گا جلا پھر تیرا "نسوانی" دماغ
پھر تجھے مل جائے گا بیٹی سکونِ زندگی
دوڑ جائے گا تیری نبضوں میں خونِ زندگی
پھر وہ دن آئے کہ جس سے رنج تیرا دور ہو
تیری خدمت سے مرا دل شاد ہو مسرور ہو

زیب عثمانیہ ۔ لدھیانوی

اُردو کی اس محترم اور گرامی قدر شاعرہ کا نام تاجور اور تخلص زیب ہے، عثمانیہ نسبت خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں، آپ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو لدھیانہ کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں

آپ کے عمِ محترم خان غلام محمد خاں صاحب یکتا پنشنر پولیس لاولد تھے بچپن ہی میں زیب کی فراست اور ہوش مندی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ چنانچہ آپ کے عم بزرگوار نے آپ کو عالمِ شیر خوارگی ہی سے اپنا متبنّٰی کر لیا اور اُن ہی کی آغوشِ محبت میں زیب کی تربیت ہوئی۔ اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق آپ کی تعلیم بھی گھر پر ہوئی، اور جلد ہی آپ نے اُردو اور فارسی کی تعلیم مکمل طور پر گھر پر حاصل کر لی۔ جب بچپن کی حدود سے گزر کر آپ نے جوانی میں قدم رکھا تو آپ کے چچا نے آپ کی شادی ماہ فروری ۱۹۳۳ء میں آپ کے پھوپھی زاد بھائی سلطان بہاء الدین صاحب سے کر دی جو آج کل محکمہ انہار میں ہیڈ ڈرافٹس مین کی خدمات انجام دے رہے ہیں شادی کے تقریباً ۹ سال بعد ۱۰ ؍جنوری ۱۹۴۳ء کو آپ کے فرزند تولّد ہوا جس کا نام سلطان صلاح الدین رکھا گیا۔

آپ کے عمِ محترم ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں چنانچہ شروع ہی سے محترمہ کے ذاتی جوہر کو تربیت اور ترقی کے لیے ایک ہم آہنگ اور خوشگوار ماحول مل گیا تھا۔ ابتدا میں آپ خاموشی کے ساتھ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ اور رفتہ رفتہ مشقِ سخن نے خیالات میں بلندی اور کلام میں پختگی پیدا کر دی، یہ وہ وقت تھا کہ دنیائے شعر و ادب پر اقبالؔ کی ہستی چھا چکی تھی۔ اس "دانائے راز" کے رازدارانہ نغمے فضائے دہر میں گونج رہے تھے۔ اس کی قومی

اور ملی نظمیں ہر مسلمان کے دل میں اپنا گھر کر چکی تھیں۔ اس کے پیام بیداری تلقین عمل اور نعرۂ خودی کو سن کر قومیں اپنے صدیوں کے سکوت پرور خواب سے آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہو رہی تھیں۔ اس کی ژرف نگاہی نے لوگوں کو زندگی کے گہرے حقائق کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اس کا کلام ہر دل میں گھر کر چکا تھا۔ زینب عثمانیہ فطرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے حساس قلب نے نہ صرف اپنے ماحول کے اس اثر کو قبول کیا بلکہ اپنے اندر جذب کر لیا۔ چنانچہ وہ پہلا نغمہ جس کے ذریعے آپ ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ ایک شاعرہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں شروع سے آخر تک اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نظم کا عنوان "مقصد حیات" ہے جو محترمہ نے دسمبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ لاہور میں پڑھی تھی اور جس پر انجمن اردو پنجاب کی طرف سے آپ کو ایک طلائی تمغہ انعام میں ملا تھا وہ نظم یہ ہے:

مقصد حیات

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ
شاہد دل نوازکی یہ بھی کوئی عطا سمجھ[1]
اس کی آرزو نہ کر اس کا مدعا ہے یہ
ہر نفس حیات کو درد میں مبتلا سمجھ

---

[1] علامہ اقبال ؒ نے از بلا ترسی ؟ حدیث مصطفیٰ ست ؛ مرد را روز بلا روز صفا ست (جاوید نامہ)

شاہراہ حیات میں رہبر و راہ زن نہ بن
اپنے سفر کا مدعا ان سے کہیں سوا سمجھ
منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ [1]
جو ہر درد ہے اگر گوہرِ اشک ہیں ترے
دامنِ کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ
تیرے صفائے قلب کا وہم ہی امتحان ہے [2]
خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ
زینتِ حریمِ قلب کی خاک میں جب چھپ گئی ہے
فتنہ کوئی اٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ

یہ نغمہ کس قدر پُر وقار اور پاکیزہ ہے اور شاعرات کی عام روش سے کس قدر مختلف! اس نظم پر انجمنِ اردو پنجاب کا طلائی عطیہ دنیائے ادب کی طرف سے آپ کے شاعرانہ کمال کا پہلا اعتراف تھا۔ اس کے

---

[1] علامہ اقبالؒ
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں (بالِ جبریل)
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے (بانگِ درا)

[2] علامہ اقبالؒ　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(بانگِ درا)

بعد انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کی گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کے نعتیہ کلام پر آپ کو سنہری تمغہ عطا کیا گیا اس کے بعد سے آپ کے کلام کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی اور موقر ادبی جرائد و رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہونے لگا۔ اور آج آپ کا شمار ادبا و شعرا کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "متاعِ حرم" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہو کر ملک کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔

آپ کا ذہنی و شاعرانہ پس منظر اسلامی ہے آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ، پردہ نشیں، سادہ مزاج کم گو اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ دورِ حاضرہ کے دقیق ملکی، ملّی اور سیاسی مسائل سے آپ کو گہری دلچسپی ہے اور آپ کا اکثر وقت غور و خوض اور فکر و تدبّر میں کٹتا ہے۔

یوں تو آج کل ہر شاعر و سخن گو علامہ اقبالؒ کے رنگ میں کہنا دلیلِ عظمت سمجھنے لگا ہے لیکن متبعین اقبالؒ کے سلسلہ میں پنجاب کے جن لوگوں کے نام لئے جاتے ہیں ان میں امین حزیں، خان صاحب خلیلی اور میر ولی آزتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لیکن ابھی ان ناموں میں ایک بہت ضروری اضافہ باقی ہے اور وہ اضافہ محترمہ زیب عثمانیہ کا نام ہے، میرا خیال ہے کہ امین حزیں کے علاوہ کسی نے آج تک اقبالؒ کے فلسفہ و پیغام اور اس کی روح شاعری کو اتنی صحیح حد تک پیش نہیں کیا جتنا کہ محترمہ زیب نے محترمہ نے ان عنوانات میں سے اکثر پر قلم اٹھایا ہے جو علامہ مرحوم کے مرغوب و مخصوص موضوعات

رہی ہیں اور اس اتباع میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے جو اس دور کے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مخدومہ کے یہاں وہ فلک پیما تخیل، وہ آفاقیت، وہ ہمہ گیری و تبحر، وہ فلسفیانہ ژرف نگاہی، وہ عمق، وہ کمالِ شاعری، وہ زندگی کو اپنے گوشے میں سمیٹ لینے والی وسعتیں نہیں ہیں جو اقبالؒ کے یہاں موجود ہیں مگر یوں بھی کسی کے یہاں ان کی تلاش و جستجو عبث و بے سود ہے اقبالؒ ہزاروں برس میں ایک ہوا ہے اور ہزاروں برس تک ایک ہے گا۔ زمانہ برسوں نہیں صدیوں میں بھی صحیح معنوں میں اقبالؒ کا حریف مشکل سے پیدا کر سکے گا۔ مگر موجودہ دور میں جن لوگوں نے اقبالؒ کا اتباع کیا ہے ان کی دو کامیاب مثالیں مخدومہ اور زیب ہیں پھر کس قدر باعثِ مسرت ہے کہ خواتین کے اس ہجوم میں جہاں ہر جگہ "طاؤس و رباب" ہی جنت نگاہ اور "فردوس گوش" ہے، ایک شاعرہ علامہ مرحوم کی پُر وقار آواز میں ان کو زندگی اور زندگی کے حقائق کی طرف للکارتی نظر آتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے فارسی کے مشہور مصرعہ میں کس قدر صحیح تصرف کیا تھا۔

"رشتے از پردہ" بروں آید و کارے بکند

انتخابِ کلام — اقبال کا رنگ

اقوام کی جاگیر ہے بے دردی و سفاکی
اقوام نے دیکھا ہے جو خواب حصول تو

ہمدردی و دلداری انسان کی جاگیریں
بربادی و ناکامی ہیں خواب کی تعبیریں

اس دین کے معنی ہیں ایثار و خدمت بے کم　　پھر شرح النجم تفسیر ہیں دین کی تفسیریں
شمشیر کو دنیا میں نصرت حق سے کام　　مغلوب جو حق ہے پھر بیکار ہیں شمشیریں
توحید پرستوں کی اک ضرب ید اللّٰہی　　اور نام پرستوں کی صد آہنی تدبیریں

احساس عظیم الشاں لے زینت ہے دین حق کا
نازاں نہ ہوں کیوں ان پر خود قوم کی تقدیریں

(متاعِ درد صہ ۹۹)

وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام　　جس کے قوا رہیں محروم آرام
تو سا وہ رہرو ہیں سا وہ رہرو　　فتنوں سے بھرے منزل کا ہر گام
گر نیرا نالہ محتاج نے ہے　　دل ہی ہیں اپنے اس کو ابھی تھام[2]
اپنی خودی کو پوج اے برہمن　　کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام[3]
اس کو زمانہ رکھتا ہے قائم　　جس قوم کو ہے احساس انجام

---

[1] مولانا حالی ؎

جو دین کہ بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں اب آکے غریب الغربا ہے

[2] علامہ اقبالؒ ؎　نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی　　(بانگ درا)

[3] علامہ اقبالؒ ؎

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد　　تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر　　نگہ کی نامسلمانی سے فریاد　(ارمغان حجاز صہ ۷۵)

ہے عہدِ عسرت، عہدِ بغاوت | اور عیش و عشرت، عسرت کا پیغام

جس میں عمل کی طاقت نہیں زینب
وقعت سے خالی ہیں اس کے احکام

فلسفۂ جنگاہ

(متاعِ حرم ص۹۴)

قوموں کی تقدیر وہ مردِ جنگاہ | ایماں جس کا انحکم بِاللّٰہ
دنیا ہے خود اک جنگِ عناصر | باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ
ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملت | شمشیر جس کی الملک لِلّٰہ
گر مرد کیست ہو واقفِ راز | اک سحر طاقت ہے شوکت شاہ

درسِ سیاست دے کون اے زینب
شیخ و برہمن ہیں مردِ درگاہ

تو صاحبِ تدبیر نہیں صاحبِ تدبیر | تدبیر پہ موقوف ہے ہر قوم کی تقدیر
مغرب کی نظر کیف اماریت پُر از خواب | مشرق کی نگاہوں میں عیاں قوتِ تسخیر
سائنس ہیں جہاں شام و سحر نفس و خرد ہو | انسانیت اس ملک میں ہے بیکس و دلگیر
بولا کہ خودی اور خدائی میں تفاوت! | یزداں سے جو پوچھی گئی اوہام کی تفسیر[۲]

---

[۱] علامہ اقبالؒ ع مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات (بالِ جبریل ص۱۴۵)

[۲] علامہ اقبالؒ ؎ خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ (بالِ جبریل ص۶۹)

اے زیبؔ پلٹ آئی ہیں اس راہ سے قومیں
ناکام رہی غرب کی یہ کوششِ تزویر

(متاعِ حرم ص۹۵)

غنچے کی جیب رنگیں نقدِ خودی سے خالی
ضعفِ خودی کی شاہد سبزہ کی پائمالی[1]
"تاریخ امتوں کی اس بات پہ ہے شاہد
ہر کم مذاقِ ملت ہے جلد مٹنے والی
قوموں کی ماندگی کا باعث رہی ہے اکثر
تیری تنک مزاجی، میری تنک خیالی
کیا چیز تھی بھلا وہ ہر دور عصبیت میں
جس نے جہاں میں قوموں کی آبرو بچالی
ٹوٹے ہوئے دلوں سے اظہارِ دردمندی
دنیا کی نعمتوں میں احساس لاابالی
اے زیبؔ مشرقی ہوں قومیں کہ مغربی ہوں
ہے جن کا عزم عالی، ان کے نصیب عالی

(متاعِ حرم ص۹۴)

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ ہے ایک سحر گاہی تقویمِ خودی مشکل
یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو (ضربِ کلیم ص۱۴۶)

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری[1]
مری کوتاہ افکاری سے ہے وقفِ مرے نغمے
تری کوتاہ کاری سے تری منزل میں دشواری
ابھی تہذیب وہ محروم ہے ایماں کی دولت سے
کسی تہذیب میں گر فقر کے معنی ہیں ناداری
نہ پاسِ عہد تجھکو ہے نہ پاسِ عہد مجھکو ہے
ترا شیوہ گلہ داری، مرا شیوہ گلہ داری
زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں
بچا لے گی تجھے کیا کفر کی آہنی دیواری
مجھے اے زیبؔ بہروں خون کے آنسو رلاتی ہے
مری ملّت کی کم کوشی، مری ملّت کی ناداری

(شارعِ حرم صفحہ ۹۳)

عورت

اے کہ تو بھی کاروانِ دہر کی ہمدوش ہے
اے کہ جس کو خلد کہتے ہیں تری آغوش ہے
گو نہیں حاصل تجھے تابِ تواں مردانہ وار
تیری نازک انگلیوں میں ہے عنانِ روزگار

---

[1] علامہ اقبالؒ
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں (ضربِ کلیم صفحہ ۵۰)

جاگے گی نہ ہرگز کبھی اس قوم کی تقدیر
جس قوم کی عورت ہی نہیں صاحبِ تدبیر
عورت میں ہو مفقود اگر جراءتِ اخلاق
قوموں کی ہے یہ خامیِ اخلاق کی تعبیر
محروم ہے وہ قبضۂ شمشیر سے اے زینب
جس قوم کی عورت میں نہ ہو جوہرِ شمشیر

(متاعِ حرم ص۴۴)

خاتونِ مسلم

پھر مٹانا ہے غلط جادۂ منزل تجھ کو
پھر بنانا ہے یہ بگڑی ہوئی محفل تجھ کو
تیج دے تو نے سیوتا کے کرلات و منات
عین ممکن ہے کہ ہو شاطرِ تقدیر کو مات
نہ تری قوم میں ثروت ہے نہ عزت باقی
ننگِ گلشن ہے کسی نخل کی کم اوراقی
بادباں چاک ہوئے ڈوب چلی ہے کشتی
تو ہے کشتی میں نہ آب چلی ہے کشتی

(متاعِ حرم ص۲۴)

سرمایہ و محنت

یہ کس کی خودی ضربتِ پا سے ہوئی بیدار
سرمایہ و افلاس میں ہیں جنگ کے آثار
مرعوب گل پختہ! تجھے کیا نہیں معلوم
خارخس و خاشاک بھی ہیں شاملِ دیوار

(متاعِ حرم ص۵۰)

ہلال اور مزدور

افق پہ ہلکے ہلکے جھلملانا
فلک پر چپکے چپکے مسکرانا

تیرے پیکر میں آب و گل بھی ہونگے — تیرے پہلو میں لاکھوں دل بھی ہونگے
وہاں مستی بھی ہشیاری بھی ہوگی — سبکساری بھی خودداری بھی ہوگی
وہاں مجبور بھی ہوگا زمانہ — وہاں مغرور بھی ہوگا زمانہ
مگر مزدور سے نفرت نہ ہوگی — غریبی باعثِ ذلت نہ ہوگی

(متاعِ حرم صفحہ ۴۶)

مزدور خدا کے حضور میں

جب یہ بندہ اپنے رب کے پاس جاکر روئے گا
ساکنانِ عرشِ اعظم کو رُلاکر روئے گا

جب یہ اہلِ خانہ کے فاقے جتاکر روئے گا
جب یہ اپنی داستانِ غم سناکر روئے گا

اہلِ ثروت کی ستم رانی بتاکر روئے گا
نوعِ انساں کی زبوں حالی سناکر روئے گا

جب یہ اپنی نیم عریانی دکھاکر روئے گا
جب اسے داور کلیجے سے لگاکر روئے گا

چیخ اٹھے گا آسماں کا ذرہ ذرہ انقلاب
انقلاب اے ساکنانِ بزمِ دنیا انقلاب

(متاعِ حرم صفحہ ۵۶)

سیاسیات

دیں سیاست سے جدا ہے نہ سیاست دیں سے — یہ ترے فہمِ کم اندیش کی ہے ناداری

(متاعِ حرم صفحہ ۵۹)

قوم وہ جو اپنے وعدوں پر نہ مستحکم رہی ۔۔۔ رہ نہیں سکتی کبھی اس کی سیاست برقرار

(متاعِ حرم ص ۶۹)

بدلا ہے اس نے غرب میں جمہوریت کا رنگ ۔۔۔ اک آخری خدنگ کلیسا کہیں جسے

(متاعِ حرم ص ۷۷)

وہ ڈکٹر اپنی سیاست میں سدا بدنام رہتا ہے
غریبوں کا ہو جس میں ہر قدم اقدام تعزیری
ریاکاری پہ مبنی ہے سراسر عہدِ طاقت میں
اگر قوموں میں ہو موجود راہ و رسم تحریری ۔۔۔ ق
کہ عنصر ہائے مبنی ہیں غلام اقوام غاصب کے
ہو کیا اس سے زیادہ پیرِ گردوں کی بے پیری

(متاعِ حرم ص ۷۹)

جمہوریت خام و ملوکیت بدنام ۔۔۔ دولت کی یہ ایجاد ہے زر کی وہ ایجاد[1]

(متاعِ حرم ص ۵۵)

بلند نظری

مرا ہمسفر نہیں تو کہ جدا ہے تیری محفل ۔۔۔ مجھے اہتمام طوفاں تجھے انتظارِ ساحل[2]

(متاعِ حرم ص ۶۵)

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری (بانگ درا)

[2] اس "اہتمام طوفاں" کا درس قرآنی علامہ اقبالؒ کی زبان سے ملاحظہ ہو

میرا مذاق فکر و غم و سوز و درد و داغ　　تیرا مذاق اک ہی آمد بہار کی

(متاعِ حرم ص۵۶)

حُبِّ قوم و وطن کا نظریہ

دلوں میں ڈال سکے قوم و وطن کا ذوق غلط
ہے مکر جذبۂ مروّت کی درس فرمائی[1]

(متاعِ حرم ص۱۹)

سماج کے رسم و رواج پر تنقید

پروانہ

آہ اے پروانہ! تجھ کو کیا خبر کیا ہے سماج
کس طرح ہم پر مسلّط ہیں غلط رسم و رواج
آدمی ذکرِ محبت لب پہ لا سکتا نہیں
جان دے سکتا ہے دردِ دل بتا سکتا نہیں
وارثانِ دیر و کعبہ، وہ بزعمِ خود حکیم
جن کو تھا شایانِ شاں اور اک احساسِ عظیم

(پچھلے صفحے سے)

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(پیامِ مشرق)

[1] علامہ اقبالؒ　　نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات　　(بانگِ درا)

احترامِ فطرتِ انساں سے ہے ان کو مفر
الحذر[1] از خود وضع کردہ طرزِ دیں سے الحذر
جب کبھی اقوام کے اخلاق کو پہنچا گزند
اس کا باعث تھے دلِ انساں پہ بیجا قید و بند
(متاعِ حرم ص ۳۵)

ایک کشتۂ رسوم کیلئے

رسم و رواجِ دہر ہوں عقل و خرد پہ حکمراں
ہے یہ اہانتِ بشر ہم کو جتا گیا ہے تو
برہم و خشمگیں نہ ہو کیوں تیری موت پر سماج
اس کے مذاقِ جہل سے پردہ اٹھا گیا ہے تو
فرد کا انتخابِ زوج تابعِ رسم و رہ ہو جب
ہے وہ زمانہ بے وقار ہم کو جتا گیا ہے تو
(متاعِ حرم ص ۴۱)

وطن کا مستقبل

ہے ضرورت صنفِ نازک جس کی بے پردہ پھرے
یا غلط ہو جس کی رسمِ پردہ داری وہ وطن

---

[1] علامہ اقبالؒ
زمن بر صوفی و ملّا سلامے　　کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفٰی را　(ارمغانِ حجاز)

رہ گزاروں میں ہوں محوِ عشق جس کے نوجواں
جو ہو ذوقِ وجذبِ خودداری سے عاری وہ وطن
معتمد ہوں جس کے اربابِ غرض و سطحِ ارض
مشتبہ ہو جس میں ذوقِ جاں نثاری وہ وطن

(متاعِ حرم صـ۱۴)

فلسفۂ ایماں

ایمانِ محکم قوموں کا معیار ایمانِ ناقص ملکوں کا ادبار[1]
ایماں نبوّت کا درسِ اوّل ایماں خدا کے آئیں کا شہ کار
ایماں ہمارا سازِ تمدّن ایماں ہمارا سامانِ پیکار[2]
مومن کے تابع ساری خدائی[3] مومن خدا کا احکام بردار
ایمان محکم ہوتا ہے اس دم جب ضربِ غم سے ہو روح بیدار
ذکرِ خدا سے تازہ ہو احساس فکرِ خودی پر مائل ہوں افکار

(متاعِ حرم صـ۱۷)

---

[1] علامہ اقبالؒ ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی (بانگِ درا)

[2] علامہ اقبالؒ ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (بانگِ درا)

[3] علامہ اقبالؒ۔ اس کام کمر کب نہیں راکب ہے مسلماں (ضربِ کلیم)

متفرقات

تری ضربِ پا سے جب تک نہ رواں ہو کوئی چشمہ
نہیں درخورِ زمانہ ترا ذوقِ تشنہ کامی

(متاعِ حرم ص۹۶)

تجھے سمجھا دیا کس سوختہ سامانِ حکمت نے
کہ کوئی شعلہ تیری خاک کا حاصل نہیں ہوتا

(متاعِ حرم ص۹۷)

بھولیں نہ مجھ کو تیری وفائیں
مجھ سے زمانہ بھر نے جفا کی[1]

(متاعِ حرم ص۹۴)

اگر ہے سخت کوشی پر بنائے آشیاں میری
محافظ میرے طوفاں ہیں تجلی پاسباں میری
ترا شیوہ تن آسانی مرا شیوہ تن آسانی
وہی مجبوریاں تیری وہی مجبوریاں میری
نزاکت برگِ گل کی سنگِ آہن بدلتا ہے
نہیں ہو جاتی تند گلشن میں فضا میری

(متاعِ حرم ص۹۷)

جو گردشِ ایام سے گھبرائے نہ اے زیب
سمجھی ہے وہی قوم زمانہ کا اشارہ[2]

(متاعِ حرم ص۹۹)

اے بحر کچھ سمجھ کر قطرے کی کر اہانت
ہے رازدار تیری دنیائے بیکراں کا

(متاعِ حرم ص۹۹)

---

[1] عندلیب شادانی:- رات اک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے
دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

[2] علامہ اقبالؒ:- زندگی از دہر و دہر از زندگی است ؛ لاتسبوا الدہر فرمانِ نبی است

رہِ حیات میں مُڑ مُڑ کے نقشِ پا کو نہ دیکھ مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر

(متاعِ حرم صفحہ ۱۰۳)

حرم و دیر ہوئے ترکِ عمل سے رسوا دیکھئے اہلِ عقیدت اسے کیا کہتے ہیں

متاعِ حرم صفحہ ۱۰۷

قطرے قطرے کو بھریں تیرے سبو کش لاچار
ہے یہ کس لئے غیرت کا مقام اے ساقی[1]
مکرمت سے تری ہو جائیں نہ مے کش بد دل
سنگدل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی

(متاعِ حرم صفحہ ۱۱۰)

ترے صحرا و بیاباں تو ہیں آباد تمام مرا حسرت کدۂ قلب ہی آباد نہیں

(متاعِ حرم صفحہ ۱۱۵)

اٹھا ہے محفلِ ہستی سے اعتمادِ وفا کہو کسی سے کہ رسمِ جفا پہ ناز کرے
خدا بھی ہو تو کبھی کوششِ نیاز نہ کر اگر وہ تجھ سے کوئی اعتنا دراز کرے

(متاعِ حرم صفحہ ۱۱۶)

گھبرا کے سرو مہر کی دنیا سے رات دن رویا کئے ہیں یاد کسی مہرباں کو ہم

(متاعِ حرم صفحہ ۱۲۰)

---

[1] علامہ اقبالؒ:- ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے :: بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم :: بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے (بالِ جبریل)
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ :: ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
(بالِ جبریل)

گردشِ چشمِ دوست ہی گردشِ روزگار ہے
درج سمجھ کے شکوۂ گردشِ روزگار کر

حجلۂ عجز سے نکل پردۂ بندگی اٹھا
وقت کا اقتضا ہے یہ تیغ خودی کو آب شکار کر

(متاعِ حرم صفحہ ۱۲۲)

اہلِ وفا کی قدر کر حاصلِ داستاں ہیں یہ
حسن بھی ایک داستاں عشق بھی ایک داستاں

(متاعِ حرم صفحہ ۱۲۸)

رحمت سے تیری ہم جو ملیں ہم کسی کو کیا　　ٹھکرائے ہیں ہم نے تو عالم کسی کو کیا
ہوتی ہے کوئی کہنے کی بات اور کوئی نہیں　　کہئے کسی سے کیوں سببِ غم کسی کو کیا
ہے پاسِ دوستی انہیں کیوں ہیں برا نام ہیں　　محفل ہیں ان کا ہے کوئی محرم کسی کو کیا

(متاعِ حرم صفحہ ۱۲۹)

خرد کے مصرفِ اعلیٰ سے کتنے بے خبر نکلے
کہ بازارِ جہاں سے اہلِ مغرب خوار تر نکلے[1]

فلک کی طرفہ کاری ہے کہ آج اے زیبِ نیا ہیں
جو تھے صیاد وہ خود طائرِ بے بال و پر نکلے[2]

(متاعِ حرم صفحہ ۱۳۰)

---

[1] علامہ اقبال رحؒ: غبارِ رہگذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو :: جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
[2] علامہ اقبال رحؒ:- عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے (بانگِ درا)

بہر ثبات کوشش نام و مقام سے گزر — اصل دوام ہے یہی حدِ دوام سے گزر[1]
زاہد کم نگاہ نے رسم سمجھ لیا تو کیا — قصد قیام اور ہے رسم قیام سے گزر[1]
ہے ترا ذوق احتیاج اہل کرم کا پردہ دار — آ کہ ادائے رمز سے سر در و بام سے گزر
نشۂ مے سے کب ملا درد حیات کو سکوں — فطرت سہل گیر کی کوشش خام سے گزر

(متاع حرم ص ۱۳۳)

ذوق فنا میں ہے نہاں رازِ حیات با شرف — ہے وہ زمانہ با وقار جس کے عوام سر بکف[2]
ذوق طلب کو کر بلند دام عمل فلک پہ ڈال — مہر و مہ و نجوم ہیں بحر حیات کے صدف

متاع حرم ص ۱۳۴

اے کہ مرا مقام عجز تیری نظر میں ہیچ تر — کس کو خبر کہ یہ بھی اک منزل پر ناز ہو

متاع حرم ص ۱۳۶

بتاتے ہیں جسے قشقہ و محراب — بہت معروف ہیں شکلیں ریا کی

(متاع حرم ص ۱۳۵)

مکتبِ ہستی میں اس درسِ قناعت سے حذر
جس سے قوموں کے عزائم میں ہو پیدا اختصار

---

[1] علامہ اقبال رح :- تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر (بال جبریل)

[2] اس زمین میں علامہ اقبال کی وہ غزل ملاحظہ ہو جس کا مطلع یہ ہے ؎
میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف ؛ آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف (بال جبریل)

صبغانِ حق سے کوئی جا کے پوچھے آج ریب
پیشِ باطل کتنا بے موقعہ ہے ان کا انکسار

(متاعِ حرم ص۱۳۹)

ذیل کے شعر متاعِ حرم میں شامل نہیں ہیں۔

خواتین میں ذوقِ علم کی کمیابی

جہل کیا ہے؟ سعیٔ حاصل پر قناعت کا خیال
علم کیا ہے؟ زندگانی میں کمال اندر کمال
صد شبابِ خام ہوں اس پختہ پیری پر نثار
جس کا اندیشہ بیاں کرتے ہیں جوشؔ نامدار[1]
علم کی توسیع سے خائف ہے ہر قومِ غلام
کیونکہ ہے محدود بزمِ دہر میں اس کا قیام

پروانہ

بزمِ ہستی میں جسارت آفریں ہے یہ عمل
دوسرے کی آگ میں پڑ کر جلا جاتا ہے تو
کس قدر وقفِ عبادت ہے ذرا سی زندگی
موت ہنگامِ طوافِ شمع میں پاتا ہے تو
شعلۂ شمعِ فروزاں سے نہیں اتنی تپش
گرمیٔ شوقِ شہادت ہے کہ گھبراتا ہے تو
سرکا بے مایہ را شمعِ فروزاں زندگیست
زیب ما را ایں دلِ بیتاب و سوزاں زندگیست

---

[1] خواتین کے تحصیلِ علم کے ضمن میں جوشؔ ملیح آبادی کا ایک شعر ہے ؎
وقت سے پہلے بلا لیتے ہیں پیری کو علوم ؛ عمر سے آگے نکل جاتے ہیں چہرے بالعموم

زینت

زینت بیگم نام اور زینت تخلص ہے۔ ڈھاکہ کی شاعرہ ہیں طرزِ ادا رواں دواں اور صاف ہے۔ گو کلام میں ابھی پختگی نہیں لیکن اگر برابر لکھتی رہیں تو خوب لکھنے لگیں گی۔

طلوعِ سحر

اُفق پر سپیدی سی چھانے لگی　　مؤذن کی آواز آنے لگی
ستارے بھی سب ماند پڑ گئے　　ضیا سے قمر جھلملانے لگی
گجر دم کلیسا کی گھڑیال بھی　　سحر پانچ کے اب بجانے لگی
سڑک پر کی بتی جلی رات بھر　　پھٹی پو تو وہ ٹمٹمانے لگی
طلوعِ سحر کی نسیمِ سحر　　جگت میں بدھائی بجانے لگی
عروسِ سحر ہو کے آراستہ　　بہار اپنی ہم کو دکھانے لگی
نسیمِ سحر جو چلی جھوم کر　　کلی شاخ پر مسکرانے لگی
چمن کا چمن بن گیا لالہ زار　　سمن باغ میں کھلکھلانے لگی
صبا اپنی مستانہ رفتار سے　　چمن در چمن گل کھلانے لگی
فضائے چمن بن کے باغِ ارم　　شگفتہ دلوں کو لبھانے لگی
سحر خیز نازک مزاجوں کے دل　　نسیمِ سحر گدگدانے لگی
مکانوں میں دھندلی سی ایک روشنی　　دریچوں سے چھن چھن کے آنے لگی
گلوں کی پرستار بلبل غریب　　محبت کا نغمہ سنانے لگی
وفورِ ترنم میں سرشار ہو　　درختوں پہ شاما بھی گانے لگی

برہمن بھجن پاٹ کرنے لگا — صدا اس کی بھگتوں کو بھانے لگی
پجارن بھی پھولوں کی ڈالی لیے — بصد ناز مندر کو جانے لگی
سجا کر عقیدت سے پھولوں کی بھینٹ — وہ دیوی کو اپنی چڑھانے لگی
دبستاں کی لڑکی بھی کر کے وضو — معلّم کو قرآں سنانے لگی

سُریلی صداؤں سے زینت بھی اب
عزیزوں کو اپنے جگانے لگی

(س)

ساجدہ شاہجہانپوری

ساجدہ بیگم نام ہے اور ساجدہ تخلّص۔ آپ منشی فاضل ہیں۔ حضرت دانش شاہجہانپوری کی صاحبزادی ہیں اور "بنتِ دانش" کے نام سے مشہور ہیں۔ عصمت کی مخصوص شاعرات سے ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ کلام میں سنجیدگی، متانت اور درد و اثر موجود ہے۔

روح علّامہ راشد الخیری سے

شکستِ عقل ہیں دامانِ عفّت و ناموس
زنانِ قوم کی حالت ہے قابلِ افسوس

وہ بڑھ رہی ہیں معاصی کی سمت روزانہ
ہیں اس قدر مدد گردگی سے مایوس

نماز و روزہ تمسخر، زکوٰۃ و حج ہیں مذاق

اصول مذہب اسلام طرز و قبانوس
ہراس شوہر و فرماں پذیری شوہر
نگاہ شوق میں ہے کار ہائے کیانی خروس
فضا میں ناز و کرشمے ہیں دیدنی تو یہ
رہا قفس سے ہوا آج طائر محبوس
ضیائے علم بدن سے نہ بڑھ سکیں آگے
وہ کیا سنیں گی صدائے ضمیر نامحسوس
گو نام علم و ترقی پہ جان دیتے ہیں
سمجھ رہی ہوں مگر ہیں ترقی معکوس
یہ وقت ہے کہ کوئی دردِ قوم کا مارا
عروج زن کو کرے راہ عقل سے مانوس
ہے یاد آپ کی ایسے میں راشد الخیری
مثالِ خضر یہ نا آشنائے راہِ نفوس
نظیر آپ کا اب تک ہے کیا پس پردہ
زنانِ قوم بجاتی ہیں کفر کا ناقوس

علامہ راشد الخیری مرحوم (وشاعرہ)

اے زنِ مسلم نہ ہونا مادیت کا شکار　　روح کا دامن نہ چھوٹے تجھ سے تا حدِ مزار
میری تصنیفات نے بخشی ہے تجھکو اک نظر　　ہو سکے تو طبقۂ نسواں کی الجھن دور کر
گریہ وقتی نہ ثابت ہو مری تصویرِ غم　　اس لیے درکار ہے مجھ کو ترا زورِ قلم
میں نے اپنے وقت میں سر تیرا اونچا کر دیا　　قوم کو شرمندۂ حرکات بیجا کر دیا
میں نے اس انداز سے چٹکی رگِ ملت میں لی　　تیرے حق کے سامنے سر کو جھکاتے ہی بنی
ہے میرے سوزِ دل ہو کاش میرا نقش پا　　مثل میرے اشکباری میں تجھے آئے مزا
"اے تسلی بخشِ جاں والے سکوں افزائے دل　　گو ہوائے مادیت چل رہی ہے متصل
گو ہوئی مفقود یکسر روح میں ڈوبی نظر　　طبقۂ نسواں کے دامن میں ہے علم بے اثر
پھر بھی ہم میں جلوہ گر ہیں چند اہلِ قلم　　جن پہ نازاں صنفِ ملت کی دھاک کا زیر و بم
ڈاکٹر اختر۔ جمیلہ۔ نذرِ سجاد۔ آمنا　　رابعہ پنہاں، صفیہ، نجمہ و حورہ حیا
آپ کا پودا بڑھا اور بڑھ کے بار آور ہوا　　شاہد ہے مثل ہیں اوراقِ "عصمت" برملا
سر جو اونچا ہو چکا نیچا وہ ہو سکتا نہیں　　نقش پائے محسنِ اعظم کو کھو سکتا نہیں
آپ کی تحریر ہے جب تک فروغِ چشمِ دل　　کر نہیں سکتی ہمیں بادِ مخالف مضمحل"

قطعات

(۱)

زندگی ٹیس کبھی بھی رائگاں جاتی نہیں
آہ کا ہونا اثر ہے قلب پر وہ ہو بہو

جس طرح آذر صفت اک بُت تراش ہوشیار
کاٹ کر پتھر بناتا ہے بتانِ خوبرو

(۲)

ایک طوفانی ہوا ہے نغمۂ راہ فنا
شورشِ دل میں اس طرح تیزی سے بھر تو ہے اثر
آم کے باغوں میں آندھی کے اثر سے جس طرح
اپنا دامن گاؤں کے لڑکے کریں دم بھر میں پُر

(۳)

رات میں مہتاب و انجم دن میں خورشید منیر
دیکھتے حسرت سے ہیں رنگِ دلِ حسرت اثر
دل یہ کہتا ہے ذرا صبر و تحمل ساجدہ
وہ تیرے پیغام کی خاطر ہیں سرگرمِ سفر

(۴)

حسنِ اصلی معتبر اہلِ نظر کی رائے میں
پھول سے چہرہ پہ پوڈر صنعتِ قدرت سے جنگ
دیدنی ہے خواہرِ من! سحرِ زینت کا اثر
روح بھی اُف ہو گئی ہے خوگرِ قیدِ فرنگ

(۵)

جس سکونِ دردسے دنیا سے دل ہے ہم کنار
ڈھونڈھنا اس کا عبث ہے، دامنِ تدبیر میں
خامۂ قدرت چلا اور ایک سوہی چل گیا
یہ مشیّت نے لکھی دولت مری تقدیر میں

ساجدہ

ساجدہ خاتون نام اور ساجدہ تخلص ہے۔ آپ سمن پور ضلع غازیپور کی شاعرہ ہیں آپ کا کلام اکثر خاتونِ مشرق میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ آپ اردو کی ایک خوشگو شاعرہ ہیں۔ کلام میں جوش و اثر اور جذبات کی شدّت موجود ہے۔ آپ کو طبقۂ نسواں کی مظلومی کا احساس ہے۔ سماج کے غلط رسم و رواج اور مذہب کے نام نہاد علمبرداروں پر آپ کی نظریں اکثر ناقدانہ پڑتی ہیں۔

مرغِ مذبوح کی آتش فشانی

ایک مرغِ نیم جاں نے مولوی جی سے کہا
سچ بتا اے پارسا اے سنگدل مرد خدا
کائناتِ رحم پر کیوں گر پڑی برقِ جلال
کس لئے اک بے زباں کو کر رہا ہے تو حلال
کیوں تری تحریکِ الفت کا علم خم ہو گیا
کیوں نظامِ مہر و شفقت آج برہم ہو گیا
کیوں تری رگ رگ میں بیدردی کا دورہ ہے ہوا
تیرے وعظ و پند کی کیوں لٹ رہی ہے آبرو
انجمن میں تیری گرما گرم تقریروں کا رنگ
ذرّہ ذرّہ پر جما دیتا ہے تاثیروں کا رنگ
تو زمانہ کو دیا کرتا ہے درسِ عاشقی
نام تیرا مولوی ہے کام تیرا رہبری

کیا محبت کرنیوالوں کا یہی انداز ہے / کس قدر مکر و دغا سے پُر تری آواز ہے
اک طرف دیتا ہے تو انسان کو نیکی کا سبق / اک طرف سر جھوٹ کا خود الٹتا ہے ورق
اک طرف کہتا ہے تو ایذا رسانی ہے بری / اک طرف میری رگِ گردن پہ پھیری ہے چھری
کیا تجھے معلوم ہے ہم زندگی رکھتے نہیں / کیا تمناؤں کے گہوارے ہیں ہم پلتے نہیں
کیا ہمارے سینۂ معصوم میں حسرت نہیں / کیا ہماری مختصر سی جان کی قیمت نہیں
ناتواں ہیں بے زباں ہیں اس لئے خاموش ہیں / درحقیقت آدمی سے بڑھ کے ہم پُرجوش ہیں
آدمی تو ہو گئے ہیں باغیِ دینِ خدا / ہے مگر اب تک ہماری جنس میں ارزاں وفا
صبح کی کچی سپیدی میں اذاں دیتا ہے کون / میٹھی میٹھی نیند کے میٹھے مزے لیتا ہے کون
اشرف المخلوق ہیں اب آدمی بس نام کے / مے نہ ہو جس جام میں وہ جام ہیں کس کام کے
بانسری ہیں لے نہ ہو تو بانسری بیکار ہے / دھار جس میں کچھ نہیں وہ کب بھلا تلوار ہے
ہوش میں آ اے ستم ایجاد بانیٔ جفا / منفعل تیری ہی کو ہے بزمِ عالم کی فضا
برقِ آفت لقمۂ تر پر ترے گرنے کو ہے / پھر ہوائے دہر کا رخ سر بسر پھرنے کو ہے
ظلم کا دریا سدا اک حال میں بہتا نہیں / ایک مرکز پر زمانہ کا قدم رہتا نہیں

ہے بظاہر گو فقط اک مرغ کی یہ داستاں
اس میں پوشیدہ ہے لیکن عبرتوں کا اک جہاں

ل موصوفہ کی یہ نظم ان کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"شاعر یا شاعرہ کا مذہب اس کا جذبۂ بے اختیار ہوتا ہے اس کی آزادی کسی دوسرے مذہب کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ نظم بھی جذباتی حیثیت سے لکھی گئی ہے اور اسی حیثیت سے پڑھی جائے۔ ہاں غلطیوں پر نگاہ عفو کی ضرورت ہے"

ستارہ حیدرآبادی

ستارہ بیگم نام اور ستارہ تخلص ہے۔ آپ احمد مدنی صاحب کی لڑکی دختر ہیں جو مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد کے ایک قابل مدرس تھے۔ آپ ۱۹۰۳ء ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ گھر پر والدین اور نانا سے ابتدائی تعلیم کے علاوہ فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد محبوبیہ گرلز اسکول میں شریک ہوئیں۔ افسانہ نگاری وغیرہ میں مختلف انعام حاصل کئے ۱۹۱۶ء ۱۳۲۵ھ میں محبوبیہ گرلز اسکول میں فارسی اور عربی کی معلمہ کی جگہ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۳۲ء ۱۳۴۲ھ میں بوجہ خرابیٔ صحت وظیفہ حاصل کر لیا۔

"عالمِ سروش" اور "اساس القواعد" آپ کی دو مستقل تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا۔ رسالہ افادہ میں آپ کے اکثر مضمون شایع ہوئے۔ انسدادِ گداگری پر آپ نے ایک رسالہ (پمفلٹ) لکھا جو پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ طرزِ بیان سادہ و دلکش ہے۔ کلام میں کیف و اثر ہے۔

واں نزاکت تھی یاں تک آ نہ سکے — یاں نقاہت تھی یہ کہ جا نہ سکے
جوشِ گریہ نے کر دیا خاموش — قصۂ غم انھیں سنا نہ سکے
میرے دل میں سما گئے کیونکر — دونوں عالم میں جب سما نہ سکے
کی دمِ نزع اس نے پرسشِ حال — لب پہ جنبش ہوئی بتا نہ سکے[1]

[1] مومن ؎ کیا مرنے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا ۔ وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

یوں سما جاؤ میری نظروں میں　　پھر کوئی دوسرا سما نہ سکے

سائرہ

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے زمانہ حال کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام میں درد و اثر اور سوز و گداز بہت ہے عشقیہ رنگ میں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ آپ کے یہاں نہایت شدید اور حسرت آمیز جذبات کی ترجمانی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

"تحیّر منفعل"

ستم ہے شرطِ آئینِ محبت میں نہ سمجھی تھی
ارے ان حسن والوں کی شریعت میں نہ سمجھی تھی
مجھے کھوئے گی اک دن شامِ فرقت میں نہ سمجھی تھی
مجھے دنیا سے کھوئے گی محبت میں نہ سمجھی تھی
تمھاری سادگی تصویرِ خاموشِ مسرت تھی
جوانی آئے گی بن کر قیامت میں نہ سمجھی تھی
پشیماں ہو رہی ہوں شکوہ جور و جفا کر کے
کوئی ہوگا پشیمان شکایت میں نہ سمجھی تھی
اسے جانے نہ دیتی جذب کر کے دل میں رکھ لیتی
بہارِ باغ کا رنگِ طبیعت میں نہ سمجھی تھی
تیری گلیوں میں مٹ کر موت کے دن کاٹ دیتی ہیں

تیری کلیوں سے اٹھے گی قیامت یہ نہ سمجھی تھی

سمجھ رکھا تھا میں نے اختیاری ولولہ دل کا
تمھارے ہاتھ میں ہے میری قسمت یہ نہ سمجھی تھی

شبِ خلوت ستاروں نے بہت لوٹے ترے جلوے
ترے حسنِ شب آرا کی حقیقت یہ نہ سمجھی تھی

محبت تھی نشاطِ زندگانی وہ بھی کیا دن تھے
کہ آفت تم نہ سمجھے تھے مصیبت یہ نہ سمجھی تھی

نظر ملتے ہی کچھ محجوب ہے وہ بے وفا مجھ سے
نگاہوں سے بھی ہوتی ہے شکایت یہ نہ سمجھی تھی

کسی کو خواب میں بے چین کر ڈالا خیالوں نے
خیالوں میں بھی ہوتی ہے یہ قوت یہ نہ سمجھی تھی

گنہ کیوں سر پہ لیتی ساغرِ حسن تماشہ کا
مجھے یوں مست کر دے گی محبت یہ نہ سمجھی تھی

سردار حیدرآبادی

منظور فاطمہ بیگم نام اور سردار تخلص ہے۔ مولوی مشتاق حسین مرحوم المخاطب نواب وقار الملک کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی سید محبوب علی صاحب ناظم لاسلکی حیدرآباد کی رفیق حیات ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔ اردو

فارسی اور عربی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُردو میں طبع آزمائی کرتی ہیں حضرت جلیل سے آپ کو تلمذ حاصل ہے۔ رسالہ آئینہ ادب میں آپ کا کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ کوئی دیوان یا کلیات شائع نہیں ہوا مگر کلام کا کافی ذخیرہ ہے۔ تصوف کا آپ کو خاص مذاق ہے، زبان میں صفائی اور پاکیزگی ہے۔ اسلوب بیان سادہ ہے نمونہ کلام یہ ہے:-

ہو آس جس کو رحمت پروردگار کی
کیا فکر اس کو پرسشِ روزِ شمار کی

آنکھوں کو ہے جو کوچہ احمد کی آرزو
ہر اشک میں چمک ہے دُرِ آبدار کی

سب سے پہلے ہے ہنر دار کے واسطے
چاہیئے انساں کرے کوشش ہنر کے واسطے

اللہ اللہ حضرت صدیق کی داد و دہش
ایک کپڑا بھی نہ رکھا اپنے گھر کے واسطے

سن لیا سرورؐ کا اسلی کو جس نے ایک بار
ہوگیا قائل خدا کا عمر بھر کے واسطے

سروپ رانی

محترمہ سروپ رانی دورِ حاضر کی شاعرہ ہیں آپ اندر جیت شرما کی طرح ہندی آمیز اُردو میں لکھتی ہیں اور ہندی شاعری کی روایات کی متبع ہیں، کلام میں بڑا رس، حلاوت، اور شیرینی ہے، اسلوب بیان دلکش اور پاکیزہ ہے، جذباتی اعتبار سے آپ کا کلام بلند اور پُرکیف ہے، نمونہ یہ ہے:-

نس دن تیرے نام کی مالا
ہے جیون کا جاپ

پاپی ہوں میں پاپی بالم　　پریم ہے میرا پاپ
تو بھی پاپی ہو جا

پریت کی الٹی ریت ہے پیارے　　ہارنے میں ہے جیت
ہار دے جیون ہار دے تن من　　چاہے گر تو میت
بالکل نردھن ہو جا

پاگل مجھ کو کہتی ہے دنیا　　کیا جانیں یہ لوگ
یارب ان کو بھی ہو جائے　　پریم کا میٹھا روگ
پریم روگی ہو جا

تجھ سے بس اک عرض ہے ساجن　　ہو جا میرا ہو جا
یا تو مجھ کو اپنا کر لے　　یا خود مجھ میں کھو جا
بس تو میرا ہو جا

سعیدہ (شوکت دولہن)

سعیدہ خاتون نام ہے تخلص کبھی سعیدہ کرتی ہیں اور کبھی شوکت دولہن للت پور وطن ہے۔ والد کا نام حکیم مولوی سجاد حسین ہے۔ شادی کے زمانہ تک اپنے والد کے ہمراہ مین پوری میں رہیں۔ شادی محمد عمر صاحب شوکت تھانوی سے ہوئی جو اردو کے ایک مشہور مزاح نگار اور اچھے شاعر ہیں۔ اسی رعایت سے شوکت دولہن تخلص کرتی ہیں۔ شادی کے بعد سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ اصلاح سخن اپنے شوہر جناب شوکت

تھانوی سے لیتی ہیں جو شاعری میں مولوی عبدالباری آسی کے شاگرد ہیں۔ غزل گو شاعرہ ہیں۔ اور قدیم و جدید دونوں رنگوں میں لکھتی ہیں آپ کے یہاں وہ شاعری بھی ہے جو صرف شاعرانہ روایات و تصورات اور اجتماع الفاظ پر مشتمل ہے اور وہ شاعری بھی ہے جس میں نظر کی وسعت، جذبات کا پھیلاؤ، اور استقصا بھی ہے۔ آپ کی ایک خاص خصوصیت ندرت بیان اور اکثر لطیف تشبیہات کا استعمال ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

مرے نالوں سے شانِ ضبطِ غم مجروح ہوتی ہے
نہیں تو میں پلٹ دیتی نظامِ دہر دم بھر میں
شبِ فرقت کی بیتابی سے میں واقف نہیں لیکن
کسی نے جیسے کانٹے رکھ دیے ہیں آج بستر میں
تخیل ہے کہ وحشت ہے سمجھ ہی میں نہیں آتا
خدا کیوں کر نظر آتا ہے ہر خاموش منظر میں
نہیں معلوم اس کے بعد کتنے انقلاب آئے
جنوں کے ساتھ ایک صحرا بھی آیا تھا مرے گھر میں

دل بہلنے کا ہمارے خوب ساماں ہو گیا
بیٹھے بیٹھے بیٹھائے گھر بیاباں ہو گیا
اللہ اللہ آج وہ آئے ہیں قصدِ قبر ہیں
ہم غریبوں کی بھی تربت پر چراغاں ہو گیا

دم نہ نکلا انتظارِ یار میں　　نیند کیسی دیدۂ بیدار میں
نبض ناحق دیکھتے ہو بار بار　　جان بھی باقی ہے جسمِ زار میں
کھنچ گئی مقتل میں مجھکو دیکھکر　　آ گئی نخوت تری تلوار میں
اے سعیدہ گریۂ شبنم پہ پھول
تا سحر ہنستے رہے گلزار میں

سکینہ

سکینہ محو و نام اور سکینہ تخلص ہے۔ دَورِ حاضر کی ایک خوش مذاق شاعرہ ہیں، کلام میں سوز و گداز ہے، طرزِ ادا صاف اور پاکیزہ ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:-

ہر قدم پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
کہہ نہیں سکتی کہاں مجھ کو لئے جاتا ہے دل
بے کسی ہائے محبت کی سنا کر داستاں
دل کو تڑپاتی ہوں میں اور مجھ کو تڑپاتا ہے دل
ایک وہ دن تھے کہ کھو جاتے تھے ذوقِ عشق میں
اب محبت کے تصوّر سے بھی گھبراتا ہے دل

سلمیٰ

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے۔ لاہور کی شاعرہ ہیں، تخیّل

بہت بلند اور نظر وسیع پائی ہے۔ آپ کے قطعات بہت خوب ہوتے ہیں۔ نمونہ یہ ہے :-

قطعات

یوں ہی آسان کٹ نہیں سکتی　　زندگانی کا سلسلہ ہے دراز
جس کو کہتے ہیں لوگ شادی و غم　　ہیں اسی راہ کے نشیب فراز

فکرِ انساں کی ہر بلندی دیکھ　　کہیں رکتی نہیں بشر کی نگاہ
آسماں پر یہ کہکشاں کا نشاں　　ہے اسی کاروان کی گردِ راہ

سلمیٰ ۔ حیدرآبادی

جمال النساء بیگم نام اور سلمیٰ تخلص ہے۔ آپ مولانا سید الدین مرحوم استاذ فلسفہ و کلام مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی شادی حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت امجد سے ہوئی تھی عالمِ شباب میں ۱۹۲۷ء میں انتقال فرمایا۔ اور درگاہ شاہ خاموش حیدرآباد میں دفن ہوئیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ نسواں نامپلی میں پائی تھی اور پھر اپنے والد سے فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ آپ ایک اچھی انشا پرداز اور نثر نگار بھی تھیں شعر گوئی کا شوق تھا۔ توحید۔ نعت اور تصوف آپ کے خاص موضوع تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

نہ ہو کوئی ہمراہ یہی ہمرہی ہے
رہوں بے خبر میں یہی آگہی ہے

کبھی ہے قیام اور کبھی وقفِ سجدہ
کبھی سرکشی ہے کبھی عاجزی ہے

کبھی ٹیس دل میں کبھی لب پہ آہیں
مری جان کو اک نہ اک دل لگی ہے

نہ میری سنیں گے نہ بولیں گے مجھ سے
عجب بے کسی ہے عجب خامشی ہے

نہ معلوم جب تجھ کو دیکھوں تو کیا ہو
ترے نام ہی سے مجھے بے خودی ہے

ہے سلمیٰ دل و جاں سے امجد کی لونڈی
اور امجد غلام غلامِ نبیؐ ہے

وہ یوسفِ گم گشتہ کس جا پہ نہاں ہوگا
کس پہلو میں پوشیدہ وہ راحتِ جاں ہوگا

یہ عالمِ کثرت کب توحید نشاں ہوگا
اس جسم کی مسجد میں کب شوقِ اذاں ہوگا

میرا عربی آقا، اللہ کہاں ہوگا

دیکھوں اسے گلشن میں ڈھونڈوں اسے صحرا میں
ہے عالمِ بالا میں یا عرشِ معلّیٰ میں

دل میں ہے مقام اس کا یا دیدۂ بینا میں
وہ کعبہ میں رہتا ہے یا گلشنِ طیبہ میں

میرا عربی آقا، اللہ کہاں ہوگا

سیدہ خیرآبادی۔

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے۔ آپ خان بہادر مضطر خیرآبادی کی صاحبزادی اور حبیب اللہ خاں صاحب کی شریکِ زندگی ہیں۔ چونکہ آپ کے والد صاحب خود شاعر تھے اس لئے ابتدا ہی سے آپ کو بھی ایک

شاعرانہ ماحول مل گیا تھا۔[1] رفتہ رفتہ آپ کا شوق ترقی کرتا رہا۔ اور اب آپ اردو کی ایک مشہور اور ممتاز شاعرہ ہیں، آپ کا کلام زیادہ تر عصمت میں شائع ہوتا ہے۔

آپ قوم کی زبوں حالی اور خستگی سے بہت متاثر ہوئی ہیں، اسی لئے آپ کے کلام میں اصلاحی، قومی اور ملی رنگ جھلکتا ہے، آپ عورتوں اور مردوں کی بے حسی اور خاموشی کو توڑ کر ان میں ایک عزم اور جذبۂ عمل پیدا کر دینا چاہتی ہیں۔ آپ کے خیالات پر اقبال کا بہت اثر پڑا ہے گو طرزِ ادا میں یہ اثر اس قدر نمایاں نظر نہیں آتا۔

آپ ایک تعلیم یافتہ، پردہ نشیں اور مذہبی خاتون ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

مالکِ کون و مکاں آسائشِ تقدیر دے — التجائے عجز کو سرمایۂ توقیر دے
زندگی کو کثرتِ جد و جہد درکار ہے — اس لئے فکرِ عمل کو صورتِ تدبیر دے
ایک عالم کو ہلا دیں طاقتِ گفتار سے — وہ کمالِ نطق دے وہ شوکتِ تقریر دے
شاہ راہِ زیست میں اسلاف کے پیرو ہیں — پھر وہی جذبِ عمل شایانِ صد تشہیر دے
تابکے یہ صورتِ تخریبِ ملت تابکے — فکرِ مسلم کو کمالِ حسرتِ تعمیر دے
پھر امیدوں کو شعاعِ کامرانی کر عطا — قسمتِ تاریک کو ہنگامۂ تنویر دے

[1] علامہ اقبالؒ: بھٹکے ہوئے راہی کو پھر سوئے حرم لے چل
اس دشت کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے (بانگ درا)

پھر حدیثِ دل سے کر جوشِ عقیدت آشکار پھر زبانِ مدعا کو نعرۂ تکبیر دے

پھر تمنا کو شریکِ ہمتِ مردانہ کر پھر تہوّر کو کمالِ جرأتِ شمشیر دے

التجائے سیّدہ سُن لے برائے مصطفٰے

قومِ مسلم کو بہارِ عالمِ تقدیر دے

مخدراتِ گروہِ مسلم ہماری حالت ہی کیا رہی ہے

یہ غفلتِ بے پناہ توبہ کہ قومِ مسلم پہ چھا رہی ہے

معاشرت کے طریق بھولے تمدنِ خوش سلیق بھولے

تمیزِ قوم و فریق بھولے اُسی کی تہذیب کھا رہی ہے

وہ طرزِ اخلاقِ احمدی بھی، وہ رسمِ آدابِ ہاشمی بھی

وہ شان ہی ہم سے مٹ گئی ہے ہماری ملت بتا رہی ہے

وہ جنگِ موتہ، وہ جنگِ خیبر، وہ حربِ خالدؓ، وہ ضربِ حیدرؓ

وہ تیغِ مسلم کی شانِ جوہر کہ شانِ مسلم بتا رہی ہے

مگر وہ حالت کہاں ہے باقی، وہ جاہ و صولت کہاں ہے باقی

وہ تیغِ ہمت کہاں ہے باقی کہ تاب و طاقت ہی کیا رہی ہے

وہ عزم باقی نہ رزم باقی، نہ شوکت و شانِ بزم باقی

ہماری ہر بات مٹ چکی ہے کہ ہم کو قسمت مٹا رہی ہے

خراب حالت ہوئی یہاں تک تغافلِ بے محل کہاں تک

کہ شاہراہِ عمل پہ دنیا قدم برابر اُٹھا رہی ہے

خدایا یہ دن بھی گذار دیگا، وہ ستیدہ پھر قرار دیگا
ہماری حالت سنوار دیگا، کہ کس کی بگڑی سدا رہی ہے

ش

شبنم

طاہرہ خاتون نام اور شبنم تخلص ہے۔ دورِ حاضرہ کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ اکثر رسالوں میں کلام چھپتا رہتا ہے۔ انداز دل کش اور کلام صاف اور پاکیزہ ہے۔

تاثیر تجھے جذبۂ دل کی ہے دکھانی — اقرارِ محبت کریں وہ اپنی زبانی
دلچسپ ہیں کس درجہ یہ قدرت کے مناظر — وہ صبح کی نیرنگیاں وہ شام سہانی
کیا جانیے خیال آگیا کس بات کا ہم کو — یہ وہ کسے جو کہتی نہیں اشکوں کی روانی
جذبات کا ہنگامہ ہے برپا مرے دل میں — کیوں آج تلاطم میں ہے یہ بحرِ معانی
گھبرائیے گا ہمدم مرے افسانۂ غم سے — دل جس سے بہلتا ہے نہیں یہ وہ کہانی

پھرتی ہیں مری آنکھوں میں ہر وقت وہ آنکھیں
شبنم مجھے مشکل ہوئی جاں اپنی بچانی

---

[1] دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے :: بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

ہر عیش و طرب کی محفل میں دل ہے کہ امنڈنے لگتا ہے
کیا جانیے کیوں از خود آنکھیں ہو جاتی ہیں پُرنم کیا کہیے
{عبدالحمید صاحب حمید لکھنوی}

جو عقل سے بالا ہے وہ کمال تیرا　　　جس پر نظر نہ ٹھہرے وہ ہے جمال تیرا
قیدِ حیات میں تو کرتا ہے فکرِ راحت　　　دیوانے ہنس پڑیں گے سن کر خیال تیرا[1]
ظلمت دوئی کی میری نظروں سے دور ہو کر　　　پھر کچھ نظر نہ آئے ہاں بس جمال تیرا
گر بادۂ فنا کی تلچھٹ بھی مجھ کو مل جائے　　　اے خضر میں نہ چکھوں آبِ زلال تیرا

شبنم تو یہ بشارت اب قوم کو سنا دے
ہوگا یہ بدر بڑھ کر اک دن ہلال تیرا

شکیل

شکیلہ خاتون نام اور شکیل تخلص ہے۔ دورِ حاضر کی ایک غزل گو شاعرہ ہیں۔ رنگ صاف ہے، نمونہ یہ ہے، یہ وہ غزل ہے جو محترمہ نے لکھنؤ کے ایک زنانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی:—

دلِ ناداں تجھے آخر ہوا کیا　　　کسی کی یاد میں گم ہو گیا کیا
برا کوئی کہے لیکن نہ مانو　　　بھلا سمجھو برے کا ماننا کیا
مجھے مقصود ہے تیری پرستش　　　مرے جینے کا ورنہ مدعا کیا
حیاتِ جاوداں ہے بعدِ مرگ　　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

[1] غالب ؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شمس

صفیہ بانو نام اور شمس تخلص ہے قریشی نسبت خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں آپ دورِ حاضر کی ایک خوش فکر نظم گو شاعرہ ہیں آپ کی نظمیں تفریح طبع کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ لوگوں کو زندگی کے حقائق کی طرف دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ اکثر کلام زنانہ رسالوں میں چھپتا رہتا ہے نمونہ یہ ہے:۔

دنیا کی کہانی زہرہ کی زبانی

جمی تھی شب کی محفل رقص میں سب ہی ستارے تھے
لبوں پر تھا تبسم شوخ آنکھوں میں اشارے تھے
اُدھر وہ بدرِ کامل یعنی دولھا بزمِ انجم کا
خوشی سے مسکراتا تھا جو بھرتے سب طرارے تھے
یکایک اک طرف سے ایک نورانی غبار اٹھا
نظر اس سمت جو اٹھی پڑا چہرہ وہیں چھینکا
لگے دھیمے سُروں میں سب کے سب سرگوشیاں کرنے
نہ جانے کیا خبر لائی سنو شہزادی زہرا
یہ شہزادی نہیں ہے زاہدہ معلوم ہوتی ہے
یا پھر کوئی حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے
کسی کی رائے تھی کافرادا معلوم ہوتی ہے
قمر کہتا تھا دیکھو غم زدہ معلوم ہوتی ہے
سُنیں زہرہ نے یہ سرگوشیاں تو ہمکلامی کی

قسم کھاتی ہوں اے تارو میں تم سب کی جوانی کی
ہماری زندگی ہے چار دن کی بھولنا کیسا
ابھی اُبھرے ابھی ڈوبے بسر یوں زندگانی کی
سُنی میں نے کہانی اک بہت دلدوز ہے پیارو
مرے دل سے نکلتی آہ آتش سوز ہے پیارو
ذرا اپنی نظر ڈالو زمیں کے بسنے والوں پر
کہ ہر انساں کے دل میں خطرۂ امروز ہے پیارو
تڑپتی بجلیوں نے سیکڑوں خرمن جلا ڈالے
کہیں تقدیر نے پھولے پھلے گلشن اُٹھا ڈالے
فلک کے گھاٹ اُترتے آہ وہ کبر و جواں دیکھے
فلک کو چیر جاتے آہ ہیں بیواؤں کے نالے
کہیں خونی درندے جنگ میں مصروف ہیں باہم
کہیں ہے آنکھیں ہیں پر نم اور کہیں ہے زندگی پر غم
نہیں یہ زخم ہے ایسا جو ہو منت کش مرہم
ابھی ٹوٹا ابھی ٹوٹا ہے ساز زندگی مدھم
اُٹھائے ننھے ننھے ہاتھ ہیں فریاد کرتے ہیں
وہ لاوارث یتیم اپنے خدا کو یاد کرتے ہیں
دل گیتی لرزتا ہے یہ منظر دیکھ کر جس دم
زبانِ حال سے یہ شکوہ بیداد کرتے ہیں

وہ دیکھو اُٹھ رہے ہیں ہر طرف سے ظلم کے بادل
ہزاروں دل ہیں زخمی اور کروڑوں جسم ہیں گھائل
کہاں سہنے کی طاقت اب ہیں آنسو خشک آنکھوں کے
نہیں ہوتا مگر چرخِ ستمگر رحم پر مائل
وہ دنیا جو کبھی نعم البدل تھی باغِ جنت کی
جہاں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں جہاں جنت رہا ہی راتھی
وہاں انساں نے اب خون کی ندیاں بہا ڈالیں
گنوادی ہائے اپنے ہاتھ سے تفویض قدرت کی
ربابِ زندگی سے غم کی لہریں پھوٹتی دیکھیں!
شہابِ زندگی سے خوں کی بوندیں چھوٹتی دیکھیں
کہیں نو خیز کلیاں مست گلچیں نے مسل ڈالیں
کہیں نازک دلوں کی اُف امیدیں ٹوٹتی دیکھیں

شمیم[1]

محترمہ انوار فاطمہ (لکھنوی) پروفیسر کراسٹھ ویٹ گرلس کالج الٰہ آباد

---

[1] محترمہ کے مستند حالات اور ان کے علمی و ادبی ذوق کا مفصل بیان "تذکرۂ شمیم" میں محفوظ ہے، یہ کتاب جو اُردو ادب میں جذبات آمیز سادہ نگاری کا ایک شاہکار ہے، آپ کی وفات کے بعد محترم سعید رضوی صاحب لکھنوی نے مرتب کی ہے۔ جو صاحب محترمہ کے حالات اور ان کی علمی کاوشوں کا مطالعہ

محترمہ انوار فاطمہ تبسم لکھنؤ کے ایک شریف اور قدیم خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ آپ کے نانا سید بخشش نبی صاحب ایک بڑے تاجر تھے۔ آپ کے دادا خدا بخش صاحب اپنی دریا دلی، وضع داری اور غربا پروری کے لئے مشہور تھے۔ آپ کے والد عبدالرشید عرف اللہ بخش صاحب عربی و فارسی کے عالم تھے اور عرصہ تک محکمہ پولیس میں انسپکٹری کی خدمات انجام دیتے رہے۔

ابھی آپ بچی ہی تھیں کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آبائی جائداد سے پرورش ہوئی۔ اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور تھوڑی ہی مدت میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ نو۔ دس سال کی عمر ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہو گیا تھا چنانچہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے مختلف اقسام کے کھانوں کی تراکیب پر چالیس بیالیس صفحہ کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو اب تک بصورت مسودہ موجود ہے۔

آپ کی شاعری کی ابتدا زندگی کی چودھویں یا پندرھویں منزل سے ہوتی ہے۔ پہلی غزل جو آپ نے لکھی اس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔ اس عمر میں جب نوجوان قلب و نظر نشاط زندگی کے طالب اور عشرت امروز

(پچھلے صفحے سے) تفصیل سے کرنا چاہیں ان کو یہ کتاب دیکھنا چاہئے۔ دنیا کو اس کتاب سے سبق لینا چاہئے کہ منہ بولے بہن بھائیوں میں بھی اتنی محبت و مودت ممکن ہے۔

کے قائل ہوتے ہیں محترمہ کے دماغ پر بے ثباتیٔ دنیا کا یہ اثر تعجب خیز ہے

ہنس رہے ہیں گل کہ رنگِ گلستاں کچھ بھی نہیں
شمع گریاں ہے کہ یہ بزمِ جہاں کچھ بھی نہیں
ہیں کہاں فرہاد و شیریں لیلیٰ و مجنوں کہاں
رہ گیا ان کا فسانہ اور نشاں کچھ بھی نہیں
صاف دیتی ہے اذانِ پنج وقتہ یہ خبر!
ہے فقط اللہ ہی اللہ اور یہاں کچھ بھی نہیں
دیکھ کر دنیائے فانی دل یہ کہتا ہے نسیم
عارضِ رنگینِ گل باغِ جہاں کچھ بھی نہیں

اسی زمانہ کے کچھ اور اشعار یہ ہیں:—

نہیں معلوم کیا حالت گزرتی جو تم سنتے مرے دل کی کہانی

اب حالِ دلِ عاشق کیا پوچھتے ہو ہنس کر خود آپ ہی بھر کے گھر کو جب کر چکے ویرانہ

محروم نہ رہ جائے نسیم ابرِ کرم سے کہنا نہ پڑے فیض ترا عام نہیں ہے[1]

---

[1] محترمہ زیب عثمانیہ کا ہے: مگر مست ہے تری ہو جائیں نہ ہیکش بیدل
سنگِ دل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی

۱۹۳۳ء میں آپ کی شادی بشارت اللہ صاحب سے ہو گئی محترمہ کو کتب بینی کا عشق تھا اور یہ شوق شادی کے بعد بھی برابر ترقی کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد بشارت اللہ صاحب کورٹ آف وارڈس کی ملازمت کے سلسلہ میں میرٹھ گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے ہو گئی جو ایک صاحب باطن اور صاحب نسبت بزرگ تھے اور اس وقت ۷۵ یا ۸۰ سال کی عمر تھی محترمہ نے ان سے عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ محترمہ نے مولانا سے علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی اکتساب فیض کیا۔ اور غالباً انہیں کے فیض کا یہ نتیجہ ہے کہ محترمہ کے اس زمانہ کے کلام میں تصوف، پاکیزگی قلب اور عشق حقیقی کے مضامین غالب نظر آتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد محترمہ نے سیرت پاک اور حیات نبویؐ کے متعلق مستند اور معتبر واقعات مرتب کر کے شائع کئے اس کتاب کا نام "انوار اسرار احمدیہ" ہے۔ اس کتاب کے متعلق مولانا صفی کے چند شعر یہ ہیں:۔

اک زنِ صالحہ کی یہ تحریر ... قابلِ قدر و بیش قیمت ہے
نثر رنگیں و نظم دلکش سے ... مترشح خلوص نیت ہے
نہیں گنجینۂ ادب یہ کلام ... بلکہ گنجینۂ سعادت ہے

اسی دوران میں محترمہ کی اکیلی بہن اور پھر ان کے شفیق استاد کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب محترمہ کا تنہا مشغلہ کتب بینی رہ گیا۔ آپ نے اپنے شوہر کے ایما اور کوشش سے لاہور اور الٰہ آباد کے فارسی و عربی

کے امتحانات میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانہ میں آپ کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اشرف سلطانہ رکھا گیا۔

کچھ عرصہ بعد بشارت اللہ صاحب کا الہ آباد تبادلہ ہو گیا۔ یہاں کراسٹھ ویٹ گرلس کالج میں اردو فارسی کے ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ یہ جگہ محترمہ شمیم کو پیش کی گئی جو شوہر کے ایما سے آپ نے قبول کر لی اور زندگی کے آخری ایام تک اس خدمت کو بطور احسن انجام دیتی رہیں۔

۲۳ اگست ۱۹۳۹ء مطابق ۸ رجب ۱۳۵۸ھ یوم جمعہ بعارضہ فالج آپ نے انتقال فرمایا اور کراسٹھ ویٹ گرلس کالج کے قریب کیٹ گنج میں دفن ہوئیں۔

محترمہ ایک نہایت روشن دماغ، بالغ نظر اور صاحب علم و فضل خاتون تھیں لیکن نام و شہرت سے بالکل بے نیاز تھیں۔ آپ نے اپنی حیات میں نہ اپنا کلام شائع کرایا نہ زنانہ مشاعروں میں حصہ لیا، جب جذبات میں ہیجان ہوتا تو تنہائی میں بیٹھ کر کہتیں اور اپنے ہی تک محدود رکھتیں۔ ظاہری زیب زینت کی بھی بالکل پرواہ نہ تھی، مگر اپنی عزت کا بڑا پاس تھا۔ فطرتاً نہایت غیور اور خوددار تھیں طبیعت میں بڑی فیاضی اور سیر چشمی تھی، غریبوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ آپ کا سلوک نہایت ہمدردانہ تھا۔ آپ نہایت دیندار، پردہ نشین اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔

شاعری کے علاوہ محترمہ ایک قابلِ قدر نثر نگار بھی تھیں۔ آپ نے

افسانے اور تذکرے، علمی اور ادبی مقالے، تنقیدیں اور تبصرے، اصلاحی اور اخلاقی مضامین سب پر قلم اٹھایا ہے، انفرادی مقالوں اور افسانوں کے علاوہ ایک مستقل ناول آپ کی یادگار ہے جو وفات سے سات آٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا۔

شاعری میں محترمہ کو کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا، مگر آپ کا کلام کہنہ مشقی اور خیالات کی پختگی کا پتہ دیتا ہے۔ یوں محترمہ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور قصیدہ پر بھی قلم اٹھایا ہے مگر آپ ایک مخصوص غزل گو شاعرہ تھیں۔ آپ کے کلام میں فطری جذبات کی عکاسی، حسن و عشق کے رموز کی تشریح اور محبت کی پاکیزگی موجود ہے، آپ کے احساسات میں نزاکت اور مذاق میں بلندی موجود ہے، جذبات نگاری اور سادگی، درد و اثر اور سوز و گداز، بلند نظری اور عالی ظرفی آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں، آپ نے منظر کشی بھی کی ہے اور ملی اور وطنی رنگ کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ زبان میں بڑی سلاست و روانی ہے بعض بعض جگہ تو زبان میں داغ کی سی بے تکلفی و سادگی نظر آتی ہے

اپنی نا اہلی کا احساس رہا تھا نہ کبھی
مجھ کو جرأت یہ ہوئی تھی کہ تری حمد کروں[1]

---

[1] حمد کے سلسلے میں مولانا رومؒ نے جس ندرت اور بلاغت سے کام لیا ہے وہ آج بھی اپنی آپ ہی مثال ہے، مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎
خود ثنا گفتن ز من ترک ثناست — کیں دلیل ہستی و ہستی خطاست

جذبات نگاری

یہ کہہ کے ٹال رہی ہوں اجل کو مدت سے
ٹھہر کہ وعدۂ دیدار اب وفا ہوگا
مٹا و شوق سے اُمید و آرزو لیکن
ہمارے دل کو تمھارا ہی آسرا ہوگا
میری تباہیاں مشہور ہیں زمانے میں
یقیں ہے آپ نے بھی کچھ نہ کچھ سنا ہوگا
تمھاری نظروں میں ہیں تماشا گر ہونگی
مرے نصیب میں جو کچھ بھی اب لکھا ہوگا
جو لغزشوں کا کرے احتساب اے واعظ
نہیں خدا وہ ہمارا، نرا خدا ہوگا
شمیم آپ سدھاریں گی یوں زمانے سے
کہ ساتھ حسرت و ارماں کا قافلہ ہوگا

مری وفا، مرا مسلک، مرے اصولِ حیات　　نہیں ہے مشعلِ راہِ عمل جہاں کے لئے

اب تو قرار آ چکا اس دلِ بیقرار کو　　آ اجل اور جلد آ ختم کر انتظار کو
جبر سے بجھ کے رہ گیا میرا چراغِ زندگی　　آج قرار آ گیا چرخ ستم شعار کو

چیخ اٹھیں ظلم ڈھا کر ہنسنے والے تو سہی[1]
ضبط کی امداد تھوڑی نالۂ دل چاہئے

مشکلیں غم کی خوشی سے کاٹ دے انساں ہے وہ
کچھ نہیں پہلو میں اک ہنستا ہوا دل چاہئے

بیزار ہے بزمِ حسینانِ جہاں سے دل شمیم
اس کا جلوہ جس جگہ ہو بس وہ محفل چاہئے

زبان کی صفائی و سادگی

کچھ درد داغ ہے کہ دکھاتے ہے کوئی تھیں
ضد کر رہے ہو آج تو تم خواہ مخواہ کی

کرنے کو آپ شوق سے وعدہ کریں مگر
جھٹلا رہی ہے دیکھئے شوخی نگاہ کی

---

[1] صاحب تذکرۃ الخواتین مولوی عبدالباری آسی نے یہ غزل "بی بیگم شمیم" کے تذکرہ میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ لکھنؤ کی کوئی پردہ نشیں خاتون ہیں۔ اور کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ بی بیگم شمیم لکھنؤ کی کوئی شاعرہ خاتون نہیں ہیں۔ یہ غزل انوار فاطمہ شمیم ہی کی ہے اور "تذکرہ شمیم" میں موجود ہے۔ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ لکھنؤ میں رہنے کے باوجود مصنف خود لکھنؤ کی ایک ایسی سربرآوردہ خاتون کے متعلق اس قسم کی غلطی کرے۔

کیوں بگڑ جاؤ اگر کہہ دے کوئی وعدہ خلاف
اس سے پہلے کیا کبھی جھوٹی قسم کھائی نہ تھی

کیا نیا دل ہو گیا پامال کوئی خیر ہے
چال تھی مستانہ لیکن ایسی اٹھلائی نہ تھی

وعدہ کبھی کسی سے تم نے وفا کیا ہے
بس ٹالتے ہو یوں ہی ہاں ہاں نہیں نہیں پر

افشاں سے شوق شاید کچھ بڑھ گیا ہے ان کو
یوں ورنہ ٹوٹتے ہیں تارے کہیں زمیں پر

دفعتاً اٹھی نگاہِ فتنہ پرور خود بخود
خود بخود پیدا ہوا آشوبِ محشر خود بخود

آپ کی محشر خرامی سے قیامت آ گئی
ورنہ کیوں اٹھنے لگا تھا شورِ محشر خود بخود

سوز و گداز

آتشِ غم بجھا رہی ہوں میں
اشک پیہم بہا رہی ہوں میں

کوئی دیکھے مرا جنونِ طلب
ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں

شاید اب عشق ہو گیا کامل
غم میں لذت سے پا رہی ہوں میں

دیکھئے کس ستم کا ہو آغاز
پھر انہیں یاد آ رہی ہوں میں

خدارا رحم کر اے دردِ پیہم ۔۔۔ نکل جائے نہ نام ان کا زباں سے
معاذ اللہ طوافِ کعبہ اور ہم ۔۔۔ ہمیں فرصت کہاں کوئے بتاں سے
شبِ تاریک اور ان کا تصوّر ۔۔۔ وہ لمحے عیش کے لاؤں کہاں سے[1]
ترے اک جلوۂ رنگیں کی خاطر ۔۔۔ بہت الجھی ہوں مرگِ ناگہاں سے

مرے دل میں ہر دم ہے نامِ محبّت ۔۔۔ مجھی سے ہے قائم نظامِ محبّت
کہا ہم نے آنکھوں میں حالِ پریشاں ۔۔۔ دیا چپکے چپکے پیامِ محبّت

جب کہ تدبیر کی قوت بھی فنا ہو جائے ۔۔۔ پھر دعا میری حقیقت میں دعا ہو جائے
میں نے اب راہِ محبّت میں بڑھائے ہیں قدم ۔۔۔ رہبرِ عقل سے کہہ دو کہ جدا ہو جائے

شفق اور شام کی نیرنگیاں دل کو دکھاتی ہیں
جنوں بڑھتا ہے اور اشکوں سے پلکیں تھرتھراتی ہیں
فضا کی خامشی میں طائرِ شب رنگ کی تانیں
مرے جذباتِ خوابیدہ کو رہ رہ کر جگاتی ہیں
خنک راتوں میں وہ مہتاب کی ننھی حسیں کرنیں
مسکن شیشۂ دریا پہ جس دم مسکراتی ہیں

---

[1] مومن: ع تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

جگر میں ہوک سی اٹھتی ہے دل بیتاب ہوتا ہے
تمنائیں اسی میں جذب ہو کر کھوئی جاتی ہیں
زمانہ اُف محبت کا اور اس کی پُر سکوں راہیں
مری تخئیل کی دنیا کو آ آ کر بساتی ہیں
محبت کی صبوحی پیتے تھے اور شاد رہتے تھے
کبھی دو دل تھے اس دنیا میں جو آباد رہتے تھے

رہے گی دردِ جگر کی خلش نہاں کب تک
کروں گی ضبط یوں ہی نالہ و فغاں کب تک
فراق و ہجر ہے الفت کا امتحاں لیکن
زمانہ ہو گیا آخر یہ امتحاں کب تک
اُداس چہرہ، زباں بند، آنکھ میں آنسو
مجھے رلائے گا رخصت کا وہ سماں کب تک
تری ہی آس پہ جیتی ہے اب شمیم حزیں
کرے گی رحم تو اے مرگِ ناگہاں کب تک[1]

مناظرِ عیش اب کہاں ہیں ستم فلک کے اٹھا رہی ہوں
ہے حسنِ رنگیں نظر میں میری میں پاس سے مسکرا رہی ہوں

[1] فانی:- تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد: مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

کبھی جو تھا وجہ کیفِ محفل زمانہ سن کر جسے تھا بسمل
شکستہ تارِ ربابِ دل پر وہی ترانہ میں گا رہی ہوں

کہیں ہے حسرت کہیں ہے حرماں کہیں تمنا کہیں ہیں ارماں
میں اپنے ویرانۂ دل کی بستی نئی طرح پھر بسا رہی ہوں

اُداس چہرہ نظر فسردہ، لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسم
ارے تم اس کو ہنسی نہ سمجھو میں اپنے غم کو چھپا رہی ہوں

نرالے آئیں ہیں اس جہاں کے جہاں محبت ہے کارفرما
کہاں کا ناموس، ننگ کیسا، خودی کو اپنی مٹا رہی ہوں

نہ بھول جاؤں کہیں وہ ماضی جو ساری رنگینیوں سے پُر تھی
غم و الم کا میں اک مرقع اکیلی بیٹھی بنا رہی ہوں

لذیذ کس درجہ تھی حکایت شمیمؔ ان سے جو کل کہی تھی
اسی فسانے کو طول دے کر میں آج دل کو سنا رہی ہوں

ستم ہر روز تازہ ہے نئی ہر روز آفت ہے[1]
کبھی جوشِ تمنا ہے کبھی جوشِ ندامت ہے

فقط اک سانس کا لینا اذیت ہی اذیت ہے
محبت درحقیقت ایک طوفانِ مصیبت ہے

---

[1] یہ محترمہ کی آخری غزل ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے ایک ہفتہ پہلے یعنی ۱۶ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کی رات کو لکھی تھی۔

ملوں یوں خاک میں گم ہو نشاں میرا زمیں پر ہو
نہ سبزہ ہو، نہ مرقد ہو، نہ پھولوں ہی کی چادر ہو
مجاور ہو نشانی ہو، کسی مرقد پہ آ کر ہو
کرم بنے مری بربادیوں پر بادِ صرصر ہو
فلک تربت کی مٹی تک ہواؤں سے اڑا دینا
شمیمِ نامور کا تو نشاں بھی اب مٹا دینا

عشقِ حقیقی کی تڑپ

وہ عطا کر عشق اے پروردگار
بیقراری جس میں ہو بلبل وہ زار

ہر گھڑی لب پر تری ہی یاد ہو
یاد سے تیری مرا دل شاد ہو

سازِ ہستی گر مرا چھیڑے کوئی
تو صدا نکلے ترے ہی نام کی

پاسِ ذلت خوفِ رسوائی نہ ہو
ہجر میں تیرے شکیبائی نہ ہو

درد اٹھے گو جگر میں بار بار
پر نہ ہوں اس درد سے میں بے قرار

استخواں جب جل کے میری خاک ہوں
بارشِ رحمت سے تیری پاک ہوں

منظر نگاری

ادھر آئی گھنگھور کالی گھٹا
ادھر رعد نے دی کڑک کر صدا

کہیں پڑ رہی ہلکی ہلکی پھوار
کسی جا پہ قوسِ قزح کی بہار

لب جو وہ سرخاب و مرغابیاں
دکھاتی ہیں قدرت کی نیرنگیاں

کہیں سیوتی ہے کہیں نیلوفر — کہیں ہے کنول سطح آب پہ
کھلے ہیں کہیں پھول نیلوفری — کہیں رنگ دکھلاتی ہے سیونتی
کہیں لالہ ہے زینت صحن باغ — جسے دیکھو لالہ رخوں کو ہے داغ
کہیں عشق پیچاں کہیں جا گلاب — چمن پر غرض ہے عجب آب تاب
تری کلک قدرت کی گلکاریاں — ہر اک پھول پتی میں دیکھی عیاں

شمیمِ جگر خستہ خاموش بس
ہے اللہ بس اور باقی ہوس

ملی، وطنی اور سیاسی رنگ

ہے تقاضائے جگر شکوہ بیداد کروں — قیدِ غم سے دلِ پُر درد کو آزاد کروں
تا کجا ضبط سے خونِ دلِ ناشاد کروں — درد کہتا ہے کہ دل کھول کے فریاد کروں

دل کی فریاد ہے بنیادِ جہاں ہلتی ہے
ہاں سنبھل جاؤ کہ اب میری زباں کھلتی ہے

لہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کی ہمرنگی ملاحظہ ہو۔ علامہ اقبالؒ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں — فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو (شکوہ)

اپنے ہاتھوں سے اجاڑا گیا گلشن اپنا — آپ بلبل نے جلایا ہے نشیمن اپنا
جھوٹ ہے سب کہ زمانہ ہوا دشمن اپنا — ہم نے تاراج کیا آپ ہی مسکن اپنا

اب نہ وہ جام ہے اپنا نہ وہ میخانہ ہے
غیر کی بزم ہے، اور غیر کا میخانہ ہے

اب نہ پہلی سی حمیت ہے نہ ہم میں غیرت — نہ وہ احساسِ اخوت ہے نہ جوشِ الفت
نہ وہ خودداریاں باقی ہیں نہ شانِ عزت — ہر طرف دور میں ہے جامِ شرابِ غفلت

سب تو دنیا میں بلندی پہ چڑھے جاتے ہیں
اک فقط ہم ہیں کہ پستی میں گرے جاتے ہیں

تم نے اسلاف کی عادات کو چھوڑا یکسر — تم میں باقی نہیں اب میل و محبت کا اثر
مسجدوں میں کہیں جھگڑا تو کہیں مندر پر — مسجدیں بن گئیں دنگل تو اکھاڑے مندر

اپنے ہاتھوں سے کنوئیں کھودتے ہو اپنے لئے
جال کے پھندوں کو خود کستے ہو پھنسنے کے لئے [1]

اب بھی گر ہوش میں آؤ تو نہیں کچھ بگڑا — چھوڑ دو اب بھی یہ آپس کا لڑائی جھگڑا
مل کے اک ساتھ کرو دور سراپا جھگڑا — آن کی آن میں ہو پار تمہارا بیڑا

---

[1] علامہ اقبالؒ

خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خوددار — تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی (جوابِ شکوہ)

خوفِ گلچیں ہو نہ اندیشۂ صیاد رہے
چمن آباد رہو بلبل اگر آزاد رہے

شمیم جالندھری

محترمہ مس۔ ایس شمیم جالندھری کی شاعرہ ہیں۔ حمد و نعت و منقبت آپ کے خاص موضوع ہیں۔ کلام سے حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کا رنگ جھلکتا ہے، کلام میں صفائی، روانی، اور متانت موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

"میلاد النبی صلعم"

آج وہ دن ہے کہ برسا آسماں سے ابرِ نور
آج کے دن جوش پر تھی رحمتِ ربِ غفور
آج یثرب میں کیا شاہِ دو عالم نے ظہور
ہو گیا روشن خدا کے نور سے نزدیک و دور

قل ہو اللہ احد سے گونج اٹھا بت کدہ[1]
بجھ گیا ایران کا جلتا ہوا آتش کدہ[2]

شعبدے گم ہو گئے شیطان بھی گھبرا گیا
جھک گئی باطل کی گردن کفر بھی شرما گیا
ہل گئے ایوانِ شاہی زلزلہ سا آ گیا
ہیبتِ لعنت تھی گویا اک جہاں تھرّا گیا

نعرۂ اللہ اکبر کی صدا آنے لگی
برقِ وحدت کفر کے خرمن کو جھلسانے لگی

---

[1] علامہ اقبال رح: کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے ؛ منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے
[2] ؎ کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدہ ایران کو ؛ کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزدان کو (شکوہ)

شمیم ملیح آبادی

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی شاعرات حاضرہ کی صفِ اول میں ایک نہایت وقیع اور نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کے خود نوشتہ حالات جو آپ نے اس تذکرہ کے لئے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں :۔

"میرا وطن ملیح آباد ضلع لکھنؤ ہے میرے مورثِ اعلیٰ نواب فقیر محمد خاں صاحب گویا تھے جو افواج اودھ کے رسالدار تھے اور تہوّر جنگ حسام الدولہ کے خطابات پائے میرے نانا صاحب نواب بشیر احمد خاں صاحب بشیر (تعلقہ دار ملیح آباد) تھے۔ آپ بھی صاحبِ دیوان تھے اور غیر معمولی شہرت کے مالک تھے۔

میرے حقیقی ماموں صاحب جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ حقیقت تعجب خیز ہوگی کہ آپ نے میرے ایک شعر کو بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھا افسوس اس میں ان کی مصروفیت ہمیشہ حائل رہی۔

میری تاریخ ولادت ۲۷ مارچ ۱۹۲۰ء ہے۔ مجھے دس سال کی عمر سے شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ میں نے چند سال مسلم گرلز اسکول میں تعلیم پائی پھر گھر پر شوقِ علم پورا کرتی رہی۔

میرا عموماً قیام لکھنؤ میں رہا اور یہیں کی علمی صحبتوں اور ادبی مجلسوں نے میرے ذوقِ شعری کو پیدا کیا۔"

صفیہ شمیم ملیح آبادی

۱۶ فروری ۱۹۴۲ء۔ لکھنؤ

محترمہ شمیم ملیح آبادی ایک تعلیم یافتہ، بالغ نظر، عالی حوصلہ اور وسیع النظر خاتون ہیں اور عصرِ حاضر میں اردو کی ایک نہایت زبردست اور نامور شاعرہ ہیں۔ آپ کی شاعری کی ابتدا سنہ ۱۹۳۰ء سے ہوتی ہے۔ شاعری کا ذوق فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، پھر آپ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جس میں جوش جیسا زبردست شاعر موجود تھا، جس کے پختہ آرٹ اور جوان نغموں نے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، یہ صحیح ہے کہ محترمہ کی شاعرانہ تربیت جوش کی کسی شعوری کوشش کی منت کش نہیں۔ جیسا کہ محترمہ نے خود اپنے حالات میں تحریر فرمایا ہے پھر بھی غیر شعوری طور پر جوش نے صرف اپنے ماحول سے جس قدر محترمہ شمیم ملیح آبادی کو متاثر کیا ہے اس کا ثبوت محترمہ کے کلام سے بخوبی ملتا ہے۔

یوں تو اس دور کی اکثر شاعرات جوش کے رنگ سے متاثر ہوئی ہیں مگر ان کے یہاں آرٹ کی وہ پختگی اور جذبات کی وہ لطافت موجود نہیں جو محترمہ شمیم ملیح آبادی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ آپ نے جس پختہ اور دلکش آرٹ کا نمونہ پیش کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

محترمہ کے کلام کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت محاکات کا حسن ہے اس سلسلہ میں جوش کی طرح محترمہ بھی نہایت نادر و لطیف، نہایت نازک و شاعرانہ تشبیہات کا استعمال کرتی ہیں، خصوصاً مناظرِ فطرت کی تصویر کشی میں جذباتِ انسانی کا امتزاج محترمہ کا کمال ہے جس سے منظر اور بھی

زیادہ دلکش اور ذی حیات بنجاتا ہے۔ یوں بھی صحیح معنوں میں محاکات کوئی آسان چیز نہیں مگر اس میں جذبات کی آمیزش نہایت دشوار آرٹ ہے اور محترمہ اس میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔

ادب اور خصوصاً شاعری کی بنیاد جذبات پر قائم ہے، جذبات جس قدر حقیقی، جس قدر گہرے اور شدید ہوتے ہیں یعنی جس قدر سچائی کے ساتھ ذاتی وشخصی طور پر محسوس کئے جاتے ہیں اُسی قدر اس ادب یا شاعری کا درجہ بلند ہوتا ہے، محترمہ شمیم ملیح آبادی کے کلام میں شدید اور تڑپتے ہوئے جذبات کا ایک ہجوم ہے، محسوسات وواردات قلبی کی ایک دنیا ہے جس نے ان کے اشعار کو نہایت بلند اور پُراثر بنا دیا ہے۔

محترمہ کے نغمے کیف اور رومان کی فضاؤں میں پلے ہیں، اور کیف ورومان کی فضاؤں کے حامل ہیں، ان میں محبت کا کیف اور جذبات کی نرمی ہے ان کا سوز وگداز اور درد واثر نہایت دلدوز ہے۔

ساتھ ہی ساتھ محترمہ نے حقایق اور زندگی کے گہرے مسئلوں کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ انھوں نے انسان کی بلندی پر بھی غور کیا ہے اور اس بلندی کے حصول کے لئے اس کو دعوتِ پیکار وعمل بھی دی ہے، ان کا دل اپنے ملک کی زبوں حالی پر بھی دکھا ہے اور ان کی آنکھ اپنے ہموطنوں کی خستہ حالی اور فاقہ مستی پر بھی روئی ہے۔

سطورِ ذیل میں محترمہ شمیم ملیح آبادی کا مرسلہ انتخاب کلام درج کیا جاتا ہے:-

منتخب اشعار

عالی ظرفی و بلند حوصلگی [1]

گلستاں کا ہر پھول دل بن کے مہکے اگر ایک اشکِ تمنا گرادوں

اگر چھیڑ دوں سازِ خلوت میں تیری چراغوں کو طاقِ حرم سے گرادوں

اجل بھی میرے غم پہ آنسو بہائے اگر نالۂ زندگانی سنادوں

یہ کیا خیال کوئی نہیں ناخدا تو کیا کشتی سپردِ شورشِ طوفاں تو کیجئے

گر ہے نئے نظام کی تخلیق کا خیال آبادیوں کو نذرِ بیاباں تو کیجئے

گر جلوۂ جمال کی دل کو ہے آرزو اشکوں سے چشمِ شوق چراغاں تو کیجئے

ہونا ہے دردِ عشق سے گر لذت آشنا دل کو خرابِ تلخیِ ہجراں تو کیجئے

اک لمحۂ نشاط کی گر ہے ہوس شمیم

دل کو ہلاکِ حسرت و ارماں تو کیجئے

دے موت ہی شاید غمِ ہستی سے رہائی ہستی تو ہے اک صورتِ زنداں مرے آگے

گر ہے سکوں کی آرزو سوئے سکوں کبھی نہ دیکھ

خاروں سے لے خلش کا لطف پھولوں کی تازگی نہ دیکھ

---

[1] عنوانات میرے ہیں۔ جمیل

ٹوٹے دلوں کی سن صدا نغمۂ عیش روک کر
سوئے گدا نظر اٹھا شانِ سکندری نہ دیکھ
صرف اجل ہی زیست کا کرتی ہے قائم اعتبار
شکلِ اجل نظر میں رکھ جانبِ زندگی نہ دیکھ
دل ہی میں اس کو پائے گا پہلے وسیع کر نظر
دیر و حرم کی سمت تو بھول کے بھی کبھی نہ دیکھ
اوجِ خودی بڑھائے جا سجدوں میں سر جھکائے جا
لذتِ بندگی اٹھا پستیٔ بندگی نہ دیکھ

کھولوں زباں جو ساری خدائی لرز اٹھے
وہ راز اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہوں میں

وہ ہم کہ شکوۂ جورِ بتاں نہیں رکھتے
وفا تو کیا ہے جفا کا گماں نہیں رکھتے
یہ وضعداریٔ اہلِ وفا کوئی دیکھے
گلے تو رکھتے ہیں لیکن زباں نہیں رکھتے
ترے خیال کی وسعت ارے معاذ اللہ
کہ دل میں آرزوئے دو جہاں نہیں رکھتے
نہ لطفِ برق سے واقف نہ زورِ طوفاں سے
جو بدنصیب کوئی آشیاں نہیں رکھتے
سنا نہ عہدِ طرب کی کہانیاں ہمدم
کہ دل میں طاقتِ آہ و فغاں نہیں رکھتے

جذبات نگاری

مری زندگی کے طربناک نغمے　　ترے غم میں آنسو ہوئے جا رہے ہیں
نہ پوچھ آہ دنیا تری انجمن سے　　تمنائیں کیا کیا لئے جا رہے ہیں

کر دیا بادِ خزاں نے خاک سارا گلستاں　　لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لئے

یہ کیسی بے کسی ہے یہ کیسی نامرادی　　کیا ختم ہو گئے ہیں لمحے مری خوشی کے

چھلک نہ جائے سبوئے حیات اپنا کہیں　　دمِ وداع ان آنکھوں کو اشکبار نہ کر

ہستی کا ہو نہ تار آخر کہیں خموش　　چھٹ جائے زندگی کا نہ داماں ترے بغیر

اے ہمنشیں نہ چھیڑ حکایاتِ رنگ و بو　　مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو

نفرت سی ہو چلی ہے خموشی سے ان دنوں　　پھر دل کو شوقِ عرضِ شکایت ہے آج کل

ناممکنات

جیسے پتھر کو کوئی ہیرا بنا سکتا نہیں　　جیسے کانٹا صورتِ گل مسکرا سکتا نہیں
جیسے ناممکن ہے انگاروں کا بن جانا گلاب　　جیسے کوئی زہر کو امرت بنا سکتا نہیں

جیسے دن کو دے نہیں سکتے ستارے روشنی
جیسے کوئی وسعتِ گردوں کو پا سکتا نہیں

جیسے چل سکتا نہیں بس زندگی کا موت پر
جیسے انساں عقدۂ ارواح پا سکتا نہیں

جس طرح بہکا نہیں سکتا فسوں کوئی
جس طرح دن شب کی سی ظلمت دکھا سکتا نہیں

چھینا جس طرح ناممکن ہے گرمی آگ سے
جیسے کوئی آگ پانی میں لگا سکتا نہیں

جیسے پتھریلی چٹانوں پر نہیں ملتے گہر
جیسے کوئی چاند کی تابش چرا سکتا نہیں

جیسے کوئی قید کر سکتا نہیں مہتاب کو
جیسے کوئی آسماں کا سر جھکا سکتا نہیں

جس طرح سے تم کو میرا یاد فرمانا محال
دل مرا یوں ہی کبھی تم کو بھلا سکتا نہیں

انسانی عظمت کا احساس

میرے لیے

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لیے
نغمہ سرا ہیں مرغِ خوش الحاں مرے لیے

روشن ہے میرے واسطے قندیلِ مہر و ماہ
تارے ہیں اوجِ چرخ پہ رقصاں مرے لیے

کھلتے ہیں میرے واسطے گل ہائے نو بہ نو
شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لیے

چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے
آتا ہے روزِ ابرِ بہاراں مرے لیے

کرتی ہے نذر اوس کے موتی خموش رات
گلشن کا عطر بیز ہے داماں مرے لیے

رخسارِ گل پہ میرے لیے مضطرب ہے رنگ
روئے گہر پہ آب ہے غلطاں مرے لیے

کھلتی ہے میرے واسطے شفاف چاندنی
انوار بار ہے مہِ تاباں مرے لیے

ہر شاخِ گل ہے جام بکف میرے واسطے
لبریز ہے سکوں بیاباں مرے لیے

ساری ہے ایک روح بقا کائنات میں
جاری ہیں لاکھ چشمۂ حیواں مرے لئے

ہوتا ہے دن کا چہرہ مری خاطر آشکار
رہتی ہے شب کی زلف پریشاں مرے لئے

میرے لئے وجود میں آیا ہے کل جہاں
پیدا ہے میرے واسطے پنہاں مرے لئے

نسوانی فطرت کی عظمت کا احساس

"عورت سے"

حلقۂ ظلمات میں شمعیں جلا سکتی ہے تو
زندگی کی تیرہ شب کو دن بنا سکتی ہے تو

اللہ اللہ تیرے حسن و رنگ کی تابانیاں
حاملانِ عرش کو حیراں بنا سکتی ہے تو

یاس کی شکلیں الم کی صورتیں غم کا وجود
ایک ہلکی مسکراہٹ سے مٹا سکتی ہے تو

گر دبیں اربابِ دولت کی شہنشاہی کے سر
بارگاہِ حسن میں اپنی جھکا سکتی ہے تو

مسکراہٹ سے ستاروں کے اڑا سکتی ہے ہوش
قدسیوں کے عزم کی تعمیر ڈھا سکتی ہے تو

اک اشارے سے بدل سکتی ہے عالم کا نظام
اک صدا سے ساری دنیا کو جگا سکتی ہے تو

آج بھی قسمت پلٹ سکتی ہے تو اقوام کی
آج بھی ہر فرد کو ارجن بنا سکتی ہے تو

قلعۂ ظلم و ستم کی تو اڑا سکتی ہے خاک
قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھا سکتی ہے تو

آہنی تیرے ارادے عزم طوفانی ترے
راہِ ہمت میں بھلا کب ہچکچا سکتی ہے تو

اپنے دلبندوں کو بے کھٹکے چڑھا کر بھینٹ بھی
طورِ قربانی کے دنیا کو دکھا سکتی ہے تو

ہیں تمام اربابِ ہمت تیری گودوں کے پلے
کب قدم میدانِ ہمت سے ہٹا سکتی ہے تو

دستِ نازک سے الٹ سکتی ہے دنیا ظلم کی
دھجیاں سرمایہ داری کی اڑا سکتی ہے تو

خالد و حیدر سے فاتح پھر جنم لینے لگیں
یہ کرشمہ اب بھی دنیا کو دکھا سکتی ہے تو

جو زمیں کیا آسمانوں سے نہ ہرگز اٹھ سکے
بوجھ وہ کمزور شانوں پر اٹھا سکتی ہے تو

آج بھی بیدار کر سکتی ہے تو اقوام کو!
آج بھی ہر ملک کی قسمت جگا سکتی ہے تو!

محاکات

برسات کی چاندنی رات

یہ برشگال کی برسی ہوئی سنہری رات
یہ بوئے عود سے مہکی ہوئی سنہری رات

یہ چاندنی یہ فضائیں یہ وادیوں کی بہار
گماں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار

یہ زرنگار فضائیں یہ جوشِ نکہت و نور
زمیں ہے وجد میں طاری ہے آسماں پہ سرور

یہ چاندنی یہ چٹکتے ہوئے سبک غنچے
یہ بوئے عود سے مہکے ہوئے خنک جھونکے

یہ آبشار کے نغمے یہ پتیوں کے ستار
بھڑک رہا ہے ہر اک شے میں زندگی کا شرار

جبینِ ناز ہے روشن عروسِ فطرت کی
ہوائیں چلتی ہیں گلشن میں باغِ جنت کی

یہ جوشِ حسن، فروغِ بہار، کیا کہنا
یہ چاندنی یہ لبِ جوئے بار کیا کہنا

نکھر رہا ہے ہر اک رنگ زندگانی کا
سرِ حیات پہ ہے تاج شادمانی کا

یہ بزمِ سازِ طرب یہ بہار کیا کہنا
یہ گنگناتے ہوئے آبشار کیا کہنا

یہ مسکراتی ہوئی رات یہ خمارِ طرب
یہ چاندنی یہ فضائیں یہ بہارِ طرب

نہیں ہے تو جو نشاطِ بہار کچھ بھی نہیں
دلِ حزیں میں بجز اضطرار کچھ بھی نہیں

رباعیات

خالی ہے تمناؤں سے سینہ اپنا
بے آب سا ہے دل کا نگینہ اپنا
خاموش ہیں موجیں تو ہوائیں ساکت
طوفان کا طالب ہے سفینہ اپنا

شب کو کوئی فریاد کیا کرتا ہے
دن عیش کے برباد کیا کرتا ہے
اس دورِ نشاط عہدِ عشرت میں صبا
ہم کو بھی کوئی یاد کب کیا کرتا ہے

دل وحشت کے دھارے میں بہا جاتا ہے
ماضی کا ہر اک نقش مٹا جاتا ہے
رنگینیٔ فطرت سے ہر اک لمحۂ زیست
فردوس کا اک خواب ہوا جاتا ہے

محترمہ کا مزید انتخاب کلام جو راقم الحروف کا کیا ہوا ہے حسب ذیل ہے:۔

محاکات

رومان آفریں رات

بھینی بھینی ہوائیں نم سی فضا
کس قدر رنگین ہے نشاط افزا
یہ مچلتی ہیں چاند کی کرنیں
دودھ کی بہہ رہی ہیں یا نہریں
سبزہ زاروں کی دو تک ہے بہار
ہے شگوفوں پہ جوانیوں کا نکھار

موجیں چھلکی ہوئی ہیں پانی کی
کان کھلی ہوئی ہے چاندی کی

مہکی مہکی فضا لطیف سماں
چرخ پر ہنس رہا ہے ماہ رواں

نکھرے نکھرے مناظرِ قدرت
نم فضائیں ہواؤں میں فرحت

نرم کلیاں لطیف نرگسِ شہلا
لے رہی ہیں عجب طرح سانسیں

ہنس رہے ہیں گلاب کے غنچے
متبسم ہیں چرخ پر تارے

بزمِ قدرت پہ کیف طاری تھے
چاند کا فیضِ عام جاری ہے

سارا عالم رہینِ عشرت ہے
نور ہے مستیاں ہیں نکہت ہے

جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں
چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں

بے خبر فکر سے ہے روحِ حزیں
سانس ہر ایک ہے نشاط آگیں

ہے ضیا تابِ وسعتِ ارض و سما
پھوٹ نکلا ہے نور کا دریا

یہ فضائیں گلوں کی یہ بو باس
اب بھی لیکن شمیم دل ہے اداس

ایک حسرت

پُر کیف ہو جب دنیائے چمن اور سرسو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں ہوں وجد میں جب گلپوش شجر
جب محوِ ترنم ہو عالم گل صحرا کو مہکاتے ہوں
جب نکہت ہواؤں کی رَو سے میدانوں میں لہراتے ہوں
روشن ہو زمیں کا جب سینہ جب حسنِ فلک کا سونا ہو

لیلائے شب کے دامن میں اک آدھ ستارا ہوتا ہو
جب نہروں اور تالابوں پر ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم ہو موتی، ہر ذرّۂ خاکی لعل و گہر
آراستہ ہو سلملے سے جہاں جب نور کے دلکش زیور سے
پُر نور ہو جب تاریک فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت ہٹا کے پردوں کو تو کاش چمن میں در آئے
ہستی کا مری ذرّہ ذرّہ تصویرِ مسرّت بن جائے[1]

ملکۂ صبح!

آ رہی ہے صبح کی ملکہ وہ بل کھاتی ہوئی
صبح کا خاموش نغمہ زیرِ لب گاتی ہوئی
نور کے زرّیں سمندر میں ڈبوتی کائنات
آ رہی ہے صبح رخ سے زلف سرکاتی ہوئی

---

[1] جوش ملیح آبادی

غلطاں ہے سبو میں عکسِ انجم ساقی
دریا میں ہے چاند سے تلاطم ساقی
اس وقت نظر ملا کے دم بھر کے لئے
ہیں تیرے نثار اک تبسم ساقی

جھاڑیوں سے جھانکتی شاخوں سے اِٹھلاتی ہوئی
آ رہی ہے تاج پہنے صبح بَل کھاتی ہوئی

ہر شجر کی چوٹیوں کو جگمگاتی ۔ جھومتی
آ رہی ہے صبح سیمیں نور پھیلاتی ہوئی

نہر کی خوابیدہ موجوں کو جگاتی ۔ چھیڑتی
آ رہی ہے صبح، دل کلیوں کے چٹکاتی ہوئی

نہر سے آنکھیں لڑاتی تھرتھراتی کودتی
آ رہی ہے ہر قدم پہ ناز فرماتی ہوئی

اہلِ عالم کو پیامِ زندگی دیتی ہوئی
ناامیدوں کو خوشی کے خواب دکھلاتی ہوئی

محفلِ گلشن کو دیتی صبح بیداری کا حکم
قطرۂ شبنم کو ضو سے اپنی جھلکاتی ہوئی

کھیتیوں پہ برق کی سی لہر دوڑاتی ہوئی
ولولے دل میں اٹھاتی زیرِ لب گاتی ہوئی

خامشی کا تار ٹوٹا چھڑ گئے نغمے نئے
محفلِ صحرا میں آئی صبح بل کھاتی ہوئی

لہر موسیقی اٹھاتی گلشنِ خاموش میں
آ رہی ہے صبح راگ زندگی گاتی ہوئی

جھاڑیوں سے مسکراتی آ گئی صبحِ بہار

پھر شمیم مبتلا کی روح چونکاتی ہوئی

آرزوئے دل

جہاں اخلاص کے چشمے رواں ہوں — محبت کے جہاں گلشن جواں ہوں
جہاں عیش و طرب شام و سحر ہو — جہاں کا ذرہ ذرہ نغمہ گر ہو
جہاں غم کی نہ دیوی کا گذر ہو — نئے ارض و سما شمس و قمر ہو
جہاں ہر سمت ہو گل ریز جنگل — جہاں جھومیں گلستانوں پہ بادل
جہاں آتے لرزتی ہو خزاں بھی — نہ ہو افکار کا جس جا نشاں بھی
جہاں سایہ فگن ہو ابرِ رحمت — جہاں مسدود ہو تخلیقِ نفرت
جہاں ہو سادگی میں اک نزاکت — جہاں آنکھوں میں ہو رنگِ مروت
جہاں ذرات کے منہ میں زباں ہو — جہاں مہر و وفا ہی کا جہاں ہو
جہاں عشرت کی دیوی جلوہ گر ہو — غمِ فردا سے ہر دل بے خبر ہو
جہاں زر کا نہ ہو کوئی پجاری — جہاں دریا محبت کے ہوں جاری
برستے ہوں جہاں راحت کے موتی — جہاں افسردہ خاطر ہو نہ کوئی
اب ایسی سرزمیں کی آرزو ہے — اب اس رنگیں فضا کی جستجو ہے

جذبات نگاری

بارگاہ جمال میں

اے خندہ بہار بیاباں کو چھوڑ دے — اے حسن ایک کشتۂ حرماں کو چھوڑ دے

اے غنچۂ بہار خزاں کی ہوس کر　　اے ماہتاب رات کے داماں کو چھوڑ دے
اے خلد آرزوئے جہنم ہے کس لئے　　اے سبزہ زار خارِ مغیلاں کو چھوڑ دے
دل سے بھلا دے یاد کسی نامراد کی　　گر ہو سکے تو عشق کے ارماں کو چھوڑ دے

ہدیۂ برق و شرار

قرار دے نہ اگر بیقراریاں ہی کر دے　　خوشی محال سہی اشکباریاں ہی کر دے
مرے چمن کے نصیبوں میں گر بہار نہیں　　تو اس کو ہدیۂ برق و شرار ہی کر دے[1]
وفا نہ ہو نہ ہو وعدہ تو کر لے آنے کا　　مجھے رہینِ غمِ انتظار ہی کر دے[2]
دلِ گرفتہ کو اے مالکِ جمالِ بہار　　شگفتہ گل نہیں کرتا تو خار ہی کر دے
اگر ہے میرے لئے لطفِ زندگی مفقود　　تو پھر فنا سے مجھے ہمکنار ہی کر دے

دریچے میرے لئے بند ہیں خوشی کے اگر
دلِ شبنم کو غم کا شکار ہی کر دے

نہیں جاتی[3]

بگولے لاکھ اٹھیں شعلہ سامانی نہیں جاتی
سحر تک شمعِ محفل کی درخشانی نہیں جاتی

---

[1] علامہ اقبال رح — نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو ؛ اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر (بالِ جبریل)
[2] " — نہ آنے کے نہیں اس میں تکرار کیا تھی ؛ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی (بانگِ درا)
[3] محترمہ کی یہ غزل قابلِ تحسین ہے خصوصاً پانچواں شعر تو تعریف سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جیسے شیخ و برہمن نے عجب سانچے میں ڈھالا ہے
وہ شئے محسوس تو ہوتی ہے پہچانی نہیں جاتی

تمہارے نور ہو جائے تبسم چھوڑ دیں غنچے
بدل جائے زمانہ خوئے انسانی نہیں جاتی

بہاریں آئی بھی اور ہو گئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی[۵]

[پچھلے صفحہ سے] بالا تر ہے۔ اس زمین میں مولانا اصغر گونڈوی نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت عمدہ غزل کہی ہے۔ یہ غزل اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی تھی ملاحظہ ہو:-

ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی　　نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

گُلوئے جلوہ بیرنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں　　کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پتہ ملتا نہیں اب آتش وادی ایمن کا　　مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

مگر اک مشت پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے　　ابھی تک شاخِ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو　　مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اڑا دیتا ہوں اب بھی تار تار ہست و بود اصغر
لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی　　(سرودِ زندگی)

۵ فیض احمد فیض ؎ کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
(نقشِ فریادی صفحہ ۱۱۸)

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

مری فکر و نظر گرمِ سفر ہے ایسے عالم میں
جہاں کی وسعتوں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی

مری باغی تمنائیں الٹ دیں گی زمانے کو
ہے جب تک زندگانی شعلہ سامانی نہیں جاتی

ستم حالات نے گو کر دیا باغی زمانے سے
مگر باتوں سے تیری بوئے انسانی نہیں جاتی

کیوں

آئیں ہمیں خیال میں وہ بار بار کیوں — خوابوں میں آ کے روز کریں بے قرار کیوں
٭ وہ حسرتیں ہیں سارا طوفانِ زندگی — آتا ہے پھر رلانے کو ابرِ بہار کیوں
٭ آلام و غم کے تند حوادث کے واسطے — آتا نشیمنِ دل پہ ہے پروردگار کیوں ۲
ترکِ وفا کے ساتھ ہو ترکِ خیال بھی ۱ — آئے ہو اب خیال میں بھی بار بار کیوں
وہ دن گذر گئے وہ زمانہ نہیں رہا — پھر ان کی یاد سے دلِ امیدوار کیوں

---

۱ غالب ـ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۔ دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے
میر ـ کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں ۔ ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں
٭ اس غزل کے یہ اشعار محترمہ نے اپنے انتخاب میں ارسال فرمائے ہیں "ج"

جب زندگی کا موت سے رشتہ ہے منسلک
پھر ہمنشیں ہے خطرۂ لیل و نہار کیوں

مطرب یہ زود لحن ہے یا کرب ساز ہے
رگ رگ میں بجلیاں ہیں مری بے قرار کیوں

* جب ربط و ضبط حسن و محبت نہیں رہا
ہے بار دوش ہستی ناپائدار کیوں

مدت ہوئی وہ نقشۂ دل ہی بدل گیا
اب چھیڑتے ہو ساز محبت کے تار کیوں

وہ شورش نشاط نہ سامانِ زندگی
اب کی چمن میں آئی عروس بہار کیوں

باب کرم میں جب کہ لفظ ستم نہ تھا
بنیاد زیست ڈال دی پروردگار کیوں

* رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ مگر شمیم
اس کا گلہ ہے آئی چمن میں بہار کیوں

نہ پوچھیے

کیوں زندگی سے دل ہے پشیماں نہ پوچھیے
دیکھا ہے جو وہ خواب پریشاں نہ پوچھیے

کیونکر ہوا ہے درد بھی درماں نہ پوچھیے
مشکل ہوئی ہے کس طرح آساں نہ پوچھیے

اہل خرد! تلطّفِ یزداں کے باوجود
بیچارگیٔ حضرتِ انساں نہ پوچھیے

دیوانگی میں جیب گریباں ہے چاک چاک
بیگانگیٔ حسنِ گریزاں نہ پوچھیے

دل میں کہاں ہے طاقتِ نظارۂ جمال

اب دل سے لطفِ صبحِ بہاراں نہ پوچھئے

فرصت نہیں ہے نالۂ شبگیر سے یہاں
اب لذّتِ سرودِ ہزاراں نہ پوچھئے

وقتِ سفر تسلّیِ پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے[1]

پر تو سے جس کے ماند ہیں انوارِ ماہتاب
تاریک زندگی کا وہ عنواں نہ پوچھئے

سایہ میں نکہتوں کے شبِ ماہتاب میں
وہ آب و تابِ جلوۂ خوباں نہ پوچھئے

چہرہ عرق عرق، وہ ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمالِ پشیماں نہ پوچھئے[2]

---

[1] جگر مرادآبادی

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں　　مگر دل ہے کہ پھر گھبرا رہا ہے
گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں　　محبت کا زمانہ آ رہا ہے

[2] ۔ "ان تھکی تھکی اداؤں" کی طرح جوش ملیح آبادی نے ایک جگہ "تھکی سی دلبری" اس طرح نظم کیا ہے

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری ؛ ایک بجھا سا تبسم اک تھکی سی دلبری

جگر مرادآبادی نے اس جمالِ پشیماں کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے

چشم پرنم زلف آشفتہ نگاہیں بے قرار ؛ اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

وقت طلوعِ جلوۂ اسرار کی قسم
کیا دیکھتی ہے چشمِ پریشاں نہ پوچھئے

فرصت سی ہو گئی ہے غمِ روزگار سے
کیا کیا ہیں دل میں حسرت و ارماں نہ پوچھئے

الہام کا نزول جب ہوتا ہے ذہن پر
اس دم مقامِ روحِ غزل خواں نہ پوچھئے

مستقبلِ شمیم ہے جس سے ضیا فگن
وہ دل فریب خوابِ پریشاں نہ پوچھئے

کامراں، کامگار ہیں ہم لوگ — نا شناسِ قرار ہیں ہم لوگ
اک بجھا سا چراغِ حسرت ہیں — اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ
ہم سے زندہ ہے گلستانِ ادب — گو خرابِ بہار ہیں ہم لوگ
فکر میں بھی شگفتہ دل ہیں ہم — غم میں بھی نغمہ بار ہیں ہم لوگ
ہیں جہاں کیلئے پیامِ سکوں — خود مگر بے قرار ہیں ہم لوگ

شاعرہ کی موت

زیست میری جب فنا کی گود میں سو جائے گی
جب متاعِ زندگی اے ہمنشیں کھو جائے گی
موت کے ہاتھوں اُجڑ جائے گا جب باغِ حیات

روحِ غمِ دنیا کے اندیشوں سے پائے گی نجات
منھ پہ جب احساس کے پڑ جائے گی کالی نقاب
آرزوؤں کا مری جب ٹوٹ جائے گا رباب
سانس کا جب ٹوٹ جائے گا یہ رنگیں سلسلہ
قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

انجمن پھولوں کی ہو گی نوحہ خواں میرے بغیر
ہو گی دیوی صبح کی حسرت فشاں میرے بغیر
ہر خس و خاشاک میں جب تازگی آجائے گی
عارضِ قدرت پہ مایوسی اک چھا جائے گی
پاس آگیں راگنی تالاب کی ہو جائے گی
ہنسنے والی ہر کلی مایوس سی ہو جائے گی
چشمِ باراں خون کے آنسو شفق جب ٹپکائے گی
روح میری آسمانوں پر بہت گھبرائے گی
نور سا روئے شفق کا دیکھنا اڑ جائے گا
میرے بن کوئل کا دل گھبرائے گا اکتائے گا
صبح کو چڑیاں جگانے کو بہت چلائیں گی
دیکھ کر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی
پھول فرقت میں مری ہو جائیں گے خستہ خراب

کھائے گی ہر شاخ میرے نام پر یوں پیچ و تاب
چاک دامانی کرے گی میرے بن موجِ نسیم
خاک اڑائے گی مری فرقت میں پھولوں کی شمیم

جستجو میں میری آوارہ پھرے گا ماہتاب
میرے بن تارے فلک پر ہوں گے غرقِ اضطراب

روئیں گی شبنم کی لڑیاں میرے غم میں زار زار
ذکر سے میرے نگارِ شب کو ہوگا اضطرار

قبر پر میری عجب دھومیں مچیں گی صبح و شام
گائیں گے بیدار کرنے کو طیورِ خوش کلام

میری فرقت میں دوانی تتلیاں ہو جائیں گی
منتشر فرشِ زمیں پر پتیاں ہو جائیں گی

سسکیاں لیں گی مری تربت پہ زندہ حسرتیں
روئیں گی فرقت میں میری گلشنوں کی رونقیں

جب بھری برکھا میں سب مل کر ترانے گائیں گی
شوخیاں میری بہت سکھیوں کو یاد آ جائیں گی
میری الفت خیز باتوں کو بہت ترسیں گے کان
پر نہ پائے گا کوئی میری محبت کا نشان
باغ سے آئے گی جب نغمگیں پپیہے کی پکار

یاد آجائے گی سکھیوں کو مری بے اختیار

جب کہانی ہوگی جاڑوں کی سنہری رات میں
یاد کرلیں گی مری سکھیاں مجھے ہر بات میں

جشنِ رنگیں ہوں گے جب ہونٹوں پہ ہیں گی بے پناہ
یاد میں میری نکل جائیگی سب کے منہ سے "آہ"

موسمِ باراں میں ہر سو حُسن جب چھا جائے گا
ساتھ اشکوں کے مرا سب کو خیال آجائے گا

نوحہ خواں بزمِ صحافت ہوگی میرے ہجر میں
ہوگا اک طوفاں بپا ہندوستاں کے بحر میں

سبزۂ علم و ادب کچھ زرد سا ہوجائے گا
شاعری کا کچھ دنوں جیسے مزا کھو جائے گا

پُر الم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر
مشرقی بہنیں مری فرقت میں ہوں گی نوحہ گر

ذکر میرا جب کبھی بزمِ سخن میں آئے گا
ایک نشتر سا دلوں میں وفتاً چبھ جائے گا

شاعری کی بزم ہو جائے گی غمگیں بے قرار
لکھنوی بہنیں مری فرقت میں ہوں گی سوگوار

آئیں گے جب آسماں پہ بادلوں کے قافلے

یادِ اہلِ ذوق کو آئیں گے میرے زمزمے

ہو گی فطرت غرق گریہ نوحہ خواں میرے لیے
کچھ دنوں تک روئے گا ہندوستاں میرے لیے
ایک دن پھر تن چلی دنیا کو صبر آ جائے گا
قصرِ امیدوں کا اک تازہ بنایا جائے گا

ملک قوم کی زبوں حالی کا احساس

رودادِ الم

نہ پوچھو ستم کیش ہندی کی حالت　　حقیقت ہے یہ کچھ کہانی نہیں ہے
تبسم کی قلت تو ہے اس کرہ میں　　مگر آنسوؤں کی گرانی نہیں ہے
نہ نالوں میں ڈھونڈو قناعت کی تانیں　　یہاں نام کو شادمانی نہیں ہے
غریبوں کی محفل میں اک دن سنو تو　　کوئی شے بجز نوحہ خوانی نہیں ہے
سسکتا جنازہ ہے کرب و بلا کا　　غریبوں کی مفلس جوانی نہیں ہے
کوئی رات آئی نہ ایسی کہ جس میں　　غریبوں کی خونی کہانی نہیں ہے
نہ پوچھو ستم کیش زندہ ہیں کیونکر　　ہے سکرات یہ زندگانی نہیں ہے
ہوں جب تک میں زندہ بغاوت ہے زندہ　　مرا جذبۂ صدق فانی نہیں ہے

دخترِ ہند

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار　　خاک پر بیٹھی ہوئی ہے دل فگار

چیتھڑوں سے جسم لاغر ہے ڈھکا کائناتِ دل میں ہے محشر بپا
آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار گیسوئے خمدار ہیں گرد و غبار
قلب میں الجھن پریشاں و حزیں ایک گرتا زیب تن ہم آستیں
ایک کہنہ اوڑھنی اوڑھے ہوئے جس کے آنچل جابجا اُدھڑے ہوئے
اندرونی دکھ کی سچی داستاں کہہ رہی ہے اس کی چشمِ خونفشاں
بیکسی ہے چارگی کا سر فرازنہ دست نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات - یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ اے ہندوستانِ خستہ حال بھوک سے بیتاب ہیں تیرے لال
آہ اے جنت نشاں ہندوستاں تو کہاں اور یہ تری حالت کہاں
کاش پلٹا کھائیں روز و ماہ و سال
تو ہو اور تیرا وہی جاہ و جلال

پیغامِ عمل

پیدا کر

شبِ تاریک سے انوارِ سحر پیدا کر ذرّے ذرّے میں نئے شمس و قمر پیدا کر
زورِ شمشیر سے دنیا کی بدل دے تقدیر قلبِ شبیرؓ کا حیدرؓ کا جگر پیدا کر
سرد ہے کب سے رگِ قوم میں خونِ چنگیز قلب میں پھر تپش برق و شرر پیدا کر
کب سے چھایا ہے فضاؤں پہ فلاکت کا غبار ہند کی خاک سے پھر لعل و گہر پیدا کر

ذرّے ذرّے کو بنا آئینہ حسنِ نگار — رنگِ زاروں میں بہارِ گل تر پیدا کر
قطرہ قطرہ میں اٹھا شورشِ طوفانِ حباب — موجِ ظلمات سے پھر آبِ خضر پیدا کر

شہناز

شہناز زیدی نام اور شہناز تخلص ہے عصمت کی شاعرہ ہیں۔ اکثر اخلاقی مضامین نظم کرتی ہیں۔ کلام صاف اور طرزِ ادا دل آویز ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

دنیا کے مسافر سے

نہ چل بن کے ناداں ہیں پُرخار راہیں — کسی جا مسرّت کسی جا پہ آہیں
کہیں پر سُنے گا تو غمگیں صدائیں — کہیں ایسے نوحے جو دنیا ہلائیں

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

ہر اک حال میں بھائی ثابت قدم ہو — کسی دکھ سے تیرا ارادہ نہ کم ہو
کسی غم میں چشم بینا نہ نم ہو — کسی کی خوشی نہ کسی کا الم ہو

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

نہ کر کچھ بھروسہ یہ دنیا ہے فانی — کسی کا فسانہ کسی کی کہانی
پڑھا کچھ صفحہ پر سنا کچھ زبانی — جھپکتے ہی آنکھیں ختم زندگانی

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

نہ کر غم کسی کا نہ ہو بے قراری — یہ دنیا ہماری ہوئی نہ تمھاری
نہ کر کوئی نوحہ۔ نہ نالہ۔ نہ زاری — جو بیٹھا ہے اب کل چلے گی سواری

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

یہ دو چار دن کی جو ہے زندگانی　　مسرت میں ہو یا صعوبت اٹھانی
لڑکپن بڑھاپا آیا ہو تو جوانی　　خوشی سے بسر کر یہ دنیا ہے فانی

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

لڑکپن کی بھولی فضاؤں میں کھو جا　　جوانی کی الھڑ اداؤں میں کھو جا
بڑھاپے کی بیکس دعاؤں میں کھو جا　　تو کھو جا جہاں کی صداؤں میں کھو جا

چلا چل چلا چل مسافر چلا چل

شیریں

شیریں خانم نام اور شیریں تخلص ہے آپ کیپٹن عزیز کی شریک زندگی ہیں
اکثر کلام رسائل میں چھپتا تھا۔

آپ کا کلام بلند پایہ اور پرکیف ہوتا ہے، بہت جذباتی رنگ میں لکھتی ہیں، کلام میں سوز و گداز اور حسرت و یاس کے دلائل موجود ہیں، زبان بہت شستہ اور صاف لکھتی ہیں۔ طرز ادا پاکیزہ اور دلکش ہے، کلام کا نمونہ یہ ہے:-

نوائے شیریں

میں ڈھونڈتی ہوں تجھ کو فضا بہار میں　　آ جلد آ کہ دل ہے ترے انتظار میں
برسوں کے تنکے چشم زدن میں جلا دیے　　کتنا اثر تھا اس نگہ شرمسار میں
عہدِ شباب ماتم امید الاماں　　فصلِ خزاں کا رنگ ہے فصلِ بہار میں

دن بھی طویل رات بھی تاریک ہے فراق | کب تک نہ فرق آئے گا لیل و نہار میں
اے بیخودی خدا کے لئے ڈھونڈھنا مجھے | کھوئی گئی ہوں سایۂ ابرِ بہار میں
صیاد کر دے یا تو قفس سے نہیں رہا | یا آشیاں کو آگ لگا دے بہار میں
تم اختیار میں جو نہیں ہو تو زور کیا | رونا یہ ہے کہ دل بھی نہیں اختیار میں

ہر گل کو بے خودی میں گلے سے لگا لیا
شیریں کو کیا ہوا یہ ہجومِ بہار میں [۵]

ص

صغرا حیدرآبادی۔

صغرا بیگم نام اور صغرا تخلص ہے آپ مرزا محمد علی خاں مرحوم سابق صوبہ دار کی چھوٹی صاحبزادی ہیں آپ کے دادا مرزا موسیٰ خاں مرحوم سرکارِ آصفیہ کے پہلے ناظمِ تعلیمات تھے اور چچا مرزا مہدی خاں کوکب اچھے شاعر اور حیدرآباد کے سب سے پہلے طالبِ علم تھے جنھوں نے یورپ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔

محترمہ صغرا بیگم کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ نے محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی۔ شادی کے بعد بنگال میں

---

[۵] محترمہ نجمہ تصدق ۵ | چومتی پھرتی ہے ہر پھول کا عارض نجمہ
اس کو عکسِ رخِ گلفام دکھایا کیوں تھا

شاہنی نکہت کی سراپا شعر اور موسیقی کی رنگین فضاؤں میں کچھ عرصہ تک رہنا ہوا۔

خاندانی علمی ماحول کے علاوہ فطری رجحان کے باعث آپ کو شعر وسخن کا ذوق ہے۔ آپ کی شادی ڈاکٹر امیر خاں المتخلص بہ ہاشم سے ہوئی ہے۔

آپ کے کلام میں سادگی وصفائی ہے۔ زبان سلیس لکھتی ہیں۔

آپ نے مناظر فطرت کی نقاشی اور جذبات نگاری دونوں پر قلم اٹھایا ہے طرز ادا دلکش اور پُر کیف ہے۔

خموشی سی عالم پہ جب چھا رہی تھی — میں ہستی سے سوئے عدم جا رہی تھی

اجالا جو گھٹتا تھا روئے زمیں پر — گھڑی عمر کی بھی گھٹی جا رہی تھی

عجب وحشت انگیز تھا وہ سماں کہ — میں صحرا نوردی سے گھبرا رہی تھی

اکیلی تھی میں اور ہمراہ ڈر تھا — مجھے اپنی تنہائی دہلا رہی تھی

اور اس اپنی مجبوری و بیکسی پر — زمین و زماں کو میں لرزا رہی تھی

جو میں ماہ نے اپنا جلوہ دکھایا — میں چاندنی کی لہروں میں نہا رہی تھی

وہ جگنو کی جگمگاہٹ نمائش قمر کی — جو حوروں کے جلوہ کو شرما رہی تھی

سہانا تھا دشت اور اجلا سماں تھا — جہاں باد صرصر بھی منڈلا رہی تھی

اور اس وقت میں مجھ کو رحمت خدا کی — خوش آئند لوری سے بہلا رہی تھی

"نہیں ہے یہ ممکن مجھے بھول جاؤں" — مجھے دھیمی دھیمی صدا آ رہی تھی

مجھے تھا گماں یہ کہ نا آشنا ہوں — صدا سے بوئے آشنا آ رہی تھی

نہیں تھا یہ معلوم مجھ کو کہ کوئی — مری بگڑی قسمت کو چمکا رہی تھی

غرض شانہ لطف سے شانِ رحمت
مری الجھی زلفوں کو سلجھا رہی تھی

صفیہ۔ حیدرآبادی

صفیہ بیگم نام اور صفیہ تخلص ہے۔ آپ محمد صدیق حسین صاحب مہاجر کی دختر ہیں۔ صدیق حسین مرحوم نظام کالج حیدرآباد دکن میں پروفیسر تھے اور فارسی زبان میں شعر کہا کرتے تھے۔

محترمہ صفیہ صدیق کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ زنانہ اسکول نامپلی میں تعلیم پائی اور پھر کلیۂ اناث میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کی۔ اردو کی خدمت گذاری کا شوق ہے۔ نظم، نثر اور ترجمہ کے ذریعہ سے آپ اس شوق کی تکمیل کرتی ہیں۔ اخبار پیام اور رسالہ شہاب وغیرہ میں آپ کی نظمیں اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور اپنے ان خیالات کی ترجمانی اکثر اپنے کلام میں بھی کرتی ہیں۔ کلام سے ابھی نومشقی ظاہر ہوتی ہے گو صفائی موجود ہے۔

نمونہ یہ ہے:

مشرقی دنیا کی عورت تجھ میں ہے عفت بھری
عورتوں پر ساری دنیا کی تو سبقت لے گئی
حسن کی دیوی ہے تو شرم و حیا تجھ پر نثار
تیرے ہر انداز میں پنہاں ہے حسنِ قدرتی

سارے گوہر سے ہے بہتر عصمت و عفت تری
ہو گئے عاجز پرکھنے سے بھی سارے جوہری
تیری خودداری سے عاجز ہو گئی ہے عاجزی
پھر وفاداری میں بھی تیرا نہیں ثانی کوئی
شکر ہے اللہ کا تو سب پہ بازی لے گئی
تو بھی اے صفیہ اسی زمرے میں شامل ہو گئی

ظ

ظریفہ

نام معلوم نہیں ظریفہ تخلص ہے لیکن نہایت دلدوز اور حسرت آمیز اشعار کہتی ہیں۔ آپ کا کلام جذبات اور واردات قلب کا گنجینہ ہے اس میں درد و اثر اور سوز و گداز سب کچھ موجود ہے۔ آپ کے یہاں معاملہ بندی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جرأت اور مومن کے رنگ سے کافی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کے کلام کی خاص خصوصیت جذبات کی فراوانی ہے جس نے آپ کے اشعار کو صرف دلکش ہی نہیں بہت پُر اثر بھی بنا دیا ہے، رنگ پختہ اور اسلوب بیان پاکیزہ ہے نمونہ کلام یہ ہے:-

"نذرِ عشق"

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے کرتے بھی تو رسوا سرِ بازار نہ کرتے

میں آپ دکھاتی مجھیں ہو رنگ کے جلوے — تم حسرتِ دیدار کا اظہار نہ کرتے
جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر — اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے
دل ہی میں چھپا رکھتے اگر رازِ محبت — اس دکھ کا علاج آپ ہی دشوار نہ کرتے
دیوانگیٔ عشق ہے سرمایۂ راحت — تم پھول میں پیدا خلشِ خار نہ کرتے
منظور نہیں مجھ کو تنگ ظرفیٔ منصور[1] — دنیا پہ عیاں حالِ دلِ زار نہ کرتے

اتنا بھی نہ تھا مادۂ ضبط جو تم میں
بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے

عابدہ

عابدۃ النساء بیگم نام اور عابدہ تخلص ہے۔ حیدرآباد کی شاعرہ ہیں۔ آپ مولوی سید عارف الدین صاحب ناظم تعمیرات حیدرآباد دکن کی دختر اور سید علی صاحب ایچ۔ سی۔ ایس کی شریکِ حیات ہیں۔

آپ نے محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ شعر گوئی سے کافی ذوق ہے۔ اس اسکول کی میگزین میں آپ کا کلام اکثر شایع ہوا کرتا تھا۔ کلام میں صفائی موجود ہے۔ اگر آپ کہتی رہیں تو پختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

---

[1] غالب :- قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اُلفت

الفت ہے اے خدا کیا ہم کو ذرا دکھا دے
الفت ہے نام کس کا؟ الفت ہمیں سکھا دے

قومیں بہت ہیں دشمن ایک دوسرے کی ہمدم
میل ملاپ کیا ہے تو ان کو سبق پڑھا دے

ملت نہیں ہے کوئی جو پھوٹ سے ہو خالی
اس پھوٹ کا جہاں سے نام و نشاں مٹا دے

دنیا میں فرقہ بندی بڑھتی ہی جا رہی ہے
آپس کے بیر کو سب دل سے خدا بھلا دے

آپس کی پھوٹ سے ہم برباد ہو رہے ہیں
اپنے کرم سے ہم کو شیر و شکر بنا دے

یہ عابدہ کی زاری کر لے قبول یا رب
الفت کے راستے پر ہم سب کو پھر لگا دے

عاصیہ

ملاحظہ ہو۔ رابعہ

عبرت

محترمہ زینت بیگم صاحبہ عبرت نے اپنے حالات جو خود لکھ کر ارسال فرمائے ہیں، درج ذیل ہیں:-

"میرا شجرۂ نسب حضرت امیر قیس عبدالرشیدؓ سے ددھیالی اور حضرت خالد بن ولیدؓ سے ننھیال شروع ہوتا ہے۔ میرے ددھیالی بزرگوں میں ہفت ہزاری پنج ہزاری اور سہ ہزاری زمانہ سلف میں گزرے ہیں میرے والد ماجد ڈاکٹر محبوب داد خان بہادر کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ

چیف مجسٹریٹ کے عہدہ پر مامور تھے۔ بریلی میں محلہ گلی بھاٹان میں ہماری کوٹھی مبارک باغ کے نام سے مشہور تھی۔ میرے والد مرحوم نے اس کوٹھی میں ایک باغ لگایا تھا جس میں انواع و اقسام کے درخت پھولوں اور پھلوں کے موجود تھے۔ دوست احباب میں اشتہار عام تھا کہ اگر کوئی شخص یہ بتا دے کہ فلاں پھل اور پھول کا درخت اس باغ میں نہیں ہے اس کو پانچ روپیہ انعام ملتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بجلی کا رواج بہت کم تھا مرحوم نے بیٹریوں کے ذریعے تمام کوٹھی اور باغ میں بجلیاں لگوائیں۔ واجد علی شاہ والی لکھنؤ کا سامان آرائش جب کلکتہ کے مٹیا برج میں نیلام ہوا تو وہاں سے بہت بیش قیمت اور منتخب سامان لا کر کوٹھی کو بقعۂ نور بنایا۔ چار قوال نوکر تھے صبح و شام کھانا کھاتے وقت ان کی قوالی ہوا کرتی تھی اور رات کو سوتے وقت قصہ خوانی کے لئے جالب صاحب مرحوم ملازم تھے جو زبانی اور کتابوں سے داستان سنایا کرتے تھے ہم تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ دنیا کے افکار و آلام سے قطعی نا آشنا۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔ والد صاحب مرحوم اردو و انگریزی کے شاعر تھے۔ ان کا اردو کا دیوان "دیوان خوب سفینۂ مرغوب" کے نام سے مشہور ہے اور انگریزی کا دیوان پوئٹیکل جمس (Poetical Gems) کے نام سے مشہور ہے جس کی تعریف گورنروں اور وائسرا و دیگر معززین انگریزوں نے کی ہے اور وہ سب اصلی ریکارڈ میرے پاس

محفوظ ہے۔

چونکہ میرے گھر میں ہر وقت علم و ادب کا چرچا تھا اس لئے اس کی ضو پاشیوں سے میں بھی محروم نہ رہی۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں پردہ کا رواج بہت سخت تھا اس لئے بلا امداد کسی استادِ فن کے اپنی استعداد کے مطابق اپنے کلام کو جلا دیتی رہی۔

سنہ ۱۹۰۷ء میرے خاندان کے لئے اس درجہ منحوس آیا کہ میرے والد ماجد کا انتقال اچانک مرض فالج میں دہلی میں ہو گیا۔ میرے منجھلے بھائی نے ریلوے کے ٹھیکہ جات لینا شروع کئے کام کا تجربہ نہ تھا۔ ملازموں نے خوب لوٹا۔ ہر کام میں نقصان ہوا ۳۔ ۴ لاکھ کے ٹھیکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ تباہ ہو گئے۔ میری شادی ۱۹۰۵ء میں سید محمد عبدالحی صاحب سے ہوئی یہ خاندان ہندوستان کا ایک مستند و مشہور و معروف خاندان ہے۔ پیرزادے ہیں۔ صاحب نسب شجرہ ہیں۔ میرے خسر سید مولوی عبدالغنی صاحب وکیل ضلع سیتاپور میں وکالت کرتے تھے کثیر آمدنی تھی۔ گاؤں، مکانات باغات تھے۔ میری دو بہنیں اور دو بھائی انتقال کر چکے۔ اب میں اور میرے ایک بھائی حیات ہیں۔ صرف تین بہنوں اور ایک بھائی کی اولاد بھی بفضلہ موجود ہے۔ چونکہ ٹوٹی پھوٹی شاعری کا شوق تھا۔ اس لئے میری لڑکیوں کو بھی شوق ہوا ماشاءاللہ ملقب فاطمہ بیگم نے تو ہندوستان میں بوجہ شاعری و قومی خدمات کافی نام پیدا کیا۔ اور پنجاب و حیدرآباد دکن کے شائقانِ ادب اس کو ادیب جلیلہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے

قائم کردہ پانچ اسلامی اسکول لڑکیوں کے لئے گوالیار اسٹیٹ میں چل رہے ہیں
چونکہ اس کی شادی ہو گئی اب اس کی جگہ جنرل سکریٹری کا کام اس کی
چھوٹی بہن انیس فاطمہ عرف زہرہ خاتون کرتی ہیں۔ انھوں نے بلقیس فاطمہ
کے اسکول سے مڈل بھی پاس کیا ہے۔

میری پانچ اولادیں ہیں تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔

میرے شوہر محمد عبدالحی صاحب جو گورنمنٹ میں منیجر کورٹ آف وارڈس
رہے ہیں اور گوالیار میں سپرنٹنڈنٹ مجسٹریٹ درجہ اوّل بھی رہے انھوں نے
بریلی سے ۱۹۱۰ء تک میٹرک کلاس تک تعلیم پائی اور اس وقت انگریزی
کھیلوں میں کافی نام پایا۔ یہ بریلی کی کل ٹیموں کے جنرل کیپٹن بھی رہے
حضرت مولوی احمد رضا خاں صاحب کے بھی عقیدت مند تھے۔ میرے
خاوند کی عمر ۶۶ سال ہے اور میری ۵۶ سال ہے۔

عصمت کا زیادہ تر کلام پرانے روایتی شاعرانہ رنگ میں ہے ایک زمانہ
میں لکھنؤ میں اور تھوڑا بہت دہلی میں بھی یہ رنگ مقبول تھا لیکن چونکہ
سچے اور صحیح جذبات کی ترجمانی اس میں زیادہ نہیں تھی اس لئے یہ رنگ
زیادہ عرصہ تک مقبول نہیں رہ سکا اور اب اس کو ترک کیا جا رہا ہے
عصمت نے چونکہ انھیں فضاؤں میں آنکھ کھولی اور اسی ماحول میں
پرورش پائی۔ اس لئے ان کے یہاں اس رنگ کا ہونا کچھ تعجب خیز
بات نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے یہاں ترجمانی جذبات کا

بالکل فقدان ہے۔ ان کے یہاں اس رنگ کے بھی کچھ اچھے شعر ملتے ہیں۔
جیسا کہ اشعار ذیل کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

ذیل میں محترمہ کے ہر سلسلہ کلام کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

لطف آتا ہے قفس میں ظلم تو ایجاد میں — چین آتا ہے مجھے دردِ دلِ ناشاد میں
دل کو دیکھوں یا جگر کو یا غم و اندوہ کو — سازِ ہستی چل رہا ہے اب کسی کی یاد میں
جانِ مضطر، دلِ شکستہ، قلبِ مجروح، چشمِ نم — ہائے کیا کیا بن گئی ہم پر کسی کی یاد میں

نہ ہوتا دل تو کوئی کیوں کسی پہ مبتلا ہوتا
حسیں ہوتے تو کیا تھا دلربا ہوتے تو کیا ہوتا

نہ دل ہوتا تو کیوں فرہاد اپنی جان کھپاتا
جہاں میں سیکڑوں شیریں ادا ہوتے تو کیا ہوتا

تصوّر میں کبھی آکر تسلّی دے ہی جاتے ہیں
نہ آتے بھی مرے درد آشنا ہوتے تو کیا ہوتے

ہمارے دم سے ہی تو نے ستمگر نام پایا ہے
نہ ہوتے ہم اور انداز جفا ہوتے تو کیا ہوتا

کسی کی اک نگاہِ مست سے بیہوش ہو بیٹھے
اسیرِ گیسوئے زلفِ رسا ہوتے تو کیا ہوتا

مقدر میں ازل کے روز سے ہم غم لکھا لائے
نہ کرتے وہ وفا کیونکر وفا کرتے تو کیا ہوتا

(نوٹ اگلے صفحہ پر)

ستمگر ہیں تو جب بھی ایک عالم ہے تمنائی
اگر رسمِ وفاداری ادا کرتے تو کیا ہوتا [2]

مجھے قسمت سے شکوہ ہے شکایت ان سے کیا عمر
ستمگر ہیں تو کیا ہے باوفا ہوتے تو کیا ہوتا

---

(۶)

وہ نہ آئے وعدہ کر کے دلِ بے قرار سو جا — ہیں دروغ ان کی قسمیں نہ کر اعتبار سو جا
مری آنکھیں منتظر تھیں مرا قلب مضطرب تھا — کہا نا امیدی نے آ کر نہ کر انتظار سو جا
مجھے دفن کر چکا جب تو یہ بولا شاد ہو کے اب — تجھے اب تو چین آیا مرے بے قرار سو جا
تجھے یاس روکتی اب تجھے شوق کھو چکا اب — ترا نوحہ ہو چکا اب مرے غمگسار سو جا

حالِ دل بر سرِ رحم ان کو میں پاؤں تو کہوں — ہیں وہ پیکرِ جفا مجھ سے سناؤں تو کہوں
زاہدو پوچھو نہ اس عشقِ بلا خیز کے ڈھنگ — نقشۂ کفر ذرا دل سے مٹاؤں تو کہوں
کیا کہوں جو دلِ صد پاش سے آتی ہے صدا — گر ذرا سنگِ جفا پر میں اٹھاؤں تو کہوں

دردِ ہجراں کا یقیں آپ کو کب آئے گا
داغ ہائے دلِ مجروح دکھاؤں تو کہوں

[پچھلے صفحہ سے] [1] مؤلف حقیرہ — شکستِ دل ازل ہی سے مری قسمت میں لکھا تھا
قصور اس میں تمہارا اے انیس ہاں کیا تھا

[2] آغا حشر کاشمیری :- جب اتنی بے وفائی پہ دل اس کو پیار کرتا ہے
خداوندا اگر وہ باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

عذرا

سیدہ عذرا جمال نام اور تخلص عذرا ہے۔ آپ موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ روشن خیال اور عالی دماغ خاتون ہیں۔ آپ نے کینرڈ ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اب آپ دہلی میں مقیم ہیں آپ کا عرف سنجیلہ خاتون ہے۔

آپ موجودہ دور کی ایک نہایت خوش گو اور قادر الکلام شاعرہ ہیں آپ کی شاعری صرف گل و بلبل کے افسانوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں قوم اور وطن، تہذیب اور سماج، رسم اور رواج اور زندگی کے حقائق پر تبصرہ ہے۔ آپ علامہ اقبالؒ کے رنگ سے بہت متاثر ہوئی ہیں اور اس رنگ میں بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام پختہ پُر وقار اور بلند ہے نمونہ یہ ہے:۔

پیامِ عذرا

آج کہ محبوب تیرا وطن گردش ایام میں ہے   تلخی زہر ترے بادۂ گلفام میں ہے
ہمہ تن پابوس غلامی کے اک دام میں ہے   زندگانی کا ہنر کوشش ناکام میں ہے
خواب غفلت میں جو سوتے ہیں جگا دے ان کو   جا کے اقبالؒ کا یہ شعر سنا دے ان کو

"آؤ کہ خورشید کا سامانِ سفر پیدا کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر پیدا کریں"

(عذرا کا پیام خواتینِ مشرق کے نام)

مجھ سے اک خضرِ تہذیب نوی نے یہ کہا

نقش بیکار ہے اب ہند میں عورت کا وجود

زنِ مغرب رہِ ایجاد پہ ہنگامہ خرام
اور یہاں زیست کی ہر سانس پہ طاری ہے جمود

عرصۂ دہر میں وہ گرمِ تقاضائے حیات
اور نظارہ کناں ہم صفتِ چشمِ حسود

سبقِ تقدیر پہ قابو ہے زنِ مغرب کا
اور ہم اپنی ہی تخئیلِ کہن سے محدود

سُن کے یہ میں نے کہا افرنگ کے اے دستِ نگر
تیری آزادیٔ افکار نہیں قابلِ سود [1]

تو کبھی نقش گرِ راہِ ترقی تھی، مگر
ذوقِ تقلید نے تو نعمتِ اجداد ربود

۱؎ مغرب زدہ عورت پر حضرت علامہ اقبالؒ نے رموزِ بیخودی میں اس طرح اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطنِ او نازن است

بندہائے ملتِ بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا دل کردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزاد بیش
از حیا نا آشنا آزاد بیش

علمِ او بارِ امومت برنتافت
بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

این گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ [رموز ص ۱۶۱]

اب بھی صد جلوہ بداماں ہے فضائے عالم
کورذوقی سے تری بند ہے گو چشمِ شہود

بت اثر ناک سہی ہو تو نہ اگر رشتہ بپا
اب بھی ہے زندہ و پائندہ ترا ربطِ ودود

جس پہ برباد ہوئی تیری حیا کی دولت
تیری عصمت کے محافظ تھے رسوم اور قیود

تو کسی روز بھی خود قوم کی زندہ تقدیر
اور اب ہے ترا لقب بہ سے شکوہ بے سود

دوزخِ غرب کو فردوس سمجھنے والی
عصمت حسن کے جوہر سے ہے عورت کی نمود

سرزمیں ہند کی ہے منتظر اس عورت کی
مایۂ ناز ہو ملت کے لیے جس کا وجود

حسن کی روحِ رواں عشقِ جواں کی دولت
اللہ کہ خطرہ میں ہے اب امن اماں کی دولت

عصمت

خورشید عصمت نام اور عصمت تخلص ہے۔ موجودہ دور کی ایک نہایت خوش فکر اور کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ سنجیدہ رنگ میں کہتی ہیں۔ زبان پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے جذبات اور طرزِ ادا دونوں اعتبار سے آپ کا

کلام بلند اور قابلِ قدر ہے، نمونہ کلام یہ ہے،

صبر کو آزما کے دیکھ لیا
تیر یہ بھی چلا کے دیکھ لیا

بے وفا سے وہ بے وفا ہی رہے
آزما آزما کے دیکھ لیا

خود ہی محفل میں ہو گئے رسوا
تم نے ہم کو اٹھا کے دیکھ لیا[1]

نہیں کوئی انہیں غم عصمت
ہم نے خوب آزما کے دیکھ لیا[2]

عصمت

عصمت جہاں بیگم نام اور عصمت تخلص ہے۔ آپ کا تعلق مظفر نگر کے ادب پرور اور ادب نواز خطہ سے ہے۔ کلام کا رنگ صاف ستھرا ہے جذبات کی ترجمانی اور دلچسپ واقعات نگاری آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسالہ محشر خیال میں شایع ہوتا تھا۔ نمونہ یہ ہے۔

مجھے ماں باپ کے گھر میں وہ اطمینان حاصل تھا
کہ دنیا بھر کی امیدوں کا گہوارہ مرا دل تھا
ہوئی حالت مگر بالکل وہی سسرال میں آ کر

---

[1] مومن:۔ تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری :: تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

[2] مومن نے اس مضمون کو بڑی لطافت اور بڑی حسرت سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو

ٹوٹ لاک مرگ غلط ہے سبب سے غافل
اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

پھنسے جیسے کوئی آزاد طائر جال میں آ کر
محلے بھر کی ساری عورتیں مجھ کو ستاتی ہیں
میں اُن کا منھ چڑاتی ہوں وہ میرا منھ چڑاتی ہیں
سہے جاتے نہیں اب مجھ سے طعنے ساس نندوں کے
قیامت ہے رہوں کس طرح دن بھر پاس نندوں کے
وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے
تری فرقت کی ماری تجھ کو اکثر یاد کرتی ہے
مجھے لے چل کہ میری آتما فریاد کرتی ہے
نہ آنسو آئیں گے رخ پر نہ گھبرائے گا دل میرا
کہ تیرے ساتھ رہنے سے بہل جائے گا دل میرا
یہ مانا ہیں بہت دلچسپ صبح و شام کے جلوے!
سہی تم آنکھ سے اوجھل تو پھر کس کام کے جلوے
تمھارے ساتھ رہ کر اپنا غم سب بھول جاؤں گی
تمھیں گاتا جو دیکھوں گی تو خود بھی ساتھ گاؤں گی
وہیں لے چل مرا چرخہ جہاں چلتے ہیں ہل تیرے

عظمت

عظمت اقبال نام اور عظمت تخلص ہے دورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں کلام نہایت پُر کیف اور بلند پایہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اساتذہ کے

کلام سے متاثر ہوئی ہیں، نمونہ کلام یہ ہے:

چمن اپنا نہ گل اپنا نہ کوئی باغباں اپنا — طبیعت مجھ گئی اجڑا خوشی کا گلستاں اپنا[1]
مری صبح مسرت بن گئی شام الم کیسی — ہے محوِ خوں فشانی یہ شبابِ نغمہ خواں اپنا
مقدر کی لکیریں مٹ نہیں سکتیں اگر یارب — نکل جائے تو پھر سینے ہی سے قلبِ طپاں اپنا
سنایا حال محرومی وہیں ہر لمحہ رنگیں نے — جہاں الٹا نقابِ ماضیٔ دو جہاں اپنا

حکایاتِ جنوں پھر لب پہ آتی ہیں مگر عظمت
فسانہ ہے لبوں پر اور نہیں افسانہ خواں اپنا[2]

---

[1] مومن:- ؎ نہیں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری
اثر کس کو ہو، ہو وے بھی اگر فریادِ بیکس میں

فانی ؎ یہ کس قیامت کی بے کسی ہے نہ میں ہی اپنا نہ یار میرا
نہ خاطر بے قرار میری نہ دیدۂ اشکبار میرا

[2] اس زمین میں نواب معظم جاہ بہادر شجیع شاہزادۂ دولت آصفیہ دکن نے بھی ایک نہایت پرکیف اور مرصع غزل لکھی ہے چونکہ عام نظروں سے یہ غزل نہیں گذری ہوگی اس لئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے ملاحظہ ہو:-

اور ہے زمانہ میں کون رازداں اپنا — یا نگاہِ نازان کی یا غمِ نہاں اپنا
جستجو محبت میں بے اثر نہیں ہوتی — ان کو ڈھونڈنے نکلے مل گیا نشاں اپنا
میرا حال سن سن کر ہنس رہے ہیں وہ — یوں بڑھا رہے ہیں وہ لطفِ داستاں اپنا
کچھ اثر نہیں کرتا جذبۂ نہاں ان پر — رہ نہ جائے تم بن کر جذبۂ نہاں اپنا

بقیہ اگلے صفحہ پر

عفت۔ مظفر نگری۔

محترمہ آمنہ خاتون عفت، رابعہ خاتون پنہاں، ملقیس جمال اور میمونہ خاتون غزالہ کی بڑی بہن اور موجودہ دور کی ایک ممتاز اور مشہور شاعرہ ہیں۔ حالات جو آپ نے اپنی زیر نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

آمنہ خاتون عفت دختر اول شیخ مولانا مولوی عبداللہ صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ پی۔ آئی۔ آفس الہ آباد ۲۲ر نومبر ۱۹۰۳ء کو بمقام سہارنپور تولد ہوئیں۔ ۶ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل

(پچھلے صفحے سے)

آپ دل میں رہ کر بھی دل سے بے خبر کیوں ہیں — دل ہی راز ہے اپنا، دل ہی رازداں اپنا

پھر گئی ہے کچھ کہہ کر وہ نگاہ جاں پرور — اب سکوں نہ بن جائے اضطراب جاں اپنا

یوں بھی جا نہیں سکتا دل سے رنج تنہائی — عالم تصور میں ان پہ ہے گماں اپنا

رائیگاں نہ ہو جائیں نقش میرے سجدوں کے — وہ بدل بھی سکتے ہیں سنگ آستاں اپنا

ابتدائے خاموشی آپ کی کہانی تھی — انتہائے خاموشی بن گئی بیاں اپنا

ان کی مہربانی سے مٹ رہی ہیں امیدیں — لٹ رہا ہے منزل پر آج کارواں اپنا

بزم ناز میں ان کی ہے کچھ اور ہی عالم — اب کسے یقیں ہوگا دل بھی تھا یہاں اپنا

ضبط غم ضروری تھا غم تشنج کیوں ہوتا
لے لیا محبت نے خود ہی امتحاں اپنا

کی۔ (جوکہ بریلی کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے) جنوری ۱۹۲۰ء
میں خاندانی عزیز مسٹر ناظر حسن صاحب وکیل و میونسپل کمشنر مظفرنگر
سے شادی ہوئی۔ یہ شادی والد صاحب نے اپنے حسب منشا کی
اوائل عمر سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ چند کتابیں تصنیف کیں اور
کچھ زیر تصنیف ہیں۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ "گوہر عفت"
شایع ہوچکا ہے، دوسرا تیار ہورہا ہے، شاعری کا بھی ذوق ہے۔ قومی
خدمات میں زندگی گزر رہی ہے، بارہ سال سے میونسپل بورڈ اور
ڈسٹرکٹ بورڈ میں بحیثیت سرکاری ممبر شامل ہیں اور دیگر اداروں
میں تقریباً ۱۵ سال سے حصہ لے رہی ہیں۔

ایک زنانہ اسلامی درسگاہ کی بنیا ڈالی جو ترقی پذیر ہے۔ اور
اس وقت (بحیثیت انگلش مڈل اسکول) دختران مظفرنگر کی تعلیمی خدمات
انجام دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک صنعتی و حرفتی زنانہ اسٹور
قائم کیا ہے جو انتہائی مقبول ہوا۔

کچھ عرصہ سے دنیائے فانی سے لگاؤ کم ہوگیا ہے اور طبیعت فقر
کی طرف راغب ہے۔ مشرقی تہذیب اور مذہب کی پابند ہیں۔ مشرقی پردہ
کرتی ہیں، چنانچہ کمیٹیوں وغیرہ میں زیر نقاب کام کرتی ہیں۔ دستکاری اور امور
خانہ داری سے دلچسپی ہے طبیعت میں ہمدردی، زندہ دلی ہے، اخلاق بہت وسیع،
آپ کا رنگ پختہ اور کلام سنجیدہ و بلند پایہ ہے اسلوب
بیان پاکیزہ اور صاف ہے ذیل میں خود محترمہ کا وہ انتخاب

درج کیا جاتا ہے، جو آپ نے اس تذکرہ کے لئے راقم الحروف کو ارسال فرمایا ہے:-

جلوہ ترا جہاں ہے — ہر گل میں تو نہاں ہے
دریا صحیفہ خواں ہے — موجوں میں اک اذاں ہے

وقتِ نماز اینست
کیفِ نیاز اینست

ہر ذرہ جاگ اٹھا ہے — نغمہ زبانِ صبا ہے
ہر برگ اک ثنا ہے — سجدہ کناں فضا ہے

وقتِ نماز اینست
کیفِ نیاز اینست

نشاطِ حال بھی ہے کشتۂ اندیشۂ فردا
حصولِ مدعا میری نظر کا منتہا کیوں ہو
درخشاں صبح و دم اشکِ تمنا ہے گریۂ عقیقت
تو پھر منت کشِ الفاظ تابِ التجا کیوں ہو

(طرحی غزل کے چند اشعار۔ طرح: میرا سونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو)

میرے زخموں میں اب تک لذتِ نیشِ سلاسل ہے
کہاں تارِ رفو ہمدم میسر نوکِ سوزن کو

مظالم چھپا نہیں سکتے تمھاری پردہ پوشی سے
چھپاؤ گے کہاں تک رنگِ چشمِ شوخ و پُرفن کو
کیا رنگین اک پرتو سے رنگِ گلشنِ ہستی
تبسم سے کیا پھر خاک کیوں گلزارِ ایمن کو
نہ اذنِ ہم نشینی ہے، نہ اذنِ دید ہے عفّت
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

اشعار ذیل محترمہ کے رسالہ انتخاب کے علاوہ آپ کے کلام کا مزید انتخاب ہیں:-

صلہ[۱] پائے گی آہِ نارسا کیا	ہلے گا پردۂ عرشِ عُلا کیا
میں ہر ذرہ میں تجھ کو پا رہا ہوں	مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا
جو غنچہ ہے حجابا جو گل انوکھا	یہ ہے نیرنگیوں کی انتہا کیا
جھلک ان کی کہیں دیکھی تھی ایسے	اسی دن سے نہ جانے ہو گیا کیا
جبل اور دشت اک جلوے نے پھونکے	کرے چشمِ طلب پھر حوصلہ کیا
مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی	شکایت ہائے دستِ ناخدا کیا

ہر اک آنسو ہے روحِ عشق عفت
دُرِ دو گوہر سے اس کو واسطہ کیا

---

[۱] یہ ایک طرحی غزل ہے جو محترمہ نے لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں سنہ ۱۹۴۰ء میں پڑھی تھی۔

ہیں ان جلووں کے قرباں کیا یہ لطفِ بیکراں ہوگا
کہ اک پرتو سے سینہ مثلِ ایمن ضو فشاں ہوگا
اگر یہ پلٹے ہمت جانبِ منزل رواں ہوگا
تو ہر خارِ بیاباں رشکِ گلہائے جناں ہوگا
شب تاریک[۱] اور بحرِ الم کی غم فزا موجیں
ٹٹولوں کس طرح یارب مرا ساحل کہاں ہوگا
قدم پہلا سنبھل کے تم نے گر عفت بڑھایا ہے
تو پھر نزدیک منزل جلد تر یہ کارواں ہوگا

مری آنکھ میں مسکرا دو محمدؐ خراب آئینہ کو جِلا دو محمدؐ
جہاں طائرِ عقل بھی نارسا ہے رسائی وہاں تک کرا دو محمدؐ
مری روح و جاں نذرِ چشمِ کرم ہیں خدارا نظر اک اٹھا دو محمدؐ
گناہوں سے مردہ ہوئی روحِ عفت
شفاعت سے اپنی جِلا دو محمدؐ

عفت۔ بنارسی

عفت تخلص ہے۔ رضا کاظمی صاحب ساکن بنارس کی شریکِ حیات

---

[۱] خواجہ حافظ
شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل ÷ کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

ہیں، اور اس نسبت سے اکثر رضا دولہن کے نام سے معروف ہیں۔
غزل گو شاعرہ ہیں اور اکثر خوب لکھتی ہیں۔ روایتی شاعری کے علاوہ جس کا مستقبل امید افزا نہیں آپ کے یہاں جذبات و وارداتِ قلب کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ طرزِ ادا پختہ اور کامیاب ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

بہار آتے ہی بن آئی جنونِ فتنہ ساماں کی
وہ دیکھو دھجیاں پھرنے لگیں بیچارے داماں کی

الٰہی خیر ہو گلزارِ وحشت کی مرے پیچھے
وہی رنگینیاں پھرتی ہیں نظروں میں بیاباں کی

نگاہِ شوق بزمِ ناز و جلوہ ہائے رنگیں ہیں
معاذ اللہ کتنی سرخیاں ہیں بزمِ امکاں کی

تغافل لاکھ برتو تم مگر یاد آ ہی جاتی ہے
نوازش ہائے پیہم کی عنایت چشمِ گریاں کی

قتیلِ حُسن کو حاجت نہیں دفن و کفن کی کچھ
لحد بن جائے گی خود خاک اُڑ اُڑ کر بیاباں کی

خدا رکھے سلامت جوشِ مستی کو مری عفّت!
اسی سے زندگی کا کچھ پتہ ملتا ہے انساں کی

غ

غزالہ بریلوی

حسن آرا بیگم نام، میمونہ خطاب اور غزالہ تخلص ہے۔ محترمہ میمونہ غزالہ آمنہ خاتون عفت، رابعہ خاتون پنہاں اور بلقیس جمال کی چھوٹی بہن ہیں۔ یہ چاروں بہنیں اردو کی گرامی قدر شاعرات ہیں۔ اور بہت خوب کہتی ہیں۔

آپ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن محترمہ آمنہ خاتون عفت نے اپنی زیر نگرانی لکھوا کر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:-

"میمونہ غزالہ بریلوی دختر چہارم شیخ مولنا مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم سپرنٹنڈنٹ ڈی۔پی۔آئی۔آفس الہ آباد۔ بمقام سہارنپور نومبر ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں۔ اور اوائل عمر میں الہ آباد اپنے والد کی جائے ملازمت پر مقیم رہیں۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم اپنی ہمشیرہ محترمہ رابعہ پنہاں سے حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں شاعری اور مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ان کے دلکش افسانے غزلیات اور نظمیں مختلف رسائل میں شایع ہوتے رہے۔ اصلاح سخن محترمہ رابعہ پنہاں بریلوی اور محترمہ بلقیس جمال بریلوی سے حاصل کی۔

جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ کی شادی آپ کے والد کے قریبی عزیز جناب مولوی احسان الحق صاحب آڈیٹر (Auditor) دہلی سے ہوئی۔ آپ کی شادی آپ کی والدہ نے اپنی حسب منشا کی۔ اب

کچھ عرصہ سے آپ کی صحت کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے علمی۔ ادبی مشاغل کم ہو گئے ہیں۔ آج کل آپ کا قیام دہلی میں ہے۔ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ بہ عنوان "غزال" شایع ہو کر بہت مقبول ہوا ہے۔ ماشاءاللہ آپ کے ۵ بچے ہیں۔ جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

آپ بچپن سے مشرقی تہذیب کی پرستار ہیں۔ اور صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ شرعی پردے کو پسند فرماتی ہیں۔ آپ رفیق القلب اور خوش مزاج ہیں۔"

محترمہ میمونہ غزالہ موجودہ دور کی ایک نہایت خوش گوار اور ممتاز شاعرہ ہیں۔ آپ نظمیں اور غزلیں دونوں خوب لکھتی ہیں۔ جذباتی اور وجدانی اعتبار سے آپ کا کلام بہت بلند ہے۔ آپ نے محاکات کی بھی نہایت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ کا کلام بہت پرکیف اور پرتاثیر ہے طرزِ ادا بہت دلکش اور صاف ہے۔ خود محترمہ کے منتخبہ اشعار جو آپ نے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:۔

اے ظلمتِ شامِ جنوں وجہ پریشانی نہ پوچھ
اے پرتوِ سوزِ دروں تمہیدِ حیرانی نہ پوچھ

میں اک حجابِ دردہوں کیا پوچھنا مژگاں کم
ہوں خوگرِ مشقِ الم اشکوں کی ارزانی نہ پوچھ

عارض ہیں برق خندہ زن اک اِس طرف اک اُس طرف
آنکھیں ہیں دو رنگیں چمن اک اِس طرف اک اُس طرف
پلکوں کی جنبش اک طرف یہ آنکھوں کی لغزش اک طرف
دو سامری ہیں خندہ زن اک اِس طرف اک اُس طرف
آنکھوں کے ڈورے اک طرف بسمل غزالہ اک طرف
دو تیر ترکش کامراں اک اِس طرف اک اس طرف

اک اشارہ سے جہانِ عشق روشن ہوگیا
ذرّہ ذرّہ غیرتِ صحرائے ایمن ہوگیا
کس کی پرتو کی جھلک سے بجلیاں لٹنے لگیں
آئینہ خانہ نویدِ برقِ ایمن ہوگیا

اضطرابِ مے خدایا کیا کروں　　ہاتھ میں پھولوں کے رنگیں جام ہے
جستجوئے ذوقِ منزل مرحبا　　اب میری پرواز نزدِ بام ہے
لوٹ لے میرا متاعِ زندگی　　اے نگاہِ نازِ یہ انعام ہے

ذیل کا کلام آپ کے کلام کا مزید انتخاب ہے جو آپ کے مختصر مجموعہ "غزال" سے پیش کیا جارہا ہے:-

بانسری بجائے جا

او حسین کافرہ　　مست و ناز مطربہ

شوخ لب مغنیہ　　اور شبلی ساحرہ

راز غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اڑائے جا
بانسری بجائے جا

میرے دل کی ابتری　　اور تیری بے خودی
میرا حالِ زندگی　　تیری زلفِ عنبری

راز غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اڑائے جا
بانسری بجائے جا

تابشِ جمال تو　　نازشِ خیال تو
رخصتِ کمال تو　　ہے دلِ غزال تو

راز غم سنائے جا
بانسری بجائے جا
خاکِ دشت اڑائے جا
بانسری بجائے جا

غزال ص۶ تا ۹

بار بار نہ پوچھ

شوقِ دیدار ایک اُلجھن ہے　　اُلجھنیں دل کی بار بار نہ پوچھ
کس لئے چشمِ نم ٹپکتی ہے　　بے قراریٔ انتظار نہ پوچھ
ایک آنسو ہے ترجماں دل کا　　حالتِ چشمِ اشکبار نہ پوچھ
دھڑکنیں بڑھ گئیں غزالؔ اب تو
دل کی حالت کا اضطرار نہ پوچھ　　(غزال ۱۷)

وہ نگاہیں شرمگیں آ کر مجھے سمجھا گئیں
خواب میں آ کر امیدیں صورتیں دکھلا گئیں
اُف ہلا پتّہ ہوا سے اور دل دھڑکا غزالؔ
چونکتے ہی چونکتے لب پر دعائیں آ گئیں
(غزال ص۱۹)

غمناک سا افسانہ

لیلیٰ کی کہانی تو برسوں کی پرانی ہے　　اک اور سنا مجنوں تازہ کوئی افسانہ
کوثر بھری آنکھوں سے مست دکھا دے ساقی　　اٹھتے ہی نظر تیری بے ہوش ہے دیوانہ
یہ تو ہے غزالہ ہی مجنوں کہو یا وحشی
ہاں دل ہے مگر اس کا غمناک سا افسانہ
[غزال ص۲۶]

محترمہ کی ذیل کی نظم آپ کے مجموعہ "غزال" میں شامل نہیں ہے :-

"ندی کنارے"

دہقاں کی پیاری لڑکی ندی پہ جلوہ زا ہے
ساری کا سبز آنچل سر سے ڈھلک رہا ہے
چتون کی سادگی میں اک برق شعلہ زا ہے
جس پر نظر پڑی وہ شعلہ بنا ہوا ہے
ہونٹوں پہ ہے تبسم نظریں جھکی ہوئی ہیں
معصوم حسنِ بے خود انگڑائی لے رہا ہے
ہاتھوں میں چوڑیوں کی رنگیں لہریاں ہیں
اک نیم باز غنچہ کانوں میں ہنس رہا ہے
معصوم سادگی میں لاکھوں تجلیاں ہیں
ماتھے کا سرخ ٹیکا شعلہ بنا ہوا ہے
مژگاں میں مست پتلی رقصاں ہے یاسمن گوں
کالی گھٹا میں کوئی انگڑائی لے رہا ہے
گیسو سے نرم جھونکے کچھ چھیڑ کر رہے ہیں
ان پیاری انکھڑیوں میں ساغر چھلک رہا ہے
بجلی تڑپ رہی ہے ہر ہر نظر میں قاتل
ہر اک ادا میں ظالم شعلہ بھڑک رہا ہے
معصومیت کی پتلی دیوی نزاکتوں کی
تیری ادائے سادہ جنت نہیں تو کیا ہے

غمخوار

آپ دہلی کی ایک ہندو خاتون ہیں۔ منورما کنول نام اور غمخوار تخلص ہے۔ اُردو سے بہت ذوق ہے۔ نظم اور نثر دونوں کے ذریعے اس کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ کلام کا رنگ نہایت پاکیزہ ہے زبان بہت شایستہ اور مہذب استعمال کرتی ہیں۔ منظر نگاری بھی خوب کرتی ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

"خزاں" (کشمیر میں)

ہر طرف پیلے پڑے ہیں لالہ زار — شعلۂ جوالہ ہے ہر اک چنار
یہ خزاں ہے یا کہ رنگین بہار؟

پتوں کے آنچل پھٹے کانٹوں میں ہیں — اور چمن کا پیرہن ہے تار تار
کس قدر ظالم ہیں یہ لیل و نہار؟

بوڑھے بوڑھے پیڑ دولہا کی طرح — پہنے بیٹھے ہیں قبائے زر نگار
ہائے پیری میں جوانی کی بہار؟

سرفروشی کا یہ عالم باغ میں — ایک جھونکا لا کے پتے گل ہزار
کر رہے ہیں اپنا اپنا سر نثار

برگ لرزاں ہیں درختوں پر کہ گل — موت کی آغوش میں ہیں بے قرار
اوڑھ کر پیلا کفن ہے سفر کا بار

مردہ پھولوں سے چمن دامن بھرے — جیسے ماں کی گود میں بیٹا مرے
کیوں نہ بجلی ہو فلک پر بے قرار

آسماں پر ہیں صدائیں بے قرار	اور زمیں پر خامشی ہے اشکبار
مر رہا ہے ایک اک زیرِ مزار

میٹھے میٹھے گیت گا کے آبشار	یا سنائے قصۂ ہائے دلفگار
ہم بھی روئیں وہ بھی روئے زار زار

ایسے روئیں رونے میں کھو جائیں ہم	رَواں رَواں ہو ہمارا اشکبار
ہائے دل کو کس طرح آئے قرار

ایک جھولا آنسوؤں کا ڈال کر	سسکیاں لے لے کے جھولیں بار بار
نالہ آئے گیت ہیں بھی لب پہ یوں
برقرار اے بیقراری برقرار

ق

قمر

آپ سید حسین صاحب ساکن دیوی شریف کی صاحبزادی ہیں اور قمر تخلص کرتی ہیں۔ طرز ادا صاف اور زبان شستہ ہے۔ کلام میں روایتی و تخیلی پہلو غالب ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

ساون

اٹھی انگڑائیاں لیتی جو گھٹا ساون کی	چلی بل کھاتی ہوئی بادِ صبا ساون کی
تیرے بیمارِ محبت کو سلانے کے لئے	رات بھر لوریاں دیتی ہے ہوا ساون کی
جھولا پھولوں کو جھلاتی ہے گلستاں میں بہار	جوشِ مستی سے مگر تن کے ہوا ساون کی

ہو گئے زخم مرے دل کے ہرے آپ سے آپ
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی کچھ ایسی ہوا ساون کی

ذہنِ دل میں لئے تازہ گلِ جذبۂ عشق
ناز کرتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

میں تھا وہ تفتہ جگر قبر پہ میری آ کر
چادرِ برق چڑھاتی ہے گھٹا ساون کی

مانگ لو بھائی سے انعام سنا کر یہ غزل!
مجھ سے کہتی ہے شمسہ اٹھ کے گھٹا ساون کی

قمر

جمیلہ خاتون نام اور قمر تخلص ہے۔ موجودہ دور کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ کلام بلند اور پُرکیف ہے۔ طرزِ ادا سنجیدہ اور صاف ہے۔ آپ کے یہاں بھی تخیلی رنگ غالب ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

خدا رکھے وہ جذبہ ہے جنونِ عشق ساماں میں
جو ہم چاہیں گلستاں کھنچ کے آ جائے بیاباں میں

یہ سایہ بھی اٹھا یا رب مری امید کے سر سے
اثر دیکھا نہیں برسوں سے اپنی آہِ سوزاں میں

شہیدانِ وفا ایسا نہ ہو بیدار ہو جائیں
ذرا اے بادِ صرصر بچ کے چل گورِ غریباں میں

کمالِ شوق میں پوشیدہ رازِ کامیابی ہے
جو میں چاہوں بہارِ بے خزاں کر دوں بیاباں میں

مری وحشت کی تفسیریں کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

ہزاروں باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے داماں ہیں

بلا سے جان جائے یا رہے اب اے قمر اپنی
کمی باقی نہ رہ جائے کوئی قاتل کے ارماں میں

قمر

صفیہ بیگم نام اور قمر تخلص ہے حیدرآبادی خاتون ہیں آپ زیادہ تر نظمیں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ رسالہ عصمت میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

عورت

تکمیل ہوں انسان کی تصویر وفا ہوں — طاعت کے طریقوں میں ملک سے بھی سوا ہوں
آلام و مصائب کی میں ہی عقدہ کشا ہوں — اور منزل الفت کی میں ہی راہنما ہوں
انسان کی صورت میں آوازِ خدا ہوں

تہذیب و تمدن میں سدا ہاتھ بٹایا — انسان کو احساس فرائض کا سکھایا
خود صبر و قناعت پہ عمل کر کے دکھایا — اور خوگر ہمدردی و ایثار بنایا
واقف ہے مرا اک اہل بصیرت کہ میں کیا ہوں

قمر

قمر سلطان بیگم نام اور قمر تخلص ہے۔ دہلوی خاتون ہیں علم و ادب کی بڑی دلدادہ اور قدرشناس ہیں۔ اردو سے شغف ہے اور

کسی نہ کسی طرح اس کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ شعر گوئی کا شوق ہے نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتی ہیں۔ کلام پُر ترکیب اور طرزِ ادا دلکش ہے ذیل میں محترمہ کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے جو آپ نے اردو زبان پر لکھی ہے۔ یہ امر خصوصاً قابلِ لحاظ ہے کہ اس خشک اور بے رنگ موضوع کو بھی محترمہ نے اپنے خاص انداز کی بنا پر کس قدر دلکش بنا دیا ہے۔

اردو مری زباں ہے

ہاں باغ پُر خزاں ہے　　ہاں دل میں غم نہاں ہے
ہاں ہر طرف زیاں ہے　　اُمید ابھی جواں ہے

اردو مری زباں ہے

بدلے گا پھر زمانہ　　کہہ دیں گے پھر فسانہ
گونجے گا پھر ترانہ　　اردو ابھی جواں ہے

اردو مری زباں ہے

آئے گی پھر مسرت　　جائے گی پھر مصیبت
چھائے گی پھر محبت　　ہر ذرّہ شادماں ہے

اردو مری زباں ہے

اب ہے ہراس تو کیا　　ہے دل کو یاس تو کیا
میں ہوں اُداس تو کیا　　موسم تو کامراں ہے

اردو مری زباں ہے

ہمّت سے کام لوں گی　　اردو کا نام لوں گی

گردنوں کو تھام لوں گی جرأت ابھی جواں ہے
اردو مری زباں ہے

بدلیں گی پھر ہوائیں پلٹیں گی پھر فضائیں
برسیں گی پھر گھٹائیں اللہ مہرباں ہے
اردو مری زباں ہے

دل شاد ہے اثر کا روشن ہے منہ سحر کا
جائے گا غم قمر کا میرا بیاں بیاں ہے
اردو مری زباں ہے

قمر

نواب قمر جہاں بیگم نام اور قمر تخلص ہے۔ اودھ کے تعلقدار اور ایک بڑے خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ تعلیم یافتہ اور بالغ نظر خاتون ہیں۔ آپ مشرقی تہذیب کی دلدادہ اور مذہب پرست خاتون ہیں۔ آپ مغربیت اور مغربیت سکھانے والی موجودہ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں اور اس کے معائب کے خلاف آپ نے نظم و نثر دونوں میں آواز بلند کی ہے۔ آپ خواتینِ مشرق اور خصوصاً دختران اسلام کو مغربی معاشرت کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہتی ہیں۔ آپ نے سماج کے غلط رسم و رواج پر بھی تنقید کی ہے۔ آپ مسلمان مرد و عورتوں کو اسلام کا بھولا ہوا سبق پھر یاد دلانے کی خواہش مند ہیں۔ اور یہ

نیک اصلاحی اور تبلیغی مقصد آپ کے کلام میں نمایاں ہے،

تہذیب جدید کا نوحہ

نئے فیشن کے دلدادہ غضب کیا یہ ڈھاتے ہیں
سرِ بازار وہ ناموس کو اپنے پھراتے ہیں
وہ نسوانی شرافت اور عزت کو مٹاتے ہیں
کہ اپنے دوستوں کے ساتھ میں اُن کو نچاتے ہیں
جو عورت مومنہ دیندار اُن کے پالے پڑتی ہے
تو کرتوتوں سے اپنے خون کے آنسو رلاتے ہیں
نہ پرواہ خانہ داری کی نہ ہے کچھ فکر بچّوں کی
یہ جوڑے پارٹی میں اور کلب میں روز جاتے ہیں
کہاں کی ہے یہ آزادی اسے کہتے ہیں بربادی
وہ دشمن ہیں ہمارے یہ طریقے جو سکھاتے ہیں
جہالت میں کبھی دختر کو زندہ دفن کرتے تھے
مگر اب روشنی میں علم کی اس کو جلاتے ہیں
نہیں ہے اب بھی وقعت کوئی عورت کی زمانے میں
بہائم کی طرح اس کو اشاروں پر نچاتے ہیں
پسند آتی ہے یہ تقلید ان کو غیر قوموں کی
سب احکام الٰہی اپنے دل سے یہ بھلاتے ہیں
وہ عاشق ہو گئے اس درجہ دیوی پرستیا کی

کہ عورت اور غیرت بھینٹ دیوی پر چڑھاتے ہیں
یہی تعلیم نسواں فرض کی ہے کیا پیمبر نے
کہ اسکولوں میں اس کو علم موسیقی سکھاتے ہیں
سمجھتے ہیں یہ جاہل اپنے ماں باپ اور دادا کو
خدا کی شان ہے غنچے گلوں پر مسکراتے ہیں
یہ اپنی بیبیوں کو دیتے ہیں دھمکی طلاقوں کی
خلع کا دھیان بھولے سے نہیں پر دل میں لاتے ہیں
اطاعت فرض ہے شوہر کی جب وہ ہو مطیع حق
خدا سے منحرف ہو کر خدائی کیوں جتاتے ہیں
ستم یا پر نچھاور کر دیا کیوں اپنے مذہب کو
کھڑے ہوں اپنے بل بوتے پہ کیوں پیاں گنواتے ہیں
پڑھو آیات قرآنی سنو تعلیم اسلامی
خدا کی اور پیمبر کی یہ خوشنودی سکھاتے ہیں
سنو اسلام بھی آیا ہے عورت کی حمایت میں
مقولہ بانیٔ اسلام کا تم کو سناتے ہیں
تمھاری ماؤں کے قدموں کے نیچے باغ جنت ہے
سلوک اچھا کرو تم اپنی زوجہ سے بتاتے ہیں
بہت تاکید زوجہ کے لئے عدل و کرم کی ہے
جو حق اُن پر تمھارا ہے وہی ان کا بتاتے ہیں

اور ان کا نان و نفقہ مہر دینا تم پہ واجب ہے
کمائی ہیں تمھاری جاں شریک اس کو بتاتے ہیں

مگر افسوس ہے بے سمجھے ہے بے انصافیاں کیسی
انھیں کا مال کھاتے ہیں انھیں پر ظلم ڈھاتے ہیں

لغت میں لفظ عورت ہی کے معنے ہیں چھپانے کے
حفاظت کے لئے سب قیمتی موتی چھپاتے ہیں

ذرا سوچو اگر اسلام میں پردہ نہیں جائز
تو محرم اور نامحرم کی شرطیں کیوں لگاتے ہیں

نہیں خارج ہوا پردہ کبھی دنیا کے ماحول میں
خواتین سلف کے کارنامے یاد آتے ہیں

حیا ایمان کا جز ہے یہی زیور ہے عورت کا
جو غافل ہیں نہیں وہ اپنی دولت کو گنواتے ہیں

قمر ہم نے ادا اپنا کیا اک فرض تبلیغی
خدا رکھے انھیں جو ہم کو دیوانہ بتاتے ہیں

قیصر

محترمہ قیصر جہاں سولی عصمت کی مشہور شاعرہ ہیں نظمیں بہت عمدہ لکھتی ہیں آپ کا کلام پختہ اور بلند ہے۔ طرزِ ادا صاف پاکیزہ دلکش ہے زبان بہت مہذب اور شائستہ لکھتی ہیں۔

نور اس کا خانۂ تاریکِ غم سے دُور ہو
قلبِ مستغنی میں یہ بن کر سکوں مستور ہو

کافر

فرخ جمال نام اور کافر تخلص ہے، جہان آباد دہلی بھیت مسکن ہے
آپ نے مسلم گرلس اسکول علیگڈھ میں تعلیم پائی ہے۔

آپ موجودہ دور کی ایک خوش گو اور قابل قدر شاعرہ ہیں۔ آپ کی شاعری میں صرف خیال آفرینی اور لفظی صناعی ہی نہیں، جذبات کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ آپ کے اشعار بہت پُر کیف اور بلند پایہ ہوتے ہیں، زبان پر بھی آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ آپ اساتذہ کے رنگ سے متاثر معلوم ہوتی ہیں "نقاب اُلٹا" اور "آفتاب اُلٹا" بہت پامال طرح ہے جس میں خصوصاً مصحفی اور سید انشا کی یہ غزلیں آج تک مشہور ہیں:-

مصحفی ؎ جو پھر کے اس نے رخ کو لفضا نقاب اُلٹا
ادھر آسمان اُلٹا ادھر آفتاب اُلٹا

سید انشا ؎ مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب اُلٹا

اسی زمین میں مخترمہ نے بھی ایک غزل لکھی ہے اس کے اشعار ملاحظہ ہوں

بدمستی شبینہ کا ہے شباب اُلٹا — جس میکدہ میں پہنچے جامِ شراب اُلٹا
ساقی سے کر رہا ہے شکوے سنا اُلٹا — کشتی مے میں کیا کیا جامِ شراب اُلٹا
شرم و حیا نے بڑھ کر خود آئینہ دکھایا — بیتاب ہو کے میں نے بڑھ کر طرفِ نقاب اُلٹا

اُٹھتی نہیں نگاہیں شرم اے گناہِ الفت
ہم ان سے کر رہے ہیں کافر حجاب اُلٹا

کامل

زمانہ حال کی ایک پردہ نشین عفت مآب تعلیم یافتہ سنی المذہب خاتون ہیں۔ کلام صاف اور ستھرا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

پی چکے جام ترے ہاتھ سے جو اے ساقی
حشر تک اب وہ نہیں ہوش میں آنے والے

چاہئے تجھ کو بھی ہو لاش اُٹھانے میں شریک
دفن ہوتے ہیں ترے ناز اُٹھانے والے

دوست کا نام لیں آ کر سرِ بالیں دم بھر
وقتِ آخر مجھے یٰسین سنانے والے

ناز ہے ہم کو بتوں کے ہوئے شیدا اے کامل
کعبہ کی سمت نہیں اب ہند سے جانے والے

جو کچھ کہ عہد ہے ترا پورا ہی کر اُسے — او بے وفا تجھے ترے ایمان کی قسم

جب تک کہ دم میں دم ہے کہوں گا میں یہی — دیتا ہوں تجھ پہ جان تری جان کی قسم

کلثوم

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے۔ آپ کا کلام عصمت میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ ذیل کا مرثیہ جو آپ نے اپنے بیٹے بشیر کی وفات پر لکھا تھا یاس و حسرت کے جذبات کا مرقع ہے۔ اس نظم میں ایک ظاہر بیں نقاد کو، جو شاعری کو صرف الفاظ و تراکیب اور زبان کے معیار پر جانچنے کا عادی ہے، بہت سے عیب نظر آئیں گے۔ مثلاً دوسرے بند میں "میں" کے بجائے "میں" ولی و سودا کے زمانے میں جائز ہو تو ہو، اب جائز نہیں۔ ساتویں بند میں "دھیان" (بہ اعلان نون) کی بجائے "دھیان" (بغیر اعلان نون) نہایت غیر فصیح ہے۔ اس بند کے آخر میں "جگر پر سانپ لوٹنا" محاورہ غلط ہے چونکہ محاورہ دل پر سانپ لوٹنا ہے۔ اور اسی طرح کے دوسرے سب اعتراضات تسلیم۔ لیکن دراصل شاعری صرف الفاظ و زبان کا نام نہیں، شاعری نام ہے ترجمانیٔ جذبات کا اور اس حیثیت سے یہ نظم بہت بلند ہے:

ایک اُجڑے دل کی فریاد

کثرتِ غم کی سینہ و دل داغ داغ ہے — یادِ پسر سے اپنا پریشاں دماغ ہے
ناکامیوں سے خانۂ دل بے چراغ ہے — ایسے بھی ہوں گے جن کو غم سے فراغ ہے
اپنی تو ہائے زیست مصیبت میں کٹتی ہے

رنج و غم و الم میں اذیت میں کٹتی ہے

سو سو مصیبتوں سے میں پالا بشیر تھا　　اس بدنصیب گھر کا اُجالا بشیر تھا
صورت میں خو میں سب سے نرالا بشیر تھا　　میرے چمن کا سروِ دو بالا بشیر تھا

چڑھتی جوانی ہی میں قضا اس کو کھا گئی
برچھی لگا گئی مجھے زخمی بنا گئی

بیٹھے بٹھائے مجھ پہ تو بپتا سی پڑ گئی　　برچھی غموں کی ہائے کلیجہ میں گڑ گئی
افسوس ہائے ہائے مری قسمت بگڑ گئی　　کیسی ہری بھری مری کھیتی اُجڑ گئی

دکھیاری غم کی ماری نہ روئے تو کیا کرے
کثرت سے غم کی جان نہ کھوئے تو کیا کرے

چین آئے کیونکر سینہ شق ہے جگر گیا　　دیکھوں جہاں میں کیا مرا نورِ نظر گیا
افسوس میرا لاڈلا اک دم میں مر گیا　　ہے ہے مٹا گیا مجھے برباد کر گیا

ہے بے قرار دل مرا سیماب کی طرح
تڑپا ہوا ہوں غم سے ماہیِ بے آب کی طرح

وہ دن کہاں گئے کہ وہ تھا شمعِ آرزو　　گھر میں اُجالا ہو رہا تھا جس سے چار سُو
ہے ہے کیسی چل گئی بے وقت کی لُو　　نغمے کے بدلے باغ میں اُلّو بولے ہے ہُو

افسوس جڑ سے نخلِ تمنا اُجڑ گیا
دم میں ہرا بھرا مرا گلشن اُجڑ گیا[1]

---

[1] چکبست کی مشہور نظم "رامائن کا ایک سین" کا ایک شعر یہ ہے ؂
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا ٭ پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

آنکھوں میں آج میری سیہ ہو گیا جہاں — اٹھتا ہے دل سے حسرتِ ارماں کا دھواں
نکلے نہ دل سے کیونکہ مرے نالہ و فغاں — افسوس لٹ گیا مری بستی میں کارواں

کچھ رحم آیا مجھ پہ نہ اے آسماں تجھے
جل جل کے کیوں جلا نہ میں دوں گالیاں تجھے

جب بھولی بھولی شکل کا آتا ہے مجھکو دھیان[۵] — گودی میں لیٹ کر وہ سنانا کہانیاں
وہ دھیمی دھیمی گفتگو اور توتلی زباں — دن رات میرے دل میں چبھوتی ہے برچھیاں

وہ لڑکھڑا کے بھاگنا جب یاد آتا ہے
میرے جگر پہ سانپ سا اک لوٹ جاتا ہے

میری کمائی لوٹ لی تو نے جو لٹ تھا — برباد میں ہوئی ترے کیا ہاتھ آ گیا
جو دل جلی کے گھر میں فقط اک چراغ تھا — بیدرد تو نے ہائے اسے بھی بجھا دیا

اے موت لے گئی تو کلیجہ نکال کر
اس غم سے کیوں کہ پھٹ کے نہ ٹکڑے ہوئے جگر

یہ مانا حکمِ حق سے تو بے اختیار ہے — بندوں کی جان لینے میں مصروفِ کار ہے
موت و حیات مرضیٔ پروردگار ہے — راہِ گریز اور نہ جائے فرار ہے

پر دل کے ہاتھوں تنگ ہوں صبر کا ہوش ہے
بے بس ہوں فرطِ رنج سے بیجا خروش ہے

---

۵ "دھیاں" میں "ن" کا اعلان ضروری ہے پھر بھی یہ بند جہاں تک ثقافت نگاری کا تعلق ہے قابلِ تحسین ہے "ج"

کنیز

محترمہ کنیز میمونہ مانڈہ کی رہنے والی ہیں۔ آپ کا کلام زنانہ رسالوں خصوصاً خاتونِ مشرق میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ محاکات اور واقعہ نگاری سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس رنگ میں اچھا لکھتی ہیں احسان و جوش کے رنگ سے متاثر ہیں۔ اشعار پُر کیف و پُر اثر ہیں، نمونہ یہ ہے :-

جا رہی ہے اک حسینہ مینڈھ پر　　　گاؤں سے کچھ فاصلے پر ننگے سر
بھوک کی شدت سے چہرہ نڈھال　　　فرطِ غم سے آرزوئیں پائمال
چشم سے لبریز پیمانے عیاں　　　آنسوؤں سے غم کے افسانے عیاں
ہائے یہ اٹھتی جوانی کا جمال　　　یہ حسینہ اور روٹی کا سوال
اس کو کھانا پیٹ بھر ملتا نہیں　　　کوئی غم کی داستاں سنتا نہیں
گرد سے ہیں اَٹے معصوم بال　　　خشک ہو کر رہ گئے رنگیں بال
زرد رنگی کی ہے عارض پر نقاب　　　جس طرح بادل کی تہہ میں ماہتاب
حسرتیں ارمان ہیں بکھرے ہوئے　　　حادثاتِ زندگی گھیرے ہوئے
اوڑھنے کو اک دوپٹہ بھی نہیں　　　آہ گردوں تو کسی کا بھی نہیں
زندگی گرداب میں آئی ہوئی　　　آبرو کی ناؤ چکرائی ہوئی
آسماں کی کج روی افسوس ہے　　　حسن کی یہ مفلسی افسوس ہے
آہ ہندوستان! تیری لڑکیاں　　　اس طرح سے ٹھوکریں کھائیں کہاں[1]

[1] صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ ۵ آہ یہ آفات سے بربادیاں ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ تیری اب یہ حالت ہو گئی — تیری قسمت منہ چھپا کر سو گئی
دل بھر آتا ہے تری برسات سے — درد اٹھتا ہے ترے نغمات سے
آہ ہندوستان ایسا انقلاب — سرنگوں ہے تیرے امن میں شباب
ہے زمانے میں سکوں شاید محال
اب ہیں سمجھی زندگانی کا مآل

ل

لطیف

لطیف النساء بیگم نام اور لطیف تخلص ہے۔ حیدرآبادی خاتون ہیں آپ سید مظفر الدین سابق مہتمم پولیس کی دختر اور سید یوسف علی صاحب لکچرار سٹی کالج حیدرآباد کی شریکِ حیات ہیں۔

ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز ہائی اسکول حیدرآباد میں ہوئی اور پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اب محبوبیہ گرلز اسکول میں معلمہ ہیں۔ نظم و نثر دونوں لکھتی ہیں۔ رسالہ سب رس کی خصوصی مضمون نگار ہیں۔ آپ کی نظمیں سادہ، سہل اور عام فہم ہوتی ہیں۔ آپ زیادہ تر بچوں کے لئے لکھتی ہیں اور اس کا خیال رکھتی ہیں کہ خیالات اور طرزِ ادا دونوں بچوں کے حسبِ حال ہوں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

زبیری اپنی جتا رہے تھے — نذیرن اپنا بنا رہے تھے
پکڑ کر لائے تھے اک مکوڑہ — بہن کو اپنی ڈرا رہے تھے

سہم کے ہلتی تھی پیچھے مریم | یہ "باؤ" کہہ کر جو آ رہے تھے
غریب بچی ہلاک رہی تھی | ذکی میاں کھلکھلا رہے تھے
نہ کھایا یا قدرت کو ظلم ان کا | جو بے خطا کو ستا رہے تھے
مکوڑے سے اب جو کاٹ کھایا | سزا کئے کی یہ پا رہے تھے

تڑپ رہے تھے دبائے انگلی
بری طرح بلبلا رہے تھے

لیلیٰ

لیلیٰ بیگم نام اور لیلیٰ تخلص ہے۔ حیدر آباد دکن کی شاعرہ ہیں آپ سید امین الحسن صاحب ناظم عدالت حیدر آباد دکن کی شریک حیات ہیں۔ شاعری کا شوق ہے۔ اپنے شوہر ہی سے تلمذ حاصل ہے۔ آپ کا کلام ادبی رسائل میں شایع ہوتا ہے۔ آپ کے کلام میں خیالات کی بلندی، رنگینی اور لطافت موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

اس انداز سے آئے غصہ میں وہ | کہ سر آگ ستم مدعا ہو گیا
محبت کا اعجاز میں کیا کہوں | بڑھا درد، بڑھ کر دوا ہو گیا[1]

---

[1] غالب ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
محترمہ انوار فاطمہ شمیم لکھنوی
شاید اب عشق ہو گیا کامل | غم میں لذت سی پا رہی ہوں میں

م

محبوب

محبوب جہاں نام اور محبوب تخلص ہے، دورِ حاضر کی ایک اچھی غزل گو شاعرہ ہیں، آپ کی صرف ایک طرحی غزل ملی ہے، زبان شستہ اور طرزِ ادا صاف و پاکیزہ ہے۔

کروں میں اس سے عرض مدعا کیا — وہ سمجھے گا وفا نا آشنا کیا
تمنا تک ہے لطفِ زندگانی — تمنا مٹ گئی تو پھر رہا کیا
نہ اب وہ بال و پر ہیں اور نہ جرأت — چھٹے بھی گر قفس سے تو مزا کیا
سنیں جب میری باتیں ہنس کے بولے — یہ ہے تمہید عرضِ مدعا کیا
نہیں جب ان کو اندازہ جفا کا — تو کیا سمجھیں گے وہ میری وفا کیا

محبت میں جو اے محبوب گزری
کہیں اب تم سے اس کا ماجرا کیا

مخفی

سعیدہ جہاں نام اور مخفی تخلص ہے آپ کے خود نوشتہ حالات جو آپ نے راقم الحروف کو اس تذکرہ کے لئے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:—

"میں ۱۵ر جولائی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی معظم و بزرگ مولوی محمد شفیع خاں سے حاصل کی جو اردو، فارسی

اور عربی میں خاصی قابلیت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ شاعر بھی تھے۔ آپ کے صاحبزادے محمد علی خاں آثر رامپوری کے نام سے مشہور ہیں۔ اُردو، فارسی کی تعلیم مولوی صاحب موصوف سے حاصل کی لیکن جلد ہی تعلیمی سلسلہ ختم کرنا پڑا کیونکہ پندرہ سال کی عمر میں ۷ ارجنوری ۱۹۳۱ء کو شادی ہوگئی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بارہ تیرہ سال کی عمر میں پیدا ہوا۔ ویسے تو یوں ہی والدین کے حکم کی تعمیل تھی لیکن شوق جوں کا توں رہا کیونکہ شادی، عورت ہونے اور گھر بار کی ذمہ داری کا سارٹیفکٹ تھی اب اتنی مہلت کہاں تھی کہ از سرِ نو اس کا اعادہ کیا جاتا لیکن ہمت اور ذوقِ حقیقی نے پھر ایک کروٹ لی اور دل کے اندر دبی ہوئی چنگاری رفتہ رفتہ آتش فشاں بن گئی روزمرہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی ابتدا میرے شوہر رحمت نبی خاں نے کرائی۔ ایک ماہ بعد استاد ہمت ہار بیٹھے لیکن شاگرد کو اور بھی زیادہ شوق پیدا ہوگیا کچھ خانگی معاملات ایسے تھے جن کی وجہ سے کوئی اُستاد یا اُستانی مقرر کر کے باقاعدہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بالآخر چھوٹے چھوٹے بچوں سے مدد لے کر ڈکشنری کی امداد سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی۔ میرے ذوقِ علمی کو مدِ نظر رکھ کر رحمت نبی خاں صاحب کے اُستاد قاضی صولت حسین خاں صاحب ایم۔ اے نے رائے دی کہ مجھے منشی الہ آباد کے امتحان میں شرکت

کی لہذا بغیر کسی استاد کے (کیونکہ بچپن کی اردو۔فارسی تعلیم تھوڑی بہت تھی) امتحان میں شرکت کی اور کامیاب بھی ہوئی اس کے بعد میرے کرم فرما ماسٹر صولت حسین صاحب کی کوشش اور آپ کی امداد سے میں نے میٹرک امتحان پاس کیا اس کے بعد رفتہ رفتہ اتنی سہولت ہوگئی کہ میں ماسٹر صاحب موصوف سے گاہے گاہے اپنی مشکلات حل کر لیا کرتی تھی۔ اور آپ نے انتہائی جانفشانی اور کوشش سے الیف۔اے کا امتحان دلا دیا۔حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے جو کچھ بھی ملا وہ ماسٹر صولت حسین صاحب کی شفقت اور مہربانی سے ملا۔ انھوں نے ہی مجھے ترقی کی راہ دکھلائی۔صاحب موصوف معزز خاندان سے ہیں خاندان مغلیہ سے خطابات بھی حاصل کئے ہوئے ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی ان کے عزیز معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔ عربی کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد جان بیگ سے حاصل کی۔

تہذیب نسواں میں متعدد مضامین شائع ہوتے رہے اور دوسرے رسائل مثلاً ایشیا وغیرہ میں بھی ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے کئی ڈرامے "نیچر" "سوتیلی ماں" "دلہن" وغیرہ براڈکاسٹ ہوئے شوہر کی تعلیم کے سلسلہ میں علیگڑھ جانا پڑا۔ وہاں ادبی ذوق سے کافی متاثر ہوئی۔ محترم قبلہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے ادبی نکات وباریکیاں سمجھائیں اور اپنی شاگردی کا شرف بخشا جو میرے واسطے

باعثِ صد افتخار ہے۔ مختصر یہ کہ ابتدا مولوی محمد شفیع خاں نے کرائی اور تکمیل پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی قبلہ نے۔ ان کی رائے سے اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا۔ شاعری کا شوق بچپن سے رہا اور اس دوران میں جب موقع ملا کچھ نہ کچھ کہہ گزری۔ سب سے پہلی چیز آل انڈیا اُردو کانفرنس بریلی کے موقعہ پر کہی جو مصرعۂ طرح پر لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور فوراً ہی علیگڑھ جانا پڑا۔ وہاں ادبی موجوں نے خوب پیاس بجھائی۔ بہت چیزیں کہیں۔ تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ گرلز کالج میں، زنانہ مسلم کانفرنس میں برابر موقع ملتا رہا اور میرے ذوق کو تسکین ملتی رہی۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک سیاسی پمفلٹ نکالا۔ ایک ڈرامہ اسٹیج کے لئے تیار کیا۔

خاندان کے متعلق مصنف کی معلومات کافی ہیں۔ راقمہ ”مخفی“

محترمہ مخفی جناب قمر شاہ خاں صاحب بی-اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا کی صاحبزادی ہیں جو رامپور کے ایک مشہور اور بڑے رئیس ہیں۔ محترمہ کے خاندان میں زمانہ قدیم سے ادبی ذوق چلا آرہا ہے۔ آپ کے جدِ امجد کے یہاں ہمیشہ شاعروں کا ہجوم رہا۔ آپ کے والد کے نانا محمد عثمان خاں صاحب رامپوری کا تذکرہ مولانا احسن مارہروی کی ”تاریخ نثر اُردو“ حصہ اول اور شوق رامپوری کے تذکرہ کاملان رامپور میں موجود ہے۔ آپ کی شادی

جناب رحمت نبی خاں صاحب ایم۔ اے دعا بیگ صاحب سے ہوئی ہے جو راقم السطور کے دوست اور ہمدرس رہ چکے ہیں، آپ جناب جمیل خاں صاحب رئیس رام پور کے صاحبزادے ہیں اور بریلی میں مقیم ہیں۔ اس نسبت سے محترمہ مخفی اکثر ادبی دنیا میں "سعیدہ رحمت نبی بریلوی" کے نام سے معروف ہیں۔

محترمہ مخفی موجودہ دور کی ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ خاتون ہیں آپ خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی خواہشمند ہیں اور ان کو علم اور زندگی کی برکتوں سے فیض یاب دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ نے اپنے ان جذبات کا اظہار اپنی اکثر نظموں میں فرمایا ہے، نظموں کے علاوہ آپ غزلیں بھی لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام صاف و پُراثر، اور اسلوب بیان پاکیزہ ہے۔

ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ محترمہ کا خود منتخبہ کلام ہے جو آپ نے اس کتاب کے لئے ارسال فرمایا ہے۔

غزل[1]

چشم تر دیکھ، غم دل نہ نمایاں ہو جائے	عشق کے سامنے ذرحسن پشیماں ہو جائے
جانتا ہوں میں تمنا کو گناہِ اُلفت	عشق وہ ہے جو نہاں رہ کے نمایاں ہو جائے
اپنی مجبوریِ اُلفت کا فسانہ کہہ کر	ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ نہ پشیماں ہو جائے

---

[1] یہ ایک طرحی غزل ہے مصرعہ طرح یہ تھا "جو نظر بھر کے تجھے دیکھ لے حیراں ہو جائے"

داغِ اُلفت کی تجلّی جو نمایاں ہو جائے
شعلۂ طور بھی اک بار پشیماں ہو جائے
ضبطِ غم سے نہیں یارائے خموشی مجھکو
تم جو کچھ پوچھ لو مشکل میری آساں ہو جائے
کاش یوں برق گرے خرمنِ دل پہ مخفی
ذرّہ ذرّہ مری ہستی کا فروزاں ہو جائے

بیداریٔ نسواں[1]

اپنی کھوئی ہوئی توقیر نمایاں کر دیں
کیوں نہ تاریکیٔ محفل کو فروزاں کر دیں[2]
نورِ سلطانہ و رضیہ کی حمیّت کی قسم
عظمتِ رفتہ سے دنیا میں چراغاں کر دیں
فاطمہ زہرہ کے دل دوز تحمّل کی قسم
گنبدِ چرخ کو اک بار تو لرزاں کر دیں
جبر اور ظلم کی بنیاد کو ڈھا کر باہم
آؤ اب ہمّتِ مردانہ کو حیراں کر دیں
تفرقے سارے یہ آپس کے مٹا دیں ہم
آؤ اب جرأتِ نسواں کو نمایاں کر دیں
ہند ویران ہوا ہم کو ہی مخفی رکھکر
اٹھو اس اُجڑے گلستاں میں بہاراں کر دیں

غزل

بتا دو تمھیں میری چاہت نہیں ہے
جدائی ہماری قیامت نہیں ہے

---

[1] یہ نظم آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ کانفرنس کے موقعہ پر علیگڑھ میں فاطمہ جناح کی صدارت میں سنائی گئی۔

[2] علامہ اقبال رح
اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

نہیں ہے تمھیں مجھ سے الفت نہیں ہے
بناوٹ ہے ساری یہ چاہت نہیں ہے
نہیں تم سے ملنے کی حسرت نہیں ہے
مگر دور رہنے کی طاقت نہیں ہے
تمھیں یاد کرنے کی فرصت نہیں ہے
ہمیں بھول جانے کی عادت نہیں ہے

نہ کنزا اور رسنہ نہ گھبرائیے بھیا کو
نہیں ہے یہ مخفی کی تربت نہیں ہے

"اُمید"

غم مخفی ہی علاج غم نسواں ہو گا
درد دل آپ ہی اپنا درماں ہو گا

ہو جو تاریکی بہم ہے تو غم کیا بہنو
بے بسی بے کسی ہمدم ہے تو غم کیا بہنو
غیرت مرد ہی برہم ہے تو غم کیا بہنو
نالش غم ہی علاج غم دوراں ہو گا

(۲)

منہ چھپائے گا خود اندوہ کو صیاد مہیب
ہو گی بربادی ہی آبادی نو کی تقریب
غرق ہو جائے گا اک روز طلسم تخریب
جب تمھیں اپنا خیال غم پنہاں ہو گا

(۳)

یہ گھٹائیں جو اٹھی ہیں افق دوراں سے
داغ مٹ جائیں گے اب سینۂ ہندوستاں سے
پھول برسیں گے یہیں پردۂ نسواں سے
دہر اب نازکش ہمت نسواں ہو گا

(۴)

دور ہو جائے گا اک روز جہالت کا فساد
قہر اور مکر سے ہو جائے گی دنیا آزاد
ہاں چکائے گی زمانہ کو ہماری فریاد
خنجر حق جو اسی طرح نمایاں ہو گا

(۵)

عقل و انصاف کا لہرائیں گے پرچم بڑھ کر بنتِ حوا کے لئے لائیں گے عزت بڑھ کر
زیست کو بخشیں گے تسکین جو عالم بڑھ کر یہ جہاں باعثِ صد عزتِ نسواں ہوگا

(۶)

دشت کو باغ بنا دے گی ہوائے دوراں سرِ مغرور جھکا دے گی صدائے نسواں
پھر نظر آئے گا ہر فرد ہی شاداں فرحاں دامنِ ہند گل افروز بہاراں ہوگا

(۷)

ہاں جہالت کا یہ تاریک زمانہ کب تک قید اور بند کا دل سوز فسانہ کب تک
اور رسوماتِ کہن کا یہ بہانہ کب تک ہوگا مہتابِ حقیقت کا درخشاں ہوگا

(۸)

خانۂ امن و مساوات بنے گی دنیا غیرتِ جنتِ فردوس بنے گی دنیا
عدل و انصاف کا گہوارہ بنے گی دنیا اخترِ امن و مساوات نمایاں ہوگا

(۹)

اب نہ ہم بارِ اذیت یہ سہیں گے بہنو غم میں ہم ہیں نہ اب ایسے پھنسیں گے بہنو
اپنی ہمت سے پھر اب ایسے بنیں گے بہنو ہر بشر قوتِ احساس پہ حیراں ہوگا

(۱۰)

شمعِ بیداریٔ نسواں ہی چراغاں ہوگی زندگی سر بکفِ احساس پہ نازاں ہوگی
آگہی جرأتِ نسواں پہ جو حیراں ہوگی ہند گلزارِ گل افروز گل افشاں ہوگا

(۱۱)

پست نظروں سے نہ دیکھے گا کوئی اب ہم کو — کیسے نظروں سے گرائے گا کوئی اب ہم کو
کیسے نفرت سے پکارے گا کوئی اب ہم کو — چرخ پہ کوکبِ نسواں ہی درخشاں ہوگا

(۱۲)

روح بیداریٔ احساس پہ یوں مائل ہے — ہم کو بیداریٔ نسواں کا یقیں کامل ہے
دردِ دل، دردِ جگر، سوزِ وفا حاصل ہے — جذبِ دل جرأتِ نسواں ہی پہ نازاں ہوگا

(۱۳)

غمِ دل اپنا جو تحفی سے سنو تم ہمدم — درسِ تاریخ کا ہم سے کچھ اب سیکھو
داستانِ خالدہ ترکی کی ذرا تو دیکھو — یوں ہی اقبال تمہارا بھی شایاں ہوگا

(۱۴)

جگمگا دے گا جہاں کو یہ مرا عزمِ شباب — ہاں ہلا دے گا فلک کو یہ مرا عزمِ شباب
اب مٹا دے گا غلامی کو مرا عزمِ شباب — دلِ پژمردہ جو تقدیر پہ خنداں ہوگا

دخترِ اسلام سے خطاب

دخترِ اسلام تو آغازِ خوش انجام ہے
تو نہیں شامل تو ہر کارِ جہاں ناکام ہے[1]
کیوں نہیں آزاد ہوتی ان قیودِ خام سے

۱۔ علامہ اقبالؒ — در معرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی (ضربِ کلیم)

کیوں پریشانی ہے تجھ کو اس اندھیری شام سے

دردِ قومی کی تڑپ سینے میں گر پاتی ہے تو

سوزِ ملت کی خلش کا کچھ اثر پاتی ہے تو

قوم تیری کیوں تباہی کی طرف جاتی ہے اب

سوچ کر شاید یہی اس درجہ شرماتی ہے تو

ظلمتِ دیرینہ میں آخر چلی جاتی ہے کیوں

بحرِ افکارِ مسلسل میں بہی جاتی ہے کیوں

تیرا ساحل چھوٹتا ہے اور تو خاموش ہے

تیرا بیڑا ڈوبتا ہے اور تو خاموش ہے

دوسری قومیں فضیلت پا رہی ہیں تجھ پہ اب

زحمتوں پر زحمتیں کیوں چھا رہی ہیں تجھ پہ اب

یادگارِ عظمتِ رفتہ ہے تو! خاموش ہے!!

دل فگار اب غیرتِ رفتہ ہے تو! خاموش ہے!!

یاد کر پچھلے سبق، پچھلی وفا، پچھلی وہ شان

یاد کر وہ آن اب اے دخترِ ہندوستان

ہاں الٹ خودداریٔ نسواں کے وہ پہلے ورق

یاد کر تہذیب اور اخلاق کے بھولے سبق

تیری دنیا لٹ رہی ہے تو بھی اب بیدار ہو

چپ پڑی کیوں گھٹ رہی ہے تو بھی اب بیدار ہو

ہاں خدارا رحم کر یہ خوابِ غفلت کب تلک؟
جبر واستبداد یہ قہر و ذلّت کب تلک؟
رفعتِ نسواں دکھا دے بس ابھی اک آن میں
نغمۂ شیریں سنا دے آج اپنی شان میں
اپنے پاکیزہ تخیّل کی بلندی سے کے آ
دخترِ اسلام شانِ ارجمندی لے کے آ
خنجرِ حق ہاتھ میں لے شورِ آزادی مچا
عزم کے طوفان بہا، انصاف کے بادل اٹھا
ذوق میں زیب النسا بن ہمّتِ رضیہ دکھا
عقل میں تو نور بن اور عفّتِ زہرہ دکھا
پھونک دے تو اپنی آہوں سے خس و خاشاک کو
سرد کر دے آنسوؤں سے بیکسی کی آگ کو
عزم میں تو خالدہ بن جرأتِ سلمیٰ دکھا
حلم میں تو فاطمہ بن رفعتِ اسمیٰ دکھا
اپنی آزادی کے نغمے گا کے دنیا کو جگا
اور اپنے طالعِ خفتہ کو بیداری سکھا
عشرتِ ثروت کو بیچا عیش سامانی کو چھوڑ
اپنی راہیں یاد کر اندازِ دیرانی کو چھوڑ
اپنے احساسِ خودی کو آہ تو نے کیا کیا

آدمیت کی سعی کو آہ تو نے کب کیا

چھوڑ دے فیشن پرستی، اور تباہی کے چلن
کھول دے اب راز ہستی بھول مستی کے چلن

تو نہیں زندہ فقط اپنے لئے یہ جان لے
رحمت کونین ہے میرا کہا تو مان لے

خود پرستی خود نمائی یہ نہیں تیرا شعار
پست نظری خود ستائی یہ نہیں تیرا شعار

بیکسوں کا تو ہے سہارا، بے نواؤں کی سکوں
تو غریبوں کی مدد کر، دے یتیموں کو سکوں

تو سہارا ڈھونڈھتی ہے خود سہارا بن کے آ
خونِ ملت سرد ہے اب تو شرارہ بن کے آ

طالبِ امداد تو ہو غیرتِ نسواں کہاں
تو کسی کے کام آ، پھر دیکھ یہ حرماں کہاں

اپنے اخلاق و ہنر، آداب و تہذیب کمال
وقف کر دے خدمتِ عالم کو اپنے جان و مال

دخترِ اسلام اپنی شان اب مخفی نہ رکھ
جوش میں آ کر ذرا ایمان اب مخفی نہ رکھ

مخفی

صالحہ بیگم نام اور مخفی تخلص ہے آپ خاتون مشرق کی مخصوص شاعرہ ہیں۔ اور زنانہ رسالوں میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا کلام صاف اور اسلوب بیان دلکش ہے۔ نمونہ یہ ہے :-

ساقی گلعذار آ بلبل نغمہ بار آ رحمت کردگار کو ساتھ لئے بہار آ

شورش اضطراب ہے یاد رخ نگار آ مونس و غمگسار آ راحت جان زار آ

ساقی کہاں کدھر ہے خم ہوش کا بھی پتہ نہیں ساغر دل میں غیب ہے بادۂ خوشگوار آ

آتا ہے کون پوچھنے ہجر کے غم نصیب کو تیرا ہی انتظار ہے بہر خدا قرار آ

خشک شجر امید کا کرتے ہے پتے خدا ہرا آس لگی ہے منتظر جلد تو اے بہار آ

شاخوں سے پھول کیا ہوئے کس کا یہ دست ظلم تھا حشر بپا چمن میں ہے بلبل سوگوار آ

حسن سے اور عشق سے نظم ہے کائنات کا سارے جہاں میں اے ندیم جا کے ذرا پکار آ

قبر شہید ناز پر پھول کبھی چڑھے نہیں دوش سے اپنے فرض کو جا کے تو ہی اتار آ

ہو شب ہجر کو زوال ملنے لگن ہے آس پال باد صبا تو جا ذرا زلف صنم سنوار آ

تیرے طلوع صبح میں تو ہے نمود نما میں دل کے اس آئینہ میں بھی عکس جمال یار آ

تیرے سوا کوئی نہیں مخفی غم نصیب کا
خانۂ دل ہے گھر ترا اس میں تو بار بار آ

مدنی

شہنانہ بیگم نام اور مدنی تخلص ہے۔ ورنگل (دکن) میں قیام ہے

زنانہ رسالوں میں اکثر آپ کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور خواتین کو مغربی تہذیب و تعلیم کی ہلاکت آفرینیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپ کے کلام میں بھی زور خیالات کا اثر موجود ہے۔ آپ کا کلام صاف اور سنجیدہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

جہاں کا رنگ پلٹا اور زمانہ کی ہوا بدلی
اثر تہذیب مغرب کا یہ ہے ساری فضا بدلی

فقط تعلیم نسواں سے نہ اک دہ ہو خصوصیت
مسلمانوں کی طرز زندگی حد سے سوا بدلی

ہمیں آزادیٔ مغرب نے بے پرواہ کیا اتنا
کہ جس فیشن کو دیکھا اپنی نیت برملا بدلی

ہمارا خلق بدلا، ڈھنگ بدلا، ہر عمل بدلا
ہماری چال بدلی، طرز بدلی، ہر ادا بدلی

ہوائے مغربی نے جوش غیرت تک کیا ٹھنڈا
کہ جنتی آج اپنی فطرتی شرم و حیا بدلی

مضطر

محترمہ رفیعہ بانو رضویہ

محترمہ مضطر رضویہ دور جدید کی شاعرات میں ایک بلند درجہ رکھتی ہیں۔ آپ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور قطعات غزلیں اور نظمیں سب کچھ لکھی ہیں۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور پُر کیف ہے

جذبات اور وارداتِ قلب کی ترجمانی آپ کا خاص جوہر ہے۔ آپ کے یہاں روحانیت کے گہرے نقوش ملتے ہیں جنھوں نے آپ کے کلام کو بہت دلدوز اور پُراثر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی طرح چاندنی اور ستارے آپ کی شاعری کے مخصوص و مرغوب موضوعات ہیں۔ آپ کے اس قسم کے اشعار بغایت بلند و دلکش ہوتے ہیں۔ آپ دنیائے ادب میں صرف ایک خوش گو شاعرہ ہی کی حیثیت سے متعارف نہیں بلکہ آپ ایک بلند پایہ اور انشا پرداز۔ مضمون نویس اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ آپ کے افسانے اور مضامین اکثر ادبی رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا طرزِ بیان پاکیزہ اور اسلوب دلکش ہے۔ زبان پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

محترمہ مظہر رضویہ نے اپنے حالاتِ زندگی اور شاعری پر جو روشنی ڈالی ہے وہ شکریہ کے ساتھ درج ذیل کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کا منتخبہ مرسلہ کلام بھی شکریہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

میری شاعری

"جناب مصنف صاحب کا اصرار پیہم ہے کہ میں ان کی کتاب کے لئے اپنے حالات لکھوں" "کیا ضرورت ہے کہ نشتر کی رگوں سے زخموں کی مزاج پرسی کی جائے اور کانٹوں کی نوکوں سے پھولوں کا ہار گوندھا جائے" میں کیا اور میرے حالات کیا۔ کچھ یہ نہیں کہ میری زندگی خدا نہ کرے کوئی ناکام زندگی ہے نہیں بلکہ میرے اس

انجماد اور افسردگی کا سبب میری خرابیٔ صحت ہے۔ اِسی کے باعث زندگی کا محبوب مشغلہ "فکرِ سخن" بالکل ترک نہیں ہوا تو کم ضرور ہو گیا ہے۔

"جو شغل کبھی "شغلِ حیات" تھا اب وہ ماضی کا بھولا ہوا خواب ہے، اللہ رے نیرنگیٔ زمانہ! آہ وہ دلچسپ مصروفیتیں، وہ مچلتی ہوئی شاعرانہ مشغولیتیں اب کہاں؟ حق تو یہ ہے کہ شادی کے بعد کوئی عورت تخیل پرست نہیں رہ سکتی، اگرچہ اس کو کتنی ہی آزادیاں میسر ہوں، سکون و اطمینان حاصل ہو۔ لیجئے میں اپنی شاعری کا نوحہ پڑھنے بیٹھ گئی مجھے تو اپنے حالات لکھنے ہیں۔

"میری پیدائش ۱۹۲۰ء میں بمقام مامن (ضلع بلند شہر) ہوئی۔ میرا پورا نام رفیعہ بانو مظہر رضویہ ہے۔ مجھے ابتدا ہی سے شعر و سخن سے بڑی رغبت تھی۔ کچھ فضا بھی حسنِ اتفاق سے شاعرانہ ملی تھی۔ والد مرحوم فارسی اشعار کے گویا لغت تھے۔ مجھے بہت بچپن سے انھوں نے حافظ و سعدی وغیرہ کے چیدہ چیدہ اشعار ازبر کرا دیے تھے۔ ۳۰ء میں میں نے گل و بلبل سے متعلق ایک شعر کہا تھا۔ سب سے پہلا شعر ذرا سنئے تو کیا عجیب سا تخیل ہے

ہمیشہ مست تم رہتے ہو اپنی خوشبوؤں میں خود ؎

اثر کیا ہوئے گا تم پر گلو شورِ عنادل کا

" اس وقت میرے والد مرحوم انتقال فرما گئے تھے برادرِ گرامی

رفیق رضوی رفلم ڈائرکٹر) نے جب شاعری سے میرا یہ انس دیکھا تو بہت خوش ہوئے انہی کی کاوش و محنت کا نتیجہ تھا جو میں اتنی جلد شعر کہنے لگی۔

"عام لڑکیوں کی مانند گھر پر اردو، فارسی کی تعلیم حاصل کی بھائی بمبئی میں اک گمنام سے گاؤں میں۔ محض اعلیٰ درجہ کے رسالوں کتابوں اور لغت کی مدد سے میں نے بغیر کسی اتالیق کے اپنے میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ نظمیں مضامین اور افسانے خدا کے فضل و کرم سے خاصے لکھ سکتی تھی۔ مجھے اپنے دماغ پر خود ناز تھا، عصرِ حاضر کے بہت سے مردانہ و زنانہ رسائل میں میرا کلام شائع ہوتا تھا۔ میری شاعری کا انتہائی عروج ۱۹۴۰ء تک ہے اس کے بعد گویا انحطاط کی ابتدا ہے۔ میری شادی ۱۹۴۰ء میں سید ارشاد حسین بی اے سے ہوئی۔ میرے خسر صاحب مرحوم سید اخلاق حسین صاحب دیوان تھے۔ مرحوم کا تذکرہ خمخانہ جاوید جلد اوّل میں آچکا ہے۔ خدا کے فضل سے میری سسرال والے شعر و ادب کے شائق اور اہلِ مذاق ہیں۔ یہاں بھی ماحول اچھا ملا۔ مگر دل و دماغ کی کیفیت نہیں کہی جا سکتی کہ کیا ہوگیا۔ اور اگرچہ شادی کے بعد بھی میں نے کافی عرصہ تک نظمیں کہیں۔ مگر میرا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ عہدِ دوشیزگی کے تخیل میں جو رومان جو شعریت جو حسن، اور جو جوانی تھی وہ بعد شادی کچھ عرصہ تک قائم رہی۔

پھر بالکل فنا ہوگئی۔ حالانکہ نہ زندگی ایک کامیاب زندگی تھی،
کیا یہ اک ناقابلِ فراموش حقیقت نہیں کہ "تکمیلِ آرزو" ہی
آرزو کی موت ہے [1]

"میں ابتدا میں اپنا کلام رشتہ کے ایک بزرگ کو دکھاتی تھی
لیکن جب تمام اعزہ میری تعلیم اور میری شاعری کے خلاف
نظر آئے تو بھائی جان کے اک دوست جناب احسن رضوی داناپوری
سے اصلاح لینے لگی، وہ بھی کچھ عرصہ تک، پھر تو اللہ کا نام لیکر
افسانے اور مضامین تو بالکل ہی اور کچھ نظمیں بھی بغیر کسی کو دکھائے
شائع کروانے لگی۔

لیجئے اب انتخاب کلام ملاحظہ فرمائیے، پہلے کچھ قطعات اور
۱۹۳۹ء کی دو تین غزلیں دیکھئے۔ "راقمہ مظفر رضویہ"

قطعات

مجھ کو قدرت نے ودیعت کی ہے وہ حسنِ لطیف
روح میں چبھتی ہے نرم و پاک پھولوں کی شمیم
جگمگا اٹھتے ہیں میرے نوجواں ماضی کے خواب
چھیڑتی ہے شوخ کلیوں کو جو گلشن میں نسیم

[1] نفسیاتی ادب اس فقرہ پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے "ج"

چاندنی، تارے، سمندر، فصلِ گل، کیفِ بہار
اُف یہ انبوہِ تجلی، یہ ہجومِ رنگ و بو
اس طرف زانو پہ میرے ان کا روئے نازنیں
ہاں یقیناً آج میں ہوں کامیابِ آرزو[1]

اے ستارو! چشمِ شاعر کے چھلکتے آنسوؤ
جاگ کر روتے ہو تم راتوں کو کیوں آخر کہو
دیکھتے رہتے ہو کیوں حسرت سے شاعر کی طرف
اس کے دامن میں مچلنے کی ہے کیا پھر آرزو؟[2]

ستارے!

جو چرخ پر سیمیں ستارے اس طرح ہیں منتشر
جیسے حورانِ بہشتی کی ردائے پُر نور سے
گر پڑے ہوں چند غنچے ٹوٹ کر ہنستے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی ؎
چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز　　خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

[2] ایضاً ؎　کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
نہ جانے کیا مجھے یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

یا حوادث سے فرشتے جب اثر لینے لگے!
روشن و بیتاب آنسو ان کی آنکھوں سے گرے
یا فروغ نکہت و ناشاد کامی دیکھ کے!!!
آسمانوں کی جبینوں پر پسینے آ گئے

غزلیات

جو صرف ماتم دل گیسوئے جانانہ ہو جائے
تو ہستی عشق کی الجھا ہوا افسانہ ہو جائے

سمجھ جائے اگر انسان خود رعنائی دل کو
نگاہوں میں جہانِ رنگ و بو افسانہ ہو جائے

ارے ظالم! نہ تیری پردہ داری میں اگر چاہوں
تو ہر نقطہ کتابِ دل کا اک افسانہ ہو جائے

وفورِ غم سے قوت ضبط کی اب سلب ہوتی ہے
مجھے ڈر ہے نہ ان کا راز بھی افسانہ ہو جائے

گدازِ درد میں ڈوبے ہوئے کچھ قطرے ہیں بر مژگاں
اگر تم دیکھ لو بہتا ہوا افسانہ ہو جائے

محبت راز رہتی ہے جب تک نگاہوں میں
اسی کو بیخودی کہہ دے تو اک افسانہ ہو جائے

جذبات اُلٹ دیں گے چہرے سے نقاب آخر
اک چشمِ تماشا سے کب تک یہ حجاب آخر
دنیا کی خبر بھی ہے او محوِ جفا کوشی
کب تک یہ بہاریں ہیں کب تک یہ شباب آخر
اک دل کی عبارت بھی بے ربط ہوئی مضطرؔ
افسانۂ ہستی کی ہوتی ہے کتاب آخر[1]

اب میں ہوں باعثِ رسوائی ان کے واسطے
اب وہ ہیں زندگی کا آسرا میرے لئے

منظومات

قسم!

میرے ایوانِ تخیل کے مکیں	تیرے گیسوئے معنبر کی قسم
میرے کاشانۂ ہستی کے چراغ	تیرے رخسارِ منور کی قسم
نکہتِ حسن و صبا کے پیکر	تیرے ملبوس معطر کی قسم
صدمۂ ہجر میں مشکل ہے سکوں	جذبۂ شوق و غمِ مضطرؔ کی قسم[2]

---

[1] مؤلف حضرت ؎ کیا تھا جس کو خود تُو نے مرتب ۔ وہ افسانہ بھی بکھرا جا رہا ہے

[2] جگر مرادآبادی ؎ اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنے ہم جڑتے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم

مرے لئے ہے!

جذبات کی رَو میں تیرے شعروں کی جوانی
اے شاعرِ نوخیز جواں میرے لئے ہے

رعنائیِ اندازِ بیاں ہے مری خاطر
یہ گرمیِ فریاد و فغاں میرے لئے ہے

ہر شعر میں تو شعلہ بہ لب ہے مری خاطر
ہر نظم میں تو نغمہ فشاں میرے لئے ہے

میں خود بھی ہوں واقف کہ یہاں صبر و تحمل
تو وقفِ غم و سوختہ جاں میرے لئے ہے

ہے میرے لئے حسنِ سخن تیرا تخیل
گویا ترے ہونٹوں میں زباں میرے لئے ہے

فریبِ تصور!

(ماضی کے ایک واقعہ کی یادگار)

سسکیاں لیتی ہے جب بستر پہ زخمی آرزو
جب تمنا کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو!!

روح میں جب چبھنے لگتی ہیں الم کی برچھیاں
جب جگر کو پھونکتی ہیں سوز کی چنگاریاں

آہ ان لمحوں میں وہ سرمایۂ عیشِ حیات

وہ میرا نادیدہ ہمدم وہ بہارِ کائنات
جو کہا کرتا ہے روح کے پردوں کی رنگیں اوٹ سے
اک مجسم التجا سے دیدۂ آنکھوں میں لئے!

مجھ سے کہتا ہے کہ اے مجبورۂ شعر و جمال
مطربِ عہدِ جوانی ساقیٔ بزمِ خیال

نشۂ صہبائے الفت جلوۂ حسنِ ازل
اُٹھ اُٹھا ساز زندگی کو زندہ بار نئے عمل

تجھ کو قدرت نے بنایا ہے عمل کے واسطے
جذبۂ بیدار عہدِ بے عمل کے واسطے

تو اگر چاہے تو اٹھتے آگ اٹھیں رفتار سے
آگ سی لگ جائے بزمِ گلشنیٔ افکار سے

اُٹھ خدا کے واسطے اٹھ کس لئے خاموش ہے
کیا قیامت ہے کہ ساقی آج خود مدہوش ہے

اے مری حورِ تخیل شکوۂ سنجِ غم ہے کیوں؟
بے نیازِ سے تو سراپا نالۂ و ماتم ہے کیوں؟

چونک اٹھتی ہوں یہ سن کر اپنے رنگیں خواب سے
اور ٹپک جاتے ہیں آنسو دیدۂ بیتاب سے

بیخودی میں دوڑتی ہوں صحنِ گلشن کی طرف
کھینچتی ہیں وحشتیں صحرا کے دامن کی طرف

یہ صدا سن کر دلِ مضطر سکوں پاتا نہیں
ڈھونڈھنے سے بھی مجھے کوئی نظر آتا نہیں
ہے تہی دامن مگر مقصد سے جیبِ آرزو
کون یوں کھائے تصور میں فریبِ آرزو

عزم!

بدل دوں گی نظامِ زندگی کو سعیِ پیہم سے!
زمانہ کانپ اٹھے گا مرے عزمِ مصمم سے
سماجی قوتوں کو زورِ بازو سے مسل دوں گی
میں اس تہذیب کی ناگن کو پیروں سے کچل دوں گی
یہ جھوٹی بندشیں، یہ مذاق و فکر کی پستی
یہ روحوں کی غلامی، یہ بیماری، یہ بدمستی
یہ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے افکار انسانی
یہ جھوٹی کی قربان گاہ پر ذہنوں کی قربانی
یہ خونیں آنسوؤں پر ہنسنے والی سنگدل ہستی
قدامت کے خمارِ سرگراں سے مضمحل بستی
یہ بستی جس نے ویراں کردیا آباد روحوں کو
کیا ہے قیدِ زنجیرِ جنوں آزاد روحوں کو
جہاں انسانیت کے ولولوں کا خون ہوتا ہے

جفا دستور ہوتی ہے ستم قانون ہوتا ہے

جہاں تہذیب کی بنیاد ہے اشکوں پر آہوں پر
جہاں اخلاق کی بنیاد ڈالی ہے گناہوں پر

جہاں عشق و محبت کو جنوں کا نام دیتے ہیں
درندے امن و تسکیں کا جہاں پیغام دیتے ہیں

جہاں پہرے لگائے ہیں نگاہوں پر زبانوں پر
بڑھاپے کی حکومت ہے جہاں کے نوجوانوں پر

جہاں جہل و ہوس کا نام علم و پارسائی ہے
جہاں بندوں پر انسانی خداؤں کی خدائی ہے

جہاں دوشیزگی خم ہے ہوس کے آستانوں پر
جہاں مذہب بکا کرتا ہے تقویٰ کی دکانوں پر

میں اس دنیا کو مضطر اپنے نعرے سے ہلاؤں گی
فروغِ سوزِ غم سے آگ دنیا میں لگاؤں گی

اٹھوں گی میں جلال و عزم و ہمت کا علم لیکر
بڑھوں گی موت کی صورت بغاوت کا علم لیکر

مرے بگڑے ہوئے تیور سے طوفاں دم بخود ہونگے
مرے بپھرے ہوئے نعروں سے انساں دم بخود ہونگے

جو طعنہ زن ہیں میرے ذوق شعر و فکر رنگیں پر

خدا شاہد وہ اک دن سر دھنیں گے میری نظموں پر
جنھیں کچھ لطف آتا ہے مرے دل کو ستاتے ہیں
وہ اک دن رنگ لائیں گے مرے سارے زمانے ہیں
میں مضطر ہوں ابھی مضطر ہے میری شانِ لاثانی
کوئی سمجھا نہیں اب تک مرا ذوقِ سخندانی

میں ہوں زیب النسا مخفی ابھی تک میری ہستی ہے
مرے افکار پر انوار کی شبنم برستی ہے
مٹا سکتا ہے کوئی بزمِ ہستی میں کہاں مجھ کو
کہ قدرت نے عطا کی ہے حیاتِ جاوداں مجھ کو

شبنم!

اے کلی! اے شاہکارِ آب و گل روحِ بہار
صبحدم یہ میری آنکھیں دیکھتی ہیں آہ کیا
نورِ چشمِ گلستاں پروردۂ نازِ بہار
تیری پلکوں پر چھلکتے آنسوؤں کا جھمگھٹا
تو نے دیکھا ہے خزاں کا کیا کوئی پرہول خواب
کیا نظر آیا تجھے فانی گلستاں کا شباب
تو نے دیکھا پھول کا انجام حسرتناک کیا

سینکڑوں غنچوں کو پایا ہے گریباں چاک کیا

کچھ تو منہ سے بول آخر کیا نظر آیا تجھے
کس لئے کیا وجہ یہ اندازِ غم بھایا تجھے

اُٹھ گیا کیا سامنے تیرے نقابِ زندگی
تو نے یا تشریح کیا پڑھ لی کتابِ زندگی

تخلیقِ نغمہ!

اگرچہ کیف و رنگینی تھی فردوسی فضاؤں میں
معطّر نور کے رقصاں شرارے تھے ہواؤں میں

وفورِ شادمانی سے کھلا جاتا تھا ہر غنچہ
ہواؤں دوشِ نکہت پر اڑا جاتا تھا ہر غنچہ

پھواریں عطرِ گل کی شاخِ نسریں پہ برستی تھیں
ہوائیں جھومتی تھیں اور فضائیں غرقِ مستی تھیں

اگرچہ نکہت و زینت کی تھی ہر سو فراوانی
نہ تھی فکر و تخیل میں ابھی اندوہ سامانی

یہ سب کچھ تھا مگر بے رونقی سی پائی جاتی تھی
فضائیں تھی ابھی فردوس کی محرومِ موسیقی

نہ کلیاں باخبر تھیں ڈالیوں پر گنگنانے سے
نہ واقف تھیں ہوائیں کوئی دلکش گیت گانے سے

نہ تھیں کوثر کی لہریں آشنا لحنِ ترنم سے
چھلکتی تھی نہ موسیقی کسی گل کے تبسم سے

یکایک خلد کی دنیا میں آدم کی دعا گونجی
اور ان کی التجاؤں سے ہوئی تخلیق حوا کی

پھر اٹھیں جانبِ محبوب حوا کی حسیں آنکھیں
اسے دینے لگیں درسِ محبت نرگسی آنکھیں

اٹھا کر پردۂ رنگِ حیا پھر اک تبسم سا
نزاکت سے مقابل ہائے نرگس پر ہوا پیدا

وہ نازک مسکراہٹ رفتہ رفتہ پھر بڑھی ایسی
فراواں موسمِ گل میں ہو پھولوں کی مہک جیسی

ملائک کے لبوں پر گنگناہٹ سی ہوئی پیدا
انھوں نے جب ہر اک سو اک سحر و کیف آگیں دیکھا

فضا میں ارغنوں بجنے لگا مدھم صداؤں سے
ہوا معمورِ نغمہ ہو گئی شیریں نواؤں سے

کوئی گانے لگا چھپ کر بہشتی آبشاروں میں
ترنم ریزیاں کرنے لگی فطرت ستاروں میں

ریاضِ خلد میں لہرا گئے جب دلنشیں نغمے
رباب و چنگ کے ہونے لگے افلاک پر چرچے

چٹک کر گلشنِ فردوس میں گانے لگیں کلیاں

خود اپنی ہی نوا پر وجد میں آنے لگیں کلیاں
ہوائیں ٹہنیوں کے ساتھ مل کر گنگنا اٹھیں
حسیں پھولوں کی گردن سے لپٹ کر مسکرا اٹھیں
یہ سب موسیقیاں پنہاں تھیں ہوا کے تبسم میں
جواب تک گونج اٹھتی ہیں فضاؤں کے ترنم میں

تارے!

(۱۹۳۸ء کی ایک نظم)

کسی مہوش کی خاطر جب شفق کے لالہ زاروں میں
ہوا مہرِ منور گم افق کے کوہساروں میں
دریچے کھل گئے گردوں کے مثلِ دیدۂ حیراں
اُتر آئیں جہانِ خامشی سے خواب کی پریاں
زمیں سے آسماں تک چھا گئی پُر ہول تاریکی
کہ جس سے کانپتی ہے روشنی ماہِ درخشاں کی
فضائیں ہو گئیں خاموش فطرت کے اشاروں سے
ہوائیں دم بخود تھیں شام کے مبہم نظاروں سے
یکایک پردۂ اسرارِ قدرت سے صدا آئی
کہ اے خیلِ ملائک، حاملانِ عرش دارائی
یہی گذرا ہے فکرِ قدرت و ذہنِ مشیت

نہیں ہے آدمؑ و حوّا کا مسکن باغِ جنّت میں

تم ان خاکستری پتلوں کو پہنچا دو زمینوں پر
یہ لکھ دو خامۂ تقدیر سے ان کی جبینوں پر

نہ جب تک سختیاں جھیلیں گے یہ نارِ جہنم کی
بہت دشوار ہے فطرت بدلنا نسلِ آدم کی

ہوئی آگاہ حکمِ غیب سے جب مخلوقِ نورانی
تو فوراً حکم کی تعمیل کی بے عذر و حیرانی

عیاں تھا رنگِ مایوسی نگاہِ حسرت افزا سے
حقیقت میں نہ تھے آگاہ وہ قدرت کے منشا سے

یہ دم بھر کا تماشہ تھا ادھر آئے ادھر لوٹے
زمیں پر آدم و حوا کو تنہا چھوڑ کر لوٹے

خیالِ جنت الفردوس میں رونے لگے آدمؑ
فراقِ روضۂ رضواں میں جاں کھونے لگے آدمؑ

ابھی تک بزمِ ہستی پر اندھیری رات تھی چھائی
وہ تاریکی، وہ سناٹا، وہ خاموشی، وہ تنہائی

عیاں تھا ہر طرف اک ہیبتِ خاموش کا منظر
اندھیرے کی حکومت تھی جہاں کے ذرّہ ذرّہ پر

دلِ آدمؑ لرزتا تھا کہ یہ ہے جنگلِ ویرانہ
بجائے جنّتِ فردوس ہے اب میرا کاشانہ

عنانِ صبر چھوٹی ہاتھ سے اور اشک بھر آئے
سرشکِ غم کا یہ عالم کہ طوفاں موج پر آئے
ملائک نے جو دیکھی چشمِ آدم کی دُر افشانی
زمینِ خشک پر اشکِ مسلسل کی فراوانی
تو وہ گھبرا اُٹھے اس منظرِ ناکامی و غم سے
زبسکہ نسبتِ سجدہ تھی اُن کو ذاتِ آدم سے
ملائک نے سرشکِ غم کو ہاتھوں ہاتھ لیکر
بصد اندازِ حرمت ان کو چھڑکا آسمانوں پر
چھڑکتے ہی یکایک اشکِ آدم جگمگا اُٹھے
تو فرطِ شادمانی سے فرشتے گنگنا اُٹھے
وہی اشکِ ندامت اب بھی روپ اپنا دکھاتے ہیں
ستارے بن کے راتوں کا مقدر جگمگاتے ہیں

ممتاز

ممتاز رفیع بیگم نام اور ممتاز تخلص ہے۔ مارہرہ وطن ہے بھوپال میں مقیم ہیں۔ آپ کا کلام اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ زبان صاف و شستہ استعمال کرتی ہیں۔ کلام سلجھا ہوا اور پُرکیف ہوتا ہے۔

عید کا چاند

مسرت آشنا ہے عید کا چاند — نوید جانفزا ہے عید کا چاند

ترقی کا سبق ملتا ہے اس سے — جو گھٹ گھٹ کر بڑھا ہے عید کا چاند
جفائے دردِ دل کافور ہو گی — کہ اک شکلِ وفا ہے عید کا چاند
زمانہ آ گیا ہے خرمی کا — خوشی کی ابتدا ہے عید کا چاند
بہت ہی سر جھکائے آ رہا ہے — عروسِ نو بنا ہے عید کا چاند
ہر اک کے دل میں ہے اس کی محبت — بہ شکلِ دلربا ہے عید کا چاند
جو یہ آیا تو دردِ دل ہوا کم — مرا درد آشنا ہے عید کا چاند
مسرت کی فضا چھائی ہوئی ہے — بہت ہی خوشنما ہے عید کا چاند
کھلی جاتی ہیں اس سے دل کی کلیاں — بہارِ دلکشا ہے عید کا چاند
جو محوِ یادِ وطن ہیں ان کے دل پر — یہ شمشیرِ جفا ہے عید کا چاند
نظر آیا ہے اب تو سال بھر میں — کہ خود ہی بن گیا ہے عید کا چاند
بنا ہے مرکزِ اہلِ حقیقت — مگر صدق و صفا ہے عید کا چاند
کسی کی ابروئے پرخم سے آگے — بہت کچھ جھک گیا ہے عید کا چاند
عزیزانِ وطن کی یاد لے کر — فلک پر آ رہا ہے عید کا چاند

نظر ممتاز کی جچتی نہیں ہے
جمالِ دلربا ہے عید کا چاند

ن

ناز

محترمہ ناز بلگرامی اورنگ آباد دکن کی رہنے والی اور اردو کی ایک با

قابلِ قدر شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر خاتونِ مشرق میں چھپتا رہتا ہے آپ کا کلام جذباتی حیثیت سے بلند اور پُرکیف ہے۔ زبان صاف اور طرزِ ادا پاکیزہ ہے نعت و منقبت بھی لکھتی ہیں۔ ایسی نظموں میں آپ کا جوشِ عقیدت جھلکتا ہے۔ کلام سنجیدہ، پُرکیف و دلپسند ہے۔

زندگانی کٹ رہی ہے ایک ہی اُمید پر — جی رہی ہوں بس تمھاری آرزوئے دید پر
تم کو کیا احساس اک سرگشتۂ ناشاد کا — تم سے ہے درد اور دردِ دل اک عاشقِ برباد کا
سب بہاریں گلشنِ ہستی کی ویراں ہو گئیں — سب تمنائیں مری خونابہ افشاں ہو گئیں
زندگی کیا ہے اب اک آزار ہے میرے لیے — گلشنِ ہستی کا ہر گل خار ہے میرے لیے
وہ بھی کیا دن تھے کہ میری آرزوئیں شاد تھیں — کیا زمانہ تھا کہ دل کی بستیاں آباد تھیں
یاالٰہی پھر وہی پچھلا زمانہ بھیج دے — پھر وہی عیش و طرب کا کارخانہ بھیج دے
پھر محبت پر بہار آئے تمنا ہو جواں — پھر امیدوں پر شباب آ جائے دنیا ہو جواں
پھر چلے بادِ بہاری پھر کھلیں گل ہائے عیش — نغمہ ہائے عیش سے معمور ہو دنیائے عیش

کھول دے تو نازنیں یارب کتابِ زندگی
حال میں پڑھ لے وہ مستقبل کا بابِ زندگی

عقیدت کے پھول
گلشنِ رسالت میں

قلب میں تیری یاد ہے ذہن میں تیری رفعتیں
تجھ پہ نثار ہو جہاں تجھ پہ نثار دولتیں

قلب میں تیرا ہے جمال نظروں میں تیرا نور ہے
روح میں تیری عظمتیں قلب میں تیری برکتیں

سارے جہاں کے آفتاب سارے جہاں کے ماہتاب
سارے جہاں کی کائنات تجھ پہ نثار مدحتیں

تیرے ہی دم سے اے حبیب سارا جہاں ہے فیضیاب
وقف ہیں تجھ پہ شوکتیں وقف ہیں تجھ پہ برکتیں

نازؔ پہ بھی نگاہِ لطف کیجئے شاہِ باصفا!
نازؔ کے حال پر بھی ہوں لطف و کرم کی بارشیں

نازؔ

شفیق بیگم نام ہے اور نازؔ تخلص۔ موجودہ دور کی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ اکثر زنانہ رسالوں میں کلام چھپتا ہے۔ کلام صاف اور شستہ ہے

نقابِ عارضِ روشن ہٹا کے مسکرا دینا
ہمارے خرمنِ دل پر ذرا بجلی گرا دینا

خرامِ ناز سے تربت پہ اک ٹھوکر لگا دینا
مری سوتی ہوئی تقدیر کو آ کر جگا دینا

لگی ہے آگ سینے میں پھُکا جاتا ہے دل میرا
ذرا سے چشمِ تر بڑھتے ہوئے شعلے بجھا دینا

نہیں ہے رونے والا کوئی بھی بیکس کی تربت پر

تمھیں آ کر ذرا اشکوں کے دو قطرے بہا دینا

تمھارے کشتۂ الفت کی بس اتنی وصیت ہے

کہ بعدِ مرگ ہاتھوں سے مری میت اٹھا دینا

حوادث سے زمانے کے نہ گھبرانا کبھی اے نازؔ

خدا کے ہاتھ ہے بگڑی ہوئی قسمت بنا دینا

نازؔ

ممتاز جہاں نام ہے نازؔ تخلص کرتی ہیں۔ غزل گو شاعرہ ہیں خوب کہتی ہیں۔ کلام اکثر زنانہ رسالوں میں شائع ہوتا ہے، رنگ یہ ہے:-

کچھ اس قدر میں کھو گئی تیرے خیال میں — معلوم تو نہیں ہوئی اپنی خبر مجھے

اتنا سکوں نہیں کہ کروں عرضِ مدعا — نیرنگیٔ فلک ہے تمھاری نظر مجھے

حالت پہ نازؔ کی ہو عنایت کبھی کبھی

بگڑی کبھی بنے گی بتا جائے گر مجھے

جورِ دنیا سے تنگ دل کیوں ہوں — ہم کو ملتا ہے اس ستم میں لطف

صبحِ امید ہے مجھ کو نشاط — ہم کو آتا ہے شامِ غم میں لطف

عینِ عرفاں ہے خود فراموشی — اپنی ہستی کے ہے عدم میں لطف

قولِ زریں ہے مت بھلا ممتاز

قصرِ دل ہی کے ہے عدم میں لطف

برجیس جوٗد خاتون 'نازش'

نازش، محترمہ برجیس جو دعرف للین

چمنستانِ دہر میں شاخِ گل سے ایک کلی پھوٹی مگر ابھی کھلنے والی ہی تھی کہ یکایک مرجھا گئی! ——— یہ ہے خلاصہ اس جواں مرگ شاعرہ کی حیات کا جس کا نام برجیس جودھا تون عرف للین (Lillian) اور تخلص نازش تھا!

محترم ڈاکٹر سید ریاض الحسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر سیرم انسٹی ٹیوٹ ایزٹ نگر، بریلی سابق پروفیسر ویٹنیری کالج لاہور کی دختر تھیں۔ لاہور میں ۲ مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں۔ اور عین عنفوانِ شباب میں اٹھارہ سال ایک ماہ اور تیرہ یوم زندہ رہنے کے بعد صرف تین دن علیل رہ کر ۱۵ اپریل ۱۹۴۴ء کو جانِ عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

محترمہ کے مختصر حالاتِ زندگی جوان کے والد ماجد جناب ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب نے راقم الحروف کو لکھ کر دیئے ہیں درج ذیل ہیں:۔

"۲ مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں، دس سال کی عمر میں (ناظرہ) کلام اللہ ختم کیا جس کی والدین نے خوشی منائی اور بڑی دھوم دھام سے احباب کی دعوت کی۔ اس کے بعد گھر پر انگریزی اور اردو کی تعلیم شروع کی۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے تمام مضامین میں "میٹری کولیشن" کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۳ء میں الہ آباد بورڈ کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک ہوئی مگر اچانک چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے

سوکس (civics) کے پرچہ میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور امتحان میں رہ گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ شامل امتحان ہوئی مگر ابھی آدھے ہی پرچے ختم کئے تھے اور تین باقی تھے کہ یکایک نہ ٹلنے والا بلاوا آ گیا ـــــــ اور ۱۵ اپریل کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ مرنے سے دو گھنٹے پہلے یہ شعر پڑھا ؎

عرق آیا جبیں پر وقت مردن آئینہ لاؤ
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

بے ثباتیٔ دنیا اور اس کی ظاہرداری کا نقشہ ہر وقت دل میں رہتا تھا۔ غالب کا مصرع:۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ـــــــ تقریباً تکیہ کلام تھا۔ حضرت عالمگیر اورنگ زیب کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد
اندرون خانہ گم کردیم صاحب خانہ را

علاوہ ازیں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رباعی بھی اکثر وردِ زبان رہتی

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

مرحومہ ماہ جنوری ۱۹۴۷ء میں مرض تپ محرقہ ہذیان میں مبتلا

ہوگئی تھی۔ اس اثنا میں اپنی تمام تصاویر اور بیاض اور کچھ دیگر کاغذات خود ضائع کر دیئے۔ اس لئے زیادہ کلام نہیں ملا۔

اپنے اشعار میں کسی دوسرے سے اصلاح نہیں لی۔ کچھ کلام لاہور کے مقامی پرچوں اور روزنامہ جھنڈا اخبار دہلی میں چھپا ہے۔

"راقم ریاض الحسن"

مرحومہ اپنے خاندان بھر میں ایک ہی لڑکی تھیں۔ آپ کی موت نے خاندان سے اس تنہا لڑکی کو بھی چھین لیا۔ آپ کی سیرت فضائل و محاسن کا گنجینہ تھی۔ آپ غریبوں کی ہمدرد، لاچاروں کی دستگیر اور مصیبت زدوں کی غمگسار تھیں، طبیعت میں سنجیدگی، انکسار، بردباری اور حلم موجود تھا علم و ادب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ اگر ۱۹۴۳ء میں چھوٹے بھائی کے فرار ہو جانے کا حادثہ پیش نہ ہوا ہوتا جس نے محترمہ کو سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا تو اب تک آپ بی۔ اے کی متعلمہ ہوتیں۔ سیاسیات میں ام۔ اے کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر موت کسی کو نہیں چھوڑتی۔

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے (علامہ اقبالؒ)

اور ایک پرانی کہاوت ہے ——— ممکن ہے اس میں بھی کچھ سچ ہو ——— کہ نیک بندے خدا کو بھی جلد ہی پیارے ہو جاتے ہیں

جواں مرگ عارف کی وفات پر مرزا غالب نے ایک دلدوز مرثیہ لکھا

تھا۔ جواں سال نازش کی وفات پر اس مرثیہ کے ایک شعر کو اس طرح پڑھنے کو جی چاہتا ہے،

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھی ابھی نازش
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتی کوئی دن اور

ایک انگریزی مقولہ ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں بنتے نہیں[1]۔ اور اس مقولہ کی صداقت کی شاہد خود مرحومہ کی حیات ہے۔ گھر کا ماحول شعر گوئی کے لئے نہایت ناموزوں تھا۔ والد کا تعلق سائنس اور علم الابدان سے تھا جس کے متعلق ورڈ زورتھ (Wordsworth) نے شکایت کی ہے کہ

Sweet is the love which Nature brings;
Our meddling intellect
Mis-shapes the beauteous form of things,
We murder to dissect.

"فطرت حسین و دلکش معلومات و روایات کی حامل ہے۔
(لیکن) ہماری خواہ مخواہ دخل اندازی کرنے والی ذہنیت
اشیاء کے پیکرِ حسین کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔
ہم (حسن کی) تشریح کرنے کے لئے اس کو قتل کر دیتے ہیں۔"

1. "Poets are born, not made".

والدہ مکتب کی پڑھی ہوئی تھیں۔ پڑوس میں ہندوستان کے دیگر صوبجات کے باشندے تھے جن کو اُردو زبان سے نہ کوئی لگاؤ تھا نہ تعلق رہائش سرکاری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تھی۔ اور ملنا جلنا ریلوے کلب کی ممبر یورپین خواتین سے۔ ایسے ماحول کو شعر گوئی سے کیا علاقہ پھر بھی مرحومہ کو قسّامِ ازل کی طرف سے یہ ملکہ ودیعت ہوا تھا وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئی تھیں غیر مناسب ماحول نے اس جوہر قابل کو اچھی طرح پروان چڑھنے نہیں دیا۔ ورنہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر مناسب تربیت و ماحول ملتا اور عمر کچھ اور وفا کرتی تو مرحومہ سپہرِ ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکتیں۔

جیسا کہ محترمی ڈاکٹر سیّد ریاض الحسن صاحب نے تحریر فرمایا ہے مرحومہ کا بیشتر کلام تلف ہو گیا۔ یہ بات بھی راقم الحروف کو یقینی طور پر معلوم ہوئی ہے کہ مرحومہ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ پھر مرحومہ کے باقیماندہ اشعار پر جب نظر پڑتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کم عمری میں اس قدر گہرائی و سنجیدگی اور حقایق و معارف سے اس قدر لگاؤ کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

مرحومہ کا جو کلام محفوظ رہ گیا ہے اس میں غزل، نظم، قصیدہ (منقبت) قطعہ، اور رباعی سب کی مثالیں ملتی ہیں۔ مرحومہ کو مذہب سے خاص شغف تھا اور آپ کا کلام مذہبی تعلیمات و روایات کے رنگ میں رچا ہوا ہے، شاعری میں مرحومہ کا ایک مخصوص رنگ ہے حقیقت، معرفت اور

تصوف کی اکثر عمدہ مثالیں آپ کے یہاں ملتی ہیں، ذہنی اور روحانی اعتبار سے آپ کا تعلق شعراء کے اس طبقہ سے ہے جس کے پیش رو خواجہ میر درد تھے، اور دورِ جدید کی شاعرات میں یہ ایک خوشگوار اضافہ ہے اس دور میں خواجہ میر درد کا رنگ، قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے، وہ زمانے نہیں رہے، وہ ماحول مٹ گیا، وہ ذہنیتیں بدل گئیں، اس لئے وہ رنگ بھی لوگوں نے چھوڑ دیا، یا زیادہ صحیح لفظوں میں وہ رنگ ان سے نبھ نہیں سکا۔ اس لئے جب مرحومہ کی زبان سے ایک دفعہ پھر ہم اسی قسم کی آواز سنتے ہیں، چاہے وہ کتنی ہی تخریب، و کمزور کیوں نہ ہو، تو بے اختیار دل متاثر ہو جاتا ہے اور منہ سے داد و تحسین نکلنے لگتی ہے مرحومہ کی اس رباعی کو پڑھ کر دیکھئے، کیا یہ ایک سترہ اٹھارہ سال کی بے باک و الھڑ لڑکی کا کلام معلوم ہوتا ہے ؟

قدرت نہیں مولا کی بیاں ہو موقوف   وہ نور ہے خود نور کے اندر ملفوف
کیا مرتبہ نازش کا جو وہ کھولے زباں   اوصاف بھی یکتا ہیں مثالِ موصوف

یا یہ شعر :-

جو سوال لب پہ آئے تو ہوں اجابتیں
یہ ابھی سے کیوں فضا میں ہو صدائے لن ترانی

یا ان کا یہ قطعہ :-

اپنی حالت ہے آج ایسی تغییر   سر کسی کا ندھوں پہ ہو گیا ہے بار
پڑھ رہی ہے یہ نازش رنجور   ربنا قنا عذاب النار

لیکن مرحومہ وقت کی ضرورت اور زمانے کے تقاضوں سے بے خبر نہیں

تھیں۔ ان کی نظم "ہندی نوجوان سے خطاب" کے جو اشعار آج باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ کے دل میں اپنے وطن کی پستی و زبوں حالی اور ملک والوں کی بے حسی و بے عملی کا احساس موجود تھا۔ اس نظم میں انھوں نے ہندی سپوتوں کو عمل کرنے اور آگے بڑھنے کی دعوت دی ہے۔

مرحومہ کا کلام جو آپ کے والد ماجد مخزنی ڈاکٹر حسن صاحب نے آپ کی مختلف کاپیوں اور کاغذات سے ڈھونڈ کر نقل کیا ہے درج ذیل ہے:

غزل

تو ہے خالق دو عالم بشر کا ہم کلام فانی
میں ہوں وقف سجدہ ریزی یہی ہے مری زندگانی

کہیں گریہ ہو رہا ہے کہیں رقص شادمانی
"یہ ہے عجیب حیرت افزا طلسم زندگانی"[1]

جو سوال لب پہ آئے تو ہوں جواب منزل میں
یہ عجیب سے کیوں فضا میں صدائے لن ترانی

یہ مرا نیاز دیکھو تمہیں ناز کی قسم ہے
یہی ایک سجدہ مجھ کو ہے حیات جاودانی

مری عاجزی میں پنہاں غرض ہے بغیر ممکن
تمہیں بے رخی سے کیا ہے یہ خرابہ بدگمانی

تمہیں خوف کیوں ہے اتنا جو بدن لرز رہا ہے
نہ خاک جانا نازش ہے حیات جاودانی

نعت

نبی ہو مصطفیٰ صل علیٰ نور خدا تم ہو
تمہیں لٰسین تمہیں طٰہٰ تمہیں ناصر مزمل ہو

تمہارے نور سے پیشانی آدم چمکتی تھی
تمہیں اول تمہیں آخر تمہیں ہادی کامل ہو

یہاں زمزم وہاں کوثر پلاؤ جسکو چاہو تم
کہ جان میکدہ تم ہو تمہیں مختار و عامل ہو

---

[1] مصرع طرح

جمالِ ہمنشیں نورِ ہدایت بن کے جب چمکا
پکار اٹھے ملایک مرحبا نورِ مجمّل ہو
نہیں کچھ خوف اسے نازش اگر کثرت مصیبت ہے
پکار دے اپنے آقا کو پڑے کیوں نیم بسمل ہو

(قصیدہ در منقبت جناب زینبؓ بنت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا)

گر باغ امکاں باغ ہے پھولوں کی نکہت آپ ہیں
رفعت کی رفعت آپ ہیں صولت کی صولت آپ ہیں
اسلاف کی اجداد کی دنیا میں عزت آپ ہیں
حسنینؓ پر نوحہ کناں معنیٔ رقت آپ ہیں
بنت علیؓ و فاطمہؓ بنت محمدؐ آپ ہیں
خاتونِ جنتؓ کی قسم خاتونِ جنت آپ ہیں

اے زینبؓ عالی نسب یہ مرتبہ ہے آپ کا
قدسی کھڑے ہیں سرنگوں یہ دبدبہ ہے آپ کا
خورشید ہو کیسے عیاں جب سر کھلا ہے آپ کا
ہیں تابعِ فرماں سبھی بے شک خدا ہے آپ کا
صلوات نازش آپ پر یہ ہدیہ ناچیز ہے
کیا لائے یہ احقر بشر جو چیز ہے ناچیز ہے

وہ جدِ امجد آپ کے یعنی نبی خیر البشر
صلو علیہ و آلہ اک شان جن کی سر بسر
وہ ساکنِ علیین ہیں جائے کہاں ان تک نظر

لولاک ان کی شان ہے، کرتی ہوں قصّہ مختصر

من تشنہ و دل خستہ ام، ایں ہدیہ ناکارہ است
بہرِ خدا نظرِ کرم، ایں نازنیں بےچارہ است

(نظم "ہندی نوجوان سے خطاب" کے چند اشعار)

تو سو گیا ہے راہ میں، اُٹھ جاگ اے ہندی جواں
سب قافلے منزل پہ ہیں، پیچھے ہے تیرا کارواں
تیرے قویٰ ہیں مضمحل، آنکھیں تری بےنور ہیں
ہشیار ہو ہشیار ہو، ہیں موت کے یہ سب نشاں
مضمون بندی چھوڑ کر، اب تو وفا کی فکر کر
کس کام کی ہے بانگِ گل، جب جل چکا ہو آشیاں
ہاں علم ہے دولت بڑی، لیکن ہے محتاجِ عمل
تو بھی بڑھا آگے قدم، قوموں کا ہے یہ امتحاں

قطعہ

اپنی حالت ہے آج ایسی غیر　　سر بھی کاندھوں پہ ہو گیا ہے بار
پڑھ رہی ہے یہ نازشِ رنجور　　رَبَّنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّار

رباعیات

قدرت نہیں ہولا کی ہے بیاں موقوف　　وہ نور ہے خود نور کے اندر ملفوف

کیا مرتبہ نازش کا جو وہ کھولے زباں اوصاف بھی یکتا ہیں مثال موصوف

کیا خوف ہے اعدا سے جو آئیں بن ٹھہرے رہتے ہیں یہاں جن و ملک کے پہرے
نازش کو ہے اللہ و محمد کی پناہ خود پنجتنِ پاک ہیں دل میں ٹھہرے

قدرت بھی زیبا ہے نقش یہ ہیں رنگ ہیں دنیا میں تجاوٹ کے سبھی ڈھنگ ہیں
لیکن کسے معلوم ہے نازش یہ راز کیوں صانع قدرت کے ترچھے رنگ ہیں

اے دل زشراب عشق اعدا سر خیز ساقی کی قسم اس سے نہیں ہے کچھ تیز
ساقی ہیں مجھے پنجتن پاک مرے کیا خوف اگر دہر ہے فتنہ انگیز

کیا ہی خوش بخت ہیں وہ جو گزر جاتے ہیں اس سے پہلے کہ زمانہ میں بگڑ جاتے ہیں
کس کو رہنا ہے یہاں غور تو کر تو نازش وہ ہی خوش بخت ہیں جو عیش میں مر جاتے ہیں

امتحاں دیکھو تو سر پر آگیا ہم نے جو کچھ تھا کیا اچھا کیا
اپنے بس میں اور نازش تھا ہی کیا لیس للانسان الا ما سعیٰ

تضمین

ایسا زمانہ بدلا ہر چیز ہے شر ریز ہر سمت اک تباہی طوفان اک بلا خیز

نازش پہ جو یارب ایسا ہو گئی ہوا تیز "کشتی شکستہ ایم اے بادِ شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار و آشنا را" (حافظ)

نازک

نازک بیگم نام اور نازک تخلص ہے۔ گیمنڈی کی رہنے والی ہیں۔ دورِ حاضر کی ایک خوشگوار اور خوش فکر شاعرہ ہیں، کلام میں بڑا سوز و گداز اور حسرت ہے۔ آپ کے یہاں شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ حسرت آمیز جذبات کی ترجمانی آپ کے کلام کی ممتاز خصوصیت ہے اور اس پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔

ذرا سی بات کہتی عرض تمنا ہم کیا کہتے وہ میری عمر بھر کی داستانِ درد کیا سنتے
وہ عالم ہی عجب تھا بیکسی و دل میں امنگیں تھیں نصیحت ابتدائے عشق میں ناصح کی کیا سنتے
نہیں سنتا آخری حسرت یہ بیمارِ محبت کی کسی صورت سے وہ حالِ دلِ زار آشنا سنتے

ہوا ہے جلوہ گاہِ عام میں جلوہ نما کوئی
کبھی اے کاش نازک ہم بھی یہ دلکش صدا سنتے

نثار

نثار فاطمہ نام اور نثار تخلص ہے۔ دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتی ہیں۔ آپ کا کلام سنجیدہ، شستہ اور پُرکیف ہے۔ جذباتی و وجدانی اعتبار سے بھی اشعار بہت بلند ہوتے ہیں۔

اسلوبِ بیان پاکیزہ و دلکش ہے کلام و بیان میں پختگی موجود ہے۔

محبت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیرِ سلاسل کی
شکایت کیجئے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی

حصولِ آرزو اور میں فریبِ آرزو ہے یہ
نگاہیں اب بھی برگشتہ ہیں مجھ سے میرے قاتل کی

وفورِ شوق میں اٹھی تمیزِ مشکل و آساں
جنابِ عشق نے آساں مری ہر ایک مشکل کی

محبت کے سمندر میں بہے جانا ہی مقصد ہے
میں بیگانہ ہوں ساحل سے خبر کیا مجھ کو ساحل کی

خبردار اے نثار ان سے نہ کہنا رازِ اُلفت کا
کہ ناکامی سزا ہے انکشافِ حالتِ دل کی

نجمہ تصدق ام اے۔ بی ٹی

نجمہ کے خود نوشتہ حالات درج ذیل ہیں جو انھوں نے بڑی عجلت میں سپردِ قلم کئے ہیں چنانچہ خود لکھتی ہیں "جلدی میں جو کچھ ہو سکا بھیج رہی ہوں"
نام شہشاد نجمہ۔ تصدق کسی خاندانی مناسبت سے رکھا گیا۔

پیدائش۔ جولائی ۱۹۱۷ء

وطن۔ سیالکوٹ

تعلیم۔ ام اے۔ بی ٹی۔

نجمہ تصدق ایم-اے بی-ٹی

میرا خاندان زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ہے قدامت پرست میں نے اپنی تمام تر تعلیم اپنے مکرم بھائی اور شفیق ماں کی بدولت حاصل کی ہے۔ شروع شروع میں مجھے اردو فارسی میں انشاء پردازی کا بیحد شوق تھا۔ لیکن فوراً بعد انقلاب زمانہ نے میرا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ بڑی بہن اور والدہ مرحومہ کی وفات حسرت آیات نے مجھے یکسر زندگی سے بیزار کر دیا۔ چنانچہ میری سب سے پہلی نظم بہن کی یاد میں تھی۔ افسوس ہے کہ وہ نظم زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی۔ ورنہ وہ ایک نہایت ہی بلند پایہ چیز تھی۔ میری اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں خاندان بھر میں منافقت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سب نے مخالفت کی لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی تعلیم میں مصروف رہی لیکن اس دوران میں شاعری کی آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی بی۔ ٹی کرنیکے بعد جب میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئی تو پھر یہ دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ پیہم حادثات اور افکار نے میری صحت پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ دائم المریض بنا دیا ہے۔

تعلیمی ضروریات کے بعد جو وقت بھی بچتا ہے وہ مطالعہ کتب یا شغل شعر گوئی میں گزرتا ہے۔ مجھے اپنے کتب خانہ پر ہمیشہ ناز رہا ہے اور رہے گا۔ اس میں بیشمار قدیم کتابیں متعدد زبانوں کی

موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ جنگ نے بیرونی ڈاک میں خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ ورنہ اب بھی کبھی کبھی طہران۔ قاہرہ بیروت سے فارسی۔ عربی، ترکی اور دیگر زبانوں کے رسائل آجاتے تھے۔

میری ملنے والیوں کو اکثر مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں کبھی بھی ان سے کھل کر باتیں نہیں کرتی۔ لیکن سچ کہتی ہوں کہ اگر میں ہنستا کبھی مسکراتی بھی ہوں تو اس مسکراہٹ میں بالکل خلوص نہیں ہوتا۔ کیا کروں۔ آخر دل ہی تو ہے۔ گو ریاضی میرا خاص مضمون ہے اور مجھے تحصیل ہیئت کے لئے اسی سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن میں ہمہ تن اس کی خشک فضا میں ہی سمو کر نہیں رہ گئی۔ میری شاعری پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ میری شاعری میرے اس ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے جس کو حوادث زمانہ نے بیس کر رکھ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں یاس اور قنوطیت کافی حد تک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں پڑھنے والوں کو رومان اور رنگینی بھی مل جاتی ہے جو ان کے لئے تفنن طبع کا سامان بہم پہنچا دیتی ہے۔

بعض ناقدین کو اعتراض ہے کہ نجمہ عریاں لکھتی ہیں۔ عورت کو اظہار جذبات میں اس قدر بیباک نہیں ہونا چاہئے۔ بجا ارشاد ہے عورت کو اتنا بیباک نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن خیال فرمائیے کہ دل کی آواز کو کیسے دبایا جا سکتا ہے۔ جو دل محسوس کرتا ہے وہ کہہ دینے کو جی چاہتا ہے آخر محسوسات دل کیوں بغیر لگی لپٹی رکھے　ظاہر نہ کئے جائیں۔

میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ جو شاعر اپنے وارداتِ قلبی اور محسوسات و مشاہدات کو چھپاتا ہے وہ تصنع اور ریا سے کام لیتا ہے اسے ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس کی شاعری کو ادب میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی"۔ ورنہ وہ صرف خود کو دھوکا دے رہا ہے بلکہ ادب سے بھی بغض روا رکھتا ہے خیر۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ہاں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوں نجمہ تصدق"

"نجمہ کے سو شعرا ایوان ادب علی گڑھ کی طرف سے شایع ہو چکے ہیں اس کی مرتب آنسہ ناجیہ خانم شیروانیہ ہیں ایک اور مجموعۂ کلام "نجمستان" شائع ہونے والا ہے۔ آج کل رسالہ ادیب کے حصۂ نسواں کی آپ ادارت فرما رہی ہیں۔ شاہکار لاہور، شاعر آگرہ، ساقی دہلی، پیام ادب حیدرآباد دکن۔ مشہور و مکمل دہلی، زیب النسا، حور، بیسویں صدی لاہور میں آپ کا کلام چھپ چکا ہے

نجمہ نے پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ دراصل ان کی شاعری کے اولین محرکات خانگی سانحات تھے جن کے متعلق انھوں نے اپنے حالات میں اشارہ کیا ہے ہمشیر او روالدہ کی وفات نے نجمہ کو رنج و غم کا پیکر بنا دیا تھا۔ اسی تنہائی اور خاموشی کے عالم میں اس حزن و ملال کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ظاہر ہے کہ وہ شاعری جس کی اساس اس قسم کے شدید و حقیقی جذبات پر قائم ہو کس قدر بلند ہوگی۔ یہی جذبات کی صداقت آمیز اور بے لاگ ترجمانی ہے جس نے اس جواں سال شاعرہ کو سپہرِ ادب کا ماہتاب بنا دیا۔

نجمہ[1] انگلستان کے جواں مرگ اور آسماں جاہ شعرا شیلی (Shelley)[2] اور کیٹس[3] (Keats) کی ہمنوا ہے اس کی فطرت شیلی اور کیٹس کی طرح الم نصیب اور رومانیت پرور ہے۔ اس میں ان ہی شعرا کی طرح احساس جمال اور حسن شناسی موجود ہے، اس میں انھیں کی طرح جذبات کا ہیجان اور جوانی کا جوش موجزن ہے۔

نجمہ کی شاعری خود اس کے ایک مصرعہ کی زبان میں

"سراپا غزل اور مجسم شراب"

ہے، وہ عشق و جوانی کا ایک نغمہ ہے ـــــــ رس بھرا، سرشار، بے خود، تشنہ و تیز بہکا ہوا نغمہ! وہ شباب و محبت کا ایک طوفان ہے جس میں ہر خیال،

---

1. محترمہ کے حالات اور کلام عین وقت پر موصول ہوئے ان کو ایک نظر پڑھنے کے بعد جب میں کلام پر تبصرہ لکھنے بیٹھا تو ضمیر جمع غائب کا استعمال میرے لئے مشکل ہوگیا اور بے اختیار قلم سے ضمیر واحد غائب نکل گئی اس میں کوئی سوئے ادب کا پہلو نہیں میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی صیغۂ واحد میں جو اختصاص اور احترام ہوتا ہے وہ صیغۂ جمع میں نہیں ہوتا۔ مجھے امید ہے کہ ارباب نظر اور خصوصاً محترمہ نجمہ اس کو اسی نظر سے دیکھیں گی۔ آپ کا کلام بھی نسبتاً زیادہ پیش کر رہا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ محترمہ نے اپنا کافی کلام ارسال کر دیا تھا اور کلام اس قدر پرکیف تھا کہ پہلی نظر میں اس میں کچھ زیادہ تخفیف کرنا مشکل تھا۔

2. Percy Bysshe Shelley (1792-1822)

3. John Keats (1795-1821)

بہہ گیا ہے، وہ ماحول، اخلاق، سماج، غرضیکہ اپنے گرد و پیش کی ہر قید و بند سے بے نیاز ہو کر نغمہ زن ہے، یہاں تک کہ خود اس کی ہستی ایک نغمہ بن کر اس کے نغموں میں کھو گئی ہے۔

سچھ بکھرے بکھرے گیت ہیں جو ہونٹوں سے برستے رہتے ہیں
ایک میٹھی میٹھی آگ ہے جو ہر سو بھڑکائے جاتی ہوں
خود اپنی لے کو سنتی ہوں، خوش ہوتی ہوں سر دھنتی ہوں
اشعار میں ڈھال کے اشکوں کو مستی میں گائے جاتی ہوں

اس کی دنیا "شعر و خواب" اور "رنگ و نور" کی دنیا ہے اس میں "ماہ و انجم" کی درخشانی ہے۔

میری دنیا ہے شعر و خواب، رنگ و نور کی دنیا
مہ و انجم کی گویا ضو فشانی لے کے آئی ہوں

اس کی نظر میں دنیا کا ذرہ ذرہ عشق و محبت کا حامل اور عشق و محبت کا طالب ہے اس کا مستی بھرا پیغام ہے کہ

عطرِ وفا کی خوشبو سے ظرفِ محبت کو مہکا
مست نگاہوں سے پی کر تجھ دنیا پر چھا جا

وہ خود سراپا آغوشِ محبت ہے ـــــ محبت کا گرم اور دھڑکتا ہوا آغوش

محبت کا آغوش ہوں میں سراپا
تجھے بھی جو چاہوں تو سانچے میں ڈھالوں

اس کی بیباک اور بیتاب تمناؤں کا تقاضہ ہے کہ

چاندنی ہے، بہار، خلوت ناز
ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

اور یہی اس کا مسلکِ حیات ہے اور یہی اس کی شاعری کا پیغام
شعور و خرد کے اندھیرے میں گھر کے دیئے بےخودی کے جلاتا چلا جا

محبت زندہ و پائندہ رنگ و بو ہے محبت زندگی کی آبرو ہے

محبت کی ہیں دادِ دل کے نجمہ گنوائیں نہ لمحاتِ حسن و جوانی

اُس کے نغموں کے محرکات کیا ہیں — اس کا جواب خود نجمہ کی زبان سے سنئے

مرا دل بھی ہے محسوسات کا آتشکدہ آخر
عجب کیا ہے جو ذوقِ شعر خوانی لیکے آئی ہوں

اُس کی شاعری میں انتہائی ربودگی اور بےخودی ہے، اس میں اس درجہ نفاستِ خیال اور لطافتِ بیان ہے، اس قدر شعریت اور رنگینی ہے کہ اس کی مثال اُردو شاعری میں ڈھونڈھنا مشکل ہے وہ اس قدر گہری داخلیت کی حامل ہے کہ اس میں دل کی دھڑکنوں کی تڑپ موجود ہے

نجمہ بے قرار تو نویدِ پیامِ صبح ہے!
بن کے ستارۂ سحر چرخ پہ جھلملائے جا

نجمہ کے نغموں کی ایک بہت بڑی خصوصیت ان کی شدید رومانیت

ہے، رومانیت کے اس قدر گہرے اور تابندہ نقوش حیا، ادا، اور شبنم کے یہاں بھی نہیں ملتے'' اس کی رومانیت ایک گہرے دکھ میں ڈوبی ہوئی ایک ابدی و لافانی غم میں سموئی ہوئی ہے ایک حسین و دلدوز تشکم ہے جو اس کی رومانیت سے بغلگیر ہے، اس کی آنسوؤں سے بوجھل آنکھیں سُنہرے خوابوں کی امین ہیں۔

پھر نجمہ تسندر سپنوں میں بننے لگے قصر اُمیدوں کے
پھر ریت کے گرتے ساحل پر بنیاد اُٹھائے جاتی ہوں

یہ نور و تاریکی ـــــ دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، یہ جگمگاتی اور جھلملاتی ہوئی رومانیت جذبۂ عشق کا جمالی پہلو ہے، اور یہ درد و تڑپ یہ قنوط و یاس اس جذبہ کو لافانی اور لاہوت بنا دینے والی گہری حقیقت ـــــ ہر لافانی جذبۂ عشق کی بنیاد قنوط و یاس ہی پر قائم ہوتی ہے، نجمہ کا دل بھی اس لافانی جذبۂ غم کا لذت شناس ہے اور یہی درد و تپش اس کے رومانیت سے بوجھل نغموں کا سنگِ بنیاد ہے، اس کے دلِ دردمند کا عالم یہ ہے

شبِ غم کی آنکھوں کا آنسو ہوں نجمہ
یونہی صبح تک جھلملاتی رہوں گی

یہ کیا دیدیا دینے والے مجھے ـــــ مسلسل خلش مستقل اضطراب

رگِ زندگی ہوں کہاں مجھ کو راحت
ازل سے میں دکھتی چلی آرہی ہوں

محبت کی میں شامِ فرقت ہوں نجمہ
مصیبت سے کٹتی چلی جا رہی ہوں

بجھ گئے روشن امیدوں کے چراغ — زیست اک شامِ ظلمت بار ہے

چکبست کا خیال تھا کہ شعر میں جب تک نازک خیالی اور رنگینی نہ ہو شعر شعر نہیں ہوتا اور یہ ایک حقیقت ہے خود نجمہ نے "رس" اور "حسن" کو شعر کے لئے لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔

نجمہ ہیں شعر و نغمہ سب یاں نواز لیکن
کچھ رس ہو رنگ ہی ہو یا حسن شاعری میں

اور نجمہ کا کلام اسی معیار پر بہ تمام و کمال پورا اترتا ہے اس کے یہاں بڑی صفائی اور پختگی پاکیزگی اور دلکشی ہے ان کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت نفاستِ خیال اور ندرتِ ادا ہے مثلاً

ان کی آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں رشکِ کہکشاں
جب کبھی راتوں کو نجمہ یاد آ جاتی ہوں میں [1]

---

[1] بہت عرصہ ہوا مولانا اختر گونڈوی نے "آنسو" کو "ستارہ" اور "ستارۂ سحری" ضرور کہا تھا

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

جو مجھ پہ گزری ہے شبِ ہجر دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پہ ستارۂ سحری

مگر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو "رشکِ کہکشاں" کہنا نجمہ کا حصہ تھا۔

اے دوست شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
تجھ سے تری راہ میں تارے بچھا دیے

تو اک کھِلی کھِلی سی کلیوں کی بُو　　میں اک کھویا کھویا جوانی کا خواب
دلوں نے جہاں سے زمان و مکاں سے

میں نسیمِ وفا ہوں، اُٹھی جا رہی ہوں
پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی　　ہر چیز ترے مستِ تبسم پہ لٹا دی
پھر بادِ بہاری نگہ ناز کو کر کے　　اس جانِ گلستاں نے کلی دل کی کھلا دی
چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو مسکرا دیے

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی طرح چاند، تارے، چاندنی، اور چاندنی رات
نجمہ کا ایک محبوب موضوع ہے اور اس کے اس قسم کے اشعار نہایت بلند
اور لطیف ہیں۔

پُر کیف راتیں، یہ رنگیں نظارے　　یہ میری تمنا، یہ تیری جوانی
تاروں کی مست چھاؤں میں اپنی کبھی کبھی
کرتی ہوں یاد بھولی ہوئی داستاں کو میں[1]

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی
کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
شرما نے کیا مجھے یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

وہ شب تاب جلوے وہ تاروں کی چھاؤں   کبھی میں نے ایسا بھی دیکھا ہے خواب[1]
وہ مست مست رات وہ بادہ بدست رات   اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے
پھر چھڑ گئے ان چاندنی راتوں کا فسانہ

سوئی ہوئی امید مرے دل کی جگا دی[2]
ہلکی ہلکی خنکیوں میں نکھری نکھری چاندنی

داستانِ حسن دہرانے کا موسم آ گیا

مسئلہ حسن و عشق کی بابت دنیا میں اب تک چار نظریے قائم ہوئے ہیں۔ (ا) عشق خالقِ حسن (ب) حسن خالقِ عشق (ج) حسن و عشق دو مستقل اور قائم بالذات حقیقتیں (د) حسن محض۔ اس سلسلہ میں نجمہ پہلے نظریہ کی قائل ہے۔ اس نے اس کا اظہار اپنے کلام میں جا بجا نہایت لطیف انداز میں کیا

اعجاز ہیں سبھی یہ تخیلِ حسیں کے   جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی

چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

[2] فراق گورکھپوری

جب شبِ مہ میں ان کی نظر آپ کہانی ہوتی تھی
بھول بھی جا ان راتوں کو، یاد نہ کر ان باتوں کو

ہے اُن کے رنگ و بو میں کچھ خونِ دل بھی شامل
میری بھی کچھ جھلک ہے کلیوں کی تازگی میں [۱]

ان کی نظر میں دیکھ لیا اپنے آپ کو　　میرا ہی جلوہ مجھ کو دکھا کر چلے گئے [۲]

لیکن حسن و عشق کی ان لطیف اور سبک رنگینیوں کے ساتھ اس کے یہاں ژرف نگاہی، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی مثالیں بھی موجود ہیں، یہ آفاقیت اور یہ وسعتِ نظر ملاحظہ ہو

تارے مرے مشفق مری خورشید و مہ مرے
ہمت سے اس جہان پہ چھانے کی دیر ہے
میری نظر نظامِ جہاں کا ہے انقلاب
دنیا کو بے قرار بنانے کی دیر ہے
ہر آدمی ہے اپنی جگہ ایک کائنات
اُجڑے ہوئے دلوں کو بسانے کی دیر ہے

شیلے اور کیٹس کی طرح نجمہ ابھی اس ہیجانی، ہنگامی، طوفانی دور سے گذر رہی ہے جس کو شباب کہتے ہیں وہ شیلے اور کیٹس کی طرح ابھی

---

[۱] مومن نے اس نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے ؎
اڑ ہی رنگ آج ہے عارضِ گلعذار میں　　خونِ دل اپنا تھا مگر گونہ رخِ طراز میں

[۲] اور اصغر گونڈوی نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎
ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا　　اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

مشتعل جذبات سے نبرد آزما ہے کبھی ان کی رَو میں بہہ جاتی ہے اور کبھی خود اُن کو اپنے دامن میں سمیٹ کر بہا لیجاتی ہے۔ یہ ہے حقیقت اس عریانی کی جس کے متعلق خود شجیہ نے اپنے حالات میں اشارہ کیا ہے اور جس کی بنا پر اس کے اکثر ناقدین نے اس پر اعتراض کیا ہے لیکن درصل وہ ترجمانی جذبات کے علاوہ اور کچھ نہیں اور خالص شاعرانہ اور ادبی نقطۂ نگاہ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، رہا اخلاقی سوال تو توقع ہے کہ بہتیں کی طرح عمر و زمانہ خود اس کے جذبات کے اشتعال کو سکون و سنجیدگی سے آشنا کردیگا اور یہ توقع بے بنیاد نہیں۔ چونکہ آج بھی اس کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں زندگی کے تقاضوں کی ہمہ گیری اور وسعت و آفاقیت موجود ہے

حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے زمانے کا ہر غم اُٹھاتا چلا جا[۱]

تری نظر سے چمن سازِ سرمدی بن جائے
کلی کلی کی زباں سے پیام پیدا کر[۲]

---

[۱] علامہ اقبال

بدریا غلط و با موجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

[۲] علامہ اقبالؒ

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر (بالِ جبریل ۱۹۸)

کسی کے رخ کے حجابات خود بخود اٹھ جائیں
نگاہ پاک، دلِ پختہ کام پیدا کر

قدم چومے گی منزل ذوق میں کرہ دل پہ پیدا
سراپا شوق بن آگے نکل جا کاروانوں سے

جہاں تک اس کے آرٹ کا تعلق ہے وہ نکتہ چینی اور عیب جوئی سے بالاتر ہے، اس عمر میں نجمہ نے جس بلند اور پختہ آرٹ کی مثالیں پیش کی ہیں وہ یقیناً لائقِ تحسین و ستائش ہیں۔

نجمہ کے آرٹ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے نہایت موزوں الفاظ، اور مترنم بحریں انتخاب کرتی ہے اس کے نغموں میں بڑی موسیقیت ہے اور یہ خصوصیت اس کے اشعار کے کیف کو اور بڑھا دیتی ہے آہنگ و ترنم کے سلسلہ میں خود اس کا یہ شعر اسی کے کلام پر صادق آتا ہے۔

جن پہ موسیقیوں کو وجد آئے　　ہائے اس سست نازکی تانیں

اس کے کلام میں جذبات کی جو شدت اور گرمی، جو حرارت، صداقت اور زندگی ہے وہ اس بات کی کافی ضمانت کہ وقت اور زمانہ اس کو آسانی سے نہیں مٹا سکتا۔

کچھ اشعار کے علاوہ ذیل کا سب کلام محترمہ کا ارسال کیا ہوا ہے ترتیب میری ہے۔

غزلیات

خود مٹ گئی نہ پا سکی تیرے نشاں کو میں
سمجھی تھی سہل شوق کی راہِ گراں کو میں[1]

یہ آرزوئے جوشِ تجسس کا ہے مآل
بھولا ہے کارواں مجھے اور کارواں کو میں

سوزِ جنوں کی آگ سے اک دن پھونک دوں
وہم و گماں کو، جذبۂ سود و زیاں کو میں

تاروں کی مست چھاؤں میں اب بھی کبھی کبھی
سنتی ہوں یاد بھولی ہوئی داستاں کو میں[2]

ہر ہر قدم پہ میری جبیں سجدہ ریز ہے
کعبہ سمجھ رہی ہوں تیری آستاں کو میں

نجمہ نہ پوچھ مجھ سے مری داستانِ زیست
المختصر کہ یاد رہوں گی جہاں کو میں[3]

۱؎ خواجہ حافظ	اَلَا یَا اَیُّہَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاسًا وَّ نَاوِلْہَا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

۲؎ ڈاکٹر عندلیب شادانی
کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا	نہ جانے کیا مجھے یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

۳؎ تبسم (؟)	یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ؎ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

افسانۂ نگاہِ محبت نہ پوچھیے کہتے ہیں کس کو حشرِ مسرت نہ پوچھیے

وہ مست مست رات وہ بادہ بدست رات اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھیے

ہوتی ہے دل میں اک خلشِ بیقرار سی واللہ اس نظر کی شرارت نہ پوچھیے

عالم تمام آنسوؤں کا ایک سیل تھا مجھ سے فسانۂ شبِ فرقت نہ پوچھیے

راتوں کو کر رہی ہوں ستاروں سے گفتگو مجھ سے مرے جنوں کی حکایت نہ پوچھیے

کیا ہو گیا ہے آج کل تجھ کو کیا کہوں
حالت نہ پوچھیے مری حالت نہ پوچھیے

یہ مے، یہ فضائیں، یہ جنوں ریز نظارے
اے کاش کوئی مجھ کو حسیں تے ہیں پکارے
اعجاز ہیں سب میری ہی تخئیلِ حسیں کے
جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے
یہ کون میری روح کی گہرائی میں جھولا
یہ کس نے مرے بگڑے ہوئے حال سنوارے
جب تک نہ بہائے گا مرے حال پہ تم آنسو
او میری محبت کے چمکتے ہوئے تارے
برساتا ہوا پھول تبسم کی نظر سے
آ، دل کے شعلے ہیں جوانی کو ابھارے
تجھ نہ کہیں مجھ کو گنہگار بنا دیں
یہ بہکی ہوئی رات، یہ ہنستے ہوئے تارے

ہم نے جو دردِ دل کے فسانے سنا دیئے
آنکھوں سے کائنات کی آنسو بہا دیئے

اللہ رے ابتدائے محبت کی بیخودی
ہم نے حجاباتِ دید کے جھگڑے مٹا دیئے

توبہ کا پاس تھا مجھے لیکن میں کیا کروں
تیری نگاہِ مست نے ساغر پلا دیئے

اتنا بلند ذوق نہیں اہلِ عشق کا
یہ کیا سمجھ کے حسن نے آنسو بہا دیئے

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے شراب پھول سبو مسکرا دیئے

اے دوست شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
نجمہ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیئے

اس نگاہِ مست سے جب وجد میں آتی ہوں میں
کیف و رنگ و نور کی دنیا پہ چھا جاتی ہوں میں

کیا کہوں کیا ہے محبت کا فریبِ خود نگر
دیکھتی ہوں جس طرف خود ہی نظر آتی ہوں میں

چاہتی تو ہوں کہ موجوں سے رہوں دامن کشاں
کشتیٔ غم ہوں بھنور میں پھر بھی آ جاتی ہوں میں

صبح تک ٹھہرا نظر آتا ہے دورِ آسماں
جب تصور میں ترے راتوں کو کھو جاتی ہوں میں

جام گر پڑتا ہے ساقی تھرتھرا جاتے ہیں ہاتھ
تیری آنکھیں دیکھ کر نشے میں آ جاتی ہوں میں [1]

---

[1] سودا — کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ان کی آنکھیں دیتی رہی ہیں رشکِ کہکشاں
جب کبھی راتوں کو تجھ کو یاد آ جاتی ہوں میں

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہی ہوں میں
قلب و نظر خراب کئے جا رہی ہوں میں

بیداریوں کی شمع جلا کر جہاں میں
تجدیدِ انقلاب کئے جا رہی ہوں میں

بہکی ہوئی ہوں لطفِ جوانی کے کیف سے
ہر چیز کو شراب کئے جا رہی ہوں میں

کتنا بلند ہے میری تعمیر کا مذاق
تاروں کو آفتاب کئے جا رہی ہوں میں

کیوں میں گناہِ عشق سے ڈرتی ہوں اس قدر
ہستی کو کیوں عذاب کئے جا رہی ہوں میں

تجھ نگاہِ شوق کو حسنِ نگاہ تک
جلووں سے فیضیاب کئے جا رہی ہوں میں

عشق روحِ رواں نہ ہو جائے — یہ بلا جزوِ جاں نہ ہو جائے [۱]

[۱] علامہ اقبالؒ

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے (بالِ جبریل)

مجھ کو دیکھو نہ مست نظروں سے　　　ضبطِ دل رائیگاں نہ ہو جائے[1]

الاماں تیری محشر آرائی　　　ذرّہ ذرّہ جہاں نہ ہو جائے

یہ تیری انکھڑیوں کی دل طلبی　　　پھر تمنّا جواں نہ ہو جائے

یہ حوادث، یہ درد، یا اللہ!　　　زیست بارِ گراں نہ ہو جائے

یہ میری داستانِ غم تجھ پہ
حُسن کی داستاں نہ ہو جائے

یہ دور کی وادی سے مجھے کس نے صدا دی　　　اک آگ سی مرے دل میں محبت کی لگا دی

پھولوں کی بہار اور ستاروں کی جوانی　　　ہر چیز ترے مست تبسم پہ لٹا دی

یہ کون مری سوچ کی گہرائی میں جھوما　　　اُجڑی ہوئی بستی یہ مری کس نے بسا دی

وہ بات جسے دل نے چھپایا تھا بمشکل　　　دنیا کو تری مست نگاہوں نے بتا دی

پھر مٹنے لگے روح سے تسکین شرارے　　　پھر ہجر کی روداد پپیہے نے سنا دی

پھر کر دیا مدہوش مجھے ہوش میں لا کر　　　پھر مست نگاہوں نے نگاہوں کو پلا دی

پھر چھیڑ کے ان چاندنی راتوں کا فسانہ　　　سوئی ہوئی اُمید مرے دل کی جگا دی

پھر بادِ بہاری نگہِ ناز کو کر کے　　　اس جانِ گلستاں نے کلی دل کی کھلا دی

اس شرمِ جفا پر تری قربان وفائیں　　　جب شکوۂ بیداد کیا آنکھ جھکا دی

---

[1] مؤلف احقر سے

دل کی دنیا تڑپ اٹھی پھر آج　　　آگ دل میں بھڑک اٹھی پھر آج

اس نے دیکھا کچھ اس طرح سے مجھے　　　ساری ہستی لرز اٹھی پھر آج

پھر ہنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ہے مجھے تم نے
پھر سینۂ تاریک میں اک شمع جلا دی[1]

کہو تو میں اپنے غموں کی کہانی — سنا دوں تمہیں آنسوؤں کی زبانی
فنا ہو گیا آدمی عشق کر کے — خرد کی کوئی بات اس نے نہ مانی
بجھے آنسوؤں سے نہ آہوں سے کم ہو — محبت ہے اک آتشِ غیر فانی
یہ پُر کیف راتیں، یہ رنگیں نظارے — یہ میری تمنّا، وہ تیری جوانی
مرا سوزِ پنہاں، ترا سازِ پیہم — کہانی سے ہوتی ہے پیدا کہانی
زمانے میں مجھ کو نہ بدنام کر دے — مرے حال پر یہ تری مہربانی

محبت کی دیں داد مل جل کے مجھ سے
گنوائیں نہ لمحاتِ حسن و جوانی

جب مرے پاس وہ نہیں ہوتے — اُن سے ہوتی ہیں راز کی باتیں[2]
ختم ہوں گی نہ حشر کے دن تک — دلِ حسرت نواز کی باتیں
نغمۂ شوق میں نے کیوں چھیڑا — کون سمجھے گا راز کی باتیں
یاد آ آ کے گدگداتی ہیں — حسنِ خاطر نواز کی باتیں
پھونک دیں تلخئ حوادث کو — آ کریں سوز و ساز کی باتیں
جن پہ موسیقیوں کو وجد آ جائے — ہائے اس مست ناز کی باتیں[3]

---

[1] مؤلف اصغر: نظرِ التفات پھر اٹھی :: آج شعلوں میں جل رہا ہوں میں

[2] مومن:- تم مرے پاس ہوتے ہو گویا :: جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

[3] مومن:- اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک :: شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تم نہ سمجھے تو کون سمجھے گا   میری راز و نیاز کی باتیں

لب پہ مہر سکوت ہو تجھے
ہوں نگاہوں سے راز کی باتیں

کب نگاہیں ملائیں گے ہم تم   کب قیامت اٹھائیں گے ہم تم
جھوم اٹھیں گے ماہ و انجم بھی   کبھی وہ گیت گائیں گے ہم تم
جس سے ہو جائے گی فضا رنگیں   ایسی ہولی منائیں گے ہم تم
راہ روکے گا تو نصیب کو بھی   ٹھوکروں میں اڑائیں گے ہم تم
میں رگ جاں ہوں تم رگ الفت   یونہی دکھ بانٹے جائیں گے ہم تم
تم ہو اک چاند میں ہوں اک تارا   عرش پر جگمگائیں گے ہم تم
آگ غم کی اگر بھڑک اٹھی   آنسوؤں سے بجھائیں گے ہم تم

چاند تاروں سے دور اے تجھے
اپنی دنیا بسائیں گے ہم تم

میرے لب پر حدیث آرزو ہے   نہ جانے کون میرے روبرو ہے
محبت زندہ دار رنگ و بو ہے   محبت زندگی کی آبرو ہے
مرے خاموش دل میں شام فرقت   یہ کیسا شور کیسی ہاؤ ہو ہے
اسی کی رو میں دنیا بہہ رہی ہے   جوانی ایک موج رنگ و بو ہے
محبت میں یہ کیسا وقت آیا   ہماری خامشی بھی گفتگو ہے
کسی کی یاد سے تازہ کریں دل   رپہلی چاندنی سے آب جو ہے
شگفتہ دل ہے جس سے دولت غم   میرے دل کی یہی اک آرزو ہے

ناچیز ہوں مگر ترے آنے کی دیر ہے
ذرّے کو آفتاب بنانے کی دیر ہے

اہلِ زمانہ چونکنے والے ہیں خواب سے
ان غافلوں کا شانہ ہلانے کی دیر ہے

دنیا تڑپ اُٹھے گی محبت کے ذکر سے
اک داستانِ درد سنانے کی دیر ہے

تارے مرے شفق مری خورشید و مہ مرے
ہمت سے اس جہان پہ چھانے کی دیر ہے

پھری نظر نظامِ جہاں کا ہے انقلاب
دنیا کو بیقرار بنانے کی دیر ہے

ہر آدمی ہے اپنی جگہ ایک کائنات
اُجڑے ہوئے دلوں کو بسانے کی دیر ہے

سنتی ہوں شامِ ہجر کی کٹھن دور ہیں
بس اب یہ ہجرِ غم کے فنانے کی دیر ہے

آخر سنبھل ہی جاؤں گی رستے دنیائے عشق میں
دو چار بار ٹھوکریں کھانے کی دیر ہے

تجھ کو سناؤں گی ہیں محبت کی داستاں
اے دوست تیرے دیس میں آنے کی دیر ہے

چھوٹے گی رات وجد میں آئے گی کائنات
نجمہ ترے ستار اُٹھانے کی دیر ہے

سامانِ صد بہار کئے جا رہی ہوں میں
داغ اپنے آشکار کئے جا رہی ہوں میں

خود سے تجھے دوچار کئے جا رہی ہوں میں
غفلت کو ہوشیار کئے جا رہی ہوں میں

جادو نگاہِ شوق نہیں پھر بھی حسن کو
آیا ہوا سا پیار کئے جا رہی ہوں میں

مدت سے گرچہ دیکھ رہی ہوں خود اپنی راہ
تیرا بھی انتظار کئے جا رہی ہوں میں

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اس مست آنکھ کو
دانستہ ہوشیار کئے جا رہی ہوں میں

آنا کسی کا آج بھی ممکن نہیں مگر
کیوں دیر سے سنگار کئے جا رہی ہوں میں

آہٹ سی پا رہی ہوں کسی کی آس پاس
یا تجھ کو رازدار کئے جا رہی ہوں میں

اس طرح غم کا بھولنا آسان تو نہیں
کیوں خود کو میگسار کئے جا رہی ہوں میں

مقصود تجربہ ہے کہ آغازِ عشق کو انجام سے دوچار کیے جا رہی ہوں میں
تجھ سے بھی کر رہی ہوں الگ تجھ کو پا کے بھی یکتائے روزگار کیے جا رہی ہوں میں
اپنی نگاہِ شوق سے دنیائے حسن کا ہر راز آشکار کیے جا رہی ہوں میں
دنیا سدا بہار، محبت سدا سہاگ کیوں نالہ بار بار کیے جا رہی ہوں میں

نجمہ اسے چلی ہے ستاروں کو نیند سی
کیوں ان کا انتظار کیے جا رہی ہوں میں

قُربت بھی بُعد ہے یہ بتا کر چلے گئے اک چیستاں وہ اور بنا کر چلے گئے
خود کو قصور وار بنا کر چلے گئے وہ مجھ کو شرمسار بنا کر چلے گئے
اب وہ نہیں تو ڈھونڈتی ہوں اپنے آپ کو مجھ کو مجھی سے آج چھپا کر چلے گئے
کچھ مسکراہٹیں تھیں نگاہیں دمِ وداع کچھ بجلیاں سی دل پہ گرا کر چلے گئے
تھی منتِ خاک پر بھی تھی شانِ کرم کیوں مجھ سے آن اپنا بچا کر چلے گئے
دل سے نکل کے دل ہی میں پیوند ہو گئے تفریقِ قرب و بعد مٹا کر چلے گئے
ان کی نظر میں دیکھ لیا اپنے آپ کو مجھ کو مرا ہی جلوہ دکھا کر چلے گئے
جس رہگذارِ شوق سے ان کا گزر ہوا اک شمعِ آرزو کی جلا کر چلے گئے
ہونٹوں کا وہ سکوت نگاہوں کی وہ صدا اک داستانِ شوق سنا کر چلے گئے
اب ہے جدھر نگاہ اُدھر جلوہ گاہ ہے وہ کائناتِ شوق پہ چھا کر چلے گئے

نجمہ غم و نشاط میں اب فرق ہے محال
ایسا وہ دردِ دل میں اٹھا کر چلے گئے

کریں یاد ہم کو کہ دل سے بھلا دیں ہم آخر غمِ عشق کو کیا بتا دیں

ڈبو کر غموں کے سمندر میں خود کو
محبت کی کشتی کنارے لگا دیں

خرابات عالم کی ویرانیوں سے
اگر ہو سکے زندگی کو صدا دیں

مٹا دیں وہ سارے زمانہ کو لیکن
یہ ممکن نہیں نقشِ الفت مٹا دیں

حیاتِ محبت کی تکمیل کر کے
حدیں موت اور زندگی کی ملا دیں

نگاہیں تری چھیڑتے پر جو آئیں
رلا کر ہنسا دیں ہنسا کر رلا دیں

محبت سے مخمور کر کے دلوں کو
ان اجڑی ہوئی بستیوں کو بسا دیں

سرِ منزلِ دوست اہلِ محبت
مقدر کو بھی ٹھوکروں میں اڑا دیں

وہ نقشِ وفا ہوں جسے وہ نگاہیں
گھٹا دیں بڑھا دیں بنا دیں مٹا دیں

محبت عبادت بھی جرم و خطا بھی
وہ کس کو جزا دیں وہ کس کو سزا دیں

ترے عشق کے درد سے مسکرا کر
شبستانِ غم کو نہ کیوں جگمگا دیں

کہانی کہیں شامِ فرقت کی تجھ سے
ستاروں کو پھر آپ بیتی سنا دیں

اسی آئینے میں امروز فردا دیکھ لیتی ہوں
تری اٹھتی جھکی نظروں میں کیا کیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی دنیا کے اندر کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
کبھی اپنے ہی اندر اک دنیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی صحرا میں آتے ہیں نظر گلزار کے جلوے
کبھی میں دامنِ گلشن میں صحرا دیکھ لیتی ہوں

مری دوشیزگی جب پھول بن کر مسکراتی ہے

نگاہِ عشق کا دامن پہ دھبا دیکھ لیتی ہوں

فنا بھی ہے بقا بھی ہے نگاہِ شوق ساماں میں
عدم اندر عدم دنیا میں دنیا دیکھ لیتی ہوں

سمجھتی ہوں کہ یہ بھی اک فریبِ حسن ہے لیکن
نگاہِ ناز میں شرمِ تمنّا دیکھ لیتی ہوں

کہیں بیتابیاں گم ہو سکی ہیں قربِ جاناں سے
نگاہیں شاد ہو جائیں بس اتنا دیکھ لیتی ہوں

وہ آنکھیں دیکھ کر میں اک شانِ بے نیازی سے
قدح خانے میں سمتِ جام و مینا دیکھ لیتی ہوں

کسی کے ڈبڈبائے آنسوؤں میں پچھلی راتوں کو
میں نجمہ اپنی قسمت کا ستارا دیکھ لیتی ہوں

بیخودی کے ساز پر گانے کا موسم آ گیا
آ گیا پی کر بہک جانے کا موسم آ گیا

رنج و غم سے دل کو بہلانے کا موسم آ گیا
تلخیوں سے لذتیں پانے کا موسم آ گیا

یاس کے پردوں میں پھر امید لیں کروٹیں
پھر فریبِ زندگی کھانے کا موسم آ گیا

پھر پیامِ آمدِ جاناں سکونِ شام ہے
سیج پر کلیوں کے کھل جانے کا موسم آ گیا

یہ تڑپ یہ درد یہ رگ رگ میں ہلکی سی کسک
یہ شباب آیا کہ مر جانے کا موسم آگیا
توڑ کر ہمدم ہر اک رسم و رہِ کونین کو
لغزشوں پر لغزشیں کھانے کا موسم آگیا
ہلکی ہلکی خنکیوں میں نکھری نکھری چاندنی
داستانِ حسن دہرانے کا موسم آگیا
دردِ فرقت میں بھی قربت کی جھلک سی آچلی
اب تو دل ہی دل میں للچانے کا موسم آگیا
پھر گلِ رخسار ہوں گے شبستاں درکنار
اشکِ غم کے پھر بکھر جانے کا موسم آگیا
وادیٔ الفت میں تجھ پھر بھٹکتے ہیں قدم
ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کا موسم آگیا

سینے میں میرے جوشِ محبت کو دیکھ لے
سامانِ صد ہزار قیامت کو دیکھ لے
کیوں بادہ خواریوں کی اٹھاتا ہے زحمتیں
مستی بھری ان آنکھوں کی حالت کو دیکھ لے
رودادِ آزمائشِ فرہاد و قیس کیا
اے دل تو آج اپنی ہی ہمت کو دیکھ لے
فرصت ہو سیرِ لالہ و گل سے اگر تجھے

اے دوست میری خون شدہ حسرت کو دیکھ لے

تو آفتابِ حشر ہے میں ہوں شبِ فراق
آ اور میری صبحِ قیامت کو دیکھ لے

پھر کر سکے نہ تذکرۂ آہوئے حرم
کوئی اگر اس آنکھ کی وحشت کو دیکھ لے

پھر بجلیاں چھپیں گی نہ تیری نگاہ میں
اک دن تو میری شوخ طبیعت کو دیکھ لے

نشتر بھی تو ہے مرہمِ زخمِ نہاں بھی تو
اے چشمِ یار دل کی جراحت کو دیکھ لے

نجمہ ترے بدلتے ہی دنیا بدل گئی
کونین کی پھری ہوئی قسمت کو دیکھ لے

الٰہی کون نظروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
کہ دل کا ذرّہ ذرّہ ماہِ کامل ہوتا جاتا ہے

خدا رکھے ترے دردِ محبت کو خدا رکھے
یہی اک زندگانی بھر کا حاصل ہوتا جاتا ہے

شعورِ ذہن میں اک روشنی محسوس کرتی ہوں
مری ہستی میں آخر کون شامل ہوتا جاتا ہے

کوئی اے ناخدا تدبیر بھی ہے پار اترنے کی
سفینہ زندگی کا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

کسی کے شوخ جلووں کی کرشمہ زائیاں توبہ
وہ عارف ہو نہ پایا ہے جو غافل ہوتا جاتا ہے

گلِ لالہ سے اکثر چوٹ لگتی ہے مگر پھر بھی
دلِ ناداں بہاروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے

نہ جانے کون سا یہ راہِ الفت میں مقام آیا
کہ تیرا درد ہی اب تو مرا دل ہوتا جاتا ہے

سلجھتی ہی نہیں ہیں عشق سے بھی زیست کی گرہیں
کہ دردِ غم ہی دردِ غم کا حاصل ہوتا جاتا ہے

کسی نے رس بھری نظروں سے دیکھا اس طرح مجھ کو
کہ مجھ سے بے نیازِ دوجہاں دل ہوتا جاتا ہے

محبت میں کیا دوں محبت میں کیا لوں ... تجھے دے کے دل تجھ کو اپنا بنا لوں
ادھر آؤ پہلو میں تم کو بٹھا لوں ... ذرا حوصلے اپنے دل کے نکالوں
وفورِ محبت بھی ہے اک مصیبت ... میں تجھ کو سنبھالوں کہ خود کو سنبھالوں
گلستاں گلستاں خیاباں خیاباں ... تجھے دیکھ کر غنچۂ دل کھلا لوں
ابھی کر کے مجبورِ تسخیرِ عالم ... ذرا ان آنکھوں سے جادو جگا لوں
دلِ مضطرب کو نہ دوں گی سکوں بھی ... دھڑکنے کا اس کے کچھ انداز پا لوں
دوام و بقا میرے بس میں ہے غافل ... بنوں گی کہ نقشِ ہستی مٹا لوں
بڑھا دوں ذرا دھڑکنیں اپنے دل کی ... ترے درد کا حوصلہ آزما لوں
مقدر سے تدبیر کی کب چلی ہے ... نہ آئے تجھے موت گر زہر کھا لوں

محبت کا آغوش ہوں میں سراپا　　تجھے بھی جو چاہوں تو سانچے میں ڈھالوں
غمِ دوست اک روز مٹنا ہے مجھ کو　　ابھی اور کچھ دن ترے کام آ لوں
اُفق پر ہیں پھر کہکشاؤں کی شمعیں
درِ یار پر چل کے قسمت جگا لوں

طلب میں تری بچ کے ہر اک جہت سے
کسی سمت کھنچتی چلی جا رہی ہوں

مجھے کھو دیا تیری فرقت نے ایسا
خود اپنی نظر سے چھپی جا رہی ہوں

دل افسردہ، لب خشک، آنکھیں بھی پُرنم
مگر مسکراتے چلی جا رہی ہوں

رگِ زندگی ہوں کہاں مجھ کو راحت
ازل سے میں دکھتی چلی جا رہی ہوں

دلوں سے جہاں سے زمان و مکاں سے
میں رسمِ وفا ہوں اٹھتی جا رہی ہوں

جہاں میں ہے رفتار میری انوکھی
بصد ہوش و صد بیخودی جا رہی ہوں

محبت محبت، زمانہ زمانہ
پیا ہے بدلتی چلی جا رہی ہوں

ترے عشق کی بن گئی ہوں کہانی

کہی جا رہی ہوں سُنی جا رہی ہوں

محبت کی میں شامِ فرقت ہوں تجھ

مصیبت سے کٹتی چلی جا رہی ہوں

کیونکر گزر رہے ہیں مری زندگی کے دن　　یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی ہوں کیا کروں

مجھ کو ترے فراق کا احساس ہے مگر　　میں ترے پاس آ نہیں سکتی ہوں کیا کروں

یہ ٹھنڈی ٹھنڈی آگ محبت کہیں جسے　　یہ آگ میں بجھا نہیں سکتی ہوں کیا کروں

تجھ ترے خیال میں برباد ہو گئی

یہ بات اب چھپا نہیں سکتی ہوں کیا کروں

میں بجھ گئی کہ نبض دو عالم ہی بجھ گئی　　دنیا ترے بغیر نہ بہلا سکی مجھے

کچھ ایسے بے دلی سے گزرتی گئی حیات　　جی ہی سکی میں اور نہ موت آ سکی مجھے

دنیا ہمہ نشاط و جوانی سہی مگر　　دنیا کسی فریب میں کب لا سکی مجھے

آئی تھی بیخودی میں صدا کے سکوں کبھی　　آوازِ بازگشت نہ پھر آ سکی مجھے

میرا ہی تھا یہ ظرف کہ ان حادثوں میں بھی　　یہ تلخیٔ حیات نہ گھبرا سکی مجھے

تجھ بن یہ سیلِ حوادث یہ شامِ غم

حیرت نہیں اجل نہ اگر پا سکی مجھے

لرزاں ہیں جو روح کے پردوں میں انوار لٹائے جاتی ہوں

ہستی کے ذرّے ذرّے کو خورشید بنائے جاتی ہوں

کچھ نکھرے نکھرے گیت ہیں جو ہونٹوں سے برستے رہتے ہیں

اک میٹھی میٹھی آگ ہے جو ہر سو بھڑکائے جاتی ہوں

خود اپنی لے کو سنتی ہوں خوش ہوتی ہوں سر دھنتی ہوں
اشعار میں ڈھال کے اشکوں کو مستی میں گائے جاتی ہوں

دل اکثر چوٹیں سہتا ہے اور چُپ چُپ روتا رہتا ہے [1]
گو سر تا پا غم ہوں لیکن ہنستی ہوں ہنسائے جاتی ہوں

موہوم سی ایک تمنّا کی خاطر، یہ حوادث تو یہ ہے
پھولوں کی محبت میں کانٹے آنکھوں سے لگائے جاتی ہوں

کیا جانے کس سے کہتی ہوں خوابوں کے سنہرے افسانے
ٹھہرو کہ ابھی میں آتی ہوں، ٹھہرو کہ ابھی آئے جاتی ہوں

معلوم کبھی یہ ہوتا ہے محصور ہوں چاند ستاروں میں
محسوس کبھی یہ کرتی ہوں ذرّوں میں سمائے جاتی ہوں

نغمے پھر سندر سپنوں میں بننے لگے قصر امیدوں کے
پھر ریت کے گرتے ساحل پر بنیاد اٹھائے جاتی ہوں

آ بیٹھے سے لگا کر دل کٹھن راہِ وفا
یہ تمنا چھرا، یہ غم، یہ ستم تیرے میرے لئے

دن ترے نوروز، رنگا رنگ ہیں راتیں تری
اور یہ ویرانی شام و سحر میرے لئے

سب کے سرو سامانوں میں یکساں گزرتے ہیں
یہ مہ و خورشید و انجم چرخ پر میرے لئے

برق و باراں میرے میا آ مرے میری شفق
بجلیاں میری ہیں اور برقِ شجر میرے لئے

میری خاطر گیسوئے ابرِ سیہ کے پیچ و خم
بدلیوں کی صاف بل کھاتی کمر میرے لئے

[1] میر سے: اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
میں راتوں کو اٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

گردشِ دوراں ہے میری جستجو کے واسطے
ہے ازل سے تا ابد دورِ قمر میرے لئے

جس طرف بھی میں نکل جاؤں ہو میری رہگذر
فرش رہ آنکھیں کئے ہیں بام و در میرے لئے

سب کرشمے حسن کے ہیں کیا ثواب کیا گناہ
نور و ظلمت میری خاطر خیر و شر میرے لئے

تو مری تازہ بتازہ رنگ ہے میرا تو یہ تو
سوز پیدا ہے نیا اک دیدہ ور میرے لئے

میری ہی خاطر ہیں یہ حسن و عشق کی نیرنگیاں
ہے ہر اک دیوانہ و دیوانہ گر میرے لئے

مالکِ کون و مکاں ہوں شاعرِ فطرت ہوں میں
یہ زمیں یہ آسماں یہ بحر و بر میرے لئے

میری ہستی انقلاب انقلاب انقلاب
نظمِ عالم آج ہے زیر و زبر میرے لئے

مجھ سے وہ چھپتا ہے مجھ بن کے میری ہی نگاہ
پردہ داری ہے بانداز دگر میرے لئے

کرم تیرا کہ سوزِ جاودانی لے کے آئی ہوں
مگر یہ کیا کہ میں اک عمرِ فانی لے کے آئی ہوں

یہ کس کافر کی محفل ہے کہ جس میں نذر کرنے کو
میں دل کی دھڑکنیں آنکھوں کا پانی لے کے آئی ہوں

یہ دنیا! یہ خلوص و عشق کے رنگ آفریں نقشے
بیاباں میں گلستاں کی کہانی لے کے آئی ہوں

بھڑک کر شعلہ بن جائے کہ بجھ کر راکھ ہو جائے
ہوا کی زد پہ شمعِ زندگانی لے کے آئی ہوں

مری دنیا ہے شعر و خواب و رنگ و نور کی دنیا
مہ و انجم کی گویا ضوفشانی لے کے آئی ہوں

اگر چاہوں یہ دنیا پھونک ڈالوں اپنے نغموں سے
کہ میں سانسوں میں شعلوں کی روانی لیکے آئی ہوں

مرا دل بھی ہے محسوسات کا آتش کدہ آخر
عجب کیا ہے جو ذوقِ شعر خوانی لے کے آئی ہوں

ضیا اندوز ہوں اک آسمانی نور سے تجمہ
زمیں پر چاند تاروں کی جوانی لے کے آئی ہوں

ہر نفس چلتی ہوئی تلوار ہے زندگی اک مستقل آزار ہے
مسکرانا تو بڑی شے ہے یہاں اب تو رونے سے بھی جی بیزار ہے
زیست کے ماحول میں چاروں طرف ایک گہری تیرگی بیدار ہے
ولولے گھٹتے ہوئے مرتے ہوئے منجمد سی گرمیٔ افکار ہے
بجھ گئے روشن امیدوں کے چراغ زیست اک اک شامِ ظلمت بار ہے
زندگانی ہر قدم ہر موڑ پر ایک محکم آہنی دیوار ہے
کاش میری وقتیں سمجھیں وہ لوگ
جن کو میری شاعری سے پیار ہے

مطربِ خوشنوا ابھی سازِ طرب بجائے جا
بھول چلی ہوں دردِ ہجر، ہاں یہی راگ گائے جا
وعدوں کی اس کے داستان چھیڑ کے دل دکھائے جا
یعنی چراغ سے چراغ اے شبِ غم جلائے جا
جوہرِ آبِ خضر بھی گرچہ اسی میں ہے نہاں

خنجرِ نازِ حسن کو زہر میں بھی بجھائے جا

اے دلِ بیقرار آج فرصتِ ترکِ عشق ہے
اب ہمہ تن ہیں گوش ہوں قصۂ غم سنائے جا

تجھ سے سکونِ حال کی حسرت آرزو ہو کیا
غم ہی تو ہے بڑھائے جا، دل ہی تو ہے دکھائے جا

اے دلِ مصلحت شناس حرف نہ تجھ پر آنے پائے
حسن کے ناز اٹھائے جا، عشق کے کام آئے جا

اس کی گدا نوازیاں عام ہیں بے حساب ہیں!
مل ہی رہے گا کچھ نہ کچھ دستِ طلب بڑھائے جا

شمعِ بیقرار تو نورِ پیامِ صبح ہے
بن کے ستارۂ سحر چرخ پہ جھلملائے جا

سب یہ آثارِ غم بدل جاتے — تو جو آتا چراغ جل جاتے
ابھی منزل ہے دامنِ جاناں — اشکِ خونیں بھی سر کے بل جاتے
یوں تو انجامِ عاشقی معلوم — حوصلہ دل کے کچھ نکل جاتے
خیر سے کارِ عشق تھے دشوار — سہل ہوتے اگر تو کھل جاتے
خیر گذری بدل گئی دنیا — قہر ہوتا جو تم بدل جاتے
کل بھی اک روز آج ہو جاتا — آج جاتے نہ وہ تو کل جاتے
طور و کعبہ سے ہم بھی مایوس — اور کچھ دور تک نکل جاتے

تری چشم ہے بادۂ مست شراب | زمانے کو کر دے گی اک دن خراب[۱]
تو اک بھینی بھینی سی کلیوں کی بو | ہیں اک کھویا کھویا جوانی کا خواب
نظر بہکی بہکی ادا مست مست | یہ الھڑ جوانی یہ کافر شباب
جبیں چاندنی اور لب پھول سے | ترا جسم اک پرتو ماہتاب
وہ آئیں ہوائیں وہ اٹھی گھٹا | بس اک گنگناتا سا جام شراب[۲]
وہ شب تاب جگنو وہ تاروں کی چھاؤں | کبھی میں نے ایسا بھی دیکھا تھا خواب
ادھر آؤ تم سے کہوں ایک بات | سراپا تغزل اور جسم شراب
یہ ساغر ہے یہ مے ہے یہ ساز ہے | بنا دو جہاں کو بہشت شباب
یہ کیا دے دیا تم نے ولے مجھے | مسلسل تپش مستقل اضطراب

پلا دو کسی روز مجھ کو بھی
ہٹا دو کسی روز رخ سے نقاب

اپنی خوشیوں کے عارضی جذبات | غم میں تحلیل کر رہی ہوں میں
کوششیں ہیں کہ غم سہے جاؤں | خود کو تبدیل کر رہی ہوں میں
ماضی و حال کے مصائب سے | اپنی تکمیل کر رہی ہوں میں
کہہ رہی ہوں ترے ستم کو کرم | خوب تاویل کر رہی ہوں میں

---

۱ اس غزل میں میرحسن کی مثنوی کی بحر استعمال کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔
رہی کوئی دانتوں میں انگلی کو داب | کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
۲ میرحسن: پلا ساقیا مجھ کو اک جام مل | جوانی میں آئے ہیں ایام گل

موت کی وادیوں میں جاتا ہے — کتنی تعجیل کر رہی ہوں میں
کل ارادوں میں جان ڈالوں گی — آج تشکیل کر رہی ہوں میں

زندگی کی حقیقت نہیں سمجھے
صرف تخئیل کر رہی ہوں میں

پھر وہ حیرت نگاہِ غم لے کے کہیں یاد آگئی
شامِ غربت میں مجھے صبحِ وطن یاد آگئی

بلبلِ رنگیں نوا کو وقفۂ شورِ چمن
رونقِ رنگینیٔ صحنِ چمن یاد آگئی

گلستاں در گلستاں ہیں میری رنگیں خواہشیں
یاد اس کی ۔۔۔ انجمن در انجمن یاد آگئی

زندگی کے والہانہ دور میں گذری ہوئی
کوئی شب نغمہ طراز و نغمہ زن یاد آگئی

جب کبھی آیا عزیزانِ وطن کا کچھ خیال
تلخیٔ بے مہریٔ اہلِ وطن یاد آگئی

دیکھ کر پردیس میں تجھ پہ توقیرِ ادب
دیس کی ناقدریٔ اربابِ فن یاد آگئی

وہ جب سامنے تھے ادب درمیاں تھا — انھیں دیکھ لینے کا موقع کہاں تھا
خود اپنے سے ہونا بھی چھپنا گماں تھا — نہ کوئی عیاں تھا نہ کوئی نہاں تھا
سرِ شاخِ گلشن ابھی آشیاں تھا — ابھی برق چمکی تو مطلق دھواں تھا

وہ دن بھی کبھی تھے کہ دنیا تھی دنیا — زمیں تھی زمیں آسماں آسماں تھا
یہ کھلتا نہیں کچھ وہ تم تھے کہ میں تھی — مگر یہ کہ حائل کوئی درمیاں تھا
شبِ ہجر میں تم بہت یاد آئے — بھری چاندنی تھی سہانا سماں تھا[1]
فقط ایک رستے میں تھا راہبر دل — مگر شورِ دل کارواں کارواں تھا
محبت سے پہلے بھی دنیا یہی تھی — یہی سر زمیں تھی یہی آسماں تھا
یہ احساس ہوتا ہے ملتے ہی تجھ سے — کہ جیسے ازل ہی سے تو مہرباں تھا

یہ قصہ ہے اب کا کہ تجھ پہ جواں ہے
وہ قصہ ہے جب کا تو آتش جواں تھا

ان لبوں میں ہے شرابِ آتشیں میرے لئے
وہ حسیں بانہیں وہ جسمِ مرمریں میرے لئے
کیف و مستی کی دنیا محفلِ رقص و سرود
کر گئی قائم وہ چشمِ سرمگیں میرے لئے
گردشِ ایام کی نبضیں یکایک رک گئیں
کس نے پھیلا دی یہ زلفِ عنبریں میرے لئے
دردِ دل، سوزِ محبت، اشکِ غم اور اضطراب
اک مصیبت ہو گیا قلبِ حزیں میرے لئے

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی ؎ بس آہ کرکے اپنے خیالوں میں کھو گیا
کچھ ذکر تھا بہار و شبِ ماہتاب کا

بڑھ جاتا ہے مجھے قوسِ قزح کے اُس طرف
منتظر ہے ایک دنیائے حسیں میرے لئے

انجمن تیری یہ شمعیں تیری یہ رونق تیری
بزمِ عالم میں سکوں کچھ بھی نہیں میرے لئے

پھر سکونِ روح میرا آ نہ جائے وجد میں
چھیڑ نہ جائے پھر کوئی نغمہ کہیں میرے لئے

تجھ کو زیبا ہے اگر تجھ سے ہے تو رات دن
یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے

محبت کے دکھ سکھ اُٹھاتی رہونگی
یونہی زندگانی مٹاتی رہوں گی

غمِ ہجر میں مسکراتی رہوں گی
تری یاد کے ناز اُٹھاتی رہوں گی

محبت میں نقشے نئی زندگی کے
بناتی رہوں گی مٹاتی رہوں گی

نگاہیں ملا دوں گی اک روز تجھ سے
ابھی کچھ دن آنکھیں چراتی رہوں گی

سوا میرے دنیا میں ہے کون تیرا
میں اپنے تم ترے کام آتی رہوں گی

رکھونگی ہری زندگانی کی کھیتی
محبت کے آنسو بہاتی رہوں گی

کھنچی سی تنی سی رہونگی کسی سے
یونہی حُسن کو آزماتی رہوں گی

محبت کی بزمِ سکون و طرب میں
میں تو کی طرح تھر تھراتی رہوں گی

ہو کیوں رائیگاں درد میری صدا کا
ترانے محبت کے گاتی رہوں گی

یہی سعیِ بیسود ہے شغل میرا
تری یاد دل سے بھلاتی رہوں گی

نظر ہے مری داستانِ محبت
کہانی سی تم کو سناتی رہوں گی

شبِ غم کی آنکھوں کا آنسو ہوں شبنم
یونہی صبح تک جھلملاتی رہوں گی

"منظومات"

امرتسر پردہ کلب

بجلیوں کی اور ستاروں کی زمیں — چاند تاروں سیم پاروں کی زمیں
قہقہے آرام پاتے ہیں یہاں — پھول سے لب مسکراتے ہیں یہاں
اُف یہ ملبوسات ہوتا ہے گماں — جیسے کوئی ساڑیوں کی ہو دکاں
عشق کے ارمان پلتے ہیں یہاں — شعر اور رومان پلتے ہیں یہاں
ریشموں میں جھلملاتی لڑکیاں — اینڈتی اور لڑکھڑاتی لڑکیاں
نکہتیں بکھری ہوئی سی چارسو — مستیاں بکھری ہوئی سی چار سُو
سحر کاری جلوہ تابی ہر طرف — دیدہ و دل کی خرابی ہر طرف
مضطرب ہیں حُسن کے جلوے یہاں — اس نمائش گاہ میں پردہ کہاں

یہ مقامِ آبروئے عشق ہے
حُسن کو خود جستجوئے عشق ہے

"رودِ جہلم"

(شہرِ جہلم کے قریب شام کا ایک منظر)

جہلم اک رودِ نظر افروز اک سیمِ رواں — زمزمہ پرواز لہروں کا یہ سیلِ بیکراں
چاندنی لپٹی ہوئی سی ساغرِ بلور میں — گیت کچھ بہتے ہوئے سے آسمانی نور میں

قطرہ قطرہ رقص کرتا وجد فرماتا ہوا
تھرتھراتی ہوئی گرداب چکراتا ہوا

یہ سبک رفتار دو نگوں میں گیتوں کی الاپ
سرمئی ساحل سے یہ شفاف لہروں کا ملاپ

ڈھلتی جاتی ہے رات کی تاریکیوں میں یہ سماں
ریل کے پل پر چمکتی جھلملاتی گاڑیاں

جنت نظارۂ حسن انجم و مہتاب ہے
اک بالائے فلک اک چاند زیرِ آب ہے

مست رو لہروں کے پاکیزہ سحر انگیز راگ
رس بھرے کیف آفریں سرشار تند و تیز راگ

جب بھی امرت سر کے ہنگاموں سے گھبراتی ہوں میں
اُٹھ کے تجھ رودِ جہلم پر چلی آتی ہوں میں

آغازِ عشق

تلوّن

آغازِ محبت میں وہ اک صبح خراماں
آنکھوں میں سمیٹے ہوئے سو رنگ کے طوفاں

اب تک ہے تصور میں وہ بیدار نظارہ
وہ مست سماں اب بھی نگاہوں میں ہے رقصاں

سانچے میں جوانی کے وہ ڈھالی ہوئی مورت
ہونٹوں کے تبسم کی جھلک رخ پہ فروزاں

دزدیدہ نگاہوں میں وہ دزدیدہ تبسم
وہ برقِ مجسم کبھی پنہاں کبھی عریاں

وہ عہدِ جوانی کی تمناؤں کا مرکز
وہ قامتِ خوش جس سے خجل سروِ گلستاں

وہ جوشِ شباب اور وہ شرمیلی ادائیں
ہنگامِ جنوں دل کے لئے عشوۂ پنہاں

انگڑائی سی لے کر ہوئی بیدار محبت
جذبات کی مستی ہوئی خورشیدِ گلستاں

امید کی آغوش میں پلتے رہے جذبے
آغاز میں ہوتا ہے مگر عشق بھی ناداں

(۲) انجامِ عشق

اک وقت پھر آتا ہے کہ مرجاتی ہے امید
فرصت نہیں ملتی کہ سئیں چاک گریباں
ہوتی نہیں مانوس کسی شے سے طبیعت
خاطر بھی پریشان، تخیّل بھی پریشاں
بڑھ جاتی ہے افکارِ معیشت کی کشاکش
دوزخ سی نظر آتی ہے یہ جنتِ دوراں
ارمانوں میں رہتا نہیں پہلا سا تموّج
ہو جاتا ہے یوں جیسے عشق کا ساماں
گھٹ جاتا ہے ذوقِ عمل و جوشِ تمنّا
بڑھ جاتی ہے مایوسیٔ دل تا حدِ امکاں
مٹ جاتی ہے تابندگیٔ کاکل و رخسار
جس طرح چھپے ابر میں خورشیدِ درخشاں
بیگانگیٔ دہر کی ہوتی ہے یہ صورت
محسن کوئی ہوتا نہیں آمادۂ احساں

(۳) تجدیدِ عشق

پھر فتنے جوانی کے مچلتے ہیں رگوں میں
پھر دل کا ہر اک گوشہ ہے صد حشر بداماں

([illegible])

پھر حُسن کی دنیا میں ہے یک گونہ تغیّر
ہے زود پشیماں کا ہر اندازِ پشیماں
پھر دیتی ہے پیغامِ جنوں میری خرابی
پھر ان کے حسیں چہرے پہ زلفیں ہیں پریشاں
پھر چھیڑتی ہیں میری تمناؤں کو نظریں
پھر روح کو تجدیدِ محبت کا ہے ارماں
پھر یاد دلاتی ہیں مجھے عہدِ گذشتہ
کیوں ہوتے ہیں پھر میری تباہی کے یہ ساماں
احساس کی دنیا متغیّر ہوئی یارب
ہے کون جو اب روک دے جذبات کے طوفاں
عورت کی ادائیں نہ ہوں بیباک الٰہی
عورت کی اداؤں سے لرز جاتا ہے ایماں

اقتباس

خدا کے واسطے لطف آفریں نظر کو روک
خدنگِ عشق کے اقدامِ پُرخطر کو روک

(پچھلے صفحہ سے)
۱؎ فیض احمد فیض ؎ مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار (نقش فریادی)

پیامِ دردِ محبت کی رہگذر کو روک

سنا نہ مجھ کو محبت کے عنبریں نغمے
حواس و ہوش کے رہزن ہیں یہ حسیں نغمے
جنوں شکار و طرب خیز و دلنشیں نغمے

طرح طرح سے تیری یاد کو بھلایا ہے
جگر کی آگ کو خونناب سے بجھایا ہے
دلِ خراب کو تخریب سے بچایا ہے

غمِ فراق میں تو کبھی نہ کر بسر راتیں
بھلا چکے شوقِ محبت کی وہ ملاقاتیں
خیال و خواب سمجھ لے وہ پیار کی باتیں

مری قبائے جنوں تار تار ہونے دے
میں خوش ہوں مجھ کو یونہی سوگوار رہنے دے

تعلقاتِ محبت کو استوار نہ کر
مجھے حسین نگاہوں کا تو شکار نہ کر

تو پھر تعلق تو کاہے مجھے پیام نہ دے
مجھے شرابِ محبت کے مست جام نہ دے

مرے فراق میں تو زندگی خراب نہ کر
دل و نگاہ کو مرہونِ اضطراب نہ کر

شمیم جہلی

تڑپ تڑپ کے گزاریں فراق کی راتیں
سسک سسک کے بھلائی ہیں پیار کی باتیں
بلا رہی ہیں مگر شام کی ملاقاتیں

تاثرات کی دنیا کو چھین لو مجھ سے

ترے خطوط سے ظاہر ہے اضطرار ترا
وفورِ گریہ سے ہے دیدہ اشکبار ترا
دلِ حزیں بھی ہے غمناک و سوگوار ترا
مگر یہ تیری محبت فریب ہے بالکل
یہ درد و رنج یہ کلفت فریب ہے بالکل

نہ حالِ زار پہ مجھ کے آپ کرم کر تو
نہ اس کے واسطے دل مائلِ الم کر تو
نہ دے پیامِ محبت نہ پھر ستم کر تو
اسے فسردہ نظر دل فگار رہنے دے
اسے اسیرِ غمِ انتظار رہنے دے

قطعات

عطرِ وفا کی خوشبو سے　　ظرفِ محبت کو مہکا
مست نگاہوں سے پی کر　　مجھ دنیا پہ چھا جا

تجھ کو اپنے قریب پاتی ہوں　　دل پہ چھایا ہوا ہے تیرا خیال
کیا تجھے بھی میں یاد آتی ہوں　　کتنا نازک ہے تجھ سے میرا سوال

سانیٹ[1] (Sonnet)

(۱)

جس طرح صبح کے انوار کی بارش ہو جائے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یا ہو آغوشِ چمن زار میں طوفانِ بہار
پتی پتی پہ کھلا رکھا ہو قرآنِ بہار
کوئی پھولوں کا ہی سہارا لیے کیسے سو جائے

یا ہو خوابوں کے جزیروں میں کوئی نغمہ طراز
جھوم کر آئے گھٹا میکدہ کاندھے پہ لیے
کوئی صہبا کسی دوشیزہ کے ہونٹوں سے پیے
چھیڑ دے جیسے جوانی کوئی گونجا ہوا ساز

[حاشیہ صفحہ ۶۸۱]
لہ "سانیٹ" (Sonnet) چودہ مصرعوں کی ایک مخصوص نظم کو کہتے ہیں محققین میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ اول اوّل سانیٹ کس جگہ ایجاد ہوا۔ اس سلسلہ میں سسلی اور پراونس (جو فرانس کا ایک صوبہ ہے) کے نام لئے جاتے ہیں لیکن یہ بات محقق ہے کہ اطالیہ میں یہ تیرھویں صدی ہجری میں آیا اور یہاں سے دوسرے ملکوں میں پھیلا۔ اطالیہ میں ڈانٹے (Dante) پیٹرارک (Petrarch) اور مایکل انجیلو (Michel Angelo) اس صنفِ شاعری کے زبردست علمبردار گزرے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد اطالیہ سے سانیٹ فرانس آیا اور پھر فرانس سے ملکہ الزبتھ (Queen Elizabeth) کے دوران حکومت یعنی سولھویں صدی میں

طامس وائٹ (Thamas wyatt) اور ہنری ہوورڈ ارل آف سرے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحنِ میخانہ میں ہلکی سی کوئی رقصاں ہو جائے
دل کے ہر تار سے نغموں کی صدا آنے لگے
تاروں کی چھاؤں میں یا چاندنی لہرانے لگے
جیسے ویرانہ کوئی بزمِ چراغاں ہو جائے
آج کل یوں ہی مری عمر بسر ہوتی ہے
یعنی لمحاتِ محبت میں گذر ہوتی ہے

(پچھلے صفحے سے) (Henry Howred Earl of surrey) کے ذریعہ انگلستان آیا اور انگریزی شاعری کا ایک جز بن گیا۔ شکسپیر (Shakespeare)، ملٹن (Milton) اور ورڈز ورتھ (Wordsworth) انگریزی میں سانٹ کے زبردست لکھنے والے گزرے ہیں۔ اب بیسویں صدی میں انگریزی ادب کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ یہ صنفِ سخن اردو میں آ رہی ہے۔ اردو میں اس کو قطعہ کی ایک مخصوص صورت کہہ سکتے ہیں۔

"سانٹ" (Sonnet) اطالوی زبان کے لفظ "سانی ٹو" (Sonnetto) سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی چھوٹی سی آواز کے ہیں۔ ابتداءً یہ ایک مختصر سی نظم ہوتی تھی جو ساز کے ساتھ ترنم سے گائی جاتی تھی۔ اب سانٹ صرف ایک مختصر نظم کو کہتے ہیں۔ ساز کے ساتھ گانے کی شرط اب اس میں باقی نہیں رہی ہے۔ قطعہ کی طرح سانٹ میں صرف ایک خیال یا جذبہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔

سانٹ صرف چودہ ۱۴ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ چودہ مصرعے دو حصوں میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲)

یادِ ایّام

زندگی کے وہ جواں لمحات اب تک یاد ہیں
چوڑیوں کی گت پہ فردوسی ترانے چھیڑنا
غیر فانی عشق کے رنگیں فسانے چھیڑنا
وہ سنہرے دن حسیں اوقات اب تک یاد ہیں

عہدِ بے فکری کے وہ دن اور راتیں یاد ہیں

(پچھلے صفحے سے) منقسم ہوتے ہیں۔ پہلے حصّے میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اور دوسرے حصّے میں چھ۔ اصطلاحی زبان میں پہلے حصّہ کو "آکٹیو" (Octave) اور دوسرے حصّہ کو "سسٹیٹ" (Sestet) کہتے ہیں۔ "آکٹیو" چار چار مصرعوں کے دو بندوں پر مشتمل ہوتا ہے اور "سسٹیٹ" تین تین مصرعوں کے دو بندوں پر۔ "آکٹیو" میں کسی خیال کا اظہار و آغاز ہوتا ہے آٹھویں مصرعہ میں گریز ہوتا ہے اور "سسٹیٹ" میں اس خیال کی تکمیل و انجام

ردیف و قافیہ کے اعتبار سے "آکٹیو" کے مصرعوں کی ترتیب و تنظیم متعین ہوتی ہے۔ وہ ترتیب یہ ہے۔ اب ب ا۔ اب ب ا اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا مصرعہ، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں مصرعہ سے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرا تیسرے سے چھٹے اور ساتویں مصرعہ میں ایک ہی ردیف و قافیہ ہوتا ہے

دیکھتا بیداریوں میں بھی سرور انگیز خواب
چھاؤں میں پھولوں کی پڑھنا کوئی شعروں کی کتاب
مجھ کو کالج کے مرے باغات اب تک یاد ہیں

حادثوں نے اب بدل دی زندگی کی شاہراہ
مونس کے بجھتے ہوئے داغوں سے دل ناکام ہے

[پچھلے صفحہ سے] "سسٹیٹ" میں یہ ترتیب کئی مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے
سانٹ کی اطالوی قسم کو کلاسیکل (Classical) یا پیٹرارکن
(Petrarchan) قسم بھی کہتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کے اعتبار سے
اس کی ترتیب کی تین خاص صورتیں یہ ہیں:

"آکٹیو"	"سسٹیٹ"
(۱) اب ب ا - اب ب ا -	ج د س - ج د س
(۲) اب ب ا - اب ب ا	ج د ج - د ج د
(۳) اب ب ا - اب ب ا	ج د س - د ج س

اس میں ملٹن عموماً پہلی ترتیب کا تتبع کرتا ہے اور ورڈز ورتھ دوسری ترتیب کا۔
ردیف و قافیہ کے اعتبار سے سانٹ کی اس کے علاوہ ایک اور قسم
ہے جس کو انگریزی قسم (English Type) کہتے ہیں۔ اس میں چار چار
مصرعوں کے تین بند ہوتے ہیں اور آخر میں ٹیپ کا ایک شعر۔ شکسپیر نے

زندگی صحرا کی اک جھلسی ہوئی سی شام ہے

اب سمٹ کر رہ گئی ہے میری بالیدہ نگاہ

زیست کے احساس کو کھوئے بھی مدّت ہو گئی

مسکرانا کیا کہ اب روئے بھی مدّت ہو گئی

[پچھلے صفحہ سے] اس قسم کی ترتیب قائم رکھی ہے۔ انگریزی سانیٹ کی ترتیب کی دو مخصوص صورتیں یہ ہیں:۔

شکسپیر کی ترتیب	بند	بند	بند	ٹیپ کا شعر
	اب اب۔	ج د ج د۔	س ص س ص۔	ع ع

اسپنسر کی ترتیب اب اب۔ ب ج ب ج۔ ج د ج د س س

سانیٹ کی اس ترتیب میں شعراء نے اکثر تصرفات کئے ہیں مثلاً موجودہ دور میں ریوپرٹ بروک (Rupert Brooke) نے سانیٹ کیلئے اپنی خاص یہ ترتیب اختیار کی ہے۔

اب اب ۔ ج د ج د س ص ع س ص ع

اُردو میں ابھی سانیٹ لکھنے والے بہت کم ہیں۔ اختر شیرانی نے البتہ کچھ قابلِ اعتنا سانیٹ لکھے ہیں۔ مخزنِ مجبہ کے مندرجہ بالا دونوں سانیٹ خصوصاً پہلا ـــــ جذباتی اعتبار سے بہت بلند ہیں اور ان میں بڑی شعریت اور رنگینی موجود ہے۔ البتہ آپ نے ردیف و قافیہ کی ترتیب کی ان مقررہ صورتوں کا تتبع نہیں کیا ہے۔ آپ نے خود اپنی نئی ترتیب اختیار کی ہے۔ آپ کے سانیٹ کی مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں ہر ایک کی

اشعار

دل میں ہجومِ یاس و تمنا لئے ہوئے
دنیا سے جا رہی ہوں میں دنیا لئے ہوئے

میں مٹ چکی ہوں پھر بھی کسی کی نظر میں ہوں
ہے موت زندگی کا سہارا لئے ہوئے

تجھ کو بھی جو دیکھ سکو چشم شوق سے
ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا لئے ہوئے

جی کھول کر کچھ آج تو رو نے دے ہم نشیں
مدت ہوئی ہے درد کا درماں کئے ہوئے[1]

ملتے ہیں دونوں وقت کہ آتا ہے کوئی یاد
عارض پہ کاکلوں کو پریشاں کئے ہوئے[2]

ظلمت نصیب گوشۂ خلوت میں تمام غم
بیٹھے ہیں داغِ دل کو فروزاں کئے ہوئے[3]

(پچھلے صفحہ سے) ترتیب مختلف ہے پہلے سانٹ کی ترتیب یہ ہے :-

بند	بند	بند	طیپ کا شعر
اب ب ا	ج د ج	اس س ا	ص ص

دوسرے سانٹ کی ترتیب یہ ہے

اب ب ا اج ج ا دس س د ص ص

[1] غالب سے پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ؎ مدت ہوئی ہے چاک گریباں کئے ہوئے

[2] فراق گورکھپوری ؎ یہ تیرگی یہ ابتری یہ نکہتیں یہ مستیاں
کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلف عنبریں کہیں

[3] غالب جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ؎ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ہر آنکھ ہے اک جلوۂ معصوم کی جویا
لیکن اُسے انکار ہے معلوم نہیں کیوں

دل کشمکشِ زیست سے ہے مرگ در آغوش
جینے پہ بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں [1]

یہ کس نے ڈوبتی نبضوں پہ رکھا دستِ ناز اپنا
کہ دنیا میری نظروں میں جواں معلوم ہوتی ہے

---

[1] اس زمین میں جتنی غزلیں راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں ان میں بہترین غزل جگر مرادآبادی کی ہے۔ جذباتی و وجدانی اعتبار سے یہ غزل بہت بلند ہے۔ ملاحظہ ہو:

بیتاب ہے، بیخواب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

بے کیف سے مے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف دوبارہ
وہ جرعہ بھی زہرآب ہے معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانیے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
اب تک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھبرائے ہوئے دل کو
اک شعلۂ بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

کل تک یہی دنیا سبدِ گل تھی مگر آج
بے رنگ ہے بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

منہ تکتے ہیں تدبیر کوئی کر نہیں سکتے
شل ہمتِ احباب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر
میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

جو ساز کہ خود نغمۂ عریاں تھا اسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں
تارے، شراب، پھول، سبو، مسکرا دیئے
اے دوست شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
تجھ سے نے تیری راہ میں تارے بچھا دیئے

مآلِ ارتباطِ باہمی ہے دید کے قابل
تڑپ اٹھتا ہے میرے ساتھ میرا غمگسار اکثر
مری نظروں سے پوچھے کوئی شانِ حسنِ غم دیدہ
انہیں بیتاب دیکھا ہے بچشمِ اشکبار اکثر
سمجھنے کو سمجھتی ہوں مزاجِ حسن اے سنجیہ
مگر کرتی ہوں دانستہ کسی کا اعتبار اکثر

فنا ہو گیا آدمی عشق کر کے خرد کی کوئی بات اس نے نہ مانی
بجھے آنسوؤں سے نہ آہوں سے کم ہو محبت ہے اک آتشِ غیر فانی[1]
یہ پرکیف راتیں یہ رنگیں نظارے یہ میری تمنا یہ تیری جوانی

[1] غالبؔ:- عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ؛ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

کیوں ہلکی ہلکی آگ نہ سینے میں جل اُٹھے
سنتی ہوں مجھ کو تم سے محبت ہے اِن دنوں

کیا کم ہے تیرے حسنِ جواں کے تکلفات
یہ سادگی تو اور قیامت ہے اِن دنوں

خون بن کر مری آنکھوں سے ٹپکنے والے
نور بن کر مری آنکھوں میں سمایا کیوں تھا[1]

چومتی پھرتی ہے ہر پھول کا عارض شبنم
اس کو عکسِ رخِ گلفام دکھایا کیوں تھا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب دل ملنے لگتے ہیں
محبت کی نظر اس وقت پہچانی نہیں جاتی

ستارے جگمگا کر آنکھ میں پھر ڈوب جاتے ہیں
محبت میں مگر نجمہ پریشانی نہیں جاتی[2]

ہے مجھے سازگار یہ دنیا　　ذکرِ روزِ حساب رہنے دے

---

[1] فانی:۔ دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے؛ تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
[2] ملاحظہ ہو صفیہ شمیم ملیح آبادی ص ۵۳۳

حالِ دل ہے یہ پتہ تو نہیں　　کچھ سُنا کچھ حجاب رہنے دے
منفعل ہو نہ شانِ غفّاری　　معصیت کا حساب رہنے دے [۱]

حُسن بے اعتبار ہے لیکن　　ہم پہ ہم اعتبار کرتے ہیں
حُسن کی اور کچھ بڑھا قیمت　　نقدِ جاں ہم نثار کرتے ہیں [۲]

قدم چومے گی منزل ذوق میں کر بال و پر پیدا
سراپا شوق بن آگے نکل جا کارواں سے

تری نظر سے چمن ساز سرمدی بن جائے
کلی کلی کی زباں سے پیام پیدا کر
کسی کے رخ سے حجابات خود بخود اٹھ جائیں
نگاہ پاک و دلِ پختہ کام پیدا کر

غم نہ کر للّٰہ اتنا غم نہ کر میرے لئے　　زندگی کیا ہے فقط ناکامیوں کا نام ہے

---

[۱] علامہ اقبالؒ ؎　روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر　　(بالِ جبریل)

[۲] امیر خسرو ؎　قیمت خود را دو عالم گفتہ　؛　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حوادث سے بچنا بڑی بزدلی ہے زمانہ کا ہر غم اُٹھاتا چلا جا
مرا ذوق محتاجِ بادہ نہیں ہے نگاہوں سے مجھ کو پلاتا چلا جا
شعور و خرد کے اندھیرے ہیں گہرے دیئے بیخودی کے جلاتا چلا جا

چاندنی ہائے بہار خلوتِ ناز ان کی باہوں میں جھوم جانے دے

شبنم کہ آنسو دونوں ہیں اس فرق کو لیکن کیا کہئے
جو خاک پہ ہے وہ پانی ہے جو پھول پہ ہے وہ موتی ہے

تصورات کی دنیا ہے اک فریبِ نظر وہ آگیا — وہ رکا — وہ چلا گیا کوئی
چراغِ عارضِ پُر نور کی ضیاؤں سے سیاہ خانۂ دل جگمگا گیا کوئی

کبھی اِدھر بھی چلے آؤ کیف برساتے سبو کدے کی فضائیں سلام کہتی ہیں
خیالِ دست بہ پیچکے سے آن کہہ دینا تمہیں کسی کی وفائیں سلام کہتی ہیں
نظامِ کون و مکاں جن میں محوِ گردش ہے وہ اشکبار نگاہیں سلام کہتی ہیں

"کچھ اور رکے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی"[۱] دبی دبی سی شرارت سے کھِل سکتی ہوں
اداسیاں مری بن جائیں داستانِ نشاط خود اپنے غم کی حکایت سے کھل سکتی ہوں
نسیمِ صبح مری کم سنی کی خوشبو ہے کلی کلی کی طرح نکہت سے کھل سکتی ہوں

---

[۱] یہ مصرعہ فراق گورکھپوری کا ہے

نجمہ

محترمہ نجمہ رحمت اللہ بی۔ اے کا تعلق بھی پنجاب کی سرزمین سے ہے۔ آپ لاہور میں رہتی ہیں اور نئی شاعرات میں سے ہیں مگر خوب لکھتی ہیں۔ ترجمانی جذبات، رومان اور مناظر فطرت کی مصوری آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ کی شاعری کا وہ حصہ جس میں کیفیات قلب کی ترجمانی ہے بہت کامیاب اور بلند پایہ ہے، اس میں سوز و گداز بھی ہے اور کیف و اثر بھی۔ آپ کی منظر نگاری بھی کامیاب ہے آپ کی رومانی نظموں میں اختر شیرانی کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ دورِ حاضر کی ایک خوش گو، قابل، قادر اور کامیاب شاعرہ ہیں۔

دردِ حیا و وال

بہت ستایا ہے اس چرخ نیلگوں نے مجھے
جلا کے خاک کیا آتشِ دروں نے مجھے
مرا یہ بخت سدا ہی ستم شعار رہا
یہ دل ہمیشہ ہی سینے میں سوگوار رہا[۱]
ہجومِ غم نے رلایا ہے مجھ کو جی بھر کے
ان آنسوؤں نے مٹایا ہے مجھ کو جی بھر کے

---

[۱] مومن:- میرے یہ بخت ہائے بخت، ایسے نصیب ہا نصیب
چارہ گر یاس امید شرا مرگ علاج مضطری

ہوا زمانے کی اک دن نہ مجھ کو راس آئی
کبھی خوشی بھی نہ بھولے سے میرے پاس آئی
کبھی تو غیر نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کبھی پھر اپنوں نے دل میرا توڑ پھوڑ دیا
اُمید و بیم میں آنسو بہائے ہیں میں نے
بڑے نصیب پہ گوہر لُٹائے ہیں میں نے
قدم قدم پہ میری آرزو کا مدفن ہے
تمام دنیا کے خار اور میرا دامن ہے[1]

عہدِ رفتہ

بہارِ جانفزا جا کر چمن سے پھر بھی آتی ہے
گھٹا کالی برس کر اک دفعہ پھر بھی تو چھاتی ہے
ستارے دن کو چھپ جاتے ہیں پھر شب کو چمکتے ہیں
فلک پر رات بھر شوخی سے ہنس ہنس کر دمکتے ہیں
شفق کی جھیل میں خورشید شب کو ڈوب جاتا ہے
درِ قصرِ اُفق سے جھانک کر پھر مسکراتا ہے

---

[1] مومن: یک دل و گونہ گونہ زخم، یک تن و فوج فوج غم
یک جگر و ہزار نیش، یک سر و صد گراں سری

اگر مرجھا گئے ہیں پھول اور غنچے تو کیا پروا
پرندے ہیں اگر مغموم گلشن کے تو کیا پروا
خزاں کے بعد یہ پھول اور غنچے پھر بھی مہکیں گے
بہار آتے ہی طائر ڈالیوں پر پھر بھی چہکیں گے
اگر تاریک سی رات آتی ہے آئے ہمدم تو آنے دے
اگر جنگل کی ندی خشک ہوتی ہے تو ہو جائے
کبھی تو چاندنی رات آکے یہ ظلمت مٹائے گی
یہ ندی پھر سریلے اور شیریں گیت گائے گی
نشاں گزری ہوئی گھڑیوں کا لیکن پھر نہیں ملتا
کنول مرجھائے دل کا اک دفعہ پھر سے نہیں کھلتا

افق کے پار [1]

افق کے پار اس دلکش فضا میں
جہاں رقصاں ہیں ہر دم کی لہریں
گھٹا غم کی نہیں جس سمت چھائی
حسین اور پُر سکوں ہے آبادی
وہاں رنگینیاں قوس قزح کی
بناتی ہیں فضا کو ارغوانی
وہاں کے پھول مرجھاتے نہیں ہیں
کبھی صیاد واں آتے نہیں ہیں
وہاں غم کے ہیں آنسو اور نہ آہیں
نہ غمگیں ہیں کسی کی واں نگاہیں
وہاں ہے چاندنی پھول اور تارے
مقدس ہیں وہاں کے سب نظارے

---

[1] ملاحظہ ہو محترمہ صفیہ بیگم شمیم ملیح آبادی کی نظم آرزوئے دل

وہاں کرتی ہیں خوشیاں رقص ہر سو
میرے ہمدم مجھے لے چل وہیں تو

وہاں کے باسیوں کے قہقہوں میں
وہاں کے طائروں کے چہچہوں میں

جفا و جور سب کچھ بھول جائیں
کبھی واپس نہ اس دنیا میں آئیں

شام

ڈوبتے آفتاب کی کرنیں
چند لمحوں میں ہو گئیں روپوش

ہلکا ہلکا سا نغمہ بلبل کا
درد اور سوز سے ہے ہم آغوش

سر جھکا کر کھڑے ہیں کھیتوں میں
پیلے پیلے سے پھول سرسوں کے

گرتے ہیں کانپ کانپ کر پتے
بید مجنوں کی شاخ لرزاں سے

ملکۂ شب کی پر فسوں خوشبو
صحن گلشن میں ہر طرف پھیلی

باغ کے اک اداس کونے میں
کوک اٹھی دل شکستہ کوئل بھی

پھول چپ چاپ ہیں کلی مغموم
جھپ کے پتوں میں سو گیا بھونرا

گیت اک گا رہا ہے غم انگیز
دور کھیتوں میں ایک چرواہا

افسردہ بہار

موسم گل آ گیا کوہ و دمن شاداب ہیں
بیکراں خوشیوں کے ہر سو امڈ رہے سیلاب ہیں
بلبلیں پھولوں پہ گانے کے لیے بیتاب ہیں
مسکرا کے غنچوں نے دکھلائی ہیں رعنائیاں

یاسمیں نے گلستاں میں کی ہیں حسن افزائیاں
کس قدر کیف آفریں ہیں یہ بہار آرائیاں

ہے فضا پر چھا گیا ابرِ مسرّت چار سُو
دیکھئے دھیرے سے گا رہا ہے ایک نغمہ آب جو
پھر رہی ہے ہو کے آوارہ ہوا میں مشک بُو

کر رہی ہیں رقص مل کر سر روش پر تتلیاں
مست ہو کر جھومتی ہیں ہر شجر کی ڈالیاں
پھول اور کلیوں سے کرتی ہیں ہوائیں شوخیاں

کروٹیں سبزے نے لی ہیں لہلہانے کے لئے
آگئے باغوں میں طائر چہچہانے کے لئے
میرے اس آئے ہوئے دل کو دکھانے کے لئے

بج رہا ہے سازِ عشرت اور فضا مدہوش ہے
بیخود و مخمور ہے ہر ایک شے مے نوش ہے
دل مرا لیکن ابھی تک غم سے ہم آغوش ہے

یادِ ایامِ گزشتہ لے کے آئی ہے بہار
روح پر افسردگی سی بن کے چھائی ہے بہار

"ساون"

وہ گھر گھر کے آئی ہیں کالی گھٹائیں ہیں مستی سے بھرپور ٹھنڈی ہوائیں

وہ بارش کے قطرے ہر اک برگِ گل پر
چمکتے ہیں یوں جیسے ہوں لعل و گوہر

یہ برسات کی رت ہے کتنی سہانی
ہر اک چیز پر چھا رہی ہے جوانی

حسیں پھول ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں
شگوفے سے سبزے پہ بکھرے ہوئے ہیں

اُچھلتا ہے آغوشِ دریا میں پانی
مچلتی ہیں رہ رہ کے موجیں سہانی

کنارے پہ سبزے کا یہ لہلہانا
پرندوں کا اشجار پہ چہچہانا

خوشی رقص کرتی گلستاں میں آئی
ہنسے پھول ننھی کلی مسکرائی

بہار آفریں ہے گلوں کی صباحت
ہر اک سمت آوارہ پھرتی ہے نکہت

یہ کوہسار یہ گلستاں دیکھتے ہیں
یہ ساون کا دلکش سماں دیکھتے ہیں

کوئی بھولی سی یاد آنے لگی ہے[1]
دلِ مضطرب کو ستانے لگی ہے

دورِ خزاں

باغ میں بکھرے ہوئے ہیں خشک پتے چار سُو
اُڑ گیا دورِ خزاں سے گلستاں کا رنگ و بُو

آبجو کے پاس نرگس آہ سر بر دوش ہے
ننھے بھونرے کا سُریلا راگ بھی خاموش ہے

---

[1] فراق گورکھپوری ؎ شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ہیں شجر بے برگ اور سب آشیاں اجڑے ہوئے
ہو چکے رخصت چمن سے طائروں کے چہچہے

قمریوں کا سرو پر بالکل نہیں نام و نشاں
اب نہ وہ بلبل سے نالے ہیں نہ کوئل کی فغاں

وہ سنہری سرخ اور نیلے گلوں کی کیاریاں
کھو کے اپنی دلکشی سب ہو گئیں وقفِ خزاں

یاسمیں کی ننھی کلیوں پر پڑی ہے خاک دھول
رو رہی ہیں فاختائیں اور فضائیں ہیں ملول

کرتی تھی ہر وم جہاں باد صبا اٹکھیلیاں
واں عنادل مل کے اب کرتے ہیں آہ و زاریاں

سنسناتی جھاڑیاں ہیں جب آ کر سرسراتی ہے ہوا
نغمۂ محزوں سے گونج اٹھتی ہے گلشن کی فضا

کلیاں کملائی ہوئی ہیں پھول مرجھائے ہوئے
ہر طرف افسردگی کے سائے ہیں چھائے ہوئے

باغ میں ہر چیز آتی ہے نظر ماتم کناں
اُف خدایا کس قدر اندوہگیں ہے یہ سماں

آمدِ بہار

گلشن میں کس ادا سے ہے آئی ہوئی بہار

پھولوں پہ حُسن بن کے ہے چھائی ہوئی بہار
مصروفِ رقص ندی کے پانی پہ ہے حباب
کرتی ہیں شوخیِ ناز سے امواج سطحِ آب
صہبا اثر ہے باغ میں خوشبوئے یاسمیں
سبزے کا حُسن سبز ہے کیا سحر آفریں
گلشن کے پھول پتوں پہ ہے آ گیا نکھار
وہ تتلیوں کا ناچنا گلشن میں بار بار
باغ اور بن میں گھِر کے وہ آنا سحاب کا
ٹھنڈی ہوا میں جھومنا بےخود گلاب کا
جوشِ طرب سے جھومتی ہیں سبز ڈالیاں
جھک کر گلوں کو چومتی ہیں سبز ڈالیاں[1]
ہلکے سُروں میں گیت سناتے ہیں آبشار
مسرور ہیں بہار در آغوشِ سبزہ زار
ہیں نغمہ زن طیورِ حسیں ہر درخت پر
خود حُسن حکمراں ہے ہر کوہ و دشت پر
پھولوں کی شال اوڑھ کے نازاں ہے کائنات

---

[1] میر حسن:- گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا   اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر   نشہ کا سا عالم گلستاں پر (مثنوی بدرِ منیر)

سازِ طرب پہ آج غزل خواں ہے کائنات
کیف آفریں فضائیں ہیں اور جاں فزا سماں
ہے گلستاں پہ گلشنِ فردوس کا گماں

نجمی

طاہرہ نجمی نام اور نجمی تخلص ہے، دورِ حاضر کی ایک خوش فکر اور اچھی شاعرہ ہیں۔ کلام وجدانی اعتبار سے بلند ہے، آپ کے یہاں جذبات بھی ہیں اور حسنِ ادا بھی، کلام پُرکیف اور رنگین ہے، طرزِ ادا پاکیزہ اور دلکش ہے۔

کیا کہوں پھر کس کو تابِ جلوۂ جانانہ تھی
خود نگاہِ شوق ہی جب دید سے بیگانہ تھی
دل میں اک دنیا کے پنہاں الفتِ جانانہ تھی
اس کی محفل میں نگاہِ شوق بھی بیگانہ تھی
دیکھنا اعجاز اس کے التفاتِ ناز کا
آرزو خود آج وقفِ سجدۂ شکرانہ تھی
قصۂ دل بیخودی میں کچھ کہا کچھ رہ گیا
حسرتِ عرضِ محبت کتنی بے تابانہ تھی
رنگِ مستی میں تھی محفل سربسر ڈوبی ہوئی
گردشِ چشمِ فسوں گر گردشِ پیمانہ تھی

حال نجمی سے تجاہل کے برتنے کا سبب
میں نے مانا آپ کو اغیار کی پروا نہ تھی

نسرین

شہر بانو نام اور نسرین تخلص ہے۔ سید ولایت حسین صاحب نقوی کی دختر ہیں۔ سنہ ۱۳۳۶ھ میں آپ کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی۔ سید ولایت حسین سرکار نظام کے سررشتہ جات مال اور پڑہ میں کارگزار رہ چکے ہیں۔ ان کے والد سید مولوی محمد حسین شہید فارسی اور اردو کے ادیب گزرے ہیں۔

محترمہ شہر بانو کے نانا باقر نواز جنگ حکیم میر باقی علی مرحوم ایک قابل اور لائق فرد تھے۔ اس طرح محترمہ نسرین کی پرورش علمی ماحول میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم محبوبیہ گرلز اسکول میں ہوئی۔ ابتدا سے جونیر کیمبرج تک آپ نے یہاں تعلیم پائی اور ہمیشہ امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتی رہیں۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں امتحان سینئر کیمبرج میں کامیاب ہوئیں اور اسی سال مدراس یونیورسٹی کے امتحان ایس۔ ایل۔ سی میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور انعام اور وظیفہ حاصل کیا۔

اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے آپ انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے امتحانات میں شریک ہوئیں، آپ کو اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے اور آپ کے اکثر مضامین اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کو جسمانی ورزش اور کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے اور محبوبیہ گرلز اسکول

میں گیمس کیپٹن رہ چکی ہیں۔

آپ کا کلام سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ زبان بھی صاف استعمال کرتی ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

کلی چٹکی، چمن پھولا، نسیمِ مشک بار آئی
دکن میں جوبلی کیا آئی اک فصلِ بہار آئی

اڑا کر فاختہ جس جا خاک آئی ہے زعفراں بن جا
نسیمِ صبح نے عنبر کی بارش ایسی برسائی

پرندے خوش نوا شاخوں پہ بیٹھے گیت گاتے ہیں
چٹکتے ہیں جو غنچے آتی ہے آوازِ عید آئی

پھلا پھولا ہے گلزارِ شاہی باغِ عالم میں
یہ سوئے حیدرآباد دکن بانگ ہزار آئی

حکومت ہے شہا تیری قلوبِ اہلِ عالم پر
عجب شاہی ترے حصے میں شاہِ نامدار آئی

غنچۂ خاطرِ مغموم کھلے جاتے ہیں
آمدِ موسمِ گل کی ہے زمانہ میں پکار

اپنے گلشن میں ہمیشہ ہی رہا دورِ خزاں
راستہ بھول کے اب کے کدھر آئی ہے بہار

خوفِ گلچیں کا کبھی ہے کبھی صیاد کا ڈر
دلِ بلبل کو گر آئے بھی تو کیا آئے قرار

———ـ٭ـ———

نسرین

عابدہ خانم نام ہے اور متھرا وطن۔ پہلے آپ پروین تخلص کرتی تھیں مگر جب اور خواتین نے یہ تخلص اختیار کر لیا تو آپ نے اس کو ترک کر کے نسرین تخلص اختیار کیا۔ آپ دور حاضر کی ایک نہایت خوش گو اور بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام پر جذباتی اور رومانی رنگ چھایا ہوا ہے اور اس رنگ میں آپ بہت خوب لکھتی ہیں، کلام اکثر رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے، رباعیاں، نظمیں، غزلیں، سب کچھ لکھتی ہیں۔ واردات و احساس قلب کی ترجمانی، لطیف و شاعرانہ تشبیہیں، کیف و اثر اور طرز ادا کی لطافت و دلکشی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں، سوز و گداز کے ساتھ ساتھ طبیعت میں مزاح کا جوہر بھی موجود ہے آپ کے اشعار بہت صاف، پر کیف اور پر تاثیر ہوتے ہیں

جب میری شوخی برباد کر کے فتنہ گر تو نے
بہت تکتی رہ گئی اور پھیر لی اپنی نظر تو نے

سزا ملتی ہے لیکن بیوفا اتنی نہیں ملتی
ذرا سے جرم الفت پر ستایا عمر بھر تو نے

فریب کامیابی اے دل مضطر مبارک ہو
اک امید اثر پر آہ کھینچی رات بھر تو نے

لطائف رہگذار ہجر کے کچھ تو سنا پروین

علیگڑھ سے کیا ہے خوب متھرا کا سفر تو نے

"ساغرِ عالمِ رنگ و بو"[1]

پہلا رُخ

یہ وقار، یہ متانت، یہ تراکمِ صباحت — یہ جبینِ صبح طلعت، یہ تلاطمِ لیاقت
یہ جبینِ وضعِ تمکیں، یہ نظر کی دل فریبی — یہ تناسب ہو تو یہ فسونِ جامہ زیبی
لبِ رنگ آفریں میں یہ چھپا ہوا تبسم — یہ دہانِ غنچہ پیکر، یہ نزاکتِ تکلم
ہے فسانہ ہر ادا میں، ہر نگہ میں ہے کہانی — یہ شہاب سی اُمنگیں، یہ شراب سی جوانی

دوسرا رُخ

یہ لگاوٹیں، یہ شوخی، یہ ادائے بے حجابی — کسی کنجِ گُل میں جیسے ہو پڑا کوئی شرابی
یہ عذارِ نوش کا کل، یہ نمائشِ پریشاں — کہ شراب جیسے اُڑ کر بنے آتشِ گلستاں
یہ کھلا ہوا گریباں، یہ نمودِ جوشِ مستی — یہ خمار ریز آنکھیں، یہ شبابِ مے پرستی
تری مستیاں وہ سمجھے جو خرابِ رنگ و بو ہو — ارے او جوان ساغر یہ جہاں اور تو ہو

"دعائے شام"

کیوں ہیں پڑے ہوئے اُداس کیف مری نگاہ میں

---

[1] موصوفہ نے یہ نظم جناب ساغر صاحب نظامی کی ایک تصویر دیکھ کر کہی تھی جو "ساغرِ عالمِ رنگ و بو" کے عنوان سے تھا، نومبر ۱۹۲۴ء میں پیمانہ میں شائع ہوئی تھی

پردے گرے ہوئے ہیں کیا حسن کی بارگاہ میں

دل ہی نہیں کہ تجھ کو دوں نذرِ محبتِ ازل
آنکھیں نہیں کہ آ رہوں میں بھی تری نگاہ میں

ہائے وہ رحم کش نظر جس کی کرم نمائیاں
بن گئیں سازِ زندگی عشق کی سوز گاہ میں

پھر تری برہمی کی یاد رنگ اڑا کے لے چلی
دیکھ رہی ہوں میں تجھے سپہرِ افقِ سیاہ میں

دعوتِ سیرِ دل تجھے دے نہ سکے معاف کر
بند پڑے تھے راستے ہر نفسِ تباہ میں

ہاں ترا عشوۂ خضاب نہیں مائلِ کرم
ہاں نہیں اب مری نگاہ تیری حسین نگاہ میں

خیر سکونِ دل نہ بن، خیر نہ التفات کر
آنے دے ذکر تو مرا پرسشِ گاہ گاہ میں

کچھ نہیں چاہتی مگر اک نگۂ غلط اثر
ہمتِ اعتراف ہو جس سے لبِ گناہ میں

گوشِ حقیقت آشنا تو جو خستہ کام سن
مہر سحر نمائے دل عرضِ نیاز شام سن

رباعیات

ورودِ سرما

(۱)

برسات گئی تو فصلِ سرما آئی — با دامنِ تر نسیمِ دریا آئی
اللہ ری سرد مہریٔ وادیٔ نجد — بُردِ یمنی میں چھپ کے لیلیٰ آئی

(۲)

باغوں میں وہ لطفِ سیر کا بھی نہ رہا — بحرِ قاف کا ذوقِ جانفزا بھی نہ رہا
سردی نے نشاطِ صبح پانی کر دی — جمنا پہ نہانے کا مزا بھی نہ رہا

(۳)

گرما میں وہ سرگرمیٔ احباب کہاں — وہ جلوۂ بحر و موج و سیماب کہاں
آسودگیٔ لحافِ رنگیں معلوم — نظارۂ تاج و شبِ مہتاب کہاں

(۴)

دل سرد ہے جا بادۂ عنّابی لا — سونے کے لئے حسین مہتابی لا
دس بجنے کو آئے نیند کا نام نہیں — اے اوّلِ شب لباسِ شب خوابی لا

نسیم

نسیم فاطمہ نام اور نسیم تخلص ہے آگرہ وطن ہے آپ اردو کی اچھی شاعرہ ہیں۔ کلام اکثر رسالہ عصمت میں شائع ہوتا رہتا ہے زبان شستہ استعمال کرتی ہیں۔ آپ کے اشعار سنجیدہ جذبات کے حامل ہوتے ہیں :-

"دو آنسو"

علامہ راشد الخیری مرحوم کی یاد میں

اے جہانِ دارِ معانی علم کے سرمایہ دار — تو نہیں باقی ہے لیکن آج تک تیرا وقار
یاد آیا ہے کہ رونق تھی ترے دم سے عیاں — یاد آیا ہے کہ تو گلشن میں تھا جانِ بہار
تو نے دنیا میں بڑھائی عزتِ ناموسِ بنت — ہو رہے ہیں آج ہم بھی نوعِ انساں میں شمار
تیرے دل کا خون صبحِ زندگی میں صرف ہے — اور شامِ زندگی کرتی ہے تیری بیقرار
ہر گلِ باغِ معانی ہے خزاں سے بے نیاز — تو نے اپنے خون سے سینچا ہے صحنِ لالہ زار
تیری ہر تصنیف ہے غم کا مرقع بے مثال — زندگی کا آئینہ ہے ہر نقش تیرا نقش کار
طبقۂ نسواں میں پھونکی تو نے آزادی کی روح — تو ہی اک عورت کے دکھ کا تھا جہاں میں رازدار

دارِ فانی سے گئے تجھ کو ہوئی مدت مگر
یاد کرتی ہے تجھے اب بھی نسیمِ سوگوار

نشتر

قیصر جہاں بیگم نام اور نشتر تخلص ہے۔ لکھنؤ کی شاعرہ ہیں کلام میں روایتی رنگ غالب ہے مگر انداز پختہ ہے اشعار صاف اور عمدہ ہیں۔

چمن میں آج آمد ہے جو اس سروِ خراماں کی
بہارِ رفتہ پھر آئی ہوا بدلی گلستاں کی
دھواں اُٹھتا ہے جب میں آہ کرتا ہوں شبِ فرقت
نہ پوچھو حال تم نقشِ حالت ہے قلبِ سوزاں کی

یہ ادائی سی عنایت تھی جنونِ فتنہ ساماں کی
کہ چھانی خاک ہم نے عمر بھر کوہ و بیاباں کی
کسی کے گیسوئے برہم جو نشتر یاد آتے ہیں
مری آنکھوں میں پھرتی ہے سیاہی شامِ ہجراں کی

نقاب

دورِ حاضر کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ نام معلوم نہیں تخلص نقاب ہے۔ اشعار صاف اور پُر اثر ہیں۔

وہ ہجر الم کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں
کہ ہاتھوں سے دل کو دبائے ہوئے ہیں
اگر سر کروں جائیں چوتھے فلک پر
یہ نالے مرے آزمائے ہوئے ہیں
وہ منھ کیا دکھائیں گے محشر میں تجھ کو
جو آنکھیں ابھی سے چرائے ہوئے ہیں
نہ تھے گھر میں تصویروں کے بیٹھے مانا
مگر کچھ تو ہے جو لبھائے ہوئے ہیں

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

نکہت

رفعت جہاں نام اور نکہت تخلص ہے۔ آپ گلشن آباد کی رہنے والی ہیں، غزل گو شاعرات میں آپ ایک خاص درجہ رکھتی ہیں۔ لہجہ رنگ سنجیدہ اور کلام پاکیزہ ہے۔ آپ کو زبان و محاورات پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے۔ آپ کے اکثر اشعار نہایت بلند و موثر ہیں۔

خفا ہو کس لیئے میں نے کہا کیا
بتاؤ تو ہوئی تجھ سے خطا کیا

حسینوں کا جفا کاری ہے پیشہ
پھر ان کی بے وفائی کا گلا کیا

شکستہ ساز کو کیوں چھیڑتے ہو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا

جو سے پاؤں تک کافر ہیں کافر
انہیں نام خدا سے واسطا کیا

نہیں جب اہلِ ساحل کی ضرورت
تو پھر فکرِ خدا و ناخدا کیا

جفا بھی اب تو عنقا ہو گئی ہے
وفا کا ذکر اے نکہت بھلا کیا

نکہت

شکیلہ بیگم نام اور نکہت تخلص ہے۔ کھنڈوہ کی رہنے والی ہیں۔ کلام میں جذباتی رنگ غالب ہے۔ خیالات لطیف، نرم اور شاعرانہ ہیں۔ اگر طرز ادا میں تھوڑی سی پختگی اور پیدا ہو گئی تو آپ اردو کی اچھی شاعرہ ہوں گی۔ کلام میں رومانی رنگ نمایاں ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

بہارِ ن کے تو آ جا کہ جا چکی ہے بہار

گلوں کو اوس سے نہلا کے جا چکی ہے بہار
مجھے تو خون کے آنسو رُلا چکی ہے بہار
مری تو دنیا مٹا کر ہی جا چکی ہے بہار
فقط مجھے یہی نغمہ سکھا چکی ہے بہار
بہارِ ن کے تو آ جا کہ جا چکی ہے بہار

ان عندلیبوں کے نغموں کی لوریوں کی قسم
نسیمِ صبح کی ان میٹھی تھپکیوں کی قسم
وہ تیری یاد کی دل دوز ہچکیوں کی قسم
تجھے گلستاں کی رنگین تتلیوں کی قسم
بہارِ ن کے تو آ جا کہ جا چکی ہے بہار

اگرچہ بادۂ رنگیں خریدنا ہے تجھے
اگرچہ بادۂ رنگیں خریدنا ہے تجھے
جو اس کا جلوۂ رنگیں خریدنا ہے تجھے
اگرچہ ہمتِ گلچیں خریدنا ہے تجھے
بہارِ ن کے تو آ جا کہ جا چکی ہے بہار

غمِ حیات میں گر پھر بہار لانا ہے
شرارِ حسن کی مینا سے گرچہ پینا ہے
اگرچہ اُودی گھٹاؤں کو پھر بلانا ہے

جو انتقامِ جفائے بہار لینا ہے
بہار بن کے تو آ جا کہ جا چکی ہے بہار

نوبیلا

شریمتی نوبیلا سنگھا اردو کی ایک خوشگو اور خوش فکر شاعرہ ہیں۔ آپ کا کلام بہت صاف اور جذباتی اعتبار سے بہت بلند اور پُرکیف ہوتا ہے۔ آپ کا رنگ پختہ اور طرزِ ادا پاکیزہ، شگفتہ اور دلکش ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں بہت خوب کہتی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

کیا سنائے کوئی فسانۂ دل	جس کا انجام سے نہ ہے آغاز
آج کچھ ان لبوں نے فرمایا	ہے یہی میری خامشی کا راز
ہم بھی ہیں درخورِ نگاہِ کرم	ہم بھی ہیں آپ کے رہینِ نیاز

نور

نورجہاں بیگم نام اور نور تخلص ہے۔ بدایوں مولد ہے۔ آپ کے خود نوشتہ حالات درج ذیل ہیں:-

"عارف پور نوادہ نامی بستی میں جو بدایوں سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے ۱۹۰۵ء میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد چودھری اساس الدین وہاں کے رئیسوں میں سے تھے۔ ابھی میں چار ہی سال

کی تھی کہ میرے والد ماجد رحلت فرما گئے۔ والد نے اپنی زندگی کی یادگار دو بہنیں اور ایک بھائی چھوڑا۔ ہمشیرہ کی عمر چھ سال کی اور بھائی چار ماہ کا تھا۔ اور یہی ہماری زندگی کا سہارا تھا۔ ابھی والد کے انتقال کو صرف تین ہی سال گزرے تھے کہ بھائی بھی ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گیا۔ اب صرف آغوش مادری باقی رہی۔ باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد آبائی جائداد ہم دونوں بہنوں کو ملی۔ اور ان مشکلات کا سامنا ہم کو بھی کرنا پڑا جو عموماً دنیا کی یتیم اور بیواؤں کو کرنا پڑتا ہے۔

چچا اس خیال سے کہ ہماری جائداد باہر نہ چلی جائے۔ ہم لوگوں کی شادی اپنے خاندان میں جاہل لڑکوں سے کرنا چاہتے تھے۔ امی اس امر کے خلاف تھیں۔ چنانچہ انھوں نے میری شادی اپنے بھانجے سے کردی۔ حالانکہ یہ بھی صرف انٹرنس پاس تھے اور کسی دفتر میں نوکر تھے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے تھے۔ شادی کے بعد میں نے چند وجوہات کی بنا پر اپنی جائداد کے سہارے اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دی اور مسلم یونیورسٹی میں داخل کرا کے چھوڑا۔ لیکن خوش قسمتی کہ میرے شوہر کو یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور وہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے جو اس وقت پرو وائس چانسلری کے عہدہ پر ممتاز تھے اسٹینو گرافر ہو گئے۔ اب ملازمت بھی تھی اور تعلیم بھی جاری ہو گئی

امتحان بھی دے سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد میں نے ان کو اپنی زندگی کا کل سرمایہ دیکر انگلستان بھیجا۔ اقربا نے بھی مالی مدد دی۔ وہاں سے وہ بی۔ اے (آنرز) اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اسلامی تاریخ میں لے کر چھ سال بعد واپس ہوئے

انگلستان سے واپسی پر کنواری لڑکی کا نام ان کی شادی کا عنوان بن گیا۔ میں نے بہت چاہا کہ اس روزِ بد سے سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر تقدیر کے آگے ایک نہ چلی۔ اور آخر اپریل ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اپنا نکاح شاکر حسین بیرسٹر میرٹھ کی دختر حلیمہ بیگم سے کر لیا۔ یہ غریب سات ماہ بعد نذرِ اجل ہوئی۔ میں نے پھر سعی و کوشش کی کہ اب دوسری شادی نہ کریں چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں ان کے ساتھ بدایوں گئی۔ خیال تھا کہ ساس اور دوسرے اقربا ان کو مجبور کر دیں گے مگر میری کوئی کوشش و منت سماجت کارگر نہ ہوئی۔ اور میرے شوہر ڈاکٹر امیر حسن صدیقی بعہدۂ پرنسپل مدرسہ کالج کراچی چلے گئے اور تیسری شادی کی فکر میں ہیں۔ میں اب اپنی زندگی کے دن اپنی بہن کے ساتھ گذار رہی ہوں۔

میری تعلیم کسی کالج و مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت خانہ داری اور مذہبی تعلیم پر مشتمل تھی میری معلمہ صرف میری والدہ تھیں نورجہاں "نور"

محترمہ دورِ حاضر کی ایک نہایت قادر الکلام اور پختہ گو شاعرہ ہیں لفظ لفظ سے کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے زبردست و سخت گیر نقاد کے الفاظ یہ ہیں:-

"بہت اچھی شاعرہ ہیں .... نظم لکھتی ہیں اور خوب کہتی ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ان کی طرح مضبوط کہنے والی خاتونیں دورِ حاضر میں کم ہیں" لہ

محترمہ نے نظم، غزل، نعت، منقبت اور مرثیہ سب پر قلم اٹھایا ہے۔ خصوصاً نظم میں آپ اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ محترمہ کے سوانح حیات نہایت دلدوز ہیں جیسا کہ ان کے خود نوشتہ حالات سے ظاہر ہے، اس لئے آپ کا سوز و گداز رسمی و روایتی نہیں حقیقی ہے آپ کی نظمیں آپ کی الم شناس فطرت کی ترجمان ہیں، ان میں زندگی کے سچے واقعات اور ذاتی و شخصی طور پر محسوس کئے ہوئے شدید جذبات نہایت سادگی و صداقت کے ساتھ نظم کر دئے گئے۔ اس لئے ان کا کیف و اثر پائندہ و دیرپا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نزاکتِ خیال اور شعریت کا دامن کہیں ہاتھ سے چھٹنے نہیں پایا جس کی وجہ سے آپ کا کلام نہایت دلکش اور پُر اثر ہو گیا ہے

لہ یہ جملے ڈاکٹر شادانی کے اس مکتوب سے ماخوذ ہیں جو محترم نے ۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو راقم الحروف کو لکھا تھا۔ "ج"

حسن و صداقت، محترمہ کے آرٹ کے ترکیبی اجزا ہیں ــــــ اور ہمیشہ قائم رہنے والا آرٹ ان ہی دو اجزاء سے ترکیب پاتا ہے!

محترمہ کو اسلامیات سے گہرا لگاؤ ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے بعض نہایت بلند اور قابلِ قدر نظموں کی تخلیق کی ہے۔ جن کے صوری و معنوی محاسن قابلِ تحسین ہیں۔ اس رنگ میں محترمہ علامہ اقبال سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں اور یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ محترمہ نے علامہ مرحوم کے رنگ کو اچھی طرح سمجھ کر صحیح قسم کی تقلید کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بہت کامیاب ہے، علامہ مرحوم کا اثر محترمہ پر لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ قومی و مذہبی نظموں میں، آپ کی زبان و خیالات پر علامہ اقبالؒ کا رنگ سا چھایا ہوا ہے، علامہ اقبالؒ کی ایسی کامیاب تقلید کے نمونے ابھی شاعرات کی دنیا میں کم ہیں۔

"شبِ عاشورہ" نامکمل اور تشنہ ہونے کے باوجود محترمہ کی ایک زبردست کامیاب نظم ہے، ہمارے مرثیہ نگاروں کے پیشِ نظر مرثیہ کا مقصد "رونا رُلانا" رہا ہے اس لئے ان کی بیشتر مساعی ایسے بے بنیاد واقعات کی تخلیق و اظہار میں صرف ہو گئی ہیں جن سے صرف یہ مقصد حاصل ہو سکے اور اکثر اس سعیٔ لاحاصل میں اسلام کے کچھ زبردست اور بزرگ ترین افراد کے کیرکٹروں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا گیا ہے، غالباً یہ بات ان کی نظر سے محو ہو گئی کہ ہائے وہو کے اس تمام شور و غل میں آلِ

افراد کی صحیح اور سچی عظمتیں دب کر رہ گئیں۔ اور دنیا ان کو ان بلندیوں پر نہیں دیکھ سکی جہاں وہ واقعتاً سرگرمِ خرام تھے۔ اس سلسلہ میں محترمہ کی نظم "شبِ عاشورہ" نہایت اہم ہے۔ یہ ایک نمونہ ہے جس سے ہمارے مرثیہ گویوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اصل میں یہ رنگ تھا جس کو مرثیوں کی روحِ رواں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر غلط مقصد کے تعین نے ہمارے بیشتر مرثیہ نگاروں کی نظروں سے اس حقیقی اور سچے مقصد کو محو کر دیا۔

محترمہ نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن دراصل یہ ان کا رنگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں میں وہ اتنی کامیاب نظر نہیں آتیں جتنی کہ نظموں میں ہیں۔

سطورِ ذیل میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے وہ سب باستثنائے "شبِ عاشورہ" محترمہ کا اپنا انتخاب ہے۔ البتہ ترتیب میری ہے نظم "شبِ عاشورہ" بھی میں نے شامل کر دی ہے۔

(الف) واقعہ نگاری اور جذبات کی دلآویز ترجمانی

پیش کش

(تقریبِ عقدِ ثانی ڈاکٹر امیر حسن)

مل گیا میری وفاؤں کا صلہ اے ہمدم — عہدِ اُلفت کا جو تھا خوب نبھایا تو نے
میری امیدوں کے خرمن پہ گرائی بجلی — دل کو وقفِ غم و آلام بنایا تو نے

وقت کے ہاتھ سے بھی جو نہیں مٹنے کا کبھی — میرے سینے پہ وہ اک زخم لگایا تو نے
ہو گئی میری تمناؤں کی دنیا تاریک — اب ہنسوں گی نہ کبھی ایسا رلایا تو نے
جن لبوں سے میں سنا کرتی تھی جینے کی نوید — اُن سے اب موت کا پیغام سنایا تو نے
بہہ گئی جس میں مرے امن و سکوں کی بستی — رنج کا دل میں وہ طوفان اٹھایا تو نے
داغِ غم سے مرے سینے میں چراغاں کر کے — شمع ساں محفلِ ہستی میں جلایا تو نے

شاد تھی میں مجھے ناشاد کیا ہے تو نے
مختصر یہ ہے کہ برباد کیا ہے تو نے

ہاں مگر پھر بھی مرے دل سے نکلتی ہے دعا — زندگی کو مری ناشاد بنانے والے
تیری دنیا میں مسرت کی فراوانی ہو — اے مجھے آتشِ فرقت میں جلانے والے
گلشنِ دہر میں تو شاد ہو آباد رہے — بجلیاں خرمنِ ہستی پہ گرانے والے
دل کے آئینے پہ آئے نہ کبھی گردِ ملال — اے مری زیست کو تاریک بنانے والے
تیری محفل میں مسرت کے ترانے گونجیں — اے مجھے نغمۂ آلام سنانے والے
تیری ہستی پہ رہے امن و سکوں کا پرتو — دل میں طوفانِ غم و رنج اٹھانے والے
شمع سے تیری رہے تیرا شبستاں روشن — نور کی شمعِ ارماں کو بجھانے والے

ہے دعا غنچۂ خاطر ترا مرجھانے نہ پائے
تیرے گلشن میں کبھی دورِ خزاں آنے نہ پائے

ماں کی تربت پر

پھر تبسم تری تصویر نظر آئی ہے — تذکرہ کو چشمِ عقیدت کے گہر لائی ہے
قبر سے اٹھ! اسے سینے سے لگا لے امی — نورِ فریاد کو تربت پہ تری آئی ہے

چھائی ہیں سحر پہ ظالم کی گھٹائیں ایسی
طاقتِ شکوہ ہے نہ تابِ شکیبائی ہے

جس کے آغاز نے بے چین کیا تھا مجھ کو
اس کے انجام کی وہ لے کے خبر آئی ہے

پھر گئیں مجھ سے زمانہ کی ہوائیں اُمّی
میری رسوائی ہے اور خلق تماشائی ہے

نقشِ سجدہ ترے در کا تھا جبیں پر جن کی
منشا اُن کا مذاقِ ستم آرائی ہے

تیری ہی شمع نے اب پھونک دی محفل تیری
انتخاب آج ترا تیری ہی رسوائی ہے

مٹ گئی آخری رونق بھی تری محفل کی
حسنِ اغیار ہے اور انجمن آرائی ہے

جو پسینے پہ ترے خون گراتی تھی کبھی
دشمنِ جاں مری اب تری ہاں جائی ہے

کیا رکھے خلق سے اُمید وفا کی کوئی
نہیں دنیا میں بُرے وقت کا ساتھی کوئی

بند ہے بیس برس سے تری ہستی کی کتاب
یاد ہے تو کو ابھی تک مگر اس کا ہر باب

نالۂ نیم شبی، گریۂ پیہم تیرا
بسترِ غم پہ تڑپنا ترا مثلِ سیماب

ناز تھا جن کی وفاؤں پہ تجھے دنیا میں
آج رکھتے نہیں وہ اپنی جفاؤں کا جواب

وقف تھے ہاتھ ترے جن کی دعاؤں کے لئے
اُن کے ہاتھوں سے پھٹی تیرے فسانہ کی کتاب

محو تھا قلب ترا جن کی ہوا خواہی میں
ڈھا گیا گھر کو ترے اُن کے ستم کا سیلاب

نعش بسمل کی تو مقتل میں تڑپتی چھوڑی
نذریں لے لے کے بڑھے جانبِ قاتل احباب

جو تری انجمنِ نور کا شیدائی تھا
ہے وہ ہمنام ستمگر کا پرستارِ شباب

تیرے گہوارۂ الفت میں پلا تھا جو کبھی
کر گیا لختِ جگر کا وہ تری خانہ خراب

غیر کی غمزوں نے بنیاد ہلا دی تیری
رنگِ تخریب بنا کافرِ مستانہ شباب

غرقِ خوناب رہا تین برس دل میرا
گھر سے بے گھر کیا اور پھر دیا پاگل کا خطاب۔

آج ہمسایہ بنانے سے اُسے ہیں بیزار
جس کی خاطر وہ لیے بیٹھے ہیں پا بہ رکاب

کر دیا زیست کو ہم رنگِ سفر اس کے لئے
جس نے دنیا میں دکھائے انھیں فردوس کے خواب

کھونٹے داموں کے عوض بیچ دی عظمت تیری
تو رہے ہو گا نہ لیتے در تقدیس مآب

"دیکھتی ہیں ملا دوں گا میں عزت تیری"
طالبِ قرضہ جو ہوتی ہوں تو دیتے ہیں جواب

چارپائی بھی نہ چھوڑی مرے سونے کے لئے
لے گئے چھین کے سب مجھ سے وہ گھر کا اسباب

دل کی گہرائیوں میں ذوقِ طلب ہے باقی
ڈھونڈتی ہے انھیں اب بھی نگاہِ بیتاب

کنجِ عزلت میں مری بے سروسامانی دیکھ
اپنی اس انجمنِ شوق کی ویرانی دیکھ

رودادِ ستم

(نورانی کے مزار پر ۱۹۴۳ء میں)

کیا انقلاب ہے فلکِ کج مدار کا
اُٹھی بجھا چراغ بھی تیرے مزار کا

تنویرِ زیست موت کی ظلمت میں کھو گئی
روشن سحر مری شبِ دیجور ہو گئی

کشتی بھنور میں چھوڑ کے وہ ناخدا گیا
موجوں کی رَو میں اپنا سفینہ بہا گیا

ناآشنا مذاقِ نظر سے نظر ہوئی
جو پیار کی نگہ تھی، وہی فتنہ گر ہوئی

میرا نہ تھا کوئی، ترا ہر کوئی زندہ تھا
بھائی بھتیجے بھانجے بہنوئی زندہ تھا

آیا نہ کام وقت پہ اُٹھی کوئی مرے
افسوس مجھ سے پھر گئے سب اقربا ترے

ایسا تھا دشمنی پہ مصر آسماں مری
سننا نہ تھا جہاں میں کوئی داستاں مری

کرتی تھی ان کا عیش منغص فغاں مری
کٹتی تھی بہر نالے پہ گویا زباں مری

جو تیرے گل تھے خارِ مغیلاں ہوئے مجھے
تھے جو سپرد وہ نشترِ زباں ہوئے مجھے

دل رفتہ رفتہ رنج کا خوگر بنا لیا
سایہ میں بے کسی کے غرض گھر بنا لیا

اک روز دی خبر یہ سحر کے نقیب نے
نجم صبح نے عابد شب کے خطیب نے

لوٹا اجل نے آ کے دیارِ حبیب کو
سر سے گرایا تاجِ حیات رقیب کو

آئی قضا کسی کی ہوا نام سحر کا
دامن پہ میرے لگ گیا الزام سحر کا

تھا کون سا وہ ظلم جو میں نے سہا نہیں
اس پر بھی اپنے منہ سے کچھ ان کو کہا نہیں

مدت ہوئی تھی کہنے کو یوں آیاب سال کی
صدیاں یہاں گذر گئیں کرب و ملال کی

ناچار ان کو مہر پہ مائل جو پایا پھر
اک دن کسی بہانہ سے ان کو بلایا پھر

آ تو گئے وہ پھر وہی تیور چڑھے ہوئے
نظریں تھیں یا کہ سان پہ خنجر چڑھے ہوئے

عنوانِ شوق بدلے نہ دل کی کتاب کے
شاکی تھے اب بھی بارِ دگر انتخاب کے

سمجھی تھی میں کہ روٹھے مناؤں گی ان کو پھر
دو چار دن میں اپنا بنا لوں گی ان کو پھر

جوہر وہ خاکساری کے ان کو دکھاؤں گی
ان کے حضور اپنی خودی کو مٹاؤں گی

لیکن یہ انکسار اسی کو پسند ہے
جس کی نظر وسیع ہے فطرت بلند ہے

کی میں نے ہر طرح سے ادا رسم بندگی
بھائی انھیں مگر نہ ذرا رسم بندگی

الجھے ہوئے خیالوں کو سلجھا سکی نہیں
باز ان کو ان خیال سے بھی لا سکی نہیں

آئے نہ ہوش میں وہ نہ سودائے سر گیا
ہفتہ سے بھی سوا انھیں آتے گزر گیا

جھولی دریچی سے نہ یہ کھیک کی بھری
کی میں نے ان کے روبرو دس دن گداگری

اٹھے وہ تاسفے اب کی دل بیزار سے

تنگ آگئی ہیں زندگیٔ مستعار سے

دل نے کہا یہ جاتے ہیں گھر میں کیوں چلوں — احوال جاکے اہلِ وطن سے بیاں کروں
جس نے دیا تھا ہاتھ مرا ان کے ہاتھ میں — جاؤں گی ان کے پاس انھیں لے کے ساتھ میں
پر ان کو رحم تھا نہ دلِ زار پر مرے — پہلو تہی دکھاتے تھے اصرار پر مرے

آخر کو منتوں سے کچھ آمادہ کر لیا
جبراً انھوں نے ساتھ میں یہ بارِ سر لیا

اٹھی وطن میں کیا مری تقدیر کرنے کو — اک عمر چاہیئے اسے تحریر کرنے کو
پڑیاں مری دوا کی وہ لے جانا ساس کا — یہ کہہ کے اپنے بیٹے کو دکھلانا ساس کا
ڈائن یہ میرے گھر کی صفائی کو آئی ہے — بیوی تمہاری زہر تمھیں دینے لائی ہے
رکھتے یہ میرے راضی تھے وہ پیشتر ہی کب — بھڑکا دی ماں کی باتوں نے اور آتشِ غضب
سنتے ہی جوشِ غیظ کا فی الحال آ گیا — دنیا ہلی زمین کو بھونچال آ گیا
غصہ کی آندھی قہر کا طوفان غضب کا جوش — تھے فرطِ اشتعال سے مغلوب سب کے ہوش
دم توڑتا تھا وقت کے انصاف کا نظام — احساسِ رحم ان کی حکومت میں تھا حرام

پہونچا پکڑ کے خالو نے گھر سے نکالا پھر
اور پا پیادہ راہِ گذر سے نکالا پھر

گردوں پہ پھر سے جھکا تھا راہ شام کی — شب لے رہی تھی ہاتھوں میں باگ انتظام کی
چوپائے اپنے باڑے کی جانب رواں تھے — رخ سائے سے طائروں کے سوئے آشیانہ تھے
مزدور خوش تھے گھر کی طرف تیز گام تھے — پلٹے سفر کے ہاتھوں میں جیبوں میں دام تھے
سڑکوں پہ غل مچا ہوا سرمایہ داری کا — گلشن میں جیسے شور ہو ابرِ بہاری کا

ہر شخص اپنے گھر کی طرف تیز گام تھا
راحت کی جستجو میں سر اک خوش خرام تھا

وہ میں کہ آج جس کا ٹھکانا نہ تھا کوئی
دنیا میں جس کا اپنا یگانہ نہ تھا کوئی

دل بیٹھا جا رہا تھا مرا اس خیال سے
آگاہ اب کسے کروں میں اپنے حال سے

اس منزلِ حیات کا رہبر نہیں کوئی
یہ شب جہاں بسر کروں وہ گھر نہیں کوئی

کوئی نہیں ہے اپنا بلاؤں میں آپ کسے
یہ حال بے کسی کا سناؤں میں آپ کسے

آنکھیں جواب دے چکی تھیں سر میں درد تھا
ہاتھوں میں رعشہ تشنگی سے گلا جسم سرد تھا

گرمی کی فصل پیاس کی شدت وہ الاماں
خشکی سے کانٹے حلق میں سوکھی ہوئی زباں

تاریکیوں میں خنجرِ قاتل کی چال تھی
یعنی کہ موت زیست کی پرسانِ حال تھی

ہونٹوں پہ پیاس چہرے سے بھوک آشکار تھی
اور سر پہ وہ ردا جو گرد و غبار تھی

چوکھٹ اسی کی پکڑ کے کھڑی ہو رہی تھی اب
سر کو جھکا کے آنسوؤں سے منہ دھو رہی تھی اب

آیا نہ اُن میں سے کوئی تسکین دینے کو
قسمت کی بگڑی بخت کی پھوٹی لینے کو

حسرت سے آسماں کی طرف منہ اٹھایا پھر
اور ایک راہ گیر سے تانگہ منگایا پھر

آئی وہاں سے دیدۂ گریاں لیے ہوئے
گھر تیرے پہنچی حالِ پریشاں لیے ہوئے

بابا ملے نہ تم نہ برادر ملا مجھے
ویران بے چراغ ترا گھر ملا مجھے

نکلا نہ تم میں سے کوئی بھی میرے بیٹھنے کو
ویرانی آئی دوڑ کے تسکین دینے کو

ہر خار گھر کا دامن سے میرے چمٹ گیا
جوتوں میں ریت بھر گیا کوڑا الٹ گیا

اللہ ہی جانتا ہے وہ شب کس طرح کٹی
اللہ ہی اللہ کرتے رہے دن نکلا تو چھٹی

مختصر یہ صبح گئی ماموں جان کے
یاں بھی قضا خلاف تھی ہیں نا تو آ گئے

ماما ملی جو در پہ مجھے اتفاق سے
وہ آئی میرے پاس بڑے اشتیاق سے

اس سے کہا کہ تو مرے ماموں جا کے کہہ
جو کچھ جواب دیں وہ مجھے مجھ سے آ کے کہہ

کہنا کہ لونڈی آپ سے ملنے کو آئی ہے
کم بخت و بدنصیب ہے غم کی ستائی ہے

سمجھے نہ پائی تھی ابھی ماما مرا کہا
چہرہ بگڑ گیا جو مری مامی جان کا

چلا کے اس سے بولیں تو آئی ہے کیوں بتا
بیٹا مرا بدنصیب کا لائی ہے کیوں بتا

قسمت کی پھوٹی ہے کہ مقدر کی ماری ہے
ہم اس کے ہیں کوئی نہ وہ کوئی ہماری ہے

پردہ ہے اس سے اپنا کہوں ہم کیسے سامنے
یہ کہہ کے در کو بند کیا نایاب نام نے

لڑ کر نکالا شوہر خواہر نے امی جان
دلوا دی کنڈی تیرے برادر نے امی جان

مجبور ہو کے قبر پہ اب تیری آئی ہوں
اور زیر لب یہ نالۂ جانکاہ لائی ہوں

افسانۂ حیات کی تکمیل ہو چکی
امی تمہارے حکم کی تعمیل ہو چکی

اب ختم ہو چکے مرے سب کار زندگی
اور اٹھ چکا وہ پردۂ اسرار زندگی

میری حیات اصل صعوبات بن چکی
ہر سانس اپنی مرگ مفاجات بن چکی

صبح طرب کی دید کہاں شام ہو چکی
قسمت مری بہار تمنا کو رو چکی

مہلک جفائے ہجر کا آزار ہو چکا
اچھا شب فراق کا بیمار ہو گیا

بلبل قفس میں رنج اسیری بھی سہہ چکی
چھٹ کر چمن سے گوشۂ زنداں میں رہ چکی

یہ مشت خاک تجلیوں سے فیض پا چکی
شعلوں سے سب فضائے چمن جگمگا چکی

تاثیر تیرے دودھ کی اماں دکھا چکی
بھینٹ اپنی حسرتوں کی جہاں میں چڑھا چکی

خوں دے کے تازہ کر چکی رسمِ وفا کو میں — خاموش رہ کے سہہ چکی ہر اک جفا کو میں

جی چاہتا ہے نالوں سے محشر بپا کروں — پاسِ حیا ہے مانعِ اظہار کیا کروں

دل دے رہا ہے جذبۂ غیرت کو جوش اب — فطرت خودی کو دیتی ہے داروئے ہوش اب

قصہ جو یہ عدالتِ دنیا چکائے گی!
محشر میں تیرے آگے مجھے شرم آئے گی

کل صبح کوچ ہے مرا شہرِ دیار سے — آؤں گی اب کبھی نہ لپٹنے مزار سے

غربت میں جو پڑے گی مصیبت اٹھاؤں گی — اب لوٹ کر دیار کو تیرے نہ آؤں گی

لیجے سلام آخری اس دلِ فگار کا — بے کس کا بے وطن کا غریب الدیار کا

آشفتہ حال لختِ جگر کا سلام لو — اس تیرہ بخت نورِ نظر کا سلام لو

اپنی جگر فگار و مسافر کا لو سلام — اپنی تباہ و سوختہ اختر کا لو سلام

گر اتفاق سے کہیں مل جائیں آپ کو — کہنا مرا سلام برادر کو باپ کو

ہو خاتمہ بخیر دعا آپ کیجیے
اور اذن اپنی نور کو رخصت کا دیجئے

(ب) اسلامیات۔ قومی و مذہبی جذبات

قدرت کا پیغام خورشیدِ رسالت کے نام

جب ختمِ نبوت کے ستاروں کا ہوا کام — خورشیدِ رسالت کو دیا حق نے یہ پیغام

آدم کے سفینے پہ ہے ابلیس کا قبضہ — کیا دور کہ بیڑے کو ڈبو دے یہ بد انجام

پوشیدہ تنِ کعبہ میں اب روحِ بتاں ہے — یزداں کی جگہ جلوہ کناں پیکرِ اصنام

بالکل ہی مجھے بھول گئی فطرتِ انساں — اب اور ہی کچھ ہو گئے اُن کے سحر و شام
اے دوست نکل پردہ سے اور بزمِ جہاں دیکھ — خلوت کا نہیں وقت یہ جلوت کا ہے ہنگام
تنویرِ فطرت کے سراکشل میں سما جا — چمکا دے مری دنیا کے سب ایوان در و بام

آفاق سے ظلمات کے لشکر کو بدر کر
عشاقِ جہاں کی شبِ ہجراں کو سحر کر

ہر شخص کا سر پھر مرے سجدہ کو جھکا دے — پھر خالق و مخلوق کے رشتہ کو ملا دے[1]
دروازہ سے مندر کے برہمن کو اُٹھا کر — لا کعبے میں اور زینتِ محراب بنا دے
قشقہ کی جگہ سجدۂ خالق کا نشاں ہو — پیشانیِ آدم کو پھر اگلی سی ضیا دے

کر غرق تو سرمایہ پرستی کا سفینہ
تابندہ ہو مزدور کی قسمت کا نگینہ[2]

انجم نے سرِ چرخ سے مژدہ یہ سنایا — خورشیدِ رسالت اُفقِ دہر پہ آیا
خالق نے اسے رخصتِ تنویر[3] عطا کی — وہ مہرِ مبیں برجِ شرف سے نکل آیا

---

[1] علامہ اقبالؒ ؎ کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو (بالِ جبریل)

[2] علامہ اقبالؒ ؎ تو قادر و مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں :: ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ :: دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات (بال)

[3] علامہ اقبال نے بھی ضربِ کلیم میں یہ ترکیب استعمال کی ہے
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو :: جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

آئینۂ ایام میں چمکا مہِ قدرت — توحید نے رنگِ رخِ تثلیث اڑایا
تاباں ہوا وہ نورِ الٰہی جو زمیں پر — کہنے لگی ہے چرخ سے قندیل مرا یا

آمد جو ہوئی موکبِ محبوبِ خدا کی
اک دھوم مچی صلِ علیٰ صلِ علیٰ کی

شبِ عاشورہ

پڑی ٹھنڈی جو حرمتِ مہِ افلاک کی گرم بازاری
عطا تب رات کو حق نے کیا تاجِ جہانداری

نہ پہلے اور نہ پھر اس کے بشر کی یاد میں آئی
یہ وہ شب تھی جو تنہا عالمِ ایجاد میں آئی

یہ وہ شب تھی لٹا تھا جس میں تاجِ سطوت و ملت
یہ وہ شب تھی مٹا تھا جس میں تاجِ شوکتِ ملت

یہ وہ شب تھی کہ تھی رحمت پر تھا حق کا دل دادہ
سحر کو جس کی رن میں لٹ گیا یثرب کا شہزادہ

یہ وہ شب تھی الم سے جس کے چرخِ پیر مضطر تھا
پیاسا تین دن کا نائبِ ساقیِ کوثر تھا

یہ شب پیغامِ تخریبِ جہاں دیتی ہوئی آئی
مکمل مصیبت کا بار سر لیتی ہوئی آئی

زمینِ کربلا پہنے ہوئے تھی ماتمی جامہ
نہاں تھا آستیں میں محشرِ فردا کا ہنگامہ
خزاں کی تھی چڑھائی اور باغِ شاہِ طیبہ تھا
ہواؤں کے تھے جھونکے اور چراغِ طاقِ کعبہ تھا

گھٹائیں چھائی تھیں غم کی ہلالِ عیدِ زہراؓ پہ
تھے طوفانی تھپیڑے کشتیِ امیدِ زہراؓ پہ
علیؓ کا چاند تھا اور گردِ رنج و غم کا ہالا تھا
سحر کو ہاشمی خورشیدِ انور گہنے والا تھا

اندھیرا چھایا تھا عالم پہ وہ ظلم و تعدّی کا
نہ تھا دنیا میں حامی کوئی اس دنیا کے ہادی کا
بچھا تھا ریت کے اوپر نبی زادہ کا سجّادہ
جبینِ آئینہ کردار پیشِ حق تھی افتادہ

صدائے نغمہ و حکمت سے پُر ہر تارِ ہستی تھا
فروغِ جلوۂ ایقاں سے دل ایماں کی بستی تھا
اُٹھی تھیں بحرِ ہستی کے کنارے عشق کی موجیں
کہ جس میں ڈوبتی تھیں کل غم و افکار کی فوجیں

تنازل کر گیا جب ضبط کے طے صبرِ انسانی
ہوئے اوجھل نگاہوں سے حجابِ عالمِ فانی
خزاں کی گود میں جلوے نظر آئے بہاروں کے

زمینِ کربلا پر سر جھکے تھے چاند تاروں کے

گروہِ انبیا میں پھر جمالِ مصطفٰے دیکھا
پریشاں بال، رُخ پُر گرد، عمامہ شہید دیکھا
فضائے کربلا کا منظرِ غمناک دکھلایا
نبیؐ نے یوں نواسے سے مخاطب ہو کے فرمایا

نہ گھبرا مرحلے طے جلد یہ جانِ پدر ہوگا
تو کل مہمانِ گلزارِ جناں میں میرے گھر ہوگا
جبینِ پاک مہتابِ درخشاں بن چمک اُٹھی
ضیائے داغِ دل مہرِ فلک بن کر دمک اُٹھی

ہوئی رخصت شبِ عاشورہ کہتی بزمِ ہستی سے
پڑے گا کام اک دن پھر مجھے دنیا کی بستی سے
تھے آثارِ سحر لیکن ابھی غالب اندھیرا تھا
اُفق کو چار سُو سے فوجِ تاریکی نے گھیرا تھا

ستارے شوقِ دیدِ شاہ میں ٹوٹے سے پڑتے تھے
فلک کے ہاتھ سے جام و صبو چھوٹے سے پڑتے تھے
کیا ارشاد فرزندِ رسولِ حق نے اکبرؓ سے
عرب کے ماہِ نو اور شہر بانوؓ کے گلِ تر سے

وفا کی آخری منزل ہے اے جانِ پدر آیا
تہِ تیغ امتحاں دینے کو زہراؓ کا پسر آیا

ہماری داستانِ حسرت و غم مختصر ہو گی
اب اس کے بعد دنیا میں نہ پھر اپنی سحر ہو گی

اذاں اک بار کہہ لو ورنہ پھر مہلت کہاں ہو گی
نہ ہم ہوں گے نہ تم ہو گے نہ یہ بانگِ اذاں ہو گی

اذانِ صبح دی اکبرؑ نے جب ارشادِ عالی سے
زمینِ دشتِ بلا کی گونج اٹھی صوتِ جمالی سے

اذاں جب دے چکا ایران اور یثرب کا شہزادہ
بچھایا ریت کے اوپر نبی زادوں نے سجادہ

امامت آپ نے فرمائی پھر ان جاں نثاروں کی
نمازِ آخری آخر ہوئی طاعت گزاروں کی

ہوئی کافور ظلمت روشنی پھیلی جہاں بھر میں
گریباں صبح نے پھاڑا غمِ آلِ پیمبر میں

پرندے آشیانوں میں جھکائے سر پڑے تھے سب
چراگاہوں سے چوپائے بھی منہ پھیرے کھڑے تھے سب

گلستاں میں ہوا ہر چار جانب خاک اڑاتی تھی
وفورِ غم سے شق گلزار میں ہر گل کی چھاتی تھی

چمن میں عندلیبِ زار یہ کہتی تھی پھولوں سے
بہارِ مصطفیٰ ہو جائے گی تاراج غولوں سے

سمیٹا دلبرِ زہراؓ نے آخر اپنا سجادہ

جماعت جاں نثاروں کی ہوئی مرنے پہ آمادہ
گیا خیمہ میں رخصت کو پسر شبیرِ الٰہیؑ کا
کہ تا ہمشیر کر لے آخری دیدار بھائی کا

وہ عالم آپ کو اس وقت خیمے میں نظر آیا
کہ جس کو دیکھ کر قلبِ شہِ مظلوم بھر آیا
ہر اک کی صورتِ پُرنور تھی تفسیر حسرت کی
کوئی غم کا مرقع تھی کوئی تصویر حسرت کی

بدقت آپ نے اپنے دلِ بیتاب کو روکا
بہت مشکل سے اس اٹھتے ہوئے سیلابِ غم کو روکا
کہا پھر اتنا آپ نے ہمشیرِ خستہ سے
گرفتارِ بلا آفت رسیدہ دل شکستہ سے

پرستارِ خدا اے عاشقِ حق ثانیِ زہراؓ
لگا ہے آج اولادِ علیؓ پر موت کا پہرا
یہاں سے ساحلِ امید اُن کا یاس و حرماں ہیں
سفینہ زندگی کا آ گیا آغوشِ طوفاں ہیں

ہوئی رخصت خیالِ زیست کی ہنگامہ آرائی
رہے گی یادگارِ تعلق دائم میری تنہائی
مجھے معلوم ہے جو بعد میرے تم پہ گذرے گی
جلے گا خیمہ اور چادر سرِ عترت سے اترے گی

کہو باطل کے ڈر سے چھوڑ دوں دعویٰ صداقت کے
سرِ سبطِ نبی جھک جائے آگے اس حکومت کے

یہ سن کر عندلیبِ گلستانِ مصطفیٰؐ بولی
گلِ گلزارِ زہراؓ نورِ چشمِ مرتضیٰؓ بولی

کہ اے آئینۂ صدق و صفا کے خوشنما جوہر
مقدس معدنِ مہر و وفا کے بے بہا گوہر

یہ شاید لے رہے ہو امتحاں زہراؓ کی دختر کا
تمہیں منظور ہے آج آزمانا اپنی خواہر کا

حمیت کا شرف ہم ہیں، وفا کا رنگ و بو ہم ہیں
صداقت کے محب ہیں، اوج باطل کے عدو ہم ہیں

بہارِ گلشنِ فردوس ہیں دنیا کے رہبر ہیں
ضیاءِ قصرِ جنت، زینتِ محراب و منبر ہیں

شرافت کے گہر ہیں ہم نبوت کے نگیں ہم ہیں
جہاں میں غیرتِ حق کی امانت کے امیں ہم ہیں

خیالِ مرگ سے عزمِ مجاہد رک نہیں سکتا
سرِ ایماں کبھی باطل کے آگے جھک نہیں سکتا

نہ گھبراؤ، یہی ہے آج کے دن آسرا اپنا
سفینہ ہیں نبیؐ کا ہم، خدا ہے ناخدا اپنا

مجھے منظور ہے راہِ خدا میں سر کٹا دو تم

صداقت کے لئے دنیا کی ہر دولت لٹا دو تم
یہ کہہ کر سو گئیں فرطِ الم سے اشکبار آنکھیں!
نہ تھا ممکن کہ ہوں جذباتِ دل کی پردہ دار آنکھیں

مسلم سے خطاب

آہ مسلم ہے یہ تیرے خوابِ غفلت کا اثر
قوم پر تیری جو چھایا ہے فلاکت کا اثر
لرزہ بر اندام تجھ سے روم اور ایران تھے
قیصر و کسریٰ ترے در کے کبھی دربان تھے
تیرے سر پہ فخر کرتا تھا جہانبانی کا تاج
تیرے بیت المال میں تھا ہفت کشور کا خراج
تیرے توسن کی عناں تھمتی نہ تھی سیلاب سے
مضطرب ہوتا نہ تھا تو وادیٔ بے آب سے
بحر کے اندر سفینہ تیرا بازی کھیلتا
اس کی موجوں کو مثالِ موج تھا تو ریلتا
تیرا بیڑہ خضر کا منت کش احساں نہ تھا
یعنی تو مرعوبِ موجِ بحرِ بے پایاں نہ تھا
بدر کے میدان کے کارِ نمایاں یاد کر
تنگ دستی تنگ دامانی کے ساماں یاد کر

رزم کی زینت وفا مسلم کے سر کا تاج تھی
موت کی منزل شہیدوں کے لیے معراج تھی

برق کے مانند چمکی تیری تیغ ناصبور
کفر کے خرمن کا تو نے جس جگہ پایا ظہور

تھرتھراتا تھا ترے ڈر سے کبھی چرخِ کہن
کفر کے ماہِ سحر کو لگ گیا تجھ سے گہن

مردہ عالم کر دیا زندہ تری تکبیر نے
طالعِ خفتہ کو چونکایا تیری تدبیر نے

تھیں وہ تلواریں تمھیں صحرا نشینوں کی کبھی
چاٹتی تھیں جو لہو شاہی جبینوں کا کبھی

راہِ گم کردہ کا رہبر ناخدا کی آس تھا
خضر تھا صحرا میں تو دریا میں تو الیاس تھا

علم ناطق تھا ترا منطق تری تقریر تھی
کاتبِ تقدیر کا لکھا تری تحریر تھی

فیضِ شبنم کا تھا تو ابرِ بہاری کی بہار
مدعا کلیوں کا تھا اور محفلِ بلبل کا سنگھار

خوئے مسلم جب کہ کعبے کے نگہبانوں کی تھی
ہفت کشور میں حکومت تم شتربانوں کی تھی

خود نمائی سے تری خو جب تلک بیگانہ تھی

تجھ پہ قرباں شمع ایمن صورتِ پروانہ تھی
مردہ دنیا تازہ تیری صحبتِ قم سے ہوگئی
کیوں وہ آوازِ مسیحا اب سدا کو کھو گئی

چھوڑ بیٹھا آہ مسلم تو اصولِ زندگی
مغربی تقلید نے کھوئی تیری تابندگی

بے نیازی نے تری کھویا تیری فطرت کا راز
تھا تقاضا عشق کا مسلم تری پچھلی نماز

جب کہ محرابِ عبادت میں جھکا بہرِ نماز
عبد اور معبود میں ہونے لگے راز و نیاز

جب اٹھاتا تھا دعا کے واسطے تو اپنے ہاتھ
آیۂ لا تقنطو تسکین کو ہوتی تھی ساتھ

جب کلام اللہ کے اوراق گردانی میں تھے
مرحبا ہاں ملک تیری نگہبانی میں تھے

پیکرِ آدم کی گل دنیا میں اب باقی نہیں
جام ہے توحید کا باقی مگر ساقی نہیں

عشق کا دل کھو گیا اب حسن بے تاثیر ہے
شمعِ محفل جل رہی ہے آنکھ بے تنویر ہے

یاد کا جب اس کی محفل میں نہیں تیری گذر
آہ بے تاثیر تیری تیرے نالے بے اثر

چھا گئے اِدبار کے بادل تری تہذیب پر
کفر نے بیڑا اٹھایا ہے تری تخریب پر

تیرے در کے پاسبانوں کے سرِ دل پر تاج ہے
اور تو نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہے

ہے حوادث کے تھپیڑوں میں ترا بیڑا اسیر
ناخدا آہوش میں ڈوبا ترا تاج و سریر

جستجو گل کی ہے تجھ کو باغِ ویراں میں عبث
ڈھونڈھتا ہے آبِ حیواں کو بیاباں میں عبث

زندگی تیری نہ ہو کیوں نذرِ طوفانِ الم
جادۂ دینِ محمدؐ پر نہیں تیرا قدم

لذتِ تکبیر سے ناآشنا ہے دل ترا
اور تیرے ماتم سے ہے نعرہ منزل ترا

تو اگر پھر وہ گذشتہ شان و شوکت چاہیئے
دردِ ملت چاہیئے، پاسِ شریعت چاہیئے[1]

اسلام

آہ اے اسلام تھا تو رشکِ مہرِ مبیں
تیری تابانی سے روشن تھی زمانہ کی جبیں
تو خدا کا اس جہاں میں آخری پیغام تھا[2]

[illegible] (نوٹ اگلے صفحہ پر)

لانے والا تھا ترا محبوب رب العالمین

تھا چمن معمور تیرا نغمۂ توحید سے
اس چمن کے عندلیبوں کی صدائیں دلنشیں

تیرے قدموں پر فراز آسماں تھا سجدہ ریز
تجھ سے تھی بستی زمیں کی غیرت عرش بریں

خرقۂ درویش تھا مایوس شاہی کا سہیم
تھے گدایانِ حرم کے پاؤں پر تاج نگیں

(پچھلے صفحے سے)

؎ اتفاقیہ طور پر یہ مصرعہ علامہ اقبالؒ سے مل گیا ہے (نور)

؎ اس نظم پر علامہ اقبالؒ کا رنگ کس حد تک چھایا ہوا ہے اس کا اندازہ مرثیۂ صقلیہ کے ابتدائی اشعار سے ہو سکتا ہے جو علامہ اقبالؒ نے یورپ سے ہندوستان آتے وقت لکھا تھا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:-

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

زلزلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

(بانگ درا صفحہ ۱۴۱)

تیرے طائر بے خطر تھے حبالۂ صیاد سے
یورشِ ظلم و ستم سے دل نہ تھا ان کا غمیں

بجلیوں کا آشیاں تھی تیری تیغِ بے نیام [1]
کر دیا تھا راکھ اس نے خرمنِ اعدائے دیں

تیری آغوشِ محبت عشق کا گہوارہ تھی
تیری نکہت نکہتِ گل سے سوا ناز آفریں

آتشِ نمرود مسلم کے لیے گلزار تھی
اس کے دل میں بھی تھا ابراہیم کا نورِ یقیں

آسماں بھی تھا جبیں گستر تری دہلیز پر
خندہ زن تھی رفعتِ گردوں پہ تیری سرزمیں

فتح و نصرت تھی جلوسِ کامیابی ہم رکاب
سینۂ باطل تھا ہیبت سے تری اندوہگیں

تیرے درویشوں کے سر پر تاجِ ہفت اقلیم تھا
ان کے تھی زیرِ نگیں پیوستہ روئے زمیں

کاتبِ تقدیر کی تحریر جاتی تھی بدل
بندۂ مومن کا دل تھا مہبطِ روح الامیں [2]

---

[1] علامہ اقبالؒ ع بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

[2] علامہ اقبالؒ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (بانگِ درا)

چھوڑ کر تجھ کو ہوئے ہیں ہم ننگِ دیں ننگِ وطن
ذلتیں سب کو ہماری درسِ عبرت ہو گئیں

خانماں برباد ایسے دہر میں ہم ہو گئے
بعد مردن گور بھی ہم کو نہیں ملتی کہیں

پائمالی کو تری اٹھے ہیں وہ دشمن ترے
ہاتھ سے تیرے اماں جنکو نہ ملتی تھی کہیں

شورشِ طوفانِ باطل آج ہے محشر بدوش
اور چلی ہے کفر کی آندھی بجھانے شمع دیں

تیرے تاروں میں ابھی بیتاب ہے سازِ کہن
تشنۂ مضراب ہے لیکن یہ سازِ دلنشیں

تیری محفل بھی ہے باقی رونقِ محفل بھی ہے
تیری محفل میں مگر افراد وہ باقی نہیں

جل رہی ہے شمع محفل بھی اسی انداز سے
آہ پروانوں میں لیکن ذوقِ خود سوزی نہیں

بادۂ توحید سے سرشار پھر کر دے انہیں
تشنہ کاموں کو عطا کر پھر وہ جام احمریں

محمد علی جناح کی آمد پر

ہے نہیں قائم کبھی ایک رنگ پر دورِ جہاں

ہر نفس ہے اک پیامِ انقلابِ آسماں
ذرّہ ذرّہ ہے جہاں کا محشرِ صد اضطراب
غیر ممکن اس خرابے میں سکونِ جاوداں
ہے قرارِ زندگی ہم معنیِ رمزِ اجل
ہے سکوتِ مستقل ہمدوشِ مرگِ ناگہاں
ہے یہی آئینۂ ہستی یہی رازِ ثبات
زندگی کیا ہے عمل کا ایک مسلسل امتحاں
ایک دن وہ بھی تھا جب تو نائبِ کونین تھا
تیری سطوت کی قسم کھاتے تھے ارض و سماں
تیرے قدموں پر جھکا تھا قیصر و کسریٰ کا تاج
رہتا تھا ٹھوکر پہ تیری تختِ جم تاجِ کیاں
تیری جولانگاہ تھے روم و عراق و مصر و شام
تھے ترے زیرِ نگیں اسپین اور ہندوستاں
جو مسلماں فخرِ موجودات تھا ہے آج وہ
ننگِ خلقت ننگِ دیں ننگِ وطن ننگِ جہاں[1]
ہیبت افگن تھی جس کی ہر اک ضربِ تیغِ خلیل
آج ہے وہ خود نشانۂ عشوۂ نازِ بتاں

---

[1] علامہ اقبال نے — جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن (جاوید نامہ)

آستاں پر جس کے ہوتا تھا جبیں گُستر فلک[۱]
آج اس کا سر ہے اور غیروں کا سنگِ آستاں
جو نہ جھکتا تھا کسی طاقت کے آگے جُز خدا
آج بندے ماترم ان کی زباں پر ہے رواں
جو کبھی نسل و وطن کی قید سے آزاد تھا
آج ناز اس سے زیادہ ہے اُسے ہندوستاں
الغرض بے غیرتی و بے حسی سے تھا قریب
دامنِ عقل و خرد اُڑ جائیں ہو کر دھجیاں
ایک کروٹ اور بدلی وفعتاً ایام نے
ہوگیا پھر سے ہرا موسم گُلِ بوستاں
پالیا بیمارِ غم نے چارۂ دردِ نہاں
مل گیا بھٹکے ہوئے رہرو کو منزل کا نشاں
اے جناح! اے قومِ مسلم کے امیرِ کارواں
چارہ سازِ دردِ ملّت تیری فکرِ نکتہ داں
اے کہ میدانِ سیاست میں نہیں تیری نظیر
تجربے میں پیر ہے تو اور ہمت میں جواں
مسلمِ خوابیدہ کو تو نے دیا درسِ عمل
بیخودی کا دَور تو نے کر دیا خوابِ گراں

[۱] علامہ اقبال۔ جن کے دروازدل پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک (بانگِ درا)

نغمۂ تر جو مسلمانوں کو تھے سمجھے ہوئے
اب انہیں زورِ عمل ان کا کریگا سرگراں
کردے تازہ اپنی تدبیرِ جہانبانی سے پھر
عظمتِ اسلام کی بھولی ہوئی وہ داستاں

(ج) غزلیات

بات کیا ہے وہ تجلّی سرِ طور نہیں
عشق مجبور سہی حسن تو مجبور نہیں

جس میں مرضی ہو تری اپنی رضا بھی ہے وہی
خود پرستی ہو محبت کا یہ دستور نہیں

چارہ گر بہرِ خدا چھوڑ دے فکرِ درماں
بھر سکے وقت کا مرہم یہ وہ ناسور نہیں

نگہِ چشمِ کرم کارِ رفو کرتی ہے
ہاں درستیٔ دلِ صد چاک کی منظور نہیں [1]

بجھ سکے سوزشِ داغِ شبِ فرقت جس سے
آہ اے جیبِ سحر تجھ میں وہ کافور نہیں

اب کسے ساغرِ مے آکے پلائے ساقی
نذرِ سر دینے کو سرمد نہیں منصور نہیں

اب سنائی نہیں دیتے ارنی کے چرچے
جلوۂ طور تو ہے عاشقِ مہجور نہیں [2]

پاسِ صیاد نے روکا ہے بمشکل ورنہ
تن ہے پابندِ قفس نالہ تو مجبور نہیں

قہر سے تیرے زیادہ ہے عنایت تیری
بخش دے نور کو رحمت سے یہ کچھ دور نہیں

---

[1] علامہ اقبال ؎ الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے (بانگِ درا)

[2] جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں۔

درستی میں دلِ صد چاک کی کیا تجھ کو مشکل تھی
نگاہوں میں تری تھے سیکڑوں تارِ رفو پنہاں

گلِ امید کی حسرت رہی میرے گلستاں کو
بہارِ لطف میں تیری تھے لاکھوں رنگ و بو پنہاں

ترستی رہ گئی ایک ایک قطرہ کو مری محفل
تری چشمِ کرم میں گرچہ تھے جام و سبو پنہاں

کھلے گا ناخنِ تدبیر سے کیا عقدۂ مشکل
خرد ہے زیرِ دامانِ فنائے سلسلہ جو پنہاں

غزل!

پھر کھنچ گئی اچانک ہمدم کمانِ تقدیر
برسے دلِ حزیں پر جور و ستم کے پھر تیر

غیر دل سے جب ملے ہم اپنا بنا کے چھوڑا
اور کر سکے نہ اس کو کرنا تھا جس کو تسخیر

اوروں کے چاکِ قسمت ہم نے رفو کئے تھے
اور سی سکے نہ اپنا افسوس چاکِ تقدیر

اس درجہ سوءِ ظن ہے ہر بات پر شکن ہے
لائے کہاں سے ہر دن اک دل نیا یہ دلگیر

پاسِ وفا ہمارا مُہرِ دہن بنا ہے
کس طرح ہو سکے گی حالِ دل کی تفسیر

آزاد کب تھی بلبل جو دام میں پھنسی اب
صیاد خود رگِ گل تھی اس کے حق میں زنجیر

ل اسرار الحق مجاز :- سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے (آہنگ ص۳)

کیوں سرخ ہو رہی ہیں پھر تیلیاں قفس کی
اے شاخِ خوں بنا گل شاید دکھلائے تقدیر
آیا جو در پہ مجرم رحمت نے اس کو بخشا
کیا قابلِ تلافی تھی تو دکی نہ تقصیر

نوشابہ

نوشابہ خاتون نام اور نوشابہ تخلص ہے۔ قریشی نسبت خاندانی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آپ حیدر آباد دکن کی رہنے والی اور اردو کی مشہور شاعرہ ہیں۔ آپ کے والد مولوی عبدالحق صاحب سابق مددگار ناظم کوتوالی اضلاع تھے۔

محترمہ نوشابہ خاتون کی تعلیم ابتدا سے آخر تک خانگی طور پر ہوئی۔ اس تعلیم سے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان خواتین میں جنھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ڈگری حاصل کی ہے آپ سب سے پہلی خاتون ہیں۔

آپ کو دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہے آپ کا کلام رسالہ عصمت میں اکثر شایع ہوتا رہتا ہے آپ کا ایک مجموعۂ کلام "موجِ تخیّل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، ہر صنفِ سخن پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے کلام میں صفائی و بلندی موجود ہے، طرزِ ادا کی ندرت، اور خیالات کی بلند پروازی قابلِ داد ہے کلام میں سوز و درد بھی ہے۔ آپ اقبال کے رنگ سے بھی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ نے عشقِ محبت کے تصور سے ملبند ہو کر زندگی کے حقائق پر بھی نظر ڈالی ہے آپ کے یہاں تلقین عمل بھی ہے اور

درسِ حیات بھی، قومی اور ملی رنگ کی نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ آپ نے طبقۂ نسواں کی اصلاح کی بھی کوشش کی ہے اور توہم اور جہالت اور سماج کے غلط رسم و رواج کے خلاف بھی احتجاج کیا ہے

ہے نوائے تلخ یا ربِ سوز و سازِ زندگی — نغمۂ شیریں شنا پر ربطِ نوازِ زندگی
اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن — شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گدازِ زندگی
منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا — آشکارا ہو گیا وہم بھر میں رازِ زندگی
ہے سکوں موت سے بدتر سکونِ انجماد — سعی و حرکت نہ میں ہے منشائے زندگی[1]

کلیجے مسلم کے جل چکے ہیں، گلوں پہ خنجر بھی چل چکے ہیں
کہ اہلِ یورپ ستم سے اپنی ہماری طاقت کچل چکے ہیں
وہ شورِ ظلم و غضب کا اٹھا، ہوئی قیامت زمیں پہ برپا
کہ خونخوارانِ فتنہ افزا، بگڑ چکے ہیں، مچل چکے ہیں
وہ آگ حرصِ ستم کی بھڑکی کہ جس سے پانی کو قوم ترسی
امان غائب، پناہ کیسی، پہاڑ آتش اگل چکے ہیں
نہ جائے مسلم کی آہ خالی، بلند ہو پرچم ہلالی
پھر وہ آ جائے اب جلالی وہ فتنے اٹھیں جو ٹل چکے ہیں

---

[1] علامہ اقبالؒ — فریبِ نظر ہے سکون و ثبات ؛ تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ؛ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی (ساقی نامہ بالِ جبریل)

ادائے قاتل پہ آفریں ہے یہ قول نوشابہ حزیں ہے
تصور جو یہ دل نشیں ہے قدم ہمارے پھسل چکے ہیں

خواہرانِ محترم بیدار ہو بیدار ہو　　تا کجے خوابِ گراں ہشیار ہو ہشیار ہو
تا کجے سامانِ نکبت ہستیٔ بیکار ہو　　رزم گاہِ دہر میں آمادۂ پیکار ہو
ہے تاسف آفریں ہیہات ہماری زندگی　　ورنہ عبرت دے رہی ہے نکبت واماندگی

تختۂ مشقِ ستم ہیں تنگ اپنی جان سے
ہمتیں ہیں پست خالی قلب ہیں ایقان سے
زندگی بدتر ہماری کیوں نہ ہو حیوان سے
علم سے محروم ہیں بے بہرہ ہیں ایمان سے
معتقد ہیں ہم شگونوں کے کہیں اوہام کے
فلسفہ سے ہم نہیں واقف ذرا اسلام کے
آہ بے علمی ہماری زیست کا مقصود ہے
جہل و نادانی ہمارے واسطے محمود ہے
ہائے کیسی کشمکش میں ہستیٔ بے بود ہے
ضعف ہیں احساس حالِ زار ہی مفقود ہے
نوش دارو زہرِ قاتل ہے ہمارے واسطے
دور ہر نزدیک منزل ہے ہمارے واسطے

جامۂ ہستی کی اے وحشت اُڑا دے دھجیاں
اب جدا مہماں ترا دنیائے دوں ہونے کو ہے
کیوں تری حسرت پہ تو تنہا نہ روئے بیکسی
تھا جو قسمت کا لکھا پورا وہ یوں ہونے کو ہے

حال کیا پوچھتے ہو سوختہ سامانی کا　　درد سرمایہ ہوا زندگیٔ فانی کا
دیکھ کر حالِ پریشانِ دلِ زار کہا　　یہ مرقع ہے یقیناً کسی دیوانی کا
عکس بتلا نہ سکا فطرتِ انسانی کا　　یہی باعث ہوا آئینہ کی حیرانی کا
سنگِ در بعض نے سنگِ رہِ مقصد سمجھا　　یہ صلہ ہم کو ملا آپ کی دربانی کا

قدرتِ کردگار ہے ذرۂ خاک سے عیاں　　ظاہر و آشکار ہے شانِ خدائے دو جہاں
باغ و راغ گل بدوش[1]　　قوتِ نامیہ بجوش
ساری زمیں ہے سبز پوش　　دامنِ کوہ گل فروش
رنگِ شفق ہے لالہ گوں چرخ کا دل ہے یا خوں[2]　　نورِ سپہر ہے فزوں، چادرِ آب سیم گوں
نکہتِ گل ہے عطر بار　　دشت و جبل ہیں لالہ زار
وردِ چمن کی ہے بہار　　قدرتِ حق ہے آشکار

---

[1] علامہ اقبالؒ　خبر کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید　(پیامِ مشرق)
[2] 〃　شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے　(بالِ جبریل)

روح فزا نسیم ہے پھیلی ہوئی شمیم ہے　　فضلِ خدا عمیم ہے خطہ ہی نعیم ہے

مولانا راشد الخیری کی وفات پر

(۱)

وا دریغا! بجھ چکی شمعِ شبستانِ حیات
چھپ گیا بدلی میں اب وہ مہرِ تابانِ حیات
تھی ضیا پاشِ جہاں جس کی منور زندگی
چھپ گیا افسوس وہ خورشیدِ رخشانِ حیات
یاد دلواتا رہا جو قوم کو بھولا سبق
جس نے ملت کو بتایا رازِ پنہانِ حیات
وہ کبیر الحوصلہ، عالی شیم، والا ہمم
ننگ تھا جس کے لیے افسوس دامانِ حیات
آہ وہ بزمِ ادب کی شمع آخر بجھ گئی
تشنگانِ علم! ہے تاریک میدانِ حیات
اب سنائیں گے کسے ہم درد و غم کی داستاں
کون بتلائے گا اب تدبیر و درمانِ حیات
لٹ گیا افسوس وہ سرمایۂ نقدِ حیات
ہائے محو جستجو ہیں یاں غریبانِ حیات
زندگی بے کیف ہے سونی ہوئی بزمِ ادب

کیا کہوں کیونکر لکھوں جاتی رہی ہے جانِ حیات

(۲)

مجلسِ علم و ادب کا بجھ گیا روشن چراغ
ہو نہ جائے آہ دنیا کے لئے تاریک تارہ
اٹھ گیا وہ ناخدائے کشتئ صنفِ لطیف
اب لگائے گا الٰہی کون اس بیڑے کو پار
تھا وہ تزئینِ ادب جانِ ادب کانِ ادب
یعنی اقلیمِ سخن کا تاجدارِ پروقار
مدتوں دیتا رہا جو درس تفسیرِ حیات
اس سے خالی ہو چکی ہے گیتی ناپائدار
قالبِ خاکی نظر سے لاکھ پنہاں ہو گیا
کارنامے ان کے دنیا میں ہیں اب تک یادگار
ہے یہی تفسیرِ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کی
ہے حباب آسا سراسر ہستئ ناپائدار
تابکے نوشابہ ناشاد فریاد و فغاں
اب اٹھیں دستِ دعا پیشِ جنابِ کردگار

وفا (و)

وفا تخلص ہے۔ ریاست ٹونک کی رہنے والی ہیں۔ دورِ حاضر کی

ایک زبردست غزل گو شاعرہ ہیں۔ کلام وجدانی اور جذباتی اعتبار سے بہت بلند اور نہایت پُر تاثیر ہے۔ جذبات و احساساتِ قلب کی ترجمانی پر آپ کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ آپ کے کلام میں نہایت شدید اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے جذبات کی فراوانی ہے جس نے آپ کے اشعار کو نہایت دلکش اور موثر بنا دیا ہے، طرزِ ادا سے کہنہ مشقی اور پختگی ظاہر ہے۔ اکثر مشکل زمینوں میں لکھتی ہیں۔ مگر کیف و اثر ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ مثلاً ذیل کی غزل کی ردیف "کبھی ایسی تو نہ تھی" مشکل ہے مگر غزل صرف پُر کیف و بلند ہی نہیں حاصلِ کلام ہے۔ اس میں سلسلہ بندی کا رنگ موجود ہے۔

شکوۂ غم

ہر گھڑی رونے کی عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
جان لیوا تری فرقت کبھی ایسی تو نہ تھی

موت ہی جیسے کہ اب اس سے چھڑا سکتی ہے
زندگی مجھ پہ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی

یوں کبھی ضیق نہ تھی اپنے ہر اک سانس سے ہیں
زندگی سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

جیسے دل سینے میں ڈوبا ہی چلا جاتا ہے
کھوئی کھوئی مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنی ہستی پہ خود اک بار ہوئی جاتی ہوں

خود سے بیزار طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسے اجڑے غمِ عشق سے ہو اس کا خمیر
دلِ ناشاد کی فطرت کبھی ایسی تو نہ تھی
دلِ ناشاد کسی طرح سنبھلتا ہی نہیں
جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی
دل کسی کام میں کمبخت بہلتا ہی نہیں
اپنے ہر کام سے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
لاکھ تدبیر کروں بن نہیں پڑتی کوئی
ناموافق میری قسمت کبھی ایسی تو نہ تھی
التجاؤں میں اثر ہے نہ دعاؤں میں اثر
مجھ سے برگشتہ مشیت کبھی ایسی تو نہ تھی
دشمنوں سے بھی سمجھنے لگوں ان کو بدتر
دوستوں سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
زندگی جیسے کہ ممکن ہی نہیں تیرے بغیر
تیرے آنے کی ضرورت کبھی ایسی تو نہ تھی
تجھ سے کچھ کہنے کا ارماں کبھی ایسا تو نہ تھا
تجھ سے کچھ سننے کی حسرت کبھی ایسی تو نہ تھی
یوں وفا سے ہوئے ناراض تم اکثر لیکن
جیسی اب ہے تمھیں نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

(نوٹ اگلے صفحہ پر)

وفاؔ

محترمہ ح - ن - وفاؔ موجودہ دور کی ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ کلام میں سوز و گداز، صفائی اور متانت موجود ہے آپ کا دل مغلیہ خاندان کی تباہی پر بہت دکھا۔ اور اس موضوع پر آپ نے اکثر نظمیں لکھی ہیں، آپ کا کلام زنانہ رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے، رنگ یہ ہے :-

پلّے کہاں قلم پہ مرا طاقتِ بیاں ۔۔۔ تحریر کیں جگر سے کرے غم کی داستاں
ہے یاد تجھ کو اے فلکِ نیلگوں وہ روز ۔۔۔ جس دن تباہ ہو گیا مغلیہ خانداں
خاتون جن پہ عفت و عصمت نثار تھی ۔۔۔ جی بھر کے جن کو دیکھنے پایا نہ آسماں
اس گھر کے بد نصیب و ستم دیدۂ فلک ۔۔۔ افراد میں تھی غمزدہ اک بچہ والی ماں
نکلی وہ ڈر سے جان بچا کے عورتوں کے ساتھ ۔۔۔ جب لوٹ سے نہ بچ سکیں عصمت کی دیویاں
بیچارگی و خوف و ستم وہ غدر کی رات ۔۔۔ سلطان کے حرم کے لئے آہ الاماں
تھی لب پہ آہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ۔۔۔ اور اس پہ یہ ستم کہ نہیں کوئی پاسباں
نکلا جو دن تو شہر سے کوسوں ہی دور تھیں ۔۔۔ جنگل تھا وہ جہاں عیش کا باقی نہ تھا نشاں
وہ نازنیں پلی ہوئی معصوم صورتیں ۔۔۔ آبِ طعام کا نہ ملا تھا جنہیں نشاں
ابتر تھا حال سب کا اسی شیر خوار کا ۔۔۔ پانی نہیں تو دودھ کہاں تھا بھلا وہاں
ماں مامتا کی ماری نے دوپٹہ پھاڑ کر ۔۔۔ اس پھول سے پسر کو لٹایا زمیں پہ واں

له غالب - بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں ؛ پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے -

فیض احمد فیض :- وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں نقشِ فریادی صفحہ ۹۵

پھرنے لگی تلاش میں پانی کی چار سو
سمجھاتی لاکھ سب سہیلیں کہ اس میں خوفِ جاں
تا نصف شب کسی طرح لائی وہ غمزدہ
تھا موت کا فرشتہ مگر سر پہ چکا اذاں
بچے کو اس کے گود میں پانی پلا دیا
لب پر دعا تھی اور نظر سوئے آسماں
یوں لاگ جیسی تھی پانی پلانا ہوا ستم
اک ہچکی آئی کہ گئی پرواز اس کی جاں
تھی جو ماں تو خاک پہ اس گل کے گر پڑی
دم توڑ کر وہ جا کے بنی خاکِ آشیاں

دونوں کی قبر آج بھی عبرت کا ہے نشاں
ماتم کساں ہیں پہ وفا خود ہے آسماں

وحید

وحید النساء نام اور وحید تخلص ہے، آگرہ کی رہنے والی ہیں اور دورِ حاضر کی ایک قابلِ قدر غزل گو شاعرہ ہیں۔ جذبات کی ترجمانی، سوز و گداز، درد و اثر آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ سنجیدہ شائستہ اور فارسی آمیز زبان میں لکھتی ہیں۔ آپ کے اکثر اشعار بہت بلند ہیں۔

دنیا سے جا رہی ہوں تمنا لئے ہوئے
دل ہے کہ ایک یاس کی دنیا لئے ہوئے[۱]

---

[۱] مجمہ تصدق :۔ ؎ دل میں ہجومِ شوق و تمنا لئے ہوئے
دنیا سے جا رہی ہوں میں دنیا لئے ہوئے

صد سوزشِ جراحت و صد شورشِ فراق
دل ہے اک اضطراب کی دنیا لئے ہوئے
ارمان عشق و حسرت و حرمان و درد و یاس
آئی ہوں بزم یار سے کیا کیا لئے ہوئے
اب آرزو ہے کوئی نہ ارمان ہے کوئی
مایوس موت کی ہوں تمنّا لئے ہوئے
مصروف شغلِ مشقِ تصوّر ہے رات دن
دل میں ترے خیال کی دنیا لئے ہوئے
امّید چارہ سازیٔ بیمار الوداع
خود ہے جگر میں دردِ مسیحا لئے ہوئے
پہلو میں ہے مرے دلِ صد آرزو وحید
ہر آرزو ہے شوق کی دنیا لئے ہوئے

(۵۸)

ہمایوں

غالباً یہی نام اور یہی تخلص ہے، میرٹھ کی رہنے والی ہیں۔ رسالوں میں کلام دینے سے احتراز کرتی ہیں۔ دورِ حاضر کی ایک تعلیم یافتہ اور خوش فکر شاعرہ ہیں، اُردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں سے واقف ہیں، آپ کے کلام میں بڑی شاعرانہ لطافت و پاکیزگی ہے،

جذباتی اعتبار سے بھی کلام بلند اور پُرتاثیر ہے۔ ندرتِ ادا قابلِ داد ہے۔ آپ کے اشعار میں پُرکیف سادگی اور زبان میں شستگی اور صفائی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اساتذہ کے کلام سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔

وعدۂ وصل کر نہیں لیتے پھول کی طرح مسکراتے ہیں
بس تسلی نہ دو دمِ رخصت جائیے آپ روز آتے ہیں
نہیں ملتے اگر غریبوں سے اُن کو دیوانہ کیوں بناتے ہیں

رند سے عصمتِ توبہ کا کالی کالی گھٹا کے ساتھ اُٹھا
یاس نے جب سے دل کو توڑ دیا پھر دعاؤں کو بھی نہ ہاتھ اُٹھا

میں تو کم بخت ہوں اور نام ہما بخت ہے مرا
حفیں یا توں سے فلک سخت جگر خوں ہے مرا

ضمیمہ

شاعرات کے حالات اور کلام کا فراہم کرنا جوئے شیر کا لانا تھا ہر امکانی کوشش کے باوجود بھی کچھ شاعرات اب تک خاموش ہیں اور کچھ کے حالات اور انتخاب کلام اُس وقت موصول ہوئے ہیں جب تذکرہ طباعت کے بالکل آخری مرحلوں میں تھا۔ اس لئے ان شاعرات کو کتاب میں حروف ہجی کے اعتبار سے اپنے صحیح مقامات پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ اُن کو یہاں ضمیمہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انشاءاللہ آیندہ ایڈیشن میں یہ نقص دور کر دیا جائیگا [1]

جمیل

---

[1] تمام شاعرات سے ایک دفعہ پھر التماس ہے کہ وہ اپنے حالات اور کلام راقم الحروف کو ارسال فرما دیں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُن کے خودنوشتہ حالات اور خود منتخبہ اشعار پیش کیے جا سکیں۔

"ج"

اختر: محترمہ سیدہ سردار اختر حیدرآبادی۔

محترمہ سیدہ سردار اختر کا تذکرہ ان ہی اوراق میں پہلے (صفحہ ۲۲۱ تا صفحہ ۲۲۹) ہو چکا ہے، محترمہ کے تفصیلی حالات جو آپ کے آفس سکریٹری محترم جناب سید الحسن صاحب نے لکھ ارسال فرمائے ہیں ابھی ابھی موصول ہوئے ہیں اور چونکہ ان سے اکثر مفید و دلچسپ نئی معلومات کا اضافہ ہوتا ہے اس لیئے ان کو ضمیمہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ جناب سید الحسن صاحب نے محترمہ کے کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ یہ حالات معہ تبصرہ کے شکریہ کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ راقم الحروف کی طرف سے محترمہ کے کلام پر پچھلے صفحات میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس لئے راقم الحروف یہاں دوبارہ اپنی طرف سے اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

آج سیدہ اختر حیدرآبادی کو "شخصیات" کے باب میں پیش کرنا ہو۔ پہلی بار ان صفحات میں ایک شاعرہ کے حالات شائع ہو رہے ہیں۔ ورنہ یہ باب مردوں کے لیئے مخصوص ہے۔ بنگلور کی کانفرنس کے حالات کی اشاعت کے بعد سے اب تک بعض لوگ برابر مصر ہیں کہ سیدہ اختر حیدرآبادی کی تصویر اور اُن کے تفصیلی حالات شائع کئے جائیں زیر نظر تذکرہ اسی اصرار اور اشتیاق کی ایک تکمیل ہے۔

سیدہ اختر کا نام سردار بیگم اور نواب خاندانی لقب ہے۔ ۹ر مارچ ۱۹۱۸ء کو مملکت آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئیں۔

والد ماجد کا نام سید امیر حسن ہے۔ جدِ امجد نواب سید کریم حسن خاں قمر لکھنوی مرزا داغ کے تلامذہ میں سے تھے اور صاحبِ ثروت بھی ددھیال کی طرح سیدہ اختر کی ننھیال بھی شرف و بزرگی اور برتری میں کسی طرح کم نہیں اور کرنول میں اب تک یہ خاندان عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سیدہ نجیب الطرفین ہیں۔ سیدہ اختر کا آبائی وطن لکھنؤ ہے۔ جب لکھنؤ کی بہاریں خزاں آلود ہو گئیں۔ جب عیش و نشاط کے ہنگامے ختم ہو گئے اور اودھ کے آخری تاجدار کو مٹیا برج کے محبس میں قید کر دیا گیا تو سیدہ کے آبا و اجداد نواب سید قطب الدین (کلکٹر) وغیرہ ترکِ سکونت کر کے حیدر آباد آنے پر مجبور ہو گئے۔ اب بھی لکھنؤ میں "لال محل" اور "موتی محل" ان کی یادگار سے ہیں۔ حیدر آباد آنے کے بعد یہاں بھی اس خاندان کو اعزاز نصیب ہوا اور سیدہ کے افرادِ خاندانی اب تک عزت و آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں چار سال کی عمر میں سیدہ اختر شفقتِ پدری سے محروم ہو گئیں اور ان کی تعلیم و تربیت اور حفاظت پرورش ان کے حقیقی چچا محبوب علی صاحب خلف الصدق مولوی چراغ علی المخاطب نواب اعظم یار جنگ بہادر نے اپنے ذمہ ہمت پر لی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے محبوبیہ گرلس اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئیں ۱۹۳۲ء میں خاں صاحب عبد الغنی گورنمنٹ آرٹی

کنٹراکٹر رئیس نصیر آباد (راجپوتانہ) سے شادی ہوگئی کچھ تو ورثتاً اور کچھ ذاتی ذوق و وجدان کی بدولت ابتدائی عمر ہی میں سیدہ کو ادب و شعر سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی شادی ہونے کے بعد جب زندگی کی تمام مسرتیں اور خوشی کامیاں نصیب ہوئیں ماحول میں آزادی اور مزاج میں حکمرانی پیدا ہوئی تو ادب و شعر کے ذوق نے نئی انگڑائی لی۔ ایسی انگڑائی جو مستیوں سے بوجھل، خمار میں ڈوبی ہوئی اور نشہ میں چور تھی۔ چنانچہ اس کا دھارا اس انداز میں بہنا شروع ہوا

خدا رکھے محبت حاصلِ صد زندگانی ہے — تبسم ہی تبسم ہے جوانی ہی جوانی ہے
یہی بس مختصر بہنائی غم کی کہانی ہے — ٹھہر جائے تو انگارہ جو بہہ جائے تو پانی ہے

کیا پوچھتے ہو عشق کی افتاد کا عالم — خاموش بھی ہے سینے میں بھی فریاد کا عالم
ہر سانس میں ہے حسن پہ آشوب کا پیغام — ہر گام پہ ہے عشق ستم زاد کا عالم

اُف تمنائیں محبت لب پہ لا سکتے نہیں — نالہ کر سکتے نہیں نغمہ سنا سکتے نہیں
واہ رے جذبِ محبت اُف رے مجبوریِ حسن — بھول جائیں پھر بھی وہ مجھ کو بھلا سکتے نہیں

مختصر ہے بس یہ اختر شرحِ آدابِ وفا
آگ سی دل میں لگی ہے اور بجھا سکتے نہیں

مرد ہو یا عورت سب پر کسی نہ کسی وقت خدمت کا ایک جذبہ طاری ہوتا ہے خواہ وہ خدمت شوہر کی ہو یا ہمسایہ کی حسن کی ہو یا عشق

کی، قوم کی ہو یا ملک کی، مذہب کی ہو یا سیاست کی، ادب کی ہو یا زبان کی، اگر حالات مساعد اور جذبات حقیقی ہوتے ہیں تو جذبۂ خدمت یقیناً بالیدگی اختیار کرتا ہے۔ سیدہ اختر کے دل میں بھی قوم و ملک اور اپنی صنف کی خدمات کا جذبہ پیدا ہوا اتفاقِ وقت دیکھئے کہ سیدہ کو درامے درمے سخنے اور قدمے غرض ہر طرح خدمت کا موقع ملا۔ سیدہ نے مختلف پلیٹ فارموں سے اپنی درد میں ڈوبی ہوئی آواز قوم و ملک تک پہونچائی۔ پھر کیا تھا ہر طرف سیدہ کا استقبال ہونے لگا۔ عوام و خواص اُن ضربوں کو محسوس کرنے لگے جو سیدہ اپنی تقاریر سے بے حس اور خوابیدہ قوم کے دماغوں پر لگا رہی تھیں سنہ ۱۹۴۳ء میں پراونشل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جس وقت سیدہ اختر پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کر رہی تھیں۔ اُس وقت پنڈال کے ہر گوشہ سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہو رہی تھی تمام لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے تھے اور منقرین انگشت بہ دندان تھے۔ حاضرین جلسہ کی نگاہیں سیدہ کی طرف اُٹھیں اور بجذبۂ عقیدت جھک گئیں اور اعتراف حقیقت کے لیئے مولانا عبدالحامد بدایونی کھڑے ہوئے۔ سیدہ کی تعریف و توصیف کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں تمام مسلمانانِ ہند کی جانب سے سیدہ کی خدمت میں "خطیبۂ ہند" کا خطاب پیش کرتا ہوں۔ مولائے محترم کا یہ اعلان کرنا تھا کہ تمام ہال "خطیبۂ ہند" زندہ باد" اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اُٹھا۔ تقریباً دس منٹ تک یہی عالم رہا

سیدہ اختر اب بھی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ خواتین کی اصلاح کرتی رہتی ہیں اور اُن میں بیداری اور تعلیمی ذوق پیدا کرنے کی جانکاہ کوششیں اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنے تجربہ اور مطالعہ کو وسیع کرنے کے لئے ۱۹۳۵ء میں سیدہ نے مشرق بعید کا سفر کیا اور وہاں بطور خاص خواتین کی زندگی کا مطالعہ اور ہندوستانی خواتین سے موازنہ کیا وہ لکھتی ہیں کہ میں نے ہندوستانی خواتین کو ہر طرح پست اور بے عمل پایا۔ اس سفر نے اُن کے ارادہ و عمل کو اور تقویت بخشی۔ اُن کے دل کی تڑپ اور کسک میں اور اضافہ ہوا۔ واپسی کے بعد انھوں نے زیادہ تیزی کے ساتھ اصلاح خواتین کے لیے قدم بڑھایا مشرق بعید میں بھی سیدہ نے اکثر مقامات پر تقریریں کیں وہاں کے اداروں اور اخباروں نے سیدہ کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور سیدہ کے محاسن سے اپنے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ کئے۔ سیدہ اختر انتہائی نڈر۔ باہمت۔ آہنی عزم رکھنے والی بے باک اور بے خوف خاتون ہیں اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتیں اور اعلائے کلمتہ الحق میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ ان کا قول ہے کہ ایک مصلح میں خلوص اور بے غرضی ہونی چاہیے۔ وہ گولیوں کی بوچھار کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ تعلّی نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ سیدہ مجاہدانہ جذبہ کی مالک ہیں۔ ایسا زمانہ میں موجودہ سیاسی پارٹیوں میں خاکسار تحریک سے ذہنی طور پر اور نہیں لگاؤ پیدا

ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اس تحریک میں شریک ہو گئیں اور اپنے عزم و عمل سے اس تحریک میں بھی چار چاند لگا دیئے۔ پُر خلوص خدمات کے سلسلے میں سیدہ کو پہلے سالارِ تبلیغ اور پھر سالارِ محاذ لکھنؤ بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں جس وقت حکومت اور خاکساروں کے مابین ٹکر ہوئی تو سیدہ اختر مردانہ وار میدانِ جنگ میں "سالار محاذ" یو۔ پی بن کر آئیں اور چند ہی دنوں میں علامہ مشرقی نے انھیں اپنے یہاں کا سب سے بڑا عہدہ "ناظم جنگ محاذ یو پی" دے دیا موصوفہ نے اپنے عہدہ کا چارج لیتے ہی محاذ لکھنؤ کے نظام کو بے حد مضبوط کر دیا اور ہزارہا خاکساروں کو احکام دینے اور سب کا مکمل انتظام کرنے کی تنہا ذمہ دار بن گئیں۔ جب خاکساروں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تو سیدہ نے کان پور کو خاکساروں کا ہیڈ کوارٹر قرار دیدیا۔ حکام شہر اس سے بہت گھبرائے اس لئے کہ نقضِ امن کا اندیشہ تھا۔ کانپور میں دفعہ ۱۴۴ بھی قائم تھی۔ اس کے باوجود سیدہ تمام خاکساروں کے ساتھ بیلچے لیکر شہر کا گشت کرتی تھیں۔ چنانچہ کانپور کے کلکٹر صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک ہزار مسلح پولیس اور گورا پلٹن کے ساتھ سیدہ کی کوٹھی "فردوس اختر" پر آئے اور سیدہ سے جو اس وقت جرنیلی لباس میں تھیں مطالبہ کیا کہ وہ فوراً خاکساروں کو کان پور سے باہر بھیج دیں اور بیلچے پولیس کے حوالہ کر دیں۔ سیدہ نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ خاکساروں کی جماعت ایک پُر امن

آمنہ برجیس

جماعت ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی خدمت گزار ہے وغیرہ وغیرہ حکام نے سیدہ کو گرفتاری کی دھمکی دی اس پر سیدہ نے جو کچھ جواب بادہ قابلِ غور و فکر ہے کہنے لگیں :-

"بسم اللہ میں گرفتاری کے لیئے تیار ہوں۔ آپ اپنی مشین گنوں کو حرکت میں لائیے سینہ حاضر ہے۔ مجھے گرفتاری تو کیا مرنے سے بھی انکار نہیں۔ لیکن نتائج کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

واقعہ بہت طویل ہے' دکھانا یہ ہے کہ سیدہ کا جذبۂ خدمت کتنا جوان اور پُرجوش ہے اور اُن میں کس قدر حوصلہ مندی ہے آجکل سیدہ اختر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ کی صدر ہیں۔ قومی اداروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ غریبوں کی امداد یتیموں کی پرورش اُن کا خاص شیوہ ہے اُن کی زندگی کا ہر لحہ انہماک میں کٹتا ہے اور وہ مصروفیت ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتی ہیں۔

قومی اور ملی خدمات کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ ادب و شعر پر صرف ہوتا ہے جس طرح قومی خدمات کے سلسلے میں سیدہ کو شہرت حاصل ہے اسی طرح ادبی اور شعری دنیا میں بھی وہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ مشاعروں میں اُن کا کلام پسند کیا جاتا ہے نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل ہے نومبر ۴۲ء میں سیدہ نے ریاست میسور کے دارالسلطنت بنگلور میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد

کی جس کے آخری اجلاس میں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے سیدہ کو "زہرۂ سخن" کا خطاب عطا فرمایا۔ جب سے سیدہ نے قوم و ملک کی خدمت اپنے ذمہ ہمت پر لی ہے اُس وقت سے شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ہے تغزل میں وہ سنجیدگی پسند کرتی ہیں چنانچہ کہتی ہیں ؎

جن سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز　　مجھ کو سنا دیجئے پھر وہ نوا ہائے راز
ذوقِ طلب ہے تو پھر سود و زیاں سے گزر　　راہِ وفا میں نہ کر فکر نشیب و فراز
آ ہی گئی آج نیند سنگِ درِ یار پر　　بیخودیٔ آرزو! عمر ہو تیری دراز

سیدہ اختر نے نظمیں بھی بکثرت کہی ہیں۔ جن میں رومانی بھی ہیں اصلاحی بھی اور سیاسی بھی "نعرۂ مجاہد" سیدہ کی طویل نظم ہے چند شعر سنیئے۔

سامنے سے میرے ہٹ جاؤ مجاہد ہوں میں　　خاکپائے عمرؓ و حیدرؓ و خالدؓ ہوں میں
مردِ مومن ہوں ہر اک شے مرے ادراک میں ہے　　برشِ تیغ مری ہر نگہِ پاک میں ہے
آسماں پر ہے مری جرأت و ہمت کا دماغ　　میں نے دنیا میں جلایا ہے شجاعت کا چراغ
جان دینے پہ مجھے ناز ہے اللہ اللہ　　موت اک زندگیٔ راز ہے اللہ اللہ
زندگی تیغ و تبر میں ہے نہ تلوار میں ہے　　زندگی ایک مسلمان کے ایثار میں ہے
آتشِ وادیٔ ایمن مری تعمیر میں ہے　　خدمت ضربِ کلیمی مری تقدیر میں ہے
دلِ پرجوش میں اک آگ دبی رکھتی ہوں　　خلشِ عشقِ حسینؓ ابنِ علیؓ رکھتی ہوں

مجھکو سب یاد ہی اسلاف کا افسونِ جہاد　　موجزن ہو میری رگ رگ میں ہی خونِ جہاد

ایک اور نظم کے دو بند دیکھیے:-

جاگ اٹھا ہے ذرہ ذرہ اور تم ہو محوِ خواب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب

آسماں پر مہرِ تاباں ہو گیا ہے جلوہ گر
رات کی تاریکیوں پر چھا چکا نورِ سحر
ہائے تم اب تک طلوعِ صبح سے ہو بیخبر

حیرت اُن ذروں پہ جو ہیں ناشناسِ آفتاب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب

خواب سے بیدار ہو اے نوحہ خوانِ ہست و بود
دعوتِ فکر و عمل ہوتا ہی شاعر کا وجود
لعنت ایسی زندگی پر جس کا مقصد ہو جمود

زندگی تو در حقیقت ہے مسلسل اضطراب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب

سیدہ کسی سے اصلاح نہیں لیتیں اُن کی شاعری میں متانت اُبھا
اور جوش پایا جاتا ہے۔ کلام نہ زیادہ مغلق ہے اور نہ بالکل سیدھا
سادہ نظموں غزلوں اور قطعات۔ رباعیات۔ افسانوں اور مضامین کے

کئی مجموعے تیار ہیں اور عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ ہمیں قومی و ملکی
جذبات کے ساتھ بغیر پس و پیش سیدہ کی شعری اور ادبی خدمات کا
بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی خواتین
میں سیدہ اختر کا پایہ بہت بلند ہے۔ ۱۹۴۳ء میں جنوبی ہند کا آل انڈیا مشاعرہ
و کانفرنس سیدہ کے علمی و ادبی کارناموں میں ایک درخشاں اور پائندہ
نقش ہے۔ جس کی صدارت خود سیدہ اختر نے فرمائی اور جس میں ہندوستان
کے کم و بیش تمام مشاہیر ادبا و شعرا اور ممتاز حضرات نے شرکت کی اور
لطف کی بات یہ ہے اس مشاعرے اور کانفرنس کے تمام کثیر اخراجات
سیدہ نے خود اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔ ہندوستان کے جن ممتاز
حضرات نے اس مشاعرے میں شرکت کی ہے۔ اُن کے دل کی ہر
دھڑکن سیدہ اختر کے اخلاق، مہمان نوازی، ادبی جوش اور پرخلوص
سخاوت کی شاہد ہے۔ اور زمانہ اُن سے اِن حقائق کی تصدیق کرسکتا ہے،
دور کیوں جائیے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء سے "شاعر آگرہ" میں مسلسل اس
مشاعرے اور کانفرنس کی روداد اور اُن کے دلچسپ حالات شائع
ہو رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں آج تک اتنا مہتم بالشان، منظم اور
تمام ہندوستان کی ادبی نمایندگی کرنے والا مشاعرہ نہیں ہوا۔

سعید محسن "آنس سکریٹری"

برجیس

محترمہ آمنہ برجیس کے خود نوشتہ حالات جو آپ نے اس تذکرہ کے لیے ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں۔

"خود نوشت سے پہلے اعتذار کی ضرورت سمجھتے ہوئے چند سطور لکھنا مناسب سمجھتی ہوں:۔

مصنف نے مجھے تین چار ماہ کے دوران میں، خود نوشت نمونہ کلام اور فوٹو کے لیے کم و بیش دس بارہ خطوط روانہ کئے تاخیر کا باعث، میری آشفتگی مزاج سمجھئے یا زندگی کی الجھنوں، اور گوناگوں مصروفیتوں پر محمول فرمائیے۔ تکمیل فرمائش میں کافی دیر ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے:۔

خود نوشت چند سطور پر مشتمل ہے۔

میری پیدائش بمبئی میں ہوئی۔ تربیت اور تعلیم کا زیادہ حصہ یہیں گذرا۔ سکونت بمبئی سمجھئے، الہ آباد سمجھیے، پرتاب گڑھ سمجھیے یا لکھنؤ۔ میرے نزدیک میرا وطن ہندوستان ہے اور میری نظر میں کسی خاص شہر یا مقام میں تخصیص نہیں۔

جب تک بمبئی میں رہی، تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی تکمیل بھی آسانی سے ہوتی رہی اور چونکہ ابتدا سے میں نے ادبی ماحول میں پرورش پائی تھی، مجھے شعر گوئی کا ذوق وہیں سے پیدا ہوا۔ اس کے بعد کئی مقامات پر مختصر سکونت اور قیام کے بعد لکھنؤ آ گئی۔ یہاں

تعلیم کے ساتھ ساتھ میں نے بہت محتاط ہو کر شعر گوئی کا آغاز کیا۔
مجھے اپنے کلام کی اشاعت اور نام و نمود کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔
اور نہ اب ہے۔ اس لیے میری چیزیں آج تک ہندوستان کے صرف
تین رسائل میں شائع ہوئیں جس میں سب سے پہلا پرچہ "اضطراب"
بنارس ہے، دوسرا "نگار" لکھنؤ اور تیسرا "ادیب" دلی۔ اضطراب
میں اشاعت کا باعث محتری مسعود اختر جمال، نگار میں گرامی قدر
نیاز فتحپوری اور ادیب میں برادر گرامی اسرار الحق مجاز۔
میں بہت کم کہتی ہوں اور جو کچھ بھی کہتی ہوں وہ میرے اپنے
جذبات ہوتے ہیں۔ کسی خارجی شے سے متاثر ہو کر میں نے کبھی کچھ
نہیں کہا تھا مگر حال میں مجھے ایک فرمائشی نظم کہنی پڑی جو "نغمۂ آتشیں"
میں گزشتہ سال شائع ہوئی ہے۔
نمونۂ کلام کے طور پر چند چیزیں حاضر ہیں:۔
آمنہ برجیس بقلمہٗ لکھنؤ"

محترمہ آمنہ برجیس کی شاعری بالکل جذباتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے
اس میں نفس تجربات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں
گہرائی اثر اور صداقت پیدا ہو گئی ہے جس کا کیف دیرپا اور پائندہ ہے۔
ہندوستان میں موجودہ دور، زندگی کا ایک انقلابی دور ہے زندگی کا
پرانا نظام بوسیدہ ہو کر درہم برہم ہو رہا ہے مگر نیا نظام ابھی پوری طرح عالم وجود
میں نہیں آیا۔ موجودہ نسل کے نوجوان افراد کو ابھی اپنا نصب العین، اپنا مقصد

اور مسلکِ حیات پوری طرح واضح نہیں۔ تجربہ اور تعلیم کی وسعت نے بھیں ذہنی آزادی ضرور دے دی ہے۔ مگر مادی معاشرتی اور سماجی رکاوٹیں ابھی سدِراہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کے ذہن کو ابھی اس درمیانی دور کی پیچیدگیوں اور مشکلوں سے دوچار رہنا پڑ رہا ہے۔ ان واقعات نے ایک عام ہیجان، ایک مبہم خلش اور بیزاری و مایوسی کی ایک ہمہ گیر کیفیت پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کیفیات موجودہ شاعری کی سب سے عام اور سب سے نمایاں خصوصیات بن گئی ہیں، اور یہی خصوصیات محترمہ جبیں کے کلام میں نمایاں ہیں۔ مبہم ماضی اور تاریک مستقبل جن کے اندھیروں میں سے کبھی کبھی امید کی کچھ روشن شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ اس کے ضروری اجزا ہیں۔ ان کیفیات میں گھر کر غمِ زیست کی موجودہ الجھنوں اور مصیبتوں کو محو کر دینے کے لئے بعض طبیعتیں ہوس کے سہارے نشاط میں جذب ہو جاتی ہیں، اور بعض اپنے ہیجان اور جذبات کا کوئی مرکز تلاش کرتی ہیں اور کسی خیالی یا حقیقی محبوب کے آغوش میں سر رکھ کر ایک الٰہی جذبۂ محبت کی بیخودی میں غمِ امروز کو غرق کر دیتی ہیں۔ محترمہ جبیں کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔

اس ذہنی ہیجان اور اس مبہم خلش کی کیفیت ملاحظہ ہو

دل سے مٹ جائے محبت کہ نقشِ دوام آج جو کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے
نغمۂ و ساز بھی ساقی بھی مے و مینا بھی دل مگر پھر بھی پریشان ہے یہ کیا عالم ہے

غمِ امروز کی یہ کیفیت ہے۔

مگر اب وہ پُرکیف باتیں نہیں ہیں　　وہ دن اب نہیں ہیں، وہ راتیں نہیں ہیں

مگر اس ہیجانِ خلش اور اس غمِ امروز کا مداوا یہ ہے

لبِ زندگی پر محبت کا نغمہ　　تری آرزو بن کے تھرا رہا ہے

جدا ہوں، مگر آج میرا تصور　　انہیں اپنی آغوش میں پا رہا ہے

محترمہ کا کلام فنکارانہ ہے اس میں نازک اور لطیف احساسات ہیں، شاعرانہ خلوص ہے، شیریں تغزل ہے۔ وہ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال سے واقف ہیں اور ان کا انتخاب بڑے سلیقے سے کرتی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کے اندازِ بیان میں ایک پاکیزگی اور نفاست ہے جس سے ان کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

محترمہ کا مرسلہ انتخاب درج ذیل ہے، آپ کی نظم "نغمۂ بیداری" جو "نقوشِ آتشیں" میں چھپی ہے اور جس کا ذکر محترمہ نے سطورِ بالا میں فرمایا ہے آپ کے مرسلہ کلام کے علاوہ وہ پیش کی جا رہی ہے۔ اس نظم کے دو بند حذف کر دیے گئے ہیں:

حجابِ نغمہ

تصورات کے موتی لٹا رہی ہوں میں　　تمہاری یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں

تمنّات کے پردے اٹھا رہی ہوں میں　　خیال و فکر کی جنت بسا رہی ہوں میں

شبِ فراق میں یوں اُن کی یاد آتی ہے　　کہ جیسے اُن کو بھی خود یاد آ رہی ہوں میں

اٹھا دیا ہے شبستانِ زندگی کا نقاب　　مثالِ شمعِ سحر جھلملا رہی ہوں میں

کمالِ جذبِ تصور کا معجزہ ہے یہ　　انہیں خود اپنی جگہ آج پا رہی ہوں میں

کسی کی برقِ تبسم کو یاد کرتی ہوں — خود اپنے دل کا نشیمن جلا رہی ہوں میں

یہ انقلاب محبت میں کیا ہوا آخر جبیں

کہ دل سے نقشِ تمنا مٹا رہی ہوں میں

فردوسِ خیال

تخیل نگاہوں سے سرشار سا ہے — کوئی آج رہ رہ کے یاد آ رہا ہے

ہیں جیسے دیکھا تھا اک خوابِ رنگیں — تمہیں دیکھ کر یہ خیال آ رہا ہے

ارادہ ہے کہ مائل بہ پرواز ہر دم — قدم ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے

لبِ زندگی پر محبت کا نغمہ — تری آرزو بن کے تھرا رہا ہے

سکوں بخش تھا جس کا رنگیں تصور — وہی آج پھر دل کو تڑپا رہا ہے

ادائے محبت نے چھیڑا تھا جس کو — فضا پر وہی زمزمہ چھا رہا ہے

تمنائے دل آج پھر جاگ اٹھی ہے — کوئی نغمۂ شوق پھر گا رہا ہے

جدا ہوں مگر آج میرا تصور

انہیں اپنی آغوش میں پا رہا ہے

نقوشِ ماضی

وہ آج تک یاد ہے وہ زمانہ — گذرتی تھی جب زندگی والہانہ

نگاہوں میں رقصاں مسرت کی لہریں — محبت میں ڈوبا ہوا اک فسانہ

ہر بات تھی دلنوازی کے شایاں — ہر اک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ

ہر ذوقِ باطن، ہر اک شوقِ پنہاں — وفا کی حقیقت، جنوں کا فسانہ

روحِ سرشار کا اک تبسم — نفس بربطِ عشق کا اک ترانہ

منانا کبھوں یا بگڑنا کبھوں ہیں — خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ
کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت — کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ
کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں — مذاقِ محبت کبھی عارفانہ
کبھی روح پرور ادائیں تمھاری — کبھی یہ بھی تھی سخن گسترانہ
تغافل کے پردے میں دل کی لگاوٹ — تجاہل - محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پُر کیف باتیں نہیں ہیں
وہ دن اب نہیں ہیں وہ راتیں نہیں ہیں

غزل

ہائے کیا تابشِ خورشید، رمِ شبنم ہے — میرے احساس کی دنیا بھی ترا عالم ہے
دل سے مٹ جائے محبت کہ نہ نقشِ موہوم — آج جو کچھ بھی نہ ہو جائے جنوں سے کم ہے
کسی طوفانِ مسرت کی خبر ہے شاید — نغمۂ شوق کی لے آج جو کچھ مدھم ہے
نغمہ و ساز بھی ساقی بھی ہے مینا بھی — دل مگر پھر بھی پریشاں ہے یہ کیا عالم ہے
کیوں چھلک اٹھتی ہو رہ رہ کے یہ احساس کی نم — کیا مری یاد میں وہ چشمِ حسیں پرنم ہے
عشق ہی کیفِ جوانی ہے، مگر افسردہ — حسن ہی نقشِ حقیقت ہے مگر مبہم ہے

میرا افسانہ تو دلچسپ ہے لیکن ہمجلیس
نہ ہمہ نغمۂ عشرت نہ ہمہ ماتم ہے

نغمۂ بیداری

ہشیار رہو اے اربابِ وطن — بیدار رہو اے اربابِ وطن
ظلمت کا گریباں چاک ہے پھر

دامانِ سحر نمناک ہے پھر
اب شعلہ نفس ادراک ہے پھر
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

وہ بزم نشاط و رقص نہیں
بے نور ہوئے ماہ و پروین
تاریک ہوئی زہرہ کی جبیں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

اب جام و صبو کا ہوش کہاں
دل میں وہ ہے سرجوش کہاں
ساقی وہ کہاں مے نوش کہاں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

یہ ابر ہے یا آہوں کا دھواں
یہ برق ہے یا شمشیر رواں
برہم ہے فضائے کون و مکاں
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

دیکھو یہ چمن برباد نہ ہو
پامالِ غمِ بیداد نہ ہو
پھر چرخ ستم ایجاد نہ ہو
ہشیار ہو اے اربابِ وطن بیدار ہو اے اربابِ وطن

یہ جنگ کی خونیں تدبیریں
یہ جبر و ہوس کی تعزیریں
ڈوبی ہیں لہو میں شمشیریں
ہشیار رہو اے اربابِ وطن　　بیدار رہو اے اربابِ وطن
لیکن یہ زمانہ بدلے گا
اک دن یہ فسانہ بدلے گا
خوں ریز ترانہ بدلے گا
ہشیار رہو اے اربابِ وطن　　بیدار رہو اے اربابِ وطن

بیدلؔ — محترمہ رسول جہاں بیگم۔

محترمہ رسول جہاں بیگم بیدلؔ بیگم ڈاکٹر رفعت حسین صاحب صدیقی ایم ایس سی پی ایچ ڈی (علیگ) ڈی فل (آکسن) کی شریکِ حیات اور محترمہ نور جہاں بیگم نورؔ کی بڑی بہن ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے حالات جو خود رقم فرما کر ارسال کئے ہیں درج ذیل ہیں:-

"سنہ ۱۹۱۶ء میں عارف پور نواده کے خوش حال خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد چودھری اساس الدین وہاں کی متمول ہستیوں میں سے تھے لیکن اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ اب ایک بھائی تھا اور دو بہنیں اور آغوشِ مادر۔ ہماری ساری آرزوئیں اور اُمیدیں اِس چھوٹے سے بھائی کے دم سے

وابستہ تھیں۔ لیکن تین سال بعد وہ بھی ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت
دے گیا۔ اُمّی نے باوجود بیوگی کی تکالیف اور دیگر مصائب کے ہماری
نہایت ناز و نعم سے پرورش کی۔ والد کی وفات سے شادی تک کا کُل
زمانہ نانا کے سایۂ عاطفت میں گزرا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں میرا نکاح میرے
والد کے قریبی رشتہ کے بھتیجے سے ہو گیا۔ ابھی رخصت بھی نہ ہونے
پائی تھی کہ نکاح سے چند ہی ماہ بعد امّی بھی جن کا والد کی وفات کے بعد
بیشتر وقت یادِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ راہیِ باغِ جناں ہوئیں۔ میرے نانا
نے میری رخصت مثل اپنی بیٹیوں کے کی۔ میرے شوہر کی تعلیم اُس
وقت تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔
اور سنہ ۱۹۲۸ء میں ایم۔ ایس۔ سی و ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں میں
اسی دوران میں ان کے ساتھ علی گڑھ رہی۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال بغرضِ اعلیٰ تعلیم انگلستان
چلے گئے۔ اکسفورڈ سے ڈی فل کی ڈگری کیمسٹری میں لیکر سنہ ۱۹۳۸ء میں
واپس ہوئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں یہ پہلے شخص ہیں جن کو
یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں میرے شوہر ڈاکٹر رفعت حسین
صدیقی کا آتے ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ کیمسٹری میں تقرر ہو گیا
دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں امپریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ امپیریل ایگریکلچرل
کیمسٹ کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا اور دہلی چلے آئے جو کہ اب ہمارا
مسکن ہے۔

میرے اس وقت چار بچے ہیں دو لڑکیاں اور دو لڑکے جو سب کے سب زیرِ تعلیم ہیں۔ میری تعلیم کسی اسکول یا مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ بابا کے مکان کی چار دیواری میں۔ شعر و شاعری سے مناسبت کچھ شروع عمر سے تھی۔
بتیدل"

محترمہ دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ اور پرگو شاعرہ ہیں۔ آپ کے کلام پر قومی اور مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام (صلعم) سے آپ کو عشق ہے جس کا اظہار آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نعتیں اکثر بہت بلند اور پر اثر ہوتی ہیں آپ نے مسلمانوں کو اُن کی دیرینہ عظمت یاد دلائی ہے۔ اور اُن کو اُن کی موجودہ غفلت سے بیدار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس رنگ میں آپ علامہ اقبالؒ سے متاثر نظر آتی ہیں۔ آپ کا دل طبقۂ نسواں کی عام مظلومیت، جہالت، غفلت اور پستی پر بھی دکھا ہے اور آپ نے اِن کی اصلاح کی بھی کوشش کی ہے۔ آپ نے مردوں سے حقوقِ نسواں کا مطالبہ کیا ہے اور عورتوں کو اُن کے حقوق و فرائض یاد دلائے ہیں۔ آپ مشرقی و اسلامی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور جوہرِ نسوانیت کے صحیح نشو و نما کے لئے اس تہذیب کو ضروری اور مفید خیال کرتی ہیں۔ آپ نے مسلمان مرد اور عورتوں کو بیداری اور عمل کا پیغام دیا ہے۔

محترمہ کا مرسلہ انتخاب کلام درج ذیل ہے:۔

نعت

وہ رسولؐ ہاشمی والا نسب عالی جناب — منظرِ نورِ خدا برجِ شرف کا آفتاب
رحمت للعٰلمین جس کو دیا حق نے خطاب — وہ شہِ امی لقبؐ اور صاحبِ امّ الکتاب

رونقِ بزمِ جہان و گلشنِ قدرت کا پھول
باعثِ تخلیقِ عالم جس کی ہے شانِ نزول

جس نے باطل کے سفینہ کو ڈبویا وہ رسولؐ — جس نے کفر و جہل کی ظلمت کو کھویا وہ رسولؐ
امتِ عاصی کی خاطر جو نہ سویا وہ رسولؐ — پیشِ خالق رات بھر سجدے میں رویا وہ رسولؐ

جس نے اپنے خوں سے سینچا گلشنِ اسلام کو
کر دیا روشن زمانہ میں خدا کے نام کو

نورِ یزداں سے منور جس کی ذاتِ پاک ہے — عطرِ عرفاں سے معطر جس کی ذاتِ پاک ہے
خلق کی حامی و یاور جس کی ذاتِ پاک ہے — قاسمِ تسنیم و کوثر جس کی ذاتِ پاک ہے

جس کی چشمِ لطف ہے غمخوار ہر دلگیر کی
جس کے در کی خاک میں تاثیر ہے اکسیر کی

وہ بہارِ بزمِ ہستی کا گلِ سرو رواں — ساکنِ محمودِ اعلیٰ مالکِ باغِ جناں
جس کا ہے قصرِ معلیٰ سجدہ گاہِ قدسیاں — جس کو بخشا حق نے جبریلؑ امیں سا رازداں

فخرِ دنیا فخرِ دیں - فخرِ عجم - فخرِ عرب
روزِ محشر ہے شفیع المذنبیںؐ جس کا لقب

وہ مجسم رحم لیکن ظالموں پر سخت گیر — جس کی شانِ پاک میں آیا بشیراً و نذیرا
مالکِ کونین اور لذت کشِ نانِ شعیر — بہترینِ خلق لیکن بندۂ ربِ قدیر

فقر و شاہی کو ہے نازش جس کی ذاتِ پاک پر
عرش پر جس کے قدم لیکن جبیں ہے خاک پر

وارثِ تاجِ کیان و تختِ جم جس کے غلام   جن کی تیغوں نے بدل ڈالا نظامِ صبح و شام
توسنِ ایام کی تھی جن کے ہاتھوں میں لگام   روند ڈالا جن کے رہوار نے روم و مصر و شام

کارنامے اُن کے اب بھی اک جہاں کو یاد ہیں
اُن کے نقشِ پا سے اب بھی رہ گزر آباد ہیں

ختم کر طولِ بیاں اب بیدلِ خستہ جگر   ان مبارک ہستیوں کے واسطے سے عرض کر
اے خدا پھر دامنِ اسلام کو وہ دے گہر   جس کی تابانی سے خیرہ ہو زمانہ کی نظر

اے خدا صدیق رضہ و فاروق رضہ و علی رضہ کو بھیج دے
سومناتِ دہر میں پھر غزنوی کو بھیج دے

مہکا وہ گلِ لولاک لما جب یثرب کے گلزاروں میں
توحید کی نکہت پھیل گئی تثلیث کے سارے اداروں میں

عالم سے جہالت دور ہوئی۔ دنیا سے جفا کافور ہوئی
مندر میں اذاں کا شور اٹھا۔ توبہ کی صدا میخواروں میں

وہ دولتِ سرمدی ملی جو طیبہ کی گلیوں میں لٹی
اربابِ ہوس کو وہ نہ ملی سلطانوں کے درباروں میں

اے ابرِ سخا۔ ہاں جھوم کے آ۔ ہے شورِ عطش پیاسوں میں بپا
اے جانِ مسیحا چشمِ کرم اب تاب نہیں بیماروں میں

ہیں تیری گلی کے خاک بسر صد قیصر و کسریٰ سے بڑھکر
ہیں تیری ادا کے دیوانے خود دنیا کے ہشیاروں میں

وہ جس نے دیا منزل کا پتا وہ جس نے دکھائی راہ ہدیٰ
گم کردہ منزل قافلہ تھا جب غم کی راہ گزاروں میں

جو رنگ جہاں میں ظاہر ہے صدقہ یہ اُسی کے نور کا ہے
ہے اُس کی تجلی تاروں میں ہے اس کی مہک گلزاروں میں

اب خوابِ فنا سے اُس کو جگا پھر مسلم خوابیدہ کو سنا
جو نعرۂ حق گونجا تھا کبھی میدانوں میں کہساروں میں

سرسبز ہوا گلزارِ جہاں فیضانِ سحابِ رحمت سے
پھولوں کا تو ہے دل ذکر ہی کیا باقی نہیں سختی خاروں میں

یثرب کے جانے والے

اے دیارِ شہ ذیجاہ کے جانے والے　　خاص دربارِ شہنشاہ کے جانے والے
سرورِ خلق کی درگاہ کے جانے والے　　منزلِ رحمت اللہ کے جانے والے

ہم سے برگشتہ نصیبوں کی خبر لیتا جا
تو سلام دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

تجھ کو قسمت نے دکھائے ہیں یہ ایامِ سعید　　کیوں نہ ہو اوجِ شرف پہ ترا نجمِ امید
تو ہے اور گلشنِ یثرب کی بہارِ جاوید　　ہیں نہیں جلوۂ جاناں کے اگر قابلِ دید

فرشِ رہ کے لئے تو میری نظر لیتا جا

تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

شکر کر دل سے ادا بخت کی بیداری کا تو ہوا خیر سے موجب کرمِ باری کا
ہاں مگر پاس رہے رسمِ وفاداری کا شغل ہو تا درِ محبوب گہرباری کا

ہو ضرورت تو مرے دیدۂ تر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

ضوفشاں جب تری قسمت کا ستارہ ہوگا سامنے مسکنِ محبوب دل آرا ہوگا
گنبدِ سبز کا جی بھر کے نظارہ ہوگا باریابی کا سرِ بزم اشارہ ہوگا

اپنی رنگین بیانی میں اثر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

جب ملے آہِ رسا کو تیری اذنِ پرواز پہنچے تقدیر تجھے لیکے سرِ محفلِ ناز
کوئی تحفہ تو نہیں لائقِ سلطانِ حجاز مگر اک عرض ہے ناچیز کی اے بندہ نواز

نذر کو چشمِ عقیدت کے گہر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

ڈوبتی ناؤ کو ساحل پہ لگانے کے لئے بند آفت سے اسیروں کو چھڑانے کیلئے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کیلئے قصۂ کاوشِ غم ان کو سنانے کے لئے

روح میں سوز دعاؤں میں اثر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

لہ آہ میں طاقتِ پرواز نہیں ہے نہ سہی عشق میں جذب کا انداز نہیں ہے نہ سہی
نالہ تاثیر سے دمساز نہیں ہے نہ سہی دل تجلی سے سرافراز نہیں ہے نہ سہی

میری شب کرنے کو مانندِ سحر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

پہونچے جب سرورِ کونین کے کاشانے پر　　　کہنا اب روح ہے آمادہ نکل جانے پر
تنگ ہے جامۂ ہستی ترے دیوانے پر　　　دلِ بیتاب بہلتا نہیں بہلانے پر

خبرِ شیفتۂ خاک بسر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

سر پہ ادبار کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے　　　طاقتِ ضبط نہ یارائے شکیبائی ہے
تیرے بدخواہ ہیں اور انجمن آرائی ہے　　　تیرے خدام ہیں اور ذلت و رسوائی ہے

عرض یہ پیشِ شہِ جن و بشر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

نوٹ صفحہ ۷۸۲ ۔ پہلی علامہ اقبال

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی　　　جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی　　　اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے　　　(بانگِ درا شکوہ صفحہ ۱۸۴)

۲ علامہ اقبال رح

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے　　　کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

ہم

دل ہے آشفتہ طبیعت ہے فغانی میری — قلق انگیز ہے اندوہ بیانی میری
نہ کہی جائیگی تجھ سے یہ کہانی میری — تو سیاہ ہوتا جو بیاں ہوتی زبانی میری
تو ہے ذکرِ مرا قلب و جگر لیتا جا
تو سلامِ دلِ تفسیدہ جگر لیتا جا

السلام اے شہِ مکی مدنی العربی — السلام اے قرشی ہاشمی و مطلبی
السلام اے مہ اوجِ فلکِ خوش لقبی — السلام اے گہرِ قلزمِ والا نسبی
درِ آقا پہ عقیدت سے غلام آئے ہیں
ہند کے خستہ جگر بہرِ سلام آئے ہیں

لیجئے بندِ مصیبت کے اسیروں کا سلام — بیکسوں یا شہِ کونین فقیروں کا سلام
فاقہ مستوں کا غریبوں کا امیروں کا سلام — قوم کے طفلوں کا بڈھاؤں کا پیروں کا سلام
گر سلام اپنا قبولِ شہِ والا ہو جائے
شبِ تاریکِ مصائب میں اجالا ہو جائے

روداد سوال

چھپا رکھا تھا شکوہ دل میں ہم نے دل کے محرم کا — بنا رکھا تھا خرمن اپنا سینہ شعلۂ غم کا
نہ خوگر ہو سکا جب دردِ دل صبرِ پیہم کا — وسیلہ بن گیا زخمِ جگر تدبیرِ مرہم کا
لبِ خاموش نے آخر سکوتِ دائمی توڑا
قلوبِ مطمئن نے دامنِ صبر و سکوں چھوڑا
تمنا بن کے سینے سے آہوں کا شرارہ اٹھا — برسنے دیدۂ تر مثلِ ابرِ نوبہار اٹھا

تڑپ کر عمر بھر رہتا ہے بیتاب قلب بے قرار اٹھا　　قفس میں طائرِ جاں مضطرب ہو کر پکار اٹھا

رقم کر خونِ حسرت سے فسانہ زندگانی کا
سنائیں ضعفِ غالب کو وفا اپنی کہانی کا

نہ پوچھو کیفیت ہم سے ہماری جذبۂ دل کی　　ہوئی گل روتے روتے شمع آخر اپنی محفل کی
نہ کی صیاد نے پروا ذرا شورِ عنادل کی　　کہ ویرانہ قفس کا انتہا تھی اپنی منزل کی

بنا کر تختۂ مشقِ ستم جلاد نے رکھا
ہمیں پابند کر کے بانیٔ بیداد نے رکھا

رکھا بیزار جاں سے نت نئی آزار دہیدیوں　　لٹائے نقدِ الفت چشمِ گوہر بار نے صدیوں
رکھا پابندِ آفت چرخِ کج رفتار نے صدیوں　　جلایا اپنا گلشن آتشِ پیکار نے صدیوں

عذابِ روح تھا ہر سانس گو خوفِ شماتت سے
نہ پھیرا منہ کو لیکن حکمِ ناطق کی اطاعت سے

سہے ہم نے ہزاروں حسرت و آلام دنیا میں　　رکھا محرومیٔ تقدیر نے ناکام دنیا میں
نہ پایا کوئی پل کوئی گھڑی آرام دنیا میں　　رہے مرغِ قفس ہو کر اسیرِ دامِ دنیا میں

جہاں میں گوہرِ مہر و وفا کی آبرو بن کر
رہے خاموش مثلِ گل پریشاں مثلِ بو بن کر

گریں گی جانِ مضطر پر الم کی بجلیاں کب تک　　بنیں گی مہماں گھر کی ستم آرائیاں کب تک
حوادث کے تھپیڑوں کی تلاطم خیزیاں کب تک　　رہیں گی ورطۂ غم میں ہماری کشتیاں کب تک

اجاڑے گا تمہارا ظلم کب تک جانستاں ہو کر
ہمارے گلشنِ امید کو بادِ خزاں ہو کر

رہیں دیکھو گے تم کبتک حقارت کی نگاہوں سے
رہیگی دشمنی کبتک تمہیں ہم بےگناہوں سے
دھواں کبتک اٹھیگا اپنی دردِ جگر آہوں سے
رہیگی تا بکجا بے اعتنائی دادخواہوں سے

رہیگا بند کبتک ساتھ ہم پہ آزادی کا دروازہ
کہاں تک آرزو کا خوں رخِ مظلوم کا غازہ

رہے دنیا میں ہم دکھتے ہوئے دل کی صدا بنکر
کہیں بچے نور آنکھوں کے لئے نور و ضیا بنکر
کہیں بچپن ضعیفوں کے سہارے کو عصا بنکر
ادا کرتے رہے حق پیکرِ مہر و وفا بنکر

دیا ہے ہر طریقہ سے ثبوت اپنی صفائی کا
رہا اس پر بھی زندہ نام ہم سے بیوفائی کا

بنایا عفت و شرم و حیا کو پاسدار اپنا
عمل پوشاک اور زیور رہا صبر و قرار اپنا
رکھا پوشیدہ دل میں جذبۂ ذاتی اختیار اپنا
رہا تلخی میں بھی غم کی تخیل خوشگوار اپنا

دکھایا عزم ہم نے معدنِ صدق و صفا ہو کر
گزاری زندگی پابند آئینِ وفا رہ کر

بسے گو دل میں تم کاشانۂ دل کے مکیں بنکر
امانت قوم کی برباد کی لیکن امیں بنکر
روا رکھا ستم ہم پر نبی کے جانشیں بنکر
اجاڑا تم نے گلشن تخلیہ باغ دیں بنکر

کہو انصاف سے خود۔ کیا ٹھکانا ایسے ظالم کا
رکھے اسلام پر الزام جو اپنے مظالم کا

بزرگانِ طریقت بھی نرالی شان رکھتے ہیں
وہ کہنے کو خدا کے حکم پر ایمان رکھتے ہیں
صداقت کے لئے اپنی سند قرآن رکھتے ہیں
غضب ہے مصحف پر کھلا بہتان رکھتے ہیں

سناتے ہیں یہ پڑھکر ترجمہ آیات قرآں کا

کہ اس میں صاف ہے فرمان قید بند نسواں کا

ہیں مومن اک صدف کے ایک گلشن کے ثمر دونوں ہوئے اک نخل کے سایہ میں پل کر بارور دونوں
ہیں اک صانع کی صنعت کے کرشموں کا اثر دونوں ہیں اک خالق کے بندے ایک رحمت کی نظر دونوں

کیا کیوں بند ہم پر اُس نے باب علم و آزادی
ہوئی منظور کیوں قدرت کو اپنی خانہ بربادی

بتاؤ تو طریقہ بانیٔ اسلام کا کیا تھا ہمارے سر پہ احساں اُن کے فیض عام کا کیا تھا
تمھیں معلوم ہے آغاز اس انجام کا کیا تھا کلام اللہ میں حق اس ہستیٔ ناکام کا کیا تھا

اگر دشمن ہے اک عالم تو ہو، اللہ یاور ہے
پڑھو قرآن میں ھُنّ لباسٌ حکم داور ہے

وہ جس کی ذات اقدس بن کے الطاف عمیم آئی وہ رحمت ساتھ جس کے رحمتِ ذاتِ قدیم آئی
جہاں میں ساغر توحید کی بن کر قسیم آئی لٹاتے ہوئے وحدت باغ میں بن کر نسیم آئی

سر فاراں پہ جھنڈا جس نے آزادی کا لہرایا
گریزاں جس کے پرتو سے ہوا الحاد کا سایا

وہ محبوب خدا صلعم ، سردار عالم ، ہادیٔ دوراں صلعم وہ کل کی عقل پہ غالب تھی جس کی عقل یکتا
کفیل طبقہ نسواں تھا جس کا سایۂ داماں بنا جس کا کرم ہم بیکسوں کی زیست کا ساماں

دیئے تھے جو حقوق زندگی اُس پاک ہستی نے
کیے نذر فنا وہ سب تمھاری چیرہ دستی نے

قوانین شریعت کا بنا کر رازداں ہم کو رفاہِ زندگی میں کر دیا ذی اختیار ہم کو
سیاسی مجلسوں میں اُس نے بخشا اقتدار ہم کو بنایا محفل علم و ادب کا حصہ دار ہم کو

ملی اس کے عمل میں طبقۂ نسواں کو آزادی
شریک حال قسمت بن گیا اسلام کا ہادی

کتابوں میں خواتین سلف کا حال زندہ ہے
زمانے میں ہما کا عزم و استقلال زندہ ہے
رضیہ کی حکومت نورجہاں کا اقبال زندہ ہے
زبیدہ کا تجمل خولہؓ کا اجلال زندہ ہے

ابھی ہے اپنا سینہ شوکت ماضی کا آئینہ
دکھاتا ہے جو اپنے عکس میں احوال پارینہ

خبر ہے صنف نازک ہی کی وہ جنس گرانمایہ[۱]
کہ جس کے سر پہ پہلے پرچم اسلام لہرایا
وہ جس نے خلق میں اول مسلماں کا لقب پایا
کیا نذر پیمبرؐ زندگی کا اپنی سرمایا

نتیجہ ہے یہ ازواج پیمبرؐ کی ثقاہت کا
ذخیرہ ہے جو دنیا میں احادیث نبوت کا[۲]

نہاں قدموں میں جس کے ہیں بہشتوں کی تفسیریں[۳]
کھنچیں جس کی اساسی کاتب قدرت کی تحریریں
ہوئیں ہیں نقش افق پر ماہ پیکرین کی تقدیریں
ابھی خواب پریشاں کی ہیں جو عالم میں تعبیریں

مشاہیر دو عالم ہیں فطرت جن کی کہتی ہے
ہوئی ہیں بارور وہ گل اسی شاخ محبت سے

---

۱ اسلام کی تاریخ میں ام المومنین حضرت بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ سب سے پہلی مسلمان ہیں۔ ج

۲ ام المومنین حضرت بی بی عائشہؓ کی بدولت احادیث کا ایک نادر دست اور گرانمایہ ذخیرہ ہم تک پہنچا۔ ج

۳ اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف جس میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ج

۴ علامہ اقبالؒ:-

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک ہے جس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

یہ تاریکی حریفِ مہرِ تاباں ہو نہیں سکتی

مآل اس تربیت کا ہے فقط ذوقِ تن آسانی نہ اس میں جذبۂ غیرت نہ احساسِ مسلمانی
سعادت فاطمہ رضی کی ہے نہ صدیقہ رضی کی تابانی قتیلِ اسوۂ حسنہ ہے یہ تعلیمِ نسوانی

نگاہِ ناز کو اپنی جو یوں بیباک کرتے ہیں
وہ اپنے ہاتھ سے ملت کا پردہ چاک کرتے ہیں

نگہ بیباک ہوتی ہے تو دل تاریک ہوتے ہیں گریزاں شرم و غیرت سے ہوس نزدیک ہوتے ہیں
حجاب آمیز ہوتے ہیں تو جلوے ٹھیک ہوتے ہیں توازن رکھنے والے لائقِ تبریک ہوتے ہیں

نگہ کی خیرگی اچھی نہ دل کی تیرگی اچھی
اُجالا جس سے دنیا میں ہے وہ روشنی اچھی

اُصولِ دینِ بیضا کی علمبردار بن جاؤں اخوت کی سپر اسلام کی تلوار بن جاؤں
گلستانِ عمل کی عندلیبِ زار بن جاؤں تہِ دل سے کنیزِ احمدِ مختار صلعم بن جاؤں

ہوں سرگرمِ عمل کشتِ وفا کی آبیاری کو
سمجھ کر اپنا فرضِ اولیں طاعت گزاری کو

خدایا ہم کنیزوں کو عمل کی تو ہدایت دے ارادوں میں بلندی حوصلوں میں استقامت دے
شجاعت اُمِ عمارہ رضی کی اسما رضی کی فراست دے ہو قائم سطوتِ اسلام جس سے وہ صداقت دے

نشانِ پرچمِ نسواں کو پھر عالم میں بالا کر
وفاؤں کا ہماری پھر جہاں میں بول بالا کر

مسلم سے خطاب

اے مسلماں ملتِ خیر البشر کے تاجدار　　پیکرِ سعی و عمل تھا زیست کا تیری معیار
آیۂ لا تقنطو کا راز تجھ پر آشکار　　سورۂ انا فتحنا سے عیاں تیرا وقار

اک زمانہ خوشہ چیں تھا تیرے فیضِ عام کا
تجھ سے دنیا میں ہوا سرسبز باغ اسلام کا

حق میں اربابِ دغل کے تیری تیغِ بے نیام　　بن کے دستِ ظلم پر لیتی تھی اپنا انتقام
خلق کو درسِ عمل تھا تیرا حسنِ انتظام　　اور نگاہِ ژرف بیں کو خود فروشی کا پیام

تو صداقت کے چمن کا اک گلِ شاداب تھا
معدنِ جود و سخا کا گوہرِ نایاب تھا

تیری نظریں اس جہانِ آب و گل سے تھیں بلند　　تیری فطرت تھی فضائے لامکاں سے بہرہ مند
گردشِ چرخِ کہن تھی تیرے حق میں سودمند　　انقلابِ دہرِ فانی سے نہ تھا تجھ کو گزند

تیری ہستی نغمۂ توحید کا اک ساز تھی
کفر کُش باطل شکن جس کی ہر اک آواز تھی

یورشِ ظلم و ستم کا گرم جب بازار تھا　　کفر کا آتش کدہ تیرے لیے گلزار تھا
حق کی خاطر تو ہمیشہ برسرِ پیکار تھا　　خطرۂ جاں تھا نہ خوفِ مرگ سے بیزار تھا

خوف تھا تجھ کو نہ برق و صرصر و صیاد سے
گلستاں محفوظ تھا تیرا ہر اک فساد سے

تیرے ہاتھوں میں عناں تھی توسنِ ایام کی　　رفعتِ پرواز ہمسر چرخِ نیلی فام کی
تھی فروزاں شمع تجھ سے ملتِ اسلام کی　　تیری جولانگاہ وسعت روم و مصر و شام کی

تیری ہمت لیتی تھی اسکندر و دارا سے باج
تھا قدم بوسی کو حاضر قیصر و کسریٰ کا تاج

رشکِ صد گلزار تھی تیری گلستاں کی ہوا — جس کی شاخیں نغمۂ توحید سے تھیں ہمنوا
تجھ کو تھا سرداری ملت کا خلعت بیاد گار — زیر فرماں تھی تیری شمس و قمر لیل و نہار

کائناتِ بزم ہستی حکم پر استادہ تھی
پیر گردوں کی جبیں در پر تری افتادہ تھی

پرچمِ اقبال تھا تیرا کبھی کشور ستاں — کشتی امید کی تھی رحمتِ حق بادباں
فصلِ گل کو ابرِ نیساں تیرا فیضِ بیکراں — قہر تیرا خرمنِ باطل کو تھا برقِ تپاں

دل کو جب سے محو ذوقِ خود پرستی کر لیا
آپ کو غارت گرِ ناموسِ ہستی کر لیا

آج ہستی تیری وقفِ ماتمِ امید ہے — تو ہے مردہ تیری عظمت زندۂ جاوید ہے
اُٹھ کہ پھر درپیش بزمِ دہر کی تجدید ہے — تیری پیشانی میں تاباں جلوۂ توحید ہے

دور کر غفلت کے پردوں کو دلِ بیتاب سے
طالعِ خفتہ کو جھٹکا دے کے خودی کے خواب سے

زینتِ محفل تھا کل کا آج ہے ننگِ جہاں — وجہِ عبرت بن گئی دنیا کو تیری داستاں
تیرے قبضہ میں تھی کل تک یہ زمین و آسماں — ہے شبِ ظلمت میں اب بھٹکا ہوا منزل کا راہی

تھا جو کل فریاد رس وہ آج خود ناشاد ہے
تاجدارِ ہفت کشور خانماں برباد ہے

گل بدامن دہر میں اغیار کے گلزار ہیں — اور تری گلشن کی زیبائش کھٹکتے خار ہیں

بادۂ عشرت کی لذت سے عدو سرشار ہیں　　تیرے ارمان زندگی کے نام سے بیزار ہیں

کفر کی حق کے مقابل میں رجز خوانی بھی دیکھ
بتکدے کی رونق اور مسجد کی ویرانی بھی دیکھ

ناخدا حالت ترے بیڑے کی عبرت خیز ہے　　آہ یہ منظر کس قدر دل لرزہ و درد انگیز ہے
لنگر کشتی شکستہ بحر طوفاں خیز ہے　　آسماں برگشتہ ہے باد مخالف تیز ہے

پھر شکستہ ہمت عالی سے اپنی کام لے
کر کے قسمت پر بھروسہ بادباں کو تھام لے

زندگی اقوام عالم کی سراپا جوش ہے　　تو تمہارا بے خودی میں کس قدر مدہوش ہے
بربطِ امید سے اب یاس ہم آغوش ہے　　وقت سے پہلے ربابِ زندگی خاموش ہے

سر پہ تیرے آج ہے چھائی گھٹا ادبار کی
آشیاں ہے نذر تیرا برقِ شعلہ بار کی

کھو نہ وقتِ یاس ہو کر شانِ استقلال کو　　خندہ پیشانی سے اٹھ قسمت کے استقبال کو
ہاں دکھا دے جوہر شمشیر فرخ فال کو　　عہدِ ماضی سے ملا دے حال و استقبال کو

خونِ آبائی رگوں میں جوش کھائے کاش پھر
دے درفش کاویانی کو شکست فاش پھر

جب سے تیری نبضِ ہستی کی حمیت کھو گئی　　دامنِ امید پہ سر رکھ کے قسمت سو گئی
کشتِ دل میں یاس تخم درد و حرماں بو گئی　　شمع احمر بجھ گئی بے نور خلوت ہو گئی

عشرتِ ماضی کی بس لب پر کہانی رہ گئی
نشہ رخصت ہو گیا اور سر گرانی رہ گئی

تجھ سے کہتا ہے یہ فطرت کا تقاضا بارہا ‌ ‌ ‌ جادۂ حق پہ چل اس کج روی سے باز آ
کفر کی آندھی بجھا دے شمعِ دینِ مصطفیٰؐ ‌ ‌ ‌ ہے یہی تیری عقیدت ہے یہی پاسِ وفا
حق کے پروانوں سے خالی حیف یہ محفل ہوئی
قوم مسلم آہ کیوں زناری باطل ہوئی

تیری ملت بھی وہی ہے ہادئ ملت بھی ہے ‌ ‌ ‌ نورِ وحدت بھی وہی ہے جوشِ رحمت بھی ہے
مصحفِ ناطق ہے اب تک مخزنِ حکمت بھی ہے ‌ ‌ ‌ ہے ابھی توحید میں تسخیر کی طاقت وہی
ہے پیمبرؐ بھی وہی تیرا وہی اسلام ہے
لیکن اے مسلم تری غفلت کا یہ انجام ہے

چارہ سازِ دردِ ملت حامیٔ دینِ متیں ‌ ‌ ‌ جس کے پرتو سے ہوئی روشن عرب کی سرزمیں
کی عطا حق نے جسے سرداری دنیا و دیں ‌ ‌ ‌ باعثِ تخلیقِ عالم رحمۃ للعالمیںؐ
قولِ اکملت لکم ہے جس کے افسر کا نگیں
"قابَ قوسین" اور "او ادنیٰ" کی خلوت کا مکیں

چھوڑ کر راہِ رضائے سیدِ ابرارؐ کو ‌ ‌ ‌ بھول کر عہدِ وفائے احمدِ مختارؐ کو
پھینک کر سر سے ردائے رحمتِ غفار کو ‌ ‌ ‌ محو کر کے یاد سے اسلاف کے کردار کو
روحِ آزادی کو پابندِ غلامی کر لیا
ملتِ اسلام کو تو نے مقامی کر لیا[1]

---

[1] علامہ اقبال:-
کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو ‌ ‌ ‌ امتِ احمدِ مرسلؐ کو مقامی کر لو
(جوابِ شکوہ)

اب بھی اے کجرو مسافر کجروی یہ چھوڑ دے — باگ رہواروں کی انتہا کی سمت موڑ دے
توڑ دے جتنے بھی ہیں اصنامِ باطل توڑ دے — رشتۂ الفت محمد مصطفےٰؐ سے جوڑ دے

ہو کے مست اکبار پھر اُس بادۂ پرجوش سے
دور کر دے لعنتِ بارِ غلامی دوش سے

پھر دکھا دے ذوالفقارِ حیدرؓ کی شان کو — اور ابوبکرؓ و عمرؓ کی قوتِ ایمان کو
زندہ کر دے پھر جہاں میں سطوتِ عثمانؓ کو — پنجۂ باطل سے کر آزاد ہندوستان کو

چھیڑ دے سازِ خودی توحید کی مضراب سے
جاگ اُٹھیں پھر نیند کے ماتے فنا کے خواب سے

سازِ تیرا اب بھی ہے نعرۂ تکبیر سے — ہو گیا خاموش لیکن شومیِ تقدیر سے
ہاں مٹا دے نقشِ باطل جلوۂ شمشیر سے — لے کے ایثار و تحمل کا سبق شبیرؓ سے

وقت ہے اب بھی کہ تو یہ بے نیازی چھوڑ دے
روحِ حریت دکھا طوقِ غلامی توڑ دے

عورت

کیا ہے عورت؟ صانعِ قدرت کا رنگیں شاہکار — نشۂ مے کی لطافت حسنِ فطرت کی بہار
غنچہ و گل کا تبسم موجِ دریا کا خرام — خود فراموشی کی دعوت خود فروشی کا پیام
کیا ہے عورت ایک رنگیں اور دلکش خواب ہے — یا نزاکت سے چمن کا اک گلِ شاداب ہے

آہ اے شاعر حقیقت کی نہیں تجھ کو خبر — کس قدر بے درد و ظاہر بیں ہے تیری نظر

ہے دلِ سادہ ذرا سرگشتۂ رنگِ مجاز
مجھ سے سن عورت کی فطرت کا سمجھنا ہو جو راز

کیا ہے عورت؟ عفت و شرم و حیا کی پاسباں
پیکرِ سعی و عمل تصویرِ تمکین و وقار

حاملِ انسانیت اور غمگسارِ کائنات
جس کے سوز و ساز سے ہے رونقِ بزمِ حیات

الفتِ معصوم اس کی جیسے طفلی کی حیات
ہے خداوندِ جہاں کا دستِ شفقت اس کی ذات

محفلِ تخلیقِ آدم کی وہ شمعِ جانفزا
زندگی کی ظلمتوں کو جس نے روشن کر دیا

جس کے نغموں سے ہے پر اس کا سازِ زندگی
اس کی چشمِ دوربیں آگاہِ رازِ زندگی

سادگی پر اس کی قرباں سیکڑوں رنگینیاں
اس کی خاموشی میں پنہاں اس کا اندازِ بیاں

ہو اگر حائل مقدر ہو نگاہِ ژرف بیں
اس کے قدموں کے تلے ہے زیرِ پا یہ فردوسِ بریں

اس کی آغوشِ کرم طفلی کی جنت سر بسر
اس کا زانو تختِ شاہی شفقت تاجِ زر

ہے معلم درسِ اول کے پڑھانے کے لئے
خضرِ رہ ہے منزلِ مقصد بتانے کے لیے

ہیں مثالِ مہر جو ہستی کے افق پر جلوہ گر
ہیں اسی معدن کے وہ سارے درخشندہ گہر

جن کی نکہت سے مشامِ دو جہاں ہے فیضیاب
ہیں اسی گلشن کے پروردہ وہ گلہائے خوش آب

استواری اور استقلال میں مشہور ہے
وقت کی یورش سے اس کے دل کی دنیا دور ہے

اس کا زیور ہے عمل پوشاک ہے صبر و قرار
غم کی تلخی میں بھی ہے اس کا تخیل خوشگوار

ہے وہ صابر دل پہ اپنی شیوہ گوئی کے تیر آ
چہرہ سے لیکن نہ ہوگی دل کی حالت آشکار

تختۂ مشقِ ستم یا کشتۂ بیداد ہو
پھر بھی ناممکن نہ لب آلودۂ فریاد ہو

ملتے ہیں اکثر وفاؤں کے ثمر جور و ستم
پھر بھی ہے پابندِ آئینِ وفا اس کا قدم

خیر خواہِ قوم ہے اس کا دلِ دردآشنا
ہے سراپا صدق و صبر و مہر و ایثار و وفا

آفریں وہ اس کے دل کا جذبۂ بے اختیار
کرتی ہے وہ اپنی ہمت سے کڑی راہوں کو پار

بیدلؔ اس جنسِ گراں مایہ کی ارزانی ہے آج
مانند اس نایاب گوہر کی درخشانی ہے آج

غزل

دیکھ کر اذنِ طرب ساقی میخانے کا — جھک کے منہ چوم لیا شیشہ نے پیمانے کا
سازِ عشرت سے نکلتی ہے صدا ماتم کی — کیا یہ دنیا ہے مرقع مرے غم خانے کا
نظر آتی ہے ہر اک بت میں خدا کی صورت — سلسلہ کعبہ سے ملتا ہے صنم خانے کا
آج وہ محفلِ اغیار میں آتا ہے نظر — دل مرا آئینہ ہے جس میں پری خانے کا
درس لے زندگی شمع سے اے پروانے — عاشقی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا [1]
حرم و دیر میں کس طرح لگے دل اس کا — جس کی نظروں میں ہو نقشہ ترے کاشانے کا
دیکھ جاؤ مرے مرنے کا تماشہ تم بھی — آخری باب ہے یہ زیست کے افسانے کا

بیدلؔ اس طرح سے کچھ عمر بسر کی ہم نے
زندگی کا ہوا اطلاق نہ مر جانے کا [2]

---

[1] فانی:-
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

[2] فانی:-
فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یا رب — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

بیکس :- محترمہ بلقیس فاطمہ۔

محترمہ بلقیس فاطمہ بیکس محترمہ عبرت کی دختر ہیں اور گوالیار کی رہنے والی ہیں۔ آپ کے حالات جو آپ کے عزیز جناب خواجہ محفوظ حسین صاحب نے لشکر گوالیار سے لکھ کر ارسال فرمائے ہیں درج ذیل ہیں:-

"بلقیس فاطمہ صاحب بیکس ۵ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بمقام میرٹھ پیدا ہوئیں تعلیم و تربیت سب گھر پر حاصل کی۔ آپ کی والدہ عبرت ایک شاعرہ اور نہایت اعلیٰ قسم کی خاتون ہیں۔ ماحول ہمیشہ ادبی اور سیاسی رہا جس نے بلقیس فاطمہ کے دل و دماغ پر اپنا گہرا عکس ڈالا۔ آپ کی تمام زندگی تاہنوز ادبی اور سیاسی رہی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے ایک خواتین کی انجمن خود قائم کی جس کا نام "انجمن خواتین پردہ نشین" ہے۔ اسی اثنا میں مسلم لڑکیوں کے واسطے ایک اسکول بھی قائم کیا جس کا نام "قادریہ گرلز اسکول" ہے یہ اسکول مڈل (Middle) تک ہے۔

فارسی اور اردو میں آپ کو کافی دسترس ہے۔ بی۔ اے کی طالبات کو فارسی وغیرہ پڑھاتی ہیں۔ شاعری ۱۲ سال کی عمر سے شروع کی ہے۔ اول اول تو اس کی اصلاح والدہ صاحبہ نے فرمائی بعد میں قاضی محمد ریاض الدین انصاری۔ ایم۔ اے حیدری سے اصلاح لی۔

خان بہادر سید محمد حسین صاحب کے فرزند لفٹیننٹ سید محمد طاہر صاحب بی۔ اے (آکسن) کے ساتھ موصوفہ کی شادی ۲۱ فروری ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔

راقم خواجہ محفوظ"

محترمہ کے ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ بعنوان "جذبات بیکس" موسوم بہ "نالہ بیکس" ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جس پر قاضی ریاض الدین صاحب ریاض انصاری ایم۔ اے جیوری لشکر گوالیار نے مقدمہ لکھا ہے اور تمہید خود محترمہ نے تحریر کی ہے۔ یہ ۴۶ صفحات کی ایک مختصر کتاب ہے۔

محترمہ کے دل میں بچپن ہی سے قومی و ملی درد موجود ہے۔ آپ نے گوالیار میں ایک انجمن خواتین اور ایک مدرسہ نسواں قائم کیا ہے جس کا ذکر اوپر آپ کے حالات میں آچکا ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے "رضاکار مستورات" کی ایک جماعت بھی قائم کی جس کا کام بقول مقدمہ نگار "شریف مسلمانوں کے یہاں شادی و غمی کے مواقع پر ان خاندانوں کی بقدر استطاعت اور موافق ضرورت امداد کرنا ہے۔ اور مراسم بیجا پر اصلاحی لکچر دینا ہے۔"

محترمہ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جہاں تعلیم نسواں کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ آپ نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے ذاتی شوق وانہماک اور اپنی والدہ کی قابل تربیت میں حاصل کیا۔ آپ کی شاعری اور جذبۂ قومی کی ابتدا، جیسا کہ محترمہ نے خود "تمہید" میں تحریر فرمایا ہے، نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی سابق ممبر کونسل آف بخشی گوالیار کی تصنیف "صبح نور" کے مطالعہ سے ہوئی۔ اس کے بعد علامہ اقبال اور مولانا حالی کی نظموں کے مطالعہ نے آپ کو متاثر کیا اور اس وقت سے آپ قومی و ملی رنگ میں کہنے لگیں۔ آپ نہایت متشرع اور پردہ نشین

خاتون ہیں اور مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کو نہایت ضروری خیال کرتی ہیں
محترمہ نے مجاز کی نظموں پر جو تضمینیں لکھی ہیں اور ان میں جن شریفانہ
جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے وہ خواتین کے لئے لائق فخر ہیں۔ یہ
صحیح ہے کہ ابھی محترمہ کے کلام میں فن کارانہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی ہے مگر
آپ نے اپنی منزل کی "سمت" دریافت کر لی ہے اور آپ راستے میں ہیں۔
آپ نے اپنا ایک رنگ مخصوص کر لیا ہے اور امید ہے کہ مشق، تجربہ اور عمر
کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام میں بھی پختگی پیدا ہو جائے گی۔ آپ کے مرسلہ
کلام کا انتخاب درج ذیل ہے:-

نوجوان خاتون سے

تضمین بر نظم مجاز

حجاب ظلم پہ مائل ہے ہم نے لکھی ہے حیاداری ۔۔۔ مسرت کے دم حاصل ہو پھر کوئی جنباداری
ابھی پردہ نشینی روح عالم کو سبکساری ۔۔۔ تقاضا کس لئے ہو کیوں ہوا ہے حکم پیغامبری

"حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا"

ہماری پاس جو ہتھیار ہیں ہم ان سے واقف ہیں ۔۔۔ ہماری جو نہاں کردار ہیں ہم ان سے واقف ہیں
ہماری پاس جو ضنو دار ہیں ہم ان سے واقف ہیں ۔۔۔ جو پینہ نہیں ہیں وہ غدار ہیں ہم ان سے واقف ہیں

"تیری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا"

ہمیں معلوم ہے عورت کی جو کچھ ہے عملداری ۔۔۔ کہیں ہے ٹھوکروں میں اور کہیں بادِ بہاری

کہیں وہ ملکۂ دل بن کے کرتی ہے جہانداری — یہ فرما کر نہ کیجے آپ مستورات کی خواری

"تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا"

تمھارے اس تملق نے کیا برباد لاکھوں کو — تمھاری ان خوشامد نے کیا رسوا ہزاروں کو
بھلی لگنے لگیں باتیں خاتونوں کے کانوں کو — انھیں باتوں پہ کر ڈالا انھوں نے چاک پردوں کو

"ترے زیرِ نگیں گھر ہو محل ہو قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا"

کہیں تو رات دن فتنے جگانے کا تقاضا ہے — کہیں گانے بجانے کے لیے ارشاد ہوتا ہے
کہیں ارض و سما لینے کا ہم کو حکم ملتا ہے — پھر اس پر بھی یہ فرمانا تماشا ہے اچنبھا ہے

"اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا"

پھکڑ چوڑیاں نسوانیت پر ٹھٹکے کہتے ہیں — بہت سے ہیں جبیں کی شکنت پر ٹھٹکے کہتے ہیں
بھلا وہ اور کیسی شرم لیتا نسوانیت پر ٹھٹکے کہتے ہیں — سبحان اللہ وہ تو حریت پر ٹھٹکے کہتے ہیں

"ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا"

تضمین متضاد بر نظم مجاز "اربابِ نشاط"

چھا گیا افلاکِ عصمت پر جو ابرِ ارتقا — چھین کر نورِ بصر خورشیدِ غیرت چھپ گیا
بجلیاں گرنے لگیں عزت کا خرمن جل اٹھا — "عہدِ روشن" نے کیا پھر تو چراغاں جابجا

"دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم"

عشوۂ ترکانہ ہر جا محوِ بیخود بے حجاب　　حسن ورنگینی کے ہر سو کھلکھلاتے تھے گلاب
محو شانِ ہند ڈالے جا بجا دامِ شباب　　دور رہتے تھے جامِ صہبا تھا عجب دورِ شراب

"نازپروردہ حسیں اور کارِ غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم قیدِ حرم سے بے نیاز"

جن کی بے باکی پہ دنیا ہے شرافت شرمسار　　جن کی بربادی پہ تھی تہذیبِ مشرق سوگوار
جن کی بے عنوانیوں سے بے حجابی آشکار　　حسن خانہ جلوہ بازار کا آئینہ دار

"جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ ندامت پاش پاش"

قشقہ سیمائی آزادی ہوئیں رسوائیاں　　غازۂ روئے شرافت بن گئیں بے باکیاں
پیرہن جسم نگاریں کا ہوئیں عریانیاں　　پھر سرِ بازار ہیں برقِ غضب لمعہ چکاں

"وہ حسین پیشانیاں آئینۂ تمکین ناز
وہ رسیلی مدبھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز"

ہیں یہ تابوتِ تمدن اپنے کاندھوں پر لیے　　اپنے صدیوں کے چلن چلتی ہیں ٹھکرائے ہوئے
کفر کا جادو جگائے دین سے پردہ کئے　　دخترانِ اہلِ عرفاں کیا یہی ہیں دیکھیے

"وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار"

کیا انھیں کے واسطے ازتی تھیں آیاتِ حجاب　　اب جھمکتی ہیں جو بن کر آسماں پر آفتاب

کیوں دامن اسلام پہ تم داغ ہوئی ہو
کس واسطے تم داعی اسلام ہوئی ہو

بدلی ہے طبیعت تو بدل ڈالو خدا کی
بھاتی نہیں جب بات رسول بطحا کی
آتی ہے پسند کفر و ضلالت کی فضا ہی
اب مٹ چکی ہو دل سے نشاں بوئے وفا کی

کیوں کرتی ہو بدنام محبت کو وفا کو
ہر حال میں اب چھوڑ چکی صدق و صفا کو

الفقر کی سنت کو بھلا بیٹھی ہو دل سے
پھر کہتی ہو پیرو ہیں رسول اور خدا کے
احکام سے پھر کر بھی یہ دعوے ہیں تمہارے
تم ہوگئے اب خواہش نفسانی کے پتلے

بدلی ہیں فضائیں چمنستان جہاں کی
بدلی ہوئی ہے طبع رسا پیر و جواں کی

دیتے ہیں پتہ جوہر ذاتی یہ تمہارے
بغلوں میں ہی قرآن تو شیطاں سے اشارے
کرتے ہو جو بے پردہ حسینوں کے نظارے
جذبات شریفانہ مٹے جاتے ہیں سارے

ہے تم کو نہ عزت کا نہ ناموس کا کھٹکا
تعلیم کی صہبا کا لگا خوب ہے چسکا

کافر ہو اور کافرہ بیٹی کو بناؤ
اغیار کی محفل ہو تو بیوی کو سجاؤ
ہو بزم طرب گرم تو بہنوں کو بلاؤ
بے باک مناظر ہوں تو اماں کو دکھاؤ

لو داد زمانہ سے زمانہ کی ہوا سے
کیا کام تمہیں دین سے ایماں سے خدا سے

نغمۂ ہندی

مہر و وفا سے ہاتھ دھلے ہیں نیّا ہے منجدھار
پریم کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے کیسے ہوں اُس پار
حرص و حسد میں دید سے گیانی دیدے پہ پھوٹا آگ
بھائی برادر آپس والے جو گن دشمنی کا سکھلائیں
اپنوں سے جو دل بھڑکا دیں آگ تعصب کی بھڑکائیں
ان کی بدھی ٹھکرا دیجو رکھیو نا تو ایک سی لاگ

شکوۂ خواتینِ مشرق

وفا آشنا دل ہمارا جو پایا ہمیں خوب دل بھر کے تم نے ستایا
خدا کو تمھارا وتیرہ نہ بھایا سروں پہ تمھاری فلاکت کو آیا
پھر ان کے تہذیبِ مغرب کا سایہ

محبت کا پہنے ہوئے تھے جو گہنا سدا ظلم سہنا مگر کچھ نہ کہنا
مصیبت میں پھنس کر بھی خاموش رہنا ہمارا مقدر ہمارا یہ کہنا
جفاؤں کو سہنا وفاؤں میں بہنا

ستم پہ ستم جور پر جور سہتے شرافت سے لیکن قدم بھر نہ ٹلتے
مروت نہیں بھولتے محبت میں مرتے بحالِ زبوں صرفِ بیداد رہتے
مگر ظالموں کو بھی ظالم نہ کہتے

لقب ہم کو پاؤں کی جوتی ملا تھا وفاؤں کا گویا ہمارا ہی صلہ تھا

مگر ہم کو پھر بھی نہ کوئی گلا تھا — یہ دل پھر بھی ہر وقت صرفِ ولہ تھا
ہمارا یہ دل اور یہہ حوصلہ تھا

بنا کر قفس میں ہمارا نشیمن — چڑھا کر دریچوں میں چلمن پہ چلمن
گھروں میں نہ رکھا کہیں ایک روزن — ہمیں کر دیا تم نے یوں زیرِ مدفن
نہیں گو یا ہم کو تمنائے گلشن

مگر جس کو کہتے ہو تم دورِ رنگیں — اسی میں تمدن کی بربادیاں تھیں
لیے تھیں جو آغوش میں لطف تمکیں — انہیں نے یہ تم کو بہاریں دکھا دیں
جو تم پر قیامت کی گھڑیاں یہ آئیں

جو پردہ نشیں آشکارا ہوئی ہے — وہ بامِ فلک پر ستارا ہوئی ہے
جو اس دور میں جلوہ آرا ہوئی ہے — تمہارے دلوں کا سہارا ہوئی ہے
یہ کیوں بے حیائی گوارا ہوئی ہے

نہ جس میں حیا ہے نہ جس میں وفا ہے — مجسم ریا ہے سراپا دغا ہے
نہ مہرِ دعا ہے نہ بہرِ دوا ہے — خود آرائیوں میں فقط مبتلا ہے
بظاہر بلا ہے بہ باطن قضا ہے

ہمارے تو رکھا تھا آنچل کا پردہ — کیا ہم نے آوازِ چھاگل کا پردہ
ہوا ہم سے اندھے کا پاگل کا پردہ — کیا دل کا آنکھوں کا کاجل کا پردہ
قیامت کا آفت کا ہل چل کا پردہ

تو پھر اب یہ بے پردگی عام کیوں ہے — مہِ مشرقی بر سرِ بام کیوں ہے
یہ صبح تمنا قرینِ اختتام کیوں ہے — یہ بد دامنی کا خوش انجام کیوں ہے

اب ان جوتیوں پہ یہ انعام کیوں ہے

دخترِ ہندی

مندرجۂ ذیل نظم آج سے ۱۳ سال پہلے لکھی گئی جبکہ قومی خدمات پر گامزن ہونے میں دقتوں اور مشکلوں سے برسرِ دست تصادم رہا تھا۔

پامالِ جفا جذبۂ معصوم ہے تیرا　　اے دخترِ ہندیہ مقسوم ہے تیرا
جس گھر میں ولادت سے ہوا تیرا اجالا　　جس گھر میں تری آنکھ کھلی ہوش سنبھالا
صد گونہ تلطف میں محبت میں پلی تو　　آنکھوں میں بھری دل میں بسی گھر میں رہی تو
گو تجھ پہ اعزہ کے مراعات بہت ہیں　　ہر ایک کے الطاف و عنایات بہت ہیں
قصہ نہیں سنتا کوئی لیکن ترے دل کا　　دستور یہاں ہے یہی ہر قوم و ملل کا
جذبات کی تیرے کوئی پرسش نہیں ہوتی　　"عورت ہے" ترے دل کی پرستش نہیں ہوتی
ہوتا نہیں کچھ پاس ترے ذوقِ طبع کا　　ہوتا نہیں یاں درد کا دختر کے مداوا
لب ہائے سکوں ساز سے کچھ کہہ نہیں سکتی　　جذبات کے طوفان میں یاں بہہ نہیں سکتی
ہوتی رہی دنیا میں یہی مشقِ ستم تو　　مقسوم یہی ہے کہ رہے صرفِ الم تو

غزلیات[1]

حیف ہے اپنی زیست پر ایسے تو ہیں نہیں　　لطف نہیں نیاز میں کیف نہیں نماز میں

[1] انتخاب از نالۂ بیکس

میرے دلِ زار کا ظرف تو دیکھیے ذرا
جلوۂ طور ہے لیے اپنی حریمِ ناز میں

بیکسِ زار کا تو راز پھر بھی نہ پا سکا کوئی
ہوتی رہی صدا بلند سوز کی غم کے ساز میں

جس کو سینچا تھا کبھی خونِ جگر سے تو نے
آج ہوتا ہے وہی تیرا گلستاں برباد

ہو دعا تجھ سے جو بیکس کی خدایا سن لے
ورنہ ہو جائیگا مسلم کا گلستاں برباد

لیلیٰ پردہ نشیں تو نے ستم کیا کر دیا
بیٹھ کر پردہ میں کیا خود کو رسوا کر دیا

کون پا سکتا ترے رازِ نہانی کو مگر
تو نے اپنے ہاتھ سے سب راز افشا کر دیا

بیٹھ کر ہر محملِ دل میں تماشائی بنا
اور کل مخلوق کو وقفِ تماشا کر دیا

شمع — محترمہ عظمت اقبال

(محترمہ عظمت اقبال کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں ص۵۹۰ تا ص۵۹۱)

عظمت تخلص سے تحت ہو چکا تھا۔ پہلے آپ عظمت تخلص کرتی تھیں مگر شوہر کی وفات کے بعد سے اس کو ترک کر کے شمع تخلص کرنے لگی ہیں، راقم السطور کے نام آپ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتی ہیں۔

"شروع شروع میں میں عظمت ہی تخلص کیا کرتی تھی۔ اور اس وقت تک اس کے تبدیل کرنے کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا جب تک کہ میری زندگی جو کہ مسلسل قہقہہ تھی آنسوؤں کا تار ہو کر نہ رہ گئی"

آپ چودھری نعمت اللہ صاحب ایڈووکیٹ (لکھنؤ) کی صاحبزادی اور محترمہ

عظامت اقبال 'شمع'

کنیز فاطمہ حیا کی چھوٹی بہن ہیں۔ آپ کی زندگی ایک غم انگیز افسانہ ہے جس کا اثر آپ کی شاعری پر بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ کی شاعری خود آپ ہی کے لفظوں میں "عشق کا گذرا ہوا افسانہ" اور "اجڑے ہوئے دل کی داستان" ہے۔ آپ کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اس میں جوش و تپش اور یاس و حسرت کے تمام دلائل موجود ہیں۔ امید ہے کہ زمانہ کے ساتھ کلام میں پختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔

محترمہ کے خود نوشت حالات اور مرسلہ کلام درج ذیل ہے:-

"اوائل عمری کے زمانہ میں اپنی بڑی ہمشیرہ صاحبہ (حیا) کی دیکھا دیکھی میں نے بھی شعر کہے اور میری بہن نے اصلاح کر دی۔ پھر پڑھنے لکھنے کی مصروفیت میں وہ ذوق پروان نہ چڑھ سکا اور میری شادی ہو گئی۔ اس درمیان میں بھی میں شاعری سے بیگانہ محض رہی۔ مگر زمانہ نے مجھے پانچ ہی سال بعد مجھے ایک ایسے صدمے سے دوچار کر دیا جس کا تصور ہی زندہ درگور کرنے کو کافی تھا لیکن مشیت کے سامنے دنیا ہمیشہ سر تسلیم خم کرتی رہی ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنے پرستار اور فرشتہ خصلت شوہر سے جدا کر دی گئی۔ بہرنوع میرے دل کی گہرائیوں سے جو بے پناہ غم کی آہیں لبوں پر آجاتی ہیں یہ وہی پارے ہیں چاہے انھیں کوئی شاعری سے تعبیر کرے چاہے میرے المناک آنسو اور آہوں سے۔

عظمت اقبال شمیم"

داستانِ درد

دردِ دل تھم جا ذرا آنسو بہانے دے مجھے
عشق کا گزرا فسانہ یاد آنے دے مجھے

آہ سُلگ اُٹھا ہے سارا جسم دل کی آگ سے
آتشِ دل اشکِ خونیں سے بجھانے دے مجھے

ڈوبتی ہے کشتیِ دل ناخدا کوئی نہیں
کشتیِ دل آج پھر ساحل پہ لانے دے مجھے

اے دلِ ناکام ارمانوں کا ماتم کب تلک
حسرتوں کی آج اک تربت بنانے دے مجھے

پھر لبِ دلگیر پہ ساقی کے ہوتا آج ہے
پھر جبینِ شوق قدموں پر جھکانے دے مجھے

ان دنوں پھر بزمِ دل ہے آہ کیوں اُجڑی ہوئی
اک خیالِ خواب کی دنیا بسانے دے مجھے

ضبطِ غم کی انتہا ہے شمعِ سوزِ نہاں!
داستاں اُجڑے ہوئے دل کی سنانے دے مجھے

دل میں جب سے چبھنوں کی لذتیں پاتی ہوں میں
ہوش کی منزل سے کوسوں دور ہو جاتی ہوں میں

یہ گھٹائیں، یہ بہاریں، یہ ہوائیں، یہ فضا
ہر گلِ نظارہ میں فطرت کی بو پاتی ہوں میں

اک کشاکش ہر قدم، ہر لحظہ پیش اک امتحاں
ہر نفس بر ہم نظامِ زندگی پاتی ہوں میں

کار فرما کون سی قوت دلِ مضطر میں ہے
جی میں کیا کچھ ہے مگر کہنے نہیں پاتی ہوں میں

ہر تبسم بھی مرا اک داستانِ درد ہے
مسکراتی ہوں تو اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہوں میں

ضبطِ غم کی چارہ فرمائی کو گذریں مدتیں
زندگی کی کشمکش سے اب تو گھبراتی ہوں میں

سازِ خاموشی میں بھی ہیں غم کے نغمے صد ہزار
آشکارا ہے وہ جس کو راز بتلاتی ہوں میں

کتنی لا محدود ہیں اس بیخودی کی وسعتیں
منزلِ ادراک سے آگے بڑھی جاتی ہوں میں

نبضِ غم ساکن ہے، اور نباضِ فطرت ہے خموش
جیسے اک کھوئی ہوئی شے آج پھر پاتی ہوں میں

گرچہ شمع جل بجھی شمعِ شبستانِ امید
دل کے خاکستر میں کچھ اب بھی شرر پاتی ہوں میں

جوانی میری آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے
کوئی برقِ طپاں دل کے قریں معلوم ہوتی ہے

نظر کی وسعتوں میں ان کے جلوے بس گئے ایسے

کہ ہر صورت نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے
گرے پڑتے ہیں سجدے خم ہوئی جاتی ہے پیشانی
نظر کو حسن ہی کی سر زمیں معلوم ہوتی ہے
ہوئی تکمیل شاید آج اے سوزِ دروں تیری
کہ اب ہر سانس آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے
مجھے معلوم ہے انجام گو دنیائے فانی کا
خدایا پھر بھی کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے
جدائی نے حدیں وہ کھینچ دی ہیں وائے محرومی
کہیں پر منزلِ مقصد نہیں معلوم ہوتی ہے
مری دردِ محبت کی جلن کو پوچھنا کیا ہے
کہاں بتلاؤں ہمدم ہر کہیں معلوم ہوتی ہے
میری مدہوشیوں کو واسطہ کیا جام و مینا سے
کہ اب ہر تلخیٔ مے انگبیں معلوم ہوتی ہے
رہِ فرقت میں رک جاتے ہیں تھک کر جب قدم میرے
مجھے جب سے میری منزل وہیں معلوم ہوتی ہے
سمجھنے کا نہ قصہ اور نہ دکھلانے کی شے الفت
نظر سے دور اور دل کے قریں معلوم ہوتی ہے
کسی کے نام پہنچ دی ہے شمع زندگی اپنی
تو پھر شکووں کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی ہے

اشاریہ

اشاریہ

الف ممدودہ (آ)

الف مقصورہ (ا)

(چ)

ح

(غ)

(ف)

(ق)

(ن)

ختم شد